اگلے پنے پہ غلطی سے شروع صفحہ از ص ۲۲۹ تا

ص ۲۶۲ کی بجائے چھپے ہیں۔ نذیر

[illegible] ۱۹۶۳ء 12 اپریل

[illegible]

(۱۲۵۹ – ۱۳۶۲ھ)

[illegible]

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۶

از جنوری تا جون سنہ ۱۹۳۱ء

سیاست

نفسیات

فہرست مضمون نگاران

(۱۹) غلام سرور صاحب بی اے (جامعہ) حال مقیم مصر

(۲۰) حضرت ثاقب لکھنوی

(۲۱) سید ابو حمزہ صاحب بھوپال

(۲۲) محمد ابراہیم صاحب عمادی ندوی متعلم جامعہ ملیہ دہلی

(۲۳) مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا

مسلمانوں کے لئے
الجمعیۃ کا مطالعہ کیوں ضروری ہے!

سہ روزہ الجمعیۃ دہلی۔ بڑے بڑے علما اور اہل قلم حضرات کی نگرانی اور سرپرستی میں تقریباً سات سال
جاری ہے اس عرصہ میں اس نے اپنی خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان [illegible] جو مقبولیت اور شہرت حاصل
کرلی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ
مسائل کی تحقیق، اسلامی ملکوں کی اہم خبریں، عربی
کے ممتاز شعراء کی دلچسپ نظمیں، ہندوستان اور ممالک
[illegible] مدلل مقالے گھر بیٹھے پڑھا کریں تو آپ الجمعیۃ کے خریدار ہوجائیے [illegible]
خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام مذہبی اور ملکی مسائل میں مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ سالانہ الجمعیۃ کا سائز
عام اخباروں سے بہت بڑا ہے اور سہ روزہ شائع ہوتا ہے لیکن اس کے فوائد کو عام کرنے کے لئے چندہ
صرف چھ روپیہ (لعہ) سالانہ۔ تین روپیہ چار آنے (سہ/) ششماہی اور دو روپیہ (عار) سہ ماہی رکھا
گیا ہے۔

اگر آپ الجمعیۃ کے خریدار نہیں ہیں تو آج ہی اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر اخبار جاری کرالیں
یا ہمیں وی پی بھیجنے کی اجازت دیں ورنہ کم از کم نمونہ مفت طلب کرکے الجمعیۃ کی خوبیوں کی تصدیق کریں۔

منیجر اخبار الجمعیۃ دہلی

افسانہ

نظم

تنقید و تبصرہ

کتب :

رسائل

شذرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ: پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد	بابتہ ماہ جو

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز

مولوی غلام سرور صاحب نے مصر سے یہ دوسرا مقالہ جو جامعہ مصریہ کے اساتذہ کے لکچروں سے لیا گیا ہے رسالہ جامعہ کے لئے بھیجا ہے۔ اس میں پہلی صدی ہجری میں مکہ۔ مدینہ۔ کوفہ۔ بصرہ۔ دمشق اور فسطاط کی علمی تحریک کی ایک مختصر مگر اجمالی کیفیت دکھائی گئی ہے۔

مقالہ نگار کو اس بیان پر کہ پہلی صدی ہجری میں حجاز میں سرود و نغمہ نے بہت ترقی کی تھی میں کبھی مبارکباد نہیں دے سکتا۔ اس سے پیشتر بعض یورپین مورخین نے بھی یہی لکھا ہے کہ حجاز اس عہد میں ساز و سرود کا گہوارہ بن گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی قسم کے بیانات سے اساتذہ جامعہ مصریہ نے بھی یہ کہنے کی جرأت کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی ادبی مورخین خاصکر ابوالفرج اصفہانی جس نے بیس جلدوں میں غنا اور مغنیوں کے حالات لکھے ہیں زیادہ تر بازاری گپیں اور سوقیانہ خرافات فراہم کی ہیں جن کو تاریخ کا درجہ دینا تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ چند لاابالی مزاج امرا اور خوش باش نوجوان تھے جو اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ عام طور پر نہ اس کا رواج تھا نہ اس کو مقبولیت ہوئی بلکہ دینداری اور تقوے کا غلبہ تھا۔ انسانی جماعت بہر صورت انسانی جماعت ہے نہ کہ ملکوتی۔ خاصکر جب دولت اور فارغ البالی ہو تو ضرور کچھ افراد ایسے ہو جاتے ہیں جو کہ اس قسم کے بے سود مشغلے اختیار کر لیتے ہیں

ازروئے تاریخ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسلام میں غنا و سرود ہمیشہ ادنےٰ درجہ کی چیز سمجھی گئی ہے۔ اور امراء کے لئے ارباب نشاط بھی خدام ہی میں گنے جاتے رہے

ہیں۔

حیرت یہ ہو کہ عراقی ساز و نغمہ کی آواز مقالہ نگار کو سنائی نہ دی اور اس نے حجاز سے عراق کو زیادہ پاک قرار دیا حالانکہ خود اصفہانی کے بیان سے اس کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے۔

عراق کی علمی تحریک خاصکر اختلافات مذہبی کے بیان میں مطلق تعمق سے کام نہیں لیا گیا۔ اور حقیقی وجوہ تک مقالہ نگار کے ذہن کی رسائی نہ ہو سکی۔ دراصل عراق مرج البحرین تھا جہاں عجمی اور عربی ذہنیت میں تصادم ہوا۔ مگر باوجود اختلاف کے دونوں میں ایک یگانگت ضرور تھی، وہ یہ کہ عجمی سلاطین خاصکر آل ساسان اور عربی قبائل کی تاریخ تمام تر شخصیت پرستی سے لبریز تھی اس لئے یہاں جو اختلافات مذہبی پیدا ہوئے وہ سب کے سب شخصی عقیدت پر مبنی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پیدا تو ہو جاتے تھے لیکن مٹ نہ سکتے تھے۔ چنانچہ آجتک ہم ایک طرف اذانوں میں علیؑ ولی اللہ، وصی رسول اللہ، اور دوسری طرف جمعہ کے دن خطبوں میں منبر و ں پر سے جو ہدایت خلق کے لئے رکھا گیا ہے ایک طویل فہرست صحابہ کے ناموں کی سنتے ہیں۔

اس قدر جزی اور حقیر باتوں پر جداگانہ مذاہب کی تعمیر ہوئی تھی جن پر حیرت ہوتی ہے۔ اور افسوسناک امر یہ ہو کہ یہی اختلافات جن سے حقیقی دین کا تا . و پود بکھیر دیا گیا امت اسلامی کا ذخیرہ بن گئے اور اس میں وراثتہ چلے آئے جن کا نتیجہ ہلاکت ہوا۔

ہم منتظر ہیں کہ آئندہ قسط میں کیا آتا ہے۔

اسلم

(جامعہ مصریہ میں عربی ادب اور تاریخ ادب کا خاص اہتمام ہے۔ تاریخ ادب کا مطالعہ شعراء کے سوانح حیات اور ان کے منتخب کلام اور اہل قلم کے چیدہ چیدہ نثری شہکاروں کے

محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس میدان میں وہ مروجہ نصاب سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون سے قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ ادب کی تعلیم میں عرب قوم کی سیاسی، اجتماعی، سماجی اور اخلاقی زندگی کے تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے۔ تقریباً ایک سال ہوا کہ جامعہ کے اساتذہ کے لیکچرز (محاضرات) کی پہلی قسط فجر الاسلام کے نام سے شائع ہو گئی ہے اس کتاب میں پہلی صدی ہجری کی ادبی تاریخ ہے اور اس کے تین مستقل حصے ہیں۔ ایک حصہ میں عربوں کی علمی و عقلی زندگی پر بحث کی گئی ہے جس کے ایک باب کا ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔ باقی حصے جس میں علی الترتیب سیاسی اور ادبی تاریخ پر بحث ہو گی ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔)

سرود

دیکھنے میں آیا ہے کہ مذاہب، علوم و فنون اور ادب و شعر نے ہمیشہ شہروں میں جنم لیا اور وہیں پروان چڑھے۔ یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ عہد حاضر میں بھی جدید افکار و آراء اور اصلاح و ترقی کے خیالات شہروں ہی سے اٹھتے ہیں اسی طرح علم و فن کی درسگاہیں ادبی ادارے، کتب خانے اور اخبارات و رسائل دیہات کے مقابلے میں شہروں میں زیادہ پھلتے پھولتے اور رو بہ ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ اس خصوصیت کا اہم ترین سبب شہروں کی کثرت آبادی اور عمرانی ترقی ہے۔ کثرت آبادی اور ترقی و تمدن نتیجہ ہے وسائل زندگی کی فراوانی کا۔ فراوانی ایک تو بلا واسطہ ہوتی ہے جیسے زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی افراط اور دوسرے بالواسطہ اور وہ یہ کہ دوسرے زرخیز علاقوں سے اہل شہر اپنی مصنوعات کے تبادلہ میں خام اجناس کی کثرت سے درآمد کریں۔ کثرت آبادی اور فراوانی معیشت کا لازمی نتیجہ ہے کہ اہل شہر کو فرصت کی گھڑیاں میسر آتی ہیں جن میں ان کو کسب رزق اور دنیا کے دوسرے دھندوں سے قدرے فارغ البالی نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے آگے چل کر سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور زندگی کو محض ٹھوس اور مادی نقطہ نظر کے علاوہ دوسرے پہلو سے بھی دیکھنے لگتے ہیں چنانچہ آراء و افکار وجود میں آتے

ہیں علوم و فنون کی داغ بیل پڑتی ہے اور ادب پھلتا پھولتا ہے[1]۔

تمام شہر ایک سے نہیں ہوتے۔ ہر ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت ضرور رکھتا ہے۔ اس تنوع سے ان کے علوم و معارف میں بھی تباین ہونا قدرتی امر ہے چنانچہ ایک شہر ایک خاص علم میں ممتاز ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے علم میں نمایاں اور اسی طرح کہیں فلسفہ و حکمت کے چرچے ہوتے ہیں اور کسی جگہ شعر و سخن کی گرم بازاری۔ مثلاً صدر اسلام کی تاریخ ملاحظہ ہو۔ علم حدیث اور تاریخ کی حجاز میں کثرت نظر آتی ہے۔ مذاہب وفقیہ اور جدید افکار و آرا کا عراق سرچشمہ بنا اور بصرہ کو نحو کی اختراع کا فخر حاصل ہوا۔ اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ یہ تنوع اور اختلاف اتفاقات زمانہ کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب نتیجہ تھے طبعی اسباب کا جن میں پیدہ کار فرما تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ اس کے سوا دوسرے مظاہر عالم وجود میں آتے۔ اسلامی شہروں کی شہرت علمی میں مختلف ہونے اور تنوع علوم میں اُن کی انفرادی حیثیت کے کئی ایک اسباب ہیں۔ اس زمانہ کا خیال رکھتے ہوئے جو ہمارا موضوع بحث ہے اہم اسباب ذیل کے دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی مدنیت و تمدن کی عمارت مدنیات قدیمہ کے کھنڈرات پر قائم ہوئی اور ہر شہر اپنے مقامی رنگ اور ماحول کے اثرات سے متاثر ہوا۔ جب مسلمانوں نے عراق و شام کی تسخیر کی تو وہاں کے باشندے اپنی پرانی ذہنیت اور افکار و مزاج سے جو انھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملے تھے یکسر خالی ہو نہیں سکتے تھے۔ البتہ اسلام کا اثر ان پر غالب آیا چنانچہ

---

(۱) اس بارے میں ابن خلدون کا بیان ملاحظہ ہو "تمدن و حضارت عقل کے لئے ترقی بخش ہے۔ تمدن مجموعہ ہے۔ تدبیر منزل۔ افراد قوم کے باہمی اختلاط اور معاشرت کا۔ باہمی اختلاط و معاشرت سے آداب وجود میں آتے ہیں۔ اور امور دین کے قیام اور اس کے آداب و شرائط کی طرح پڑتی ہے اور یہ سب چیزیں قوانین اجتماعیہ سے علوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ عقل کی افزائش و ترقی ہے۔"

نئی ذہنیت کی تشکیل عمل میں آئی جو نتیجہ تھی قدیم افکار و آراء پر اسلامی خیالات کے اثر و نفوذ کا۔

۲۔ صحابہ کرام اور تابعین کا اہل علم طبقہ علمی رجحانات اور دماغی انفرادیت میں ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس اختلاف کے علاوہ صحابہ کرام نے ممالک اسلام کے مختلف حصوں کو اپنا آماجگاہ بنایا۔ اور وہاں اپنے درس و تدریس اور اثر و نفوذ سے علمی مراکز اور فکری اداروں کی بنیاد رکھی ان کی تکوین میں اُن کے شخصی رجحانات اور نقطۂ نظر کا ضرور پر تو پڑا اور بعد میں آنے والے لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگے اور اس طرح سے کئی ایک مستقل فکری ادارے قائم ہو گئے

۳۔ تیسرا اہم سبب سیاسی اور تاریخی حوادث کا ظہور ہے جس نے مختلف شہروں کی علمی و ذہنی زندگی کی بالکل کایا پلٹ دی۔ مکہ کیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول اجلال نے اس کو کیا سے کیا کر دیا۔ مدینہ آپؐ کے دار الہجرت ہونے سے ایک نئے رنگ میں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا۔ سیاسی انقلابات و حوادث کی گرم بازاری اور فتنہ و فساد کی کثرت نے عراق کو نئے نئے افکار اور جدید مذاہب کا بازی گاہ بنا دیا۔ اسی طرح دمشق کی ذہنی زندگی کی تشکیل اور نشو و نما پر خلافت اموی کا مرکز ہونے نے مہتم بالشان اثر ڈالا۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات پیش کریں گے۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی و عقلی مراکز حسب ذیل تھے۔ سرزمین حجاز میں مکہ و مدینہ۔ عراق میں بصرہ و کوفہ۔ شام میں دمشق اور مصر میں فسطاط۔

حجاز | خطۂ حجاز بنجر اور بے سر و سامان اور دریا و انہار سے خالی ہے۔ زمین کا بیشتر رقبہ صحرا اور چٹانیں ہیں۔ تمازت آفتاب کی وہ شدت کہ چند منتشر وادیوں کے سوا روئیدگی زمین سے سر نہیں نکال سکتی۔ باشندوں کا جز و غالب بادیہ نشین ہے۔ حجاز آس پاس کی دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ اس سرزمین میں نہ تو کبھی تہذیب و تمدن کا سایہ پڑا اور نہ یہاں کے باشندوں نے بیرونی دنیا سے تہذیب و تمدن مستعار لینے کی زحمت گوارا کی۔ باہر کی دنیا سے یہودیت و نصرانیت کے قدم اس خطہ تک پہنچے اور قدرے فلسفی آراء و افکار نے بھی اس طرف راہ پائی لیکن بالکل

غیر منظم صورت میں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اہل حجاز ایسی حکمراں قوموں کی سیادت سے محروم ہے جو انھیں تہذیب و تمدن کا سبق دیتیں لیکن ان کی اس محرومی نے اُن میں غیرت، عزتِ نفس، خود اعتمادی اور غیر معمولی فریفتگیِ حریت کے جذبات پیدا کئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے دنیا جہان کو تسخیر کرنے کی ٹھانی۔

اس ظلمت کدہ میں نورِ اسلام طلوع ہوتا ہے۔ اس کی زرفشانیوں سے مکہ و مدینہ علم و حکمت کے مراکز بن جاتے ہیں لیکن یہ علم و حکمت زیادہ تر دینی تھا اور خالص عربی ماحول میں۔

مکہ معظمہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور مبارک کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس سے آپ کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ قریش کو دعوت حق اور اُن کی خودسری اور مخالفت اور عہد نبوت کے ابتدائی حوادث اس سرزمین میں واقع ہوئے اور اس جگہ شریعت مکی کا وجود عمل میں آیا۔ مکی شریعت کی صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مکہ کی اجتماعی تاریخ کا جاننا اشد ضروری اور لابد ہے۔

مکہ کے بعد مدینہ مطہرہ کو آپ کے دار الہجرت ہونے کی سعادت ملی اور یہ شہر اسلامی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا گیا۔ اس جگہ شریعت اسلامی کا بڑا حصہ مدون ہوا اور صدر اسلام کے اہم تاریخی واقعات کا سرچشمہ یہی شہر تھا۔ مدینہ ہی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تعداد میں حدیثیں چھوڑیں۔ اس عہد کی اسلامی تاریخ اور تشریع و قانون کو خاطر خواہ سمجھنے کے لئے مدنی ماحول اور اس کے مختلف اجزا کا غائر مطالعہ نہایت اہم ہے۔

نیز مسلمانوں کے انتہائی عروج کے زمانہ یعنی حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں مدینہ ہی دار السلطنت رہا اور صحابہ کرام کی بڑی تعداد یہیں مقیم تھی۔ ان بزرگوں نے آنحضرت کو دیکھا تھا۔ آپؐ کے ارشادات سنے تھے اور غزوات اور مہمات میں آپ کے رفیق تھے۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال کے بعد یہ لوگ آپ کے سوانح حیات

اور آپ کے اوامر کا تذکرہ کرتے ہوں گے۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مکہ و مدینہ کی علمی شان اور ان کی مرکزی اہمیت میں کوئی شک باقی نہیں تھا۔ صدر اسلام میں علوم حدیث و قرآن، فقہ اور تاریخ کے طلبہ کا مرجع و مقصد یہی دو شہر تھے۔ ان دونوں میں آخر الذکر اول الذکر سے فوقیت لے گیا تھا۔ بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کا ممتاز حصہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہی مکہ سے ہجرت کر گیا تھا۔

نیز ہجرت کے بعد اہل مکہ میں سے جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا۔ سیدھا مدینہ کا رُخ کرتا۔ اور خاص طور پر اہل مکہ کے ذی اثر افراد و اصحاب عقل و فہم مدینہ کی سکونت کو ترجیح دیتے اس کے علاوہ نبی کریم کی آخری زندگی مدینہ میں گزری اور اسلامی عظمت و رفعت کا سرچشمہ یہی شہر تھا۔ عرب کے طول و عرض سے متلاشیان حق اسی سرزمین کا قصد کرتے تھے۔ سیرت نبوی میں عام الوفود کی اہمیت اہل نظر سے مخفی نہیں۔ بہت سے صحابہ کرام کی شیفتگی اور عشق نے جو انھیں رسول کریم سے تھا مجبور کیا کہ وہ اپنے آبائی جگہوں کو چھوڑ کر مدینہ ہی میں چلے آئیں تاکہ آپ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہو سکیں اور اسلامی سرگرمیوں میں آپ کے ساتھ شرکت کا شرف حاصل کریں۔ آنحضرت کے وصال کے بعد مدینہ کی مرکزیت میں فرق نہ آیا اور نبوت کے بجائے اب وہ خلافت کی آماجگاہ قرار پایا۔ اہل اثر حضرات کو مدینہ ہی میں رکھنے کے لئے حضرت عمر نہایت منصر تھے۔ اُن کے عہد خلافت میں رؤسائے قریش بغیر کسی خاص ضرورت کے مدینہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس عہد کی عظیم الشان فتوحات میں تمام اسیران جنگ دار الخلافہ میں پہنچتے تھے حضرت عمر کا خاص حکم تھا کہ جنگ میں جو قیدی مسلمان فوجوں کے ہاتھ لگیں ان کو آپس میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ سیدھا مدینہ بھیجا جائے۔ ان اسیران جنگ میں فارس و روم کے طبقہ امراء کے ممتاز افراد بھی ہوتے تھے اور وہ اپنے ملک اور دستور کے مطابق علوم مروجہ سے بہرہ ور بھی ہوتے ہونگے ان میں سے ایک کافی تعداد مدینہ میں بس گئی۔ چنانچہ ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات میں ان میں سے کثیر التعداد افراد کے نام گنائے ہیں۔ یہ لوگ ان اکابر صحابہ کے موالی

شمار ہوتے تھے جن کے ہاتھ پر یہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے افکار اور نفسیات میں اپنے عرب ہم مذہبوں سے ضرور مختلف ہوں گے۔ ان کے امتزاج اور معاشرت سے اسلامی زندگی کا موثر ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔ یہ مسلم گروہ اپنی قوموں کے متعلم علوم وفنون اور تمدن کی خوبیوں سے کافی مانوس ہوگا۔ اور اُن کی سابقہ تعلیم و تربیت نے اُن میں افکار وخیالات ضرور چھوڑے ہوں گے۔ ان حالات میں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور اسی ذہنیت کے ساتھ احکام اسلام سمجھنے لگے۔

مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا کہ علمی اہمیت اور سیاسی مرکزیت میں مدینہ مکہ سے بہت بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ یہ اضافہ بے محل نہ ہوگا کہ عہد ابتدا میں مہاجرین مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہونا نہایت کراہت سے دیکھتے تھے چنانچہ ابن سعد کا بیان ملاحظہ ہو، "محمد بن عمر کہتے ہیں کہ مہاجرین اہل بدر میں سے کوئی ایسا فرد یاد نہیں پڑتا جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد مکہ واپس چلا گیا ہو۔ صرف ابی سبرۃ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ صحابی مکہ گئے اور وہاں مقیم ہوگئے۔ مسلمانوں نے اُن کے اس فعل کو نہایت برا سمجھا۔ صحابی موصوف کے لڑکے اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں اور اس کے ذکر کو پسند نہیں کرتے۔"

مدرسہ (SCHOOL) مدینہ کی علمی شہرت اور بلند پائیگی کے یہی اسباب تھے صدر اسلام کے بیشتر علما تفسیر وحدیث، فقہ وتاریخ اس مدرسہ سے نکلے اور نیز دور دراز حصوں سے تحصیل علم کی غرض سے طلبہ مدینۃ النبی کا قصد کرتے تھے۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے اپنے بیٹے عمر کو جو بعد میں خلیفہ ہوئے تعلیم و تربیت کے لئے مدینہ بھیجا اور صالح بن کیسان کو اُن کی نگرانی سپرد کی۔ ایک دن عمر نے نماز میں تاخیر کی۔ صالح بن کیسان کی جواب طلبی پر آپ نے کہا شانہ میرے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ صالح نے اس واقعہ کی اطلاع عبدالعزیز بن مروان کو دی انھوں نے ایک خاص ایلچی بھیجا اور اس نے بالوں کا سرے سے صفایا کرکے دم لیا۔ محمد بن اسحاق اور واقدی نے مدینہ ہی میں نشوونما پائی اور اسی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ متاخرین اہل تالیف نے مغازی

و سیر تدوین میں ان ہر دو سے جو مدد ملی وہ ظاہر ہے۔

یہ طبعی امر ہے کہ رسول اللہ صلعم کی حدیث اور آپ کے غزوات کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا۔ آپ کی زندگی اور جانشین خلفاء راشدین کی تاریخ سے واقف ترین اہل مدینہ سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے سامنے یہ سب واقعات رونما ہوئے تھے اور وہ اس کے شاہد عینی تھے۔ اب مکہ و مدینہ کے مدرسہ کے دیگر حالات اور وہاں کے مشاہیر علماء کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔

مدرسہ مکہ | مکہ فتح کرنے کے بعد آنحضرت نے حضرت معاذ کو اپنا جانشین چھوڑا تاکہ وہ اہل مکہ کو دینی تعلیم دیں اور حلال و حرام کے احکام سے آگاہ کریں اور لوگوں کو قرآن سمجھائیں۔ حضرت معاذ اپنے علم، صبر و تحمل اور فیاضی میں نوجوانان انصار میں خاص طور پر ممتاز تھے۔ آپ رسول کریم کی تمام علمی زندگی کے عینی شاہد تھے۔ آپ کا شمار مسائل حلال و حرام میں معرفت تامہ رکھنے والے صحابہ میں ہوتا تھا۔ نیز آپ قرآن کے بہترین قاریوں میں سے تھے اور عہد نبوت میں قرآن جمع کرنے کی سعادت آپ کو نصیب ہوئی تھی۔ حضرت عمر۔ ابن عباس۔ ابن عمر نے آپ سے روایت کی حضرت معاذ نے طاعون عمواس میں انتقال فرمایا۔

حضرت معاذ کے بعد ابن عباس نے اپنی آخری زندگی میں مکہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے قبل مدینہ و بصرہ آپ کے علمی فیوض سے سرفراز ہو چکے تھے۔ عبدالملک اور عبداللہ بن زبیر کی خانہ جنگی کے دوران میں آپ مکہ منتقل ہو گئے اور اس جگہ اپنی علمی بساط بچھائی۔ آپ کعبہ میں تشریف فرما ہوتے اور یہیں تفسیر، حدیث اور فقہ و ادب کا درس دیتے مکہ کی علمی شہرت اور مرکزیت ان کے اور ان کے تلامذہ کی رہین منت ہے۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل علماء میں حسب ذیل تابعین خاص طور پر ممتاز ہیں۔ مجاہد بن جبیر و عطاء بن ابی رباح۔ طاؤس بن کیسان[1]۔

---

(۱) ذہبی نے طاؤس کا شمار علماء و فقہاء یمن میں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق آپ نے ایام حج میں مکہ میں

یہ تینوں بزرگ غیر عرب یعنی جماعت موالی میں سے تھے۔ مجاہد بنی مخزوم کے مولی تھے ابن عباس کی تفسیر کے راوی بھی ہیں۔ مجاہد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس کے سامنے تین دفعہ قرآن پڑھا۔ ہر آیت پر ٹھہر جاتا اور اس کے متعلق ان سے استفسار کرتا کہ یہ آیت کس بارے میں اتری اور کہاں اتری۔ اور اس کا کیا مطلب ہے۔

عطا بن ابی رباح بنی فہر کے مولی تھے۔ آپ کا رنگ سیاہ، ناک چپٹی اور بال گھونگھر والے تھے۔ آپ کا شمار مکہ کے جلیل ترین فقہاء اور عبادت گزاروں میں ہوتا تھا حضرت عطاء مناسک حج کے احکام میں سب سے چوٹی پر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ حرم میں بیٹھ جاتے اور لوگ ان کے گرد حلقہ باندھ لیتے۔ آپ ان سے گفتگو کرتے پڑھاتے اور فتوے دیتے۔

طاؤس یمنی تھے اور ابناء فارس کی اولاد میں سے تھے۔ آپ بہت سے صحابہ سے ملے اور ان سے تحصیل علم کی۔ آخر میں ابن عباس کے زمرۂ تلامذہ میں منسلک ہو گئے۔ آپ کا شمار ابن عباس کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے۔ نیز آپ ممتاز تابعین میں سے تھے اور مکہ کے فقیہہ و مفتی مانے جاتے تھے۔

اس مدرسہ کی علمی سرگرمیوں کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ جاری رہا۔ ہر طبقہ کے مشہور علماء کے نام گنانے اور ان کے حالات زندگی کے بیان کے لئے غیر معمولی طوالت ہو جائے گی جو سر دست ممکن نہیں۔ بالاختصار واضح ہو کہ اس سلسلہ کی پانچویں کڑی میں سفیان بن عیینہ اور مسلم بن خالد الزنجی کی شخصیتیں خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں بزرگ موالی تھے۔ امام شافعی نے جو قریش میں سے تھے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ امام موصوف غزہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والدہ مکہ لے گئیں ادب و شعر میں اہل بادیہ کی شاگردی کی۔ آپ شعر حفظ کرتے اور لغت سیکھتے تھے۔ بعد ازاں مقدم الذکر

انتقال فرمایا۔ ابن سعد بھی اس طرف گیا ہے۔ لیکن ہم نے ابن القیم الجوزیہ کے حوالہ سے ان کو علماء مکہ میں گنا ہے۔

علماء کی درسگاہ میں حدیث وفقہ پڑھا۔ بیس سال کی سن میں مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے اور یہاں تعلیم مکمل کی۔

مدرسہ مدینہ | اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مدینہ کا مدرسہ علمیت میں ممتاز ترین اور شہرت میں سب سے چوٹی پر تھا۔ اور اس کے اسباب بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس مدرسہ کے اہل علم صحابہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ خاص طور پر مشہور ہیں لیکن اس درسگاہ کے ممتاز ترین مؤسس جنھوں نے اپنی زندگی صرف درس و تدریس کے لئے وقف کر دی اور اُن کے شاگردوں اور ساتھیوں کا دائرہ بہت وسیع ہوا صرف دو ہیں۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر۔ یہ دونوں بزرگ اپنے علمی مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ زید بن ثابت انصاری تھے۔ صغر سنی ہی سے آنحضرت کے ساتھ رہے۔ سریانی اور عبرانی زبانوں کی بھی تحصیل کی لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ ان زبانوں میں اُن کو کہاں تک درک حاصل تھا۔ اہل سیرت کا بیان ہے کہ زید موصوف نے پندرہ دن میں عبرانی اور سترہ دن میں سریانی پڑھی۔ اس قلیل مدت میں کسی زبان پر قدرت اور اُس کے آداب سمجھنے کی پوری صلاحیت کا بہم کرنا مشکل امر ہے۔ کیا انھوں نے تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا اور ان زبانوں میں مہارت حاصل کی! اس کے متعلق ہماری معلومات قاصر ہیں۔ بہرحال احکام اسلام کے فہم و ادراک میں زید بن ثابت کا درجہ مسلم ہے۔ قرآن و حدیث سے استنباطِ مسائل میں اُن کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور نیز جب کوئی مسئلہ قرآن و حدیث میں نہ ملتا تو اپنی رائے و قیاس سے کام لیتے۔ ان کے بارے میں سلیمان بن یسار کہتے ہیں "حضرت عمرؓ و عثمانؓ مقدمات کے فیصل کرنے، فتوے دینے، علم الفرائض اور قرأت میں زید بن ثابت پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے" القاسم لکھتے ہیں "حضرت عمر جب کبھی سفر کرتے زید بن ثابت کو اپنا قائم مقام بناتے اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کو وہ اور جگہ بھیجتے ...... حضرت عمرؓ اہل فہم و ذکا اشخاص کو دریافت کرتے تو زید بن ثابت کا نام لیا جاتا۔ آپ فرماتے کہ زید کی منزلت سے مجھے انکار نہیں لیکن اہل مدینہ کو آئے دن کے مسائل میں زید کی اشد ضرورت رہتی ہے اور اُن کے سوا دوسرا یہ کام کر نہیں سکتا۔ اس لئے میں زید کو باہر نہیں بھیج سکتا"

تیسرا کا قول ہے، حضرت عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم کے زمانہ خلافت میں مدینہ کی قضاء، فتوے روایت اور فرائض (وراثت) کے مناصب ان کے سپرد تھے۔ حضرت علی کے بعد امیر معاویہ نے بھی اُن کو اسی خدمت پر بحال رکھا۔ یہاں تک کہ ۴۵ ہجری میں راہی ملک عدم ہوئے۔ ابن عباس ان کی رکاب تھام کر کہا کرتے کہ علما، اور اکابر کی تو قیر یوں کی جاتی ہے۔ زید بن ثابت ریاضیات میں خاص ماہر تھے۔ اور فرائض میں تو اُن کا کوئی مثیل نہ تھا۔ جنگ یرموک کی غنیمت ان کے ہاتھوں تقسیم ہوئی۔ المختصر زید بن ثابت بلند پایہ عالم اور فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور مسائل و معانی کے استنباط میں اُن کو خاص ملکہ ودیعت کیا گیا تھا۔ جو مسئلہ قرآن و حدیث میں نہ ملتا اس میں اپنی رائے سے کام لیتے۔

حسان بن ثابت رسول اللہ صلعم کے شاعر نے آپ کی وفات پر مرثیہ کہا۔ اُس میں کا ایک شعر یہ ہے۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنہ ۔۔۔ ومن للمعانی بعد زید بن ثابت

(حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اہل سخن کون ہے؟ اور زید بن ثابت کے بعد صاحب معانی کون ہے؟)

یہی معانی، یا معنویت کا وصف جس کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے زید بن ثابت کا نمایاں جوہر ہے اور یہی خصوصیت عبداللہ بن عمر سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ ابن عمر صرف عالم تھے۔ وہ حدیثیں جمع کرتے۔ ان کی روایت کرتے اور اُن کو قلمبند کرتے۔ فتوے دیتے اور ذاتی رائے کے اظہار سے وہ ہمیشہ بچتے۔ علوم اسلامیہ کی تاریخ میں یہی دونوں میلان (تقلید و اجتہاد) ایک طویل عرصہ تک پہلو بہ پہلو سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

مدرسہ مدینہ نے علمائے تابعین کی کافی تعداد پیدا کی۔ ان کے سرتاج اور سب سے مشہور سعید بن المسیب ہیں۔ آپ زید بن ثابت کے تلامذہ میں تھے۔ سعید موصوف اپنے استاد کے فتووں کو محفوظ رکھتے تھے اور اُن کے قول کو دوسرے اقوال پر ترجیح دیتے۔

عروہ بن زبیر بن عوام بھی اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ مدینہ کے اہل علم و اہل تقویٰ بزرگوں میں آپ کی ممتاز حیثیت تھی

علماء کے اسی گروہ سے ابن شہاب الزہری قریشی نے علم حاصل کیا۔ صاحب موصوف نے علمار مدینہ سے فقہ و حدیث لی۔ زمرۂ علمار میں سے تدوین علم میں آپ نے سبقت کی۔ آپ کو متعدد خلفار امیہ کے ہاں تقرب حاصل تھا۔ اور خاص طور پر عبدالملک اور ہشام آپ کا بہت احترام کرتے۔ یزید بن عبدالملک اُن سے فتوے طلب کیا کرتے۔ عمر بن عبدالعزیز نے انھیں کے متعلق فرمایا تھا کہ پیشیر و سنت کا جاننے والا الزہری سے بڑھ کر کوئی نہیں ملے گا۔

آخر میں اس مدرسہ نے امام مالک بن انس ایسی زبردست شخصیت پیدا کی۔

جہاں سرزمین حجاز میں ایک طرف یہ قابل احترام اور باعظمت علمی تحریک جس کے کارنامے محدثین فقہا و علما کے رشحات قلم نے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دئے ہیں۔ سرگرم عمل تھی اسی کے ساتھ عیش و نشاط اور رنگ و طرب کی زندگی بھی موجود تھی۔ اس کی تفصیل کے لئے کتب ادب اور خاص طور پر کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے صحیح تجزیہ کے لئے تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھیں اور اس دور کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کیجائے۔

حجاز میں زہد و ورع۔ دینداری اور حدیث و فقہ کے چرچے تھے اور رنگ و طرب۔ لہو لعب کے بھی حلقے موجود تھے۔ شراب بھی تھی اور اشعار میں عورتوں سے تغزل و تشبیب بھی ہوتی تھی اور راگ و سرود کی محفلیں بھی رہتی تھیں۔ اول الذکر تحریک نے اسلامی علوم کو ترقی دی اور دوسری زندگی نے ادب، نکتہ سنجی، شعر و سخن اور راگ و رنگ کی طرح ڈالی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ فن لطیف عراق اور شام کے مقابلہ میں حجاز میں زوروں پر تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ و مدینہ اور اُن کے اطراف گانے والوں اور گانے والیوں سے بھرے پڑے تھے۔ ابوالفرج کے قول کے مطابق مغنی قافلوں کی صورت میں حج کے لئے نکلتے تھے۔ ایک زمانہ

میں ان چار مغنیوں کا بہت شہرہ تھا۔ ان میں سے تین ابن سریج، الغریض، معبد تو حجاز میں تھے اور حنین عراق میں۔ ان تینوں نے آخر الذکر کو حجاز بلا بھیجا چنانچہ وہ آیا اور چاروں اہل کمال حضرت سکینہ کے ہاں جمع ہوئے اور بزم سرود آراستہ کی گئی۔ شائقین کو صلائے عام تھی بس پھر کیا تھا خلقت ٹوٹ پڑی۔ مکان کی چھت پر اتنا اژدہام ہوا کہ چھت نیچے آرہی اور حنین دب کر مر گیا۔
ایک اور واقعہ ہے کہ حجاز میں حسب ذیل مشہور و معروف گانے والے اور گانے والیاں جمع ہوئیں

جمیلہ۔ ہیت۔ طویس۔ دلال۔ بردالفواد نومۃ الضحیٰ رحمۃ۔ ہبۃ اللہ۔ معبد۔ مالک ابن عائشہ۔ نافع ابن طنبورہ۔ عزۃ المیلاء۔ حبابہ۔ سلامہ۔ بلبلہ۔ لذۃ العیش۔ سعیدہ۔ الزرقاء وغیرہ۔ روایت ہے کہ ان لوگوں نے حج کیا اور مکہ میں ان میں سعید بن مسجح۔ ابن سریج۔ الغریض ابن محرز کا اضافہ ہو گیا۔ اہل مکہ مرد و عورت ان کے حسن ہیئت کو دیکھتے تھے۔

ابوالفرج ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ جمیلہ مغنیہ کے ہاں شائقین کا ہجوم ہوا اس نے ستار لیا۔ اور لونڈیوں کے ساتھ مل کر سب نے ساز چھیڑا چنانچہ کوئی پچاس نغمے نکالے اور مکان لرزنے لگ گیا۔ اس کے بعد عود پر گایا اور لونڈیاں ساز بجاتی رہیں۔

مکہ کا طرز راگ اور تھا اور مدینہ کا اور۔ اور دونوں میں خوب چشمک رہتی تھی۔ راگ و رنگ کی طرف لوگوں کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ ابوالفرج کے بیان کے مطابق ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک اموی سے یہ شکایت کی گئی کہ مکہ میں ایک کالا کلوٹا سعید بن مسجح نامی ہے جس نے قریشی نوجوانوں کو خراب کر دیا ہے۔ اور وہ بے طرح اس پر زر و مال کی بارش کرتے ہیں۔ خلیفہ نے حاکم مکہ کو حکم دیا کہ سعید کا مال ضبط کر کے اس کو کوڑے لگائے جائیں! ایک اور روایت ہے کہ امام مالک بن انس نے بیان کیا میں لڑکا ہی تھا اور گانے والوں کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا اور ان کے راگ یاد کرتا۔ ایک دن والدہ نے کہا کہ بیٹا اگر مغنی بدصورت ہو تو اس کے راگ کی طرف زیادہ التفات نہیں ہوتا۔ راگ و غنا چھوڑ کر علم فقہ کی تحصیل کرو۔ کیونکہ اس میں بدصورتی گزند نہیں پہنچاتی۔ چنانچہ میں نے گانے کا شوق چھوڑا اور فقہ کی طرف توجہ کی اور اس میں خدا تعالیٰ نے مجھے

فضل و کمال بخشا۔

گانے کے علاوہ نکتہ سنجی اور نکابات ظرافت کی بھی گرم بازاری تھی۔ مدینہ میں الناضری اس فن کا استاد تھا۔ اس کے بعد اشعب نے اس کی جگہ لی اور حجاز کو نوادر نکابات اور خوش گوئی سے مسحور کر دیا۔ اہل مدینہ کی بزم طرب کے اس گل سر سبد کے کارنامے اب تک کتب ادب میں ثبت ہیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ سرزمین حجاز راگ و رنگ اور نکابات ظرافت سے بھی مالا مال تھی اور حدیث و فقہ کے درس و تدریس کا چشمہ فیض بھی ابل رہا تھا۔ اس عہد کے چوٹی کے مغنی جن سے امرائے بنی امیہ کی محفلیں سجتی تھیں سب حجازی درسگاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ اس کے ساتھ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ حجاز میں فقہ و حدیث کی غیر معمولی فراوانی ہو۔ اس کے اسباب اوپر گذر چکے ہیں۔ ہاں تعجب تو اس پر ہے کہ راگ و رنگ اور شعر و سخن میں حجاز عراق اور شام پر بازی لے جائے۔ چاہئے تو یہ تھا اور یہ ہی قریب الفہم کہ عراق جو قدیم تمدن و حضارت کا حامل اور شام جو رومی تہذیب کا آماجگاہ رہ چکا تھا۔ راگ و رنگ میں حجاز سے پیشقدمی کرتا۔ اور حجاز کی حالت تو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ تہذیب سے زیادہ اسے بدویت سے قرب تھا اور وہ شام اور عراق کے مقابلہ میں اقتصادی لحاظ سے بالکل صفر تھا۔ آخر یہ کیا راز ہے؟

اس عہد کی کتب ادب سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حجاز ظرافت اور لطافت طبع میں عراق و شام کے باشندوں سے فوقیت لے گئے تھے۔ یہاں تک کہ حجاز کے فقہا راگ و سرود کے معاملہ میں فقہاء عراق سے زیادہ بردبار اور وسیع القلب تھے۔ ہمارے خیال میں عراق کا یہ مذہبی تشدد فارسی اثرات کا نتیجہ تھا۔ آغانی عبداللہ بن عمر العمری سے بیان کرتا ہے کہ میں نے حج کا قصد کیا راستہ میں ایک حسین عورت کو دیکھا کہ گفتگو میں فحش کی حد تک پہنچ گئی۔ میں نے اپنی ناقہ کو اس کے قریب لا کر کہا۔ خدا کی بندی حج کا ارادہ ہو اور اللہ سے نہیں ڈرتی۔ عورت نے اپنے حسین چہرہ سے جس کی تاب جمال آفتاب بھی نہ لا سکے۔ نقاب الٹ کر کہا کہ میں ان میں سے ہوں جن کے متعلق العرجی

کہتا ہے

من الالم یحجن بنیین حسبتہ ولکن لیقتلن البری المغفلا

(میں اُن میں سے ہوں جو ثواب کی غرض سے حج نہیں کرتیں بلکہ ان کا مقصد بے گناہ سادہ لوحوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے)

میں نے کہا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ اس چہرہ کو عذاب آتشیں سے مامون رکھے۔ سعید بن المسیب مغنی مدینہ کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو کہنے لگے کہ خدا کی قسم اگر اہل عراق میں سے کوئی بھلا چنگا ہوتا تو کہتا۔ ہٹ دور ہو۔ خدا تجھے غارت کرے۔ لیکن یہ اہل حجاز کے عبادت گزاروں کی ظرافت ہے۔ کتاب الاغانی میں ایک اور مقام پر داود الثقفی کا قول منقول ہے کہ ہم ابن جریج کے حلقہ میں بیٹھے تھے اور وہ حدیث بیان کر رہے تھے۔ اُن کے ارد گرد کافی مجمع تھا جس میں عبداللہ بن مبارک اور جنید عراقی بھی تھے۔ اسی اثنا میں ابن میزل مغنی ادھر سے گزرا۔ ابن جریج نے بلایا اور گانے کی فرمائش کی۔ ابن میزل نے عذر کیا ادھر سے مزید اصرار ہوا۔ آخر ابن میزل نے گایا۔ اور آخر میں کہا کہ اگر آپ کے پاس ان خشک مزاج حضرات کا ہجوم نہ ہوتا تو میں آپ کو دل بھر کر گانا سناتا کہ آپ نہال ہو جاتے۔ ابن جریج اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا شاید تم نے میرے اس فعل کو ناپسند کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ عراق میں ہم گانے کو پسند نہیں کرتے اور کراہیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابن جریج نے پوچھا۔ رجز یعنی حدی کے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ابن جریج نے کہا کہ حدی اور غنا میں کیا فرق ہے۔ ابوالفرج لکھتا ہے کہ ایک دفعہ جنین شام میں پہنچا اور نوجوانوں کی ایک محفل میں بزم سرود جمائی۔ جنین نے ہر رنگ کے راگ الاپے اور ہر ساز چھیڑا لیکن اہل محفل محظوظ نہ ہوئے اور ہنبہ مغنی کی فرمائش کی۔ وہ آیا اور سخیف گانا گایا۔ حاضرین اس پر لٹو ہو گئے۔ جنین جھلا اٹھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہاں ایک رات گزارنا بھی مجھ پر حرام ہے

اس کا ایک اور سبب ہے اور وہ یہ کہ حجاز امرائے عرب کا مرکز تھا اور انھیں کے ہاتھوں

پر بڑی بڑی فتوحات سر ہوئی تھیں ظاہر ہے کہ مال غنیمت میں سے سب سے چوٹی کی لونڈیاں جو عالی نسبی اور تعلیم و تربیت میں خاص ممتاز تھیں ان کے حصہ میں آئیں۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو امراو بادشاہوں کے محلات میں پلیں اور تہذیب و تمدن سے کافی بہرہ ور تھیں۔ ان لونڈیوں کی وساطت سے یہ چیزیں حجاز میں پہنچیں اور یہاں ان پر عربی رنگ چڑھا۔ حجاز میں مدرسہ موسیقی کی تاسیس انھیں لوگوں کی رہین منت ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اہل بادیہ جب دائرہ تہذیب میں آئیں اور انھیں وسائل زندگی کی فراوانی حاصل ہو تو وہ اس شخص کی طرح جو تنگی و فقر و فاقہ کے بعد فارغ البال ہوا ہو لہو ولعب میں پڑ جاتے ہیں۔

اس کا یہ بھی سبب ہے کہ بنی امیہ خود خلافت پر قابض ہو گئے اور اُس کو اپنے گھرانے تک کیا صرف ایک خاندان میں محدود کر لیا۔ اور دوسری قریشی خاندانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ یہاں تک کہ اُن کے لئے امور سیاست میں دخل تو کیا اُس میں فکر و غور کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ شام بنی امیہ کا موید تھا اور عراق ان کا شدید مخالف۔ حجاز کا نوجوان طبقہ خلافت اور سیاست دونوں سے بے نیاز ہو گیا۔ مال و دولت اور جاہ و ثروت کی کیا کمی تھی۔ اس کا نتیجہ رنگ و طرب ظرافت و تکاہات اور لہو و لعب لازمی تھا۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ حجاز میں جو کچھ رونما ہوا وہ ان مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا۔ زندگی کی اس خاص روش کا اثر ادبیات پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس سلئے اس پر مزید گفتگو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔

عراق | وادی دجلہ و فرات کا جنوبی حصہ عراق کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ پانی کی فراوانی ہے اور آب و ہوا معتدل ہے۔ اسی سبب سے اس کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی۔ حضرت مسیح سے تین ہزار سال قبل مختلف متمدن قوموں نے یکے بعد دیگرے عراق کو اپنا جولانگاہ بنایا۔ اہل بابل۔ اشوری۔ کلدانی۔ فارسی اور

یونانی نسلوں نے اپنے اپنے وقت میں عراق پر قبضہ کیا اور ہر ایک نے اپنے دستور کے مطابق یہاں سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں۔ یہ اپنے مظاہر اور خصوصیات میں ایک دوسرے مختلف تھیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کی تہذیب و تمدن کی ضیا باریاں آس پاس کے ملکوں کو برابر منور کرتی رہیں۔

اہل عرب قدیم سے اس سرزمین کو جانتے تھے۔ قبائل بکر و ربیعہ تو یہاں آباد بھی ہو گئے تھے اور بعد میں ان لوگوں نے یہاں ایک ریاست بھی قائم کی جو ریاست حیرہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عراق مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں بصرہ و کوفہ نئے شہروں کی بنیاد پڑی جو بسرعت پروان چڑھے۔ مدائن جو کسروی دارالسلطنت رہ چکا تھا اُس کے مال و دولت کے خزانے بصرہ و کوفہ کے حصہ میں آئے اور بابل اور حیرہ کی تہذیب نے بھی ادھر کا رخ کیا چنانچہ بنی امیہ کے دور حکومت میں عراقی تہذیب کی مرکزیت صرف ان دو شہروں میں سمٹ آئی تھی۔ یہاں تک کہ اُس زمانہ میں عراق سے بصرہ و کوفہ مراد لئے جاتے تھے اور بسا اوقات ان پر "عراقین" کا اطلاق کیا جاتا تھا۔

جب عراق فتح ہو گیا اور اہل عرب نے اس کی ثروت کے قصے سنے تو اس طرف کا رخ کیا۔ طبری کا بیان ہے "عتبہ نے انس بن حجیہ کو ایران سے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ آپ نے مسلمانوں کی کیفیت دریافت کی۔ انس نے کہا کہ دنیا اُن کے اوپر ڈھے پڑی ہے اور وہ سونے چاندی سے کھیلتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کو بصرہ کا اشتیاق ہوا اور بڑی تعداد میں وہاں پہنچے حضرت عمرؓ نے اراضی اصلی باشندوں کے پاس ہی رہنے دی۔ البتہ اس پر خراج لگایا چنانچہ ایک جریب (۳۶۰۰ مربع ہاتھ) خرمہ پر دس درہم۔ نیشکر پر چھ درہم۔ گیہوں پر چار درہم اور جو پر دو درہم خراج مروی ہے۔ اس حساب سے مالگذاری کی مجموعی تعداد دس کروڑ درہم تک پہنچی۔ علاوہ ازیں غیر مسلم رعایا پر جزیہ بھی نافذ کیا گیا۔ جزیہ دینے والوں کی تعداد پانچ لاکھ پچاس ہزار تھی۔ جزیہ کی تعداد ایک سی نہ تھی ۴۸ دینار سالانہ سے کر حسب توفیق ۲۴ اور ۱۲ دینار تک اس کی تعدادیں مقرر تھیں۔ اس

بیان سے عراق کی ثروت و امارت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے چنانچہ یہی سبب تھا کہ اہل عرب نے بڑی تعداد میں ادھر کا رُخ کیا۔

عرب سرزمین عراق میں پہنچے تو اپنے ساتھ قبائلی رقابتیں اور فاتحانہ عالی دماغی بھی لیتے گئے اول الذکر جذبہ کا مظاہرہ بصرہ و کوفہ کے تعمیری نقشہ میں ہی کیا گیا۔ان ہر دو شہروں کی تقسیم روز اول قبیلہ وار کی گئی۔کوفہ کے دو حصے کئے گئے شرقی اور غربی۔شرقی حصہ موخر الذکر سے بہتر تھا۔اب معاملہ یہ درپیش ہوا کہ بہتر حصہ کسے ملے۔آخر کار شرقی حصہ اہل یمن نے لیا اور دوسرا نزاری قبائل کے حصہ میں آیا۔اس تقسیم کے بعد ہر جماعت نے اپنے اپنے حصہ کو قبیلہ وار تقسیم در تقسیم کیا۔اس کی تفصیلی تشریح کے لئے تاریخ طبری ملاحظہ ہو۔شعبی کا بیان ہے کہ کوفہ میں اہل یمن نزاریوں سے زیادہ تھے۔اول الذکر بارہ ہزار تھے اور نزاری صرف آٹھ ہزار۔ان دونوں کی باہمی چشمک نت نئے فتنوں کا سبب بنتی رہتی تھی جب کبھی کوفہ اور بصرہ کے عربوں میں لڑائی ٹھنتی تو ہر ایک قبیلہ علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے قبیلہ کے خلاف صف آرا ہوتا۔مثلاً کوفہ کے یمنی بصرہ کے یمنیوں سے الجھتے اور کوفہ کے بنو ربیعہ بصرہ کے بنو ربیعہ کے مقابل میں آئے۔اسی طرح مضر مضر سے بھڑتے

(باقی آئندہ)

صحبت کا اثر تعلیم کی جان ہے

گِلے خوشبوئے در حمام روزے رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکے یا عبیری کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

آج کل ہماری آنکھوں میں مغربی تمدن کی روشنی ایسی سمائی ہے کہ مشرق کی کوئی چیز نظر میں نہیں جچتی۔ ہمارے کالجوں کے طالبعلموں سے پوچھئے کہ دنیا کے سب سے بڑے شاعر کون تھے تو وہ چھٹ سے جواب دیں گے ہومر، ورجل، ڈانٹے، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے۔ پھر کچھ سوچ کر حب وطن کی خاطر کالیداس اور فردوسی کا نام بھی لے دیں گے مگر ڈرتے ڈرتے کہ کہیں آپ یہ نہ پوچھ بیٹھیں: "ان میں سے کسی کا کلام بھی پڑھا ہے؟" اگر ان سے یہ سوال کیجئے کہ سب سے بڑے معلم کون گذرے ہیں تو وہ سقراط، افلاطون، روسو، پیسٹا لوزی، فروبل کی فہرست گنوا کر خاموش ہوجائیں گے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ مشرق میں بھی کوئی ایسا شخص گذرا ہے جو ان معلموں کی صف میں ممتاز جگہہ پانے کا مستحق ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو تعلیم کے پیمبر دنیا میں تین ہی ہوئے ہیں مغرب میں سقراط اور پیسٹالوزی اور مشرق میں شیخ سعدی شیرازی۔

شیخ سعدی کا نام سن کر لوگ چونکیں گے اور کہیں گے کہ انھوں نے کونسی کتاب نظریۂ تعلیم یا فنِ تعلیم پر لکھی ہے جو ان کا شمار دنیا کے بڑے معلموں میں کیا جائے؟ ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ بیشک شیخ سعدی نے کوئی "رہنمائے مدرسین"، یا "ضابطۂ تعلیمات"، تصنیف نہیں

کیا جو نیکسٹ بک کیٹی میں پیش کیا جا سکے۔ مگر یہ شرف تو سقراط کو بھی حاصل نہ تھا۔ اس نے تو تعلیم کیا کسی موضوع پر ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ پیسٹالوزی کی بھی جو عظمت ہو وہ اس کی تصانیف کی وجہ سے نہیں ہے۔ ہم نے ان تینوں کو تعلیم کا پیمبر کہا ہے۔ پیمبر کا کام صفحہ کاغذ کو سیاہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ زمانے کے ورق پر اپنی کتاب زندگی تحریر کرے جو اس کے عہد میں بلکہ قیامت تک دنیا کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے۔ تعلیم کا پیمبر اُسے کہنا چاہئے جو سرسے پیر تک بچوں کی نارستہ یا نوجوانوں کی ناشگفتہ روح کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو جسے خدا نے یہ ملکہ عطا کیا ہو کہ ایک نظر میں ان کے دل کے بھید کو سمجھ لے ایک بات میں ان کی زندگی کی رو کو پلٹ دے اور یہ توفیق دی ہو کہ اپنے آپ کو ان کے بنانے کی کوشش میں مٹا دے۔ یہ چیز اگر یونان کے حکیم اور جرمنی کے مدرس کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہے تو ایران کے شاعر کے یہاں بھی کچھ کم نہیں۔

افسوس ہے کہ شیخ سعدی کی زندگی کا یہ پہلو ان کے سوانح نگاروں نے اچھی طرح نہیں دکھایا مگر دیکھنے والے کے لئے گلستاں اور بوستاں کا ہر صفحہ ایک چمن ہو جس میں تعلیمی نکتوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اصول تعلیم اور نفسیات شباب کے متعلق ایسی ایسی پتے کی باتیں ملتی ہیں جن سے پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ اس عارف زندگی کا دل تعلیم کی سچی روح سے معمور تھا اور اُسے خدا نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ نوجوانوں کو نغمہ شعر کے پردے میں رازِ حیات کا محرم اور بارِ امانت کا حامل بنا دے۔

چنانچہ دیکھئے گلستاں کے اس مشہور قطعے میں جو ہمارے مضمون میں زیب عنوان ہے تعلیم کا اصل اصول کس خوبی سے ایک لطیف حکایت کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہو کہ تعلیم کی جان استاد کی صحبت کا اثر ہے۔ یہ روح افزا اور روح پرور اثر آہستہ آہستہ شاگرد پر پڑتا ہو اور اس کے نفس کی تہذیب اور ترقی میں معاون ہوتا ہے۔ ہم اس قطعے کے مضمون کی تحلیل کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شاعر کے وجدان صحیح نے وہ نظریہ تعلیم پہلے ہی محسوس کر لیا تھا جسے آگے چل کر فلسفیوں نے غور و فکر سے معلوم کیا۔

ایک اتفاقی واقعے سے شاعر شیراز کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ باغ کی مٹی میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو سرایت کر جاتی ہے اس مضمون کو اس کا حسن آفریں قلم بڑے پیارے انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مٹی میں ایسی خوشبو پاکر مجھے حیرت ہوئی " میں نے اس سے کہا تو مشک ہے یا عبیر ہے کہ تیری پیاری خوشبو نے مجھے مست کر دیا۔ مٹی نے جواب دیا نہیں میں تو ناچیز مٹی تھی مگر کچھ دن گلاب کے پھول کے ساتھ رہی۔ یہ اُسی کی خوشبو مجھ میں آگئی ہے ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو پہلے تھی "

اب ذرا غور کیجئے تو اس چھوٹے سے قطعے میں یہ چاروں باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اگر دو آدمی مدت تک ساتھ رہیں تو ایک کی صحبت کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے جسے تعلیم کہتے ہیں دوسرے یہ کہ تعلیمی اثر ڈالنے کے لئے شرط ہے کہ ان میں سے ایک شخص کمال علم و اخلاق سے مالا مال ہو جیسے گلاب کا پھول جمال رنگ و بو سے مالا مال ہوتا ہے اور دوسرا خاک کی طرح خاکسار ہو اور بیرونی اثر قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ تیسرے یہ کہ یہ اثر اصل میں بے محسوس کئے ہوئے خود بخود پڑتا رہتا ہے جیسے پھول کی خوشبو مٹی میں جذب ہوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ اس اثر کی ایک حد ہے۔ اچھی صحبت انسان کے جذبات و خیالات کو بہت کچھ بدلتی ہے مگر اس کی وضع نفسی یعنی طینت کو نہیں بدل سکتی۔ مٹی مٹی ہی رہتی ہے چاہے اس میں خوشبو پھول کی پیدا ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نظریۂ تعلیم کے اہم ترین مسئلے یعنی شخصی تاثیر و تاثر کے پانچ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (۱) صحبت کے اثر کی اہمیت۔ (۲) اثر آفرینی کی شرائط۔ (۳) اثر پذیری کی شرائط (۴) اثر پڑنے کا طریقہ (۵) اس کی حد۔

ہم ان پانچوں پہلوؤں پر الگ الگ کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے تاکہ تعلیم کا یہ اصل اصول ارباب نظر کو متوجہ کرے اور وہ اس پر غور کر کے ہم سے زیادہ گہرے اور مفید نتائج پر پہنچ سکیں۔

(۱)

یوں تو جب کبھی دو آدمی ساتھ رہتے ہیں۔ ایک کی خو بو کا اثر دوسرے پر ضرور پڑتا ہے۔

اور اس طرح کے ہر اثر کا شمار تعلیم میں ہے۔ مگر ہمیں اس وقت اس مسئلے سے بحث کرنا ہے کہ افادہ تعلیم میں صحبت کا اثر کیا اہمیت رکھتا ہے اور اس شخص میں جس کا کام دوسروں پر تعلیمی اثر ڈالنا ہو کیا صفات ہونا چاہییں تعلیم میں بچوں یا نوجوانوں پر ایک دوسرے کی صحبت کا اثر بھی پڑتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تعلیمی قوت اس تاثیر میں ہے جو شاگردوں کی سیرت میں استاد کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اسی کی ذات ان کے سامنے ہمیشہ نمونے کے طور پر رہتی ہے۔

پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ تاثیر کن چیزوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ استاد کی صحبت کا جو اثر شاگردوں کی ذہنی تربیت پر پڑتا ہے اسے سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اگر استاد ناقابل، کند ذہن یا بدشوق ہو تو یہی نہیں کہ شاگردوں کو اس سے کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اکثر وہ جوہر قابل بھی جوان میں ہے ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر انگریزی ہمیشہ ولیسی لہجے میں اردو کی نحوی ترتیب کے ساتھ بولتے تھے اور شعر خواہ کسی زبان کا ہو ناموزوں پڑھتے تھے۔ اس سُودیشی انگریزی اور شرعی شعر خوانی کا اثر ان کے شاگردوں پر یہ ہے کہ ان کی انگریزی اور قواعد صرف و نحو میں ہمیشہ ان بن رہتی ہے اور شعر اگر ان کی زبان پر آجائے تو صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس سے ان کی عام ذہنی قابلیت خصوصاً احساس تناسب اور ذوق ادب کا جو اندازہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ شکر ہے کہ اب ہمارے ملک میں مدرسوں کا معیار قابلیت بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے مگر ہیڈ ماسٹری کے لئے اب بھی ذہنی قابلیت سے زیادہ ضروری خوش پوشاک "دبنگ" تیز زبان، تیز مزاج اور انگریز ہونا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہیڈ ماسٹر اسکول کے لڑکوں کی نظر میں مولانا حالی کے موچی کی طرح افلاطون سے کچھ یوں ہی سا کم ہوتا ہے۔ اُس کی قابلیت اُن کے نزدیک وہ بلندی ہے جہاں مرغ خیال مشکل سے پہنچتا ہے۔ اب اگر خود ہیڈ ماسٹر صاحب کی علمی پونجی تھوڑی ہو تو طالب علموں کی بے مائگی کا کیا پوچھنا ہے۔

بچے جب اسکول میں آتے ہیں تو ان کے دل پر ایک عجیب وحشت سی طاری ہوتی ہے انھیں شوق تو ہوتا ہے "زندگی کے ہرے بھرے درخت" کے پھل کھانے کا اور سابقہ پڑتا ہے

علم جیسی خشک اور بے رنگ چیز سے جسے لاکھ دلچسپ بنایئے پھر بھی طبیعت اُس سے اچاٹ رہتی ہے۔ اگر استاد قابل ہو تو شاگردوں کو دکھا دے کہ یہ بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اگر خدا نخواستہ وہ خود ہی علم کے نام سے گھبراتا ہو تو ظاہر ہے کہ شاگرد تو اس مصیبت سے کوسوں دور رہیں گے۔

اخلاقی تربیت پر محبت کا اثر اور بھی زیادہ پڑتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اخلاق کی تعلیم کا سوائے اچھی صحبت کے اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے اخلاق برتنے کی چیز ہے۔ اس کا ایک نظری پہلو بھی ہوتا ہے مگر وہ محض جسم ہے جس کی جان عمل ہے۔ اخلاقی اصول جن کی بچوں کو تلقین کی جاتی ہے مردہ الفاظ کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان پر عمل کر کے دکھایا جائے۔ بچوں کے والدین اور استاد جس قدر اہتمام وعظ و نصیحت میں کرتے ہیں اس کا آدھا بھی اس بات میں کریں کہ بچوں کے پیش نظر ریاکاری سے پاک سچے اخلاق کے نمونے رہا کریں تو ان کی کوششوں میں کہیں زیادہ کامیابی ہو۔

تربیت کا ایک اور شعبہ ہے جو سراسر تاثیر محبت پر مبنی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچوں میں ذوق جمال پیدا ہو جس میں لباس کا ستھرا پن۔ رہنے سہنے کا سلیقہ، فطرت کے خوشنما مناظر کا شوق، آرٹ کے حسین نمونوں کی قدر دانی۔ دلکش اطوار، دلپذیر اخلاق، دل پسند گفتگو، سبھی کچھ داخل ہے تو انھیں ایسے استاد کے سپرد کرنا چاہئے جسے خدائے جمیل نے ہر چیز میں حسن کے پہچاننے اور برتنے کا جوہر عطا کیا ہو۔ ہماری موجودہ تعلیم کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے طالب علموں میں ظاہری ٹیپ ٹاپ اور عورتوں کی طرح بننے سنورنے کا شوق تو بے حد ہے مگر سچے ذوق جمال سے وہ عموماً مطلق بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھیں اپنے استادوں میں ہمیشہ "جلالی شان" نظر آتی ہے "جمالی شان" کا دیکھنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ فطرت اور آرٹ کے حسن کی بیصری اور اخلاقی صفات کی خوشنما ہم آہنگی تو ایک طرف ہمارے معلموں کی ظاہری وضع قطع میں اس قدر خشونت ہوتی ہے کہ حسن ذوق

کو ان کی صورت سے وحشت ہو۔ غالب کے ایک شعر میں تھوڑا سا تصرف کر کے ہم اسکول کے ماسٹر صاحب کی شان جلال کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک ترش رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی ماسٹر کو میں

یہ بات ہماری تعلیم اور ہماری قومی زندگی کے لئے باعث افسوس ہے کہ ہم حسن کے ذوق سے قریب قریب عاری ہیں۔ ہم اپنے پرانے جمالی معیار کھو بیٹھے اور نئے ابھی ہاتھ نہیں آئے۔ ہم مکان کی آرائش، لباس، آداب مجلس، فنون لطیفہ میں عموماً مغربی معیاروں کی بری بھلی تقلید کرتے ہیں لیکن یہ چیزیں ہماری وضع نفسی کے مطابق نہیں اس لئے ہم انھیں اچھی طرح جذب نہیں کر پاتے۔ اس کا اثر ہماری ذہنی اور اخلاقی زندگی پر بہت خراب پڑتا ہے۔ ذوق جمال ہی انسان کو اعتدال، تناسب اور ہم آہنگی سکھاتا ہے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر ذہنی اور اخلاقی زندگی ناتمام اور ناتراشیدہ رہتی ہے۔ ہماری تعلیم میں حسن ذوق کی تربیت کی بہت سخت ضرورت ہے خصوصاً معلموں کی تعلیم میں کیونکہ انھیں کی صحبت میں ہمارے ملک کی آئندہ نسل نشوونما پائے گی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تربیت نفس کے سب سے اہم عنصر یعنی مذہبی تربیت کا دارومدار بھی صحبت کے اثر پر ہے۔ مذہب نام ہے اس عقیدے کا جو انسان حیات و کائنات کے بنیادی مسائل کی نسبت رکھتا ہے۔ لیکن عقیدہ حقیقی معنی میں مذہب جبھی کہلائے گا جب یہ انسان کے احساس وجذبات پر چھایا ہوا ہو اور اس کی نفسی زندگی کا مرکز اور اس کے عمل کا محرک بن گیا ہو۔ بچوں کو مذہبی اصول رٹا دینے سے ان میں سچی مذہبیت ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ ان اصولوں کا زبان پر چڑھ جانا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ وہ دل میں اتر جائیں اور روح میں پیوست ہو جائیں یہ کام درس وتدریس کے بس کا نہیں۔ اس کی تو یہی صورت ہے کہ قلب سے قلب پر اثر پڑے۔ جتنی وجدانی چیزیں ہیں ان کی حقیقت الفاظ میں کبھی نہیں ظاہر ہو سکتی یہ اگر جیتی جاگتی نظر آتی ہیں تو کسی دل والے کے دل ہی میں نظر آتی ہیں اور وہیں سے حاصل کرنے والا انھیں حاصل کر سکتا ہے۔ حسن

اور حسنِ ذوق کی طرح حسنِ عقیدت بھی اچھوں کے فیضانِ صحبت ہی سے میسر آتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

مذہبی تعلیم کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اگر استاد کسی خاص مذہب کا پابند ہے لازمی ہے کہ شاگرد بھی اس کے اثر سے اسی مذہب کے پیرو بن جائیں۔ اسی لئے ہمارے ملک میں لوگ چاہتے ہیں کہ ہر مدرسے میں ہر فرقے کی مذہبی تعلیم دینے والے موجود ہوں اور جب اس کا انتظام نہیں ہو سکتا تو مذہبی تعلیم ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مشترکہ مدارس میں جو مذہبی تربیت ہو اُسے مخصوص مذاہب کے عقیدوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تو استاد بس اتنا کرے کہ شاگردوں کے دل میں ایک عام احساس اور عقیدہ پیدا کردے کہ انسان کی نجات زندگی اور کائنات کے حقیقی سرچشمے تک پہنچنے اور اُس سے روحانی علاقہ قائم کرنے پر موقوف ہے۔ یہی قلبی کیفیت وہ بنیاد ہے جس پر ہر مذہب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ استاد مدرسے میں یہ بنیاد قائم کردے تو آگے چل کر ہر شاگرد اپنی خاندانی روایات اور ذاتی روحانی ضروریات کے لحاظ سے کسی مخصوص مذہب کے اصول اختیار کر سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں ایسے استاد موجود نہیں ہیں اور ہوں بھی تو والدین اتنی وسعتِ نظر نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے دیں۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک تو مذہبی تربیت کے معنی یہ ہیں کہ بچوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت کرنا اور ان کے عقائد کو حقارت کی نظر سے دیکھنا سکھایا جائے۔

(۳)

اوپر کی سطروں سے واضح ہو گیا کہ ذہنی تربیت بڑی حد تک اور جمالی، اخلاقی، مذہبی تربیت سراسر صحبت کے اثر پر موقوف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اثر آفرینی کی قوت ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتی۔ بُرا اثر جو عموماً فوری لذت کی ترغیب پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر شخص ڈال سکتا ہے کیونکہ اکثر

لوگوں کا نفس خود ہی اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مادی لذات کی خواہش انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور ہر نفس میں خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ موجود ہوتی ہے اس چنگاری کو ترغیب کی ہوا سے بھڑکا دینا بہت سہل چیز ہے مگر اچھا اثر ڈالنا یعنی اعلیٰ قدروں کی آرزو کو جو ان کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوتی ہے ڈھونڈھ نکالنا اور اُسے اتنا ابھارنا کہ لذت پرستی کی شدید قوت پر غالب آجائے بڑا کام ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر افیونی اپنے مشرب کی تبلیغ میں بہت آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ جہاں کسی کو نزلے کی دوا کے نام سے افیون کی گولیاں چند روز کھلائیں اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کالی بلا کے دام میں گرفتار ہوا مگر کسی افیونی کی افیون چھڑانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ بہت کم لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کا عقیدہ یا ارادہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ دوسروں کے کمزور ارادے کو تقویت پہنچا کر ہوائے نفس کا مدمقابل بنا سکیں اور جو ہوتے بھی ہیں ان کی اس قوت کے مختلف درجے اور مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض کا اثر اپنے خاندان یا اپنے حلقۂ احباب تک محدود ہوتا ہے۔ بعض کا اس سے زیادہ وسیع دائرے میں کام کرتا ہے۔ بعض ایک خاص قسم کی طبیعت کے لوگوں پر اثر ڈال سکتے ہیں بعض ہر قسم کے لوگوں پر۔ بعض کا اثر اپنے ہمنشینوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو پر پڑتا ہے۔ بعض کا ساری زندگی پر۔

معلم کی اثر آفرینی کا دائرہ ہے بچوں اور نوجوانوں کی زندگی اور اس کا مقصد ان کی جسمانی ذہنی، اخلاقی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت یعنی ان کی مجموعی سیرت کی تشکیل میں مدد دینا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس ہمہ گیر اثر آفرینی کے لئے معلم میں کون کونسی صفات ہونا چاہئے۔

سب سے پہلی چیز تو یہی ہے کہ جو ذہنی اور اخلاقی فضائل بچوں کی زندگی میں پیدا کرنا ہیں وہ خود معلم کی زندگی میں موجود ہوں جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں تعلیم و تربیت کے اہم ترین شعبوں میں شاگرد استاد کی تلقین سے نہیں بلکہ اس کے نمونے سے متاثر ہوتا ہے۔ اس محفل میں اصل چیز ”حال“ ہے ”قال“ نہیں۔

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ معلم زندگی کے تمام اعلیٰ قدروں کا مالک ہو یعنی اس کی ذات میں تمام

انسانی فضائل مکمل حیثیت سے موجود ہوں۔ یہ تو انسان کامل کی صفت ہے جو روز بروز پیدا نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو بچوں کو پڑھایا نہیں کرتا۔ ہم جو چیز معلم میں چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے کل تمدنی قدروں یعنی مذہب، علم، آرٹ وغیرہ سے محبت اور ایک گونہ مناسبت ہو۔ جب تک اتنی ہمہ گیری اس کی طبیعت میں نہ ہو وہ اپنے شاگردوں کی مجموعی سیرت کی تشکیل نہیں کرسکتا

اسی کے ساتھ اس کا دل تمام انسانوں خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی محبت اور جذبۂ خدمت سے معمور ہونا چاہیے جس کے دل میں یہ لگن نہ ہو وہ معلمی کی کٹھن ذمہ داری اپنے سر کیوں لے گا۔ اور لے بھی لے تو اسے پورا کیسے کرے گا۔ یوں پیٹ پالنے کے لئے معلمی کا دھندا جو چاہے لیکن اسے فطرت کی پاک امانت سمجھ کر وہی شخص قبول کرسکتا ہے جسے اس راہ کی کڑیاں جھیلنے میں لطف آتا ہو۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب ان کا کسی اور پیشے میں ٹھور ٹھکانا نہیں لگتا تو وہ معلمی اختیار کرتے ہیں۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اسی کو اپنے لئے سعادت کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر دولت، شہرت، عزت تج دیتے ہیں۔ یہی سچے معلم کی صفت ہے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کا دل دوسروں کے درد سے دکھتا ہو اور اُن کی خدمت کے لئے تڑپتا ہو۔

مگر خدمت خلق کے لئے محض جوش اور درد کافی نہیں بلکہ انسان میں یہ مادہ بھی ہونا چاہئے کہ جن کی خدمت کرنا ہے ان کی طبیعت کو پہچان کر اور ان کی ضرورتوں کو دیکھ کر اصلاح و ترقی کی کوشش کرے۔ یک من جوش را دہ من علم و صد من عقل باید۔ ہر خادم خلق کے لئے مردم شناسی کا جوہر ضروری ہے اور معلم کے لئے تو یہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کا کام مختلف طبیعتوں پر اثر ڈالنا ہے اور وہ بھی ہر ایک کی فطری صلاحیتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جس طرح سچا مرشد ہر مرید کی روحانی حالت اور استعداد کو دیکھ بھال کر ان کی ہدایت کرتا ہے اسی طرح سچا معلم ہر بچے کی سیرت اور سرشت کو سمجھ بوجھ کر اُسے تعلیم دیتا ہے۔ اسی تعلیم میں تاثیر بھی ہوتی ہے ورنہ یوں تو اخبارات، واعظ، خطیب دن رات پکار پکار کر تعلیم دیتے ہی رہتے ہیں۔ یہ صفت انسان میں بڑی حد تک مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جب اس کا تھوڑا بہت فطری مادہ طبیعت میں نہ ہو تجربہ کوئی مدد نہیں

دیتا۔

ایک اور صفت بھی معلم کے لئے ناگزیر ہے جس کی طرف لوگوں کا خیال کم جاتا ہے یعنی بڑا بھاری صبر و استقلال۔ یہ اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل جسے ہم تعلیم کہتے ہیں آتا دیر طلب ہو کہ یہاں بے صبر اور کم ہمت آدمی کا گذر ہی نہیں۔ اصلی تعلیم یعنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشوونما اس قدر آہستہ اور غیر محسوس طور پر ہوتی ہے کہ انسان ایک ایک بچے کی تربیت میں برسوں محنت کرے تب جاکر کچھ تھوڑا سا نتیجہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اکثر یہ نتیجہ زمانۂ تعلیم کے ختم ہوجانے کے بعد آئندہ زندگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ کاشتکار خصوصاً ہندوستانی کاشتکار کا صبر مشہور ہے۔ مگر معلم کو کاشتکار سے بھی زیادہ صابر ہونے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی کھیتی صبر ہی کے پانی سے سینچی جاتی ہے۔ اس کا حوصلہ تو وہ کرے جو مدتوں تک خدا کے اور انسانی فطرت کے بھروسے پر بچوں کی کشت دل کی آبیاری کرتا رہے چاہے اُسے پودوں کا بڑھنا اور پنپنا نظر آئے یا نہ آئے۔

ان خلقی صفات کے علاوہ معلم کی تعلیم بھی وسیع اور ہمہ گیر ہونا چاہئے یعنی اسے تمدن کے ہر شعبے سے تھوڑا بہت مس ہو اور کسی ایک شعبے پر ایک حد تک عبور حاصل ہو۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ معلم کو ہر چیز میں کمال ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ ایک حد تک مضر ہے۔ بچے اور نوجوان اس شخص سے کچھ فیض نہیں حاصل کرسکتے جو سفر زندگی میں منزل مقصود پر پہنچ چکا ہو انھیں تو ایسے رہبر کی ضرورت ہے جو تھوڑی بہت اٹکل رکھتا ہو اور ہر قدم پر رستہ ڈھونڈھتا ہو۔ یہ ڈھونڈھنا اور پانا تعلیم کا لازمی جزو ہے اور اسی پر سقراطی طریقۂ تعلیم کی بنیاد ہے۔ سقراط کے اصول کے مطابق پختہ کار رسا فردوں کو بھی اپنے نوسفر ہمراہیوں کی خاطر ناآشنائے راہ بننا اور ٹٹول کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ سقراط اور سعدی دونوں میں یہ صفت تھی کہ نوجوانوں کی رہنمائی میں ان کے آگے آگے نہیں بلکہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور ہر نئی وادی میں پہنچ کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مل کر خوشیاں مناتے تھے۔ جیسے انھوں نے بھی پہلی بار یہاں قدم رکھا ہو۔

یہ چیزیں تو وہ ہیں جو خود معلم میں ہونا چاہئے اب اس سماج (سوسائٹی) کا جس کے بچوں

کو معلم تعلیم دیتا ہو یہ فرض ہے کہ اسے اس کی خدمات کا اتنا معاوضہ دے کہ وہ فراغت کی زندگی بسر کر سکے اور اپنے ہم چشموں اور شاگردوں کی نظر میں اپنا وقار قائم رکھ سکے۔ ہمارے ملک کی حالت آج کل یہ ہے کہ معلم تمام مساوی قابلیت رکھنے والے سرکاری ملازموں سے کم تنخواہ پاتا ہے اور سب سے کم درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر کلکٹر کا ادنیٰ ماتحت سمجھا جاتا ہے بلکہ دیسی ہیڈ ماسٹر تو ڈپٹی کلکٹروں کے سلام کو بھی جایا کرتا ہے۔ ابتدائی مدرسے کے مدرس کی حیثیت گاؤں کے پٹواری کے مقابلے میں کچھ نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں پر جن میں بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے لڑکے بھی ہوتے ہیں رعب قائم رکھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ جب اس کی ظاہری حیثیت اس کے وقار کو کم کرتی ہے تو اُسے خواہ مخواہ بید کے نسخے سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ افلاس کے سبب سے معلم میں وہ بلند نظری، سیر چشمی اور بے طمعی نہیں ہوتی جو شاگردوں پر جمالی اور اخلاقی اثر ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔

(۳)

مگر استاد کی اثر آفرینی بجائے خود مکمل نہیں۔ اس کی تکمیل شاگرد کی اثر پذیری سے ہوتی ہے۔ تعلیم کا موضوع بچے یا نوجوانوں کا نفس ہے جو کوئی بیجان، بے حس یا بے نمو چیز نہیں بلکہ زندگی احساس اور بالیدگی کا طلسم ہے اس پر کوئی اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے جب وہ خود اثر قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ عمل تعلیم کا سب سے اہم عنصر یہی ہے کہ بچے یا نوجوان کی اثر پذیری کی صلاحیت ابھاری جائے۔

اس کی پہلی شرط تو یہی ہے کہ طالب علم وہ کم سے کم جسمانی اور ذہنی قوتیں رکھتا ہو جو تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ سیدھی سی بات ہے مگر اس پر بھی ہمارے ملک میں بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خدا جانے کتنے بچے جو خفیف سی جسمانی مشقت سے بھی معذور ہیں یا جس کا دماغ تقریباً ماؤف ہے مار مار کے عام مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ ان کے لئے خاص طریقۂ تعلیم اور خاص نصاب تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ بعض تو کسی طرح نہیں پڑھ سکتے۔ بہت سے نوجوان جن میں اسکول کے میعا

سے آگے تعلیم پانے کا ہوتا نہیں جبراً کالجوں میں بھیجے جاتے ہیں اور چار برس کی جگہ آٹھ آٹھ دس دس برس میں مرمر کے بی اے پاس کرتے ہیں یا بے پاس کئے تعلیم ختم کر دیتے ہیں۔ ان کی صحتیں برباد ہوجاتی ہیں ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور زندگیاں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ اگر وہ اسکول کی تعلیم کے بعد کوئی دوسرا کام سیکھتے یا عملی زندگی میں داخل ہوجاتے تو چار پیسے بھی کماتے اور ملک و قوم کے لئے بھی کسی حد تک مفید ہوتے مگر اب وہ بالکل بیکار رہتے ہیں اور ان کا وجود ملک اور قوم پر بار ہوجاتا ہے۔

اس عام جسمانی اور ذہنی استعداد کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم پانے والا کسی ایک شعبۂ ذہنی میں خاص طور پر صلاحیت رکھتا ہو۔ تعلیم کے معمار یعنی استاد کو شاگرد کی سیرت کا قصر تیار کرنے کے لئے ایک بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر بچوں یا نوجوانوں میں کوئی خاص وضع نفسی زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ کسی کو کسی علم و فن سے مناسبت ہوتی ہے کسی کو عملی زندگی یا تخئیلی زندگی کے کسی شعبے سے۔ استاد اسی چیز کو مرکز قرار دے کر اس کے ذریعے سے اس کی اور ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ابھارتا ہے اور اس کی مجموعی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا ہو جسے ایک چیز کی طرف بھی خاص رجحان نہ ہو تو اس کی تعلیم بہت ہی دشوار ہے۔

تعلیمی تاثر کی ایک اور اہم شرط یہ ہے کہ شاگرد استاد کا ادب کرتا ہو اور اس کے دل میں عجز و انکسار کا جذبہ موجود ہو۔ یہ بات سن کر لوگ ہم پر قدامت پرستی کا الزام لگائیں گے کیونکہ اس آزادی اور خودداری کے دور میں ادب وغیرہ دقیانوسی چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ محض واعظوں کی نصیحت نہیں بلکہ علم نفس کی ایک حقیقت ہے۔ شاگرد تمدنی زندگی کا محرم بننا چاہتا ہے اور استاد اسے اس حلقے میں داخل کرتا ہے۔ تمدن ایک زندہ اور نامی چیز ہے اس کے حاصل کرنے میں محض ادراک کام نہیں دیتا بلکہ اسے کل روحانی اور ذہنی قوتوں کی مدد سے جذب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے سچی اور گہری آرزو کی ضرورت ہے اور محبت اور ادب اور احترام کی جب تک بچے کو تمدنی زندگی اور اس کے حامل اور مبلغ یعنی معلم سے یہ قلبی تعلق نہ ہو وہ راہ طلب میں قدم کس برتے پر بڑھائے گا۔ فطرت انسانی کا عارف گوئٹے ولہیلم مائسٹر میں ادب

تعلیم کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ ایشیا میں تو سب مکمل ہی سکتے آئے ہیں۔

(۴)

ے ہم نے ابتک یہ کہا ہے کہ تعلیم کا جزو اعظم صحبت کا اثر ہے اور استاد کی اثر آفرینی اور شاگرد کی اثر پذیری کی کیا صورت ہونا چاہئے۔

شاگرد کی اثر پذیری کی ایک شرط ہم نے یہ قرار دی ہے کہ اس کا دل استاد کے ادب مجزو انکسار اور استاد کے ادب و احترام سے معمور ہو۔ کہیں اس کے معنی یہ نہ سمجھ لئے جائیں کہ شاگرد اپنی عقل اور اپنے ارادے کو معطل کرکے ہر چیز میں استاد کی تقلید کرے اور اپنی زندگی کو اس کی زندگی کی عکسی تصویر بنادے یہ بات سراسر تعلیم کے منشا کے منافی ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد کے نفس میں جو قوتیں مضمر ہیں وہ ابھر آئیں اور اس کی سیرت اپنے قانون ارتقا کے مطابق نشو و نما پائے۔ جو استاد یہ کوشش کرتا ہے کہ شاگرد کو اپنے نمونے پر ڈھالے وہ گویا اس کو بے حس اور بیجان مادہ سمجھتا ہے اور اس کی انسانی عظمت کی توہین اور شاگرد اس پر راضی ہوتا ہے وہ خدا کی دی ہوئی بہترین نعمت یعنی شخصیت کو کھو کر روحانی موت اختیار کرتا ہے۔ یہ تعلیم کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے ہر شاگرد اور استاد کو ڈرنا چاہئے۔ پرانے طرز کے مدرسوں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شاگرد لباس، رفتار، گفتار سے لے کر خیالات اور عقائد تک ہر بات میں استاد کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر استاد کا کرتہ گھٹنوں تک پہنچتا ہے تو شاگرد کو بھی گھٹنوں تک کا کرتا پہننا ضروری ہے۔ اگر استاد بال کم ہونے کے سبب سر گھٹاتا ہے تو شاگرد محض تقلید میں گھٹاتے ہیں۔ استاد افیوں کی عادت کی وجہ سے ناک میں بولتا ہو تو شاگرد خواہ مخواہ اس ورد ناک آواز میں گفتگو کرتے ہیں اگر استاد جبر کا قائل ہے تو شاگرد بھی ہیں وہ اختیار کو مانتا ہے تو شاگرد بھی مانتے ہیں۔ یہ نقالی جو انسان کو بندر بنا دیتی ہے اور جو کچھ بھی ہو مگر تعلیم ہرگز نہیں ہے۔

ب استاد کا سب سے نازک فرض یہی ہے کہ شاگرد کے انفرادی رجحانات کو پہچانے اور اس کو اسی رستے پر ڈالے جس پر چلنے کی اس میں صلاحیت ہو۔ خیالات اور عقائد کے بارے میں

دیانتداری کا تقاضا یہ ہو کہ اُستاد شاگرد کو ہر مسئلے کے کل پہلو سمجھا دے اور اسے اپنے طور پر رائے قائم کرنے دے۔ اگر کبھی اس کے عقائد پر اثر بھی ڈالے تو اس کی رضامندی سے اور جائز ترغیب اور تلقین کے ذریعے سے۔ اپنی شخصیت یا اپنے رتبے کے دباؤ سے کوئی بات منوانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

"ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ معلمی کے قابل وہی شخص ہے جس کی سرشت میں بنی نوع انسان کی خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی محبت ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ محبت سب سے بڑی تعلیمی قوت ہے اور اسی کی بدولت تعلیم کا سارا طلسم قائم ہو اگر استاد اور شاگرد کے درمیان محبت کا رشتہ نہ ہو تعلیمی اثر آفرینی اور اثر پذیری ایک سطحی اور مصنوعی چیز ہو کر رہ جائے۔ استاد کی بات شاگرد کے دل میں تبھی اترتی ہے جب وہ شفقت سے کہی جائے اور محبت سے سنی جائے۔

مگر محبت کا لفظ اتنے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ ہمیں اُس خاص مفہوم کو جو ہمارے پیش نظر ہے کسی قدر وضاحت سے بیان کر دینا مناسب ہو۔

محبت پانچ طرح کی ہوتی ہے:۔

(۱) انسانی ہمدردی جو فطری جذبۂ اُنس اور جذبۂ خدمت پر مبنی ہے۔

(۲) عزیزوں کی الفت جو اتحاد خون اور اتحاد نسل پر مبنی ہے۔

(۳) رفاقت جو اتحاد مقاصد پر مبنی ہے۔

(۴) دوستی جو اتحاد طبیعت اور اتحاد مذاق پر مبنی ہے۔

(۵) عشق جو خدا جانے کس چیز پر مبنی ہے۔

ان میں سے عزیزانہ الفت صحیح معنی میں استاد اور شاگرد میں عموماً نہیں ہو سکتی اور دوستی کی بھی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے لئے ہمسنی، ہمچشمی اور ہم مشربی کی ضرورت ہو جو استاد اور شاگرد کے درمیان عموماً نہیں ہوتی۔ استاد جو محبت شاگرد سے رکھتا ہے اُس میں گہرا رنگ جذبۂ خدمت اور ہمدردی کا ہوتا ہے مگر کبھی کبھی رفاقت اور عشق کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ استاد اور شاگرد میں پیر اور مرید یا گرو اور چیلے کا تعلق بھی ہوتا ہے یعنی استاد کی طرف سے شفیقانہ اور مرشدانہ سلوک اور شاگرد کی طرف

سے جوشِ عقیدت۔ یہی روحانی تعلق ان دونوں کی سچی اور مستحکم بنیاد ہے

اس محبت میں عشق کا عنصر جہاں کہیں ہوتا ہے عموماً بے محل ہوتا ہے اور اس سے تعلیمی تاثیر و تاثر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ عشق بھی ایک تعلیمی قوت ہو مگر اسی وقت تک کہ یہ نفسانی خواہشات سے الگ رہ سکے اور یہ بات صرف بچوں کے آپس کے عشق میں ممکن ہے۔ پختہ عمر کے لوگوں کے دل میں عشق کے ساتھ جنسی شہوت کے عنصر کا موجود ہونا قریب قریب لازمی ہے اور یہ چیز تعلیم کے لئے مہلک ہے۔ اور فرض کیجئے کہ استاد کا عشق شاگرد سے بالکل پاک بھی ہو اس کی بدولت اسے ایک گونہ تسلیم ونیاز کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو شانِ ہدایت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اخلاقی پہلو سے قطع نظر کر کے محض تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھئے تب استاد و شاگرد کا باہمی عشق تعلیم میں مانع آتا ہے اور اکثر شدید نفسی کشمکش اور صدمات کا باعث ہوتا ہے۔ اس نکتے کو نہ سمجھنے سے بہت سی تعلیمی کوششیں بیکار رہتی ہیں اور بہت سی قیمتی زندگیاں برباد جاتی ہیں۔

(۵)

آخر میں ہم یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ تاثیر و تاثر کا عمل جو تعلیم کہلاتا ہے کوئی اسم اعظم کا عمل نہیں جس کی کامیابی غیر محدود ہو۔ اول تو استاد کی اثر آفرینی اور شاگرد کی اثر پذیری کے لئے جتنی شرطیں ہم نے بیان کی ہیں ان سب کا پورا ہونا کارے دارد۔ پھر اگر یہ سب کچھ ہو بھی جائے یعنی استاد کامل ہو اور شاگرد مستعد اور تعلیم کا طریقہ صحیح تب بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نتیجہ توقع کے مطابق ہوگا کیونکہ شاگرد پر استاد کے تعلیمی اثر کے علاوہ بھی ہمسن دوستوں عزیزوں اور غیروں کے اثرات پڑتے رہتے ہیں اور یہ سب عناصر مل کر اس کی مجموعی سیرت کی تشکیل کرتے ہیں۔ پھر سب سے قوی عنصر خود اس کی فطری صلاحیتوں کا ہے جن میں استاد کی صحبت کا اثر اس سے زیادہ تصرف نہیں کر سکتا کہ انھیں کسی قدر ابھار دے یا دبا دے یا ان میں ترتیب اور ہم آہنگی پیدا کر دے۔ ایک لحاظ سے دیکھئے تو استاد کی صحبت کی بدولت جو تہذیب اور پختگی شاگرد کی سیرت میں پیدا ہوتی ہے

وہ اسے بالکل نیا آدمی بنا دیتی ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ "جمال ہم نشیں در من اثر کرد" لیکن اصل میں اس کی فطرت اپنے اندرونی قانون ارتقا کے مطابق نشو و نما پاتی ہے یعنی وہ جو تھا وہی رہتا ہے اور اسے کہنا پڑتا ہے "ہماں خاکم کہ ہستم"

اکثر یہ احساس استاد کے لئے نہایت المناک ہوتا ہے کہ اس کا اثر شاگرد کی تربیت میں بہت محدود ہوتا ہے یعنی وہ لاکھ کوشش کرے اُسے جیسا چاہتا ہے ویسا نہیں بنا سکتا لیکن وہ غور کریگا تو اس کو بہت غنیمت سمجھے گا کہ اس کے سر انسانی سیرت کی تخلیق کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کا کام محض اتنا ہے کہ جوہر اصلی کی تشکیل میں مدد دے۔

ہندوستان

عربی جریدہ "الشہاب" میں یہ مختصر مضمون شائع ہوا ہے، اور چونکہ نہایت ہی دلچسپ ہے اس لئے ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ ابراہیم عمادی

ہندوستان میں حکومت حاضرہ کے خلاف سخت جہاد ہو رہا ہے[1] اور ایسا معلوم ہو رہا ہے ہندوستانی قوم اس بار میں متحد ہو کر غلامی کے جوئے کو اتار پھینکے گی، ان میں ۲۴۰ ملین ہندو اور ۷۰ ملین مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں، حکومت کے خلاف عام منافرت کا اظہار کیا جا رہا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس قدر مختلف عناصر، مختلف المذاہب، مختلف زبان اور مختلف خیال رکھنے والے لوگ ایشیار کے اس شاداب خطہ میں رہتے ہیں دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہوں گے۔

قومیں اور زبان

براعظم ہند میں کم از کم ۴۰ قسم کی قومیں پائی جاتی ہیں اور یہ سب تمام ۲۲۲ قسم کی زبانیں بولتی ہیں۔ ان کے لہجے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں، ۵۰ قسم کے رسم الخط جاری ہیں بعض بعض کے حروف ہجا تقریباً پچاس ہیں۔ جملہ تعداد حروف ہجا ۴۰۰ تک پہنچ جاتی ہے۔ مشہور اور عالمگیر زبان "اردو" ہے جو کہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو داں طبقہ کوشش کر رہا ہے کہ سارے ہندوستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہو جائے۔

---

(۱) لیکن اب صلح ہو گئی۔

بلادِ ہند میں ہزاروں طرح کی بُری بُری رسمیں جاری ہیں اور ۵۰۰۰۰۰۰ آدمی ایسے ہیں جو کہ بالکل ناکارہ اور بیکار ہیں، لیکن فقرا، خدا رسیدہ بندوں کی بھی تعداد کم نہیں یعنی یہ لوگ ۴۷۵۲۱۷۴ ہیں۔

گائے

جیسا کہ مشہور ہے برہمنوں کا طبقہ گائے کی تعظیم اور پرستش کرتا ہے۔ گایوں کی تعداد جو کہ صرف عبادت کے لئے مخصوص ہیں ۱۱۴۶۰۰۰ ہے جن پر سالانہ ۱۵۰ ملین فرنک خرچ کیا جاتا ہے ان کی اس قدر تعظیم کیجاتی ہے کہ کوئی شخص ان کو مار نہیں سکتا، یہ گائیں دن رات کھلی ہوئی ادھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہیں اور جو چاہیں کھا سکتی ہیں، کوئی سبزی فروش انھیں مار کر ہنکال نہیں سکتا، اگر یہ کہیں راستے میں بیٹھ جائیں تو کوئی شخص ان مقدس گایوں کو اٹھا نہیں سکتا، یہ بیٹھی رہیں گی اور راہ گیروں نیز گاڑی والوں کو چاہئے رستہ کترا کر جائیں تا کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

شادی

ہندوستان میں سالانہ ۳۲۰۰۰۰۰ لاکھ لڑکیاں قبل البلوغ شادی کے سبب جاں بحق ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ظلم یہ ہوتا ہے کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ لوگوں کی شادی نوجوان کم عمر لڑکیوں سے کردی جاتی ہے جس سے کہ آئندہ نسل پر نہایت ہی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ بڈھے شوہر کے مرنے کے بعد نوجوان بیوہ دوبارہ شادی نہیں کرسکتی، اور اس میں بڑی حد تک رسم دخل ہے۔ مجوسیوں یہاں بیوہ عورتوں کا نکاح قطعاً جائز نہیں، اسی وجہ سے ہندوستان میں ۲۰ ملین عورتیں حالت بیوگی میں زندگی بسر کررہی ہیں۔

برہمنوں کا قدیم مذہب مجوسیت کے اثر سے پاک نہیں، چنانچہ ان رسوم کے علاوہ جس طرح مجوسیوں کے یہاں لڑکیاں ان کے معبد میں خدمت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں رہتی ہیں برہمنوں کے یہاں بھی ہزاروں کنواری لڑکیاں مندروں میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔

ادنےٰ طبقے کے لوگ

ہندوؤں میں جو ادنےٰ طبقے کے لوگ ہیں۔ بلند پایہ ہندوان سے گفتگو کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے چہ جائیکہ ان کا عبادت خانوں میں داخل ہونا۔ اس چیز نے قومیت متحدہ کو سخت پہنچا رکھا ہے۔ سعی بلیغ کے بعد انگریزی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں ان ادنیٰ ذات کے لوگوں کے لئے معمولی مدرسے کھولے گئے اور ان کو اجازت ہوئی کہ قانوناً ہر کنوے سے پانی لے سکیں۔

غیر ملکی حکومت

انگریزی حکومت کا اسقدر جلد استحکام حاصل کرلینا اور حسب منشاء حکومت کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں کتنے بڑے بڑے شان و شوکت کے بادشاہ گذرے اور ایسی حکومت کی کہ غیر ممالک کے بادشاہوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔

ہندوستان میں انگریزی فوج ۵۰ ہزار رہتی ہے اور وظیفہ خواران حکومت کی تعداد ۳۴۴۳ ہے اسی فوج اور انھیں ہوا خواہان حکومت کے سبب غیر ملکی حکومت قائم ہے اور لاکھوں کی تعداد میں اہل ہند غیر ممالک میں یورپ کی عظمت برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے۔

غزل

از یادگارِ اساتذہ حضرت اثر رودولوی

سوزِ پنہانی سے اشکوں کی فراوانی کہاں
قلزمِ خاطر میں وہ اگلی سی طغیانی کہاں

آج امیدِ سحر اے دردِ پنہانی کہاں
دیکھئے پہنچے شبِ فرقت کی طولانی کہاں

اک زمانہ ہوگیا قیدِ قفس کو جھیلتے
ہمصفیرو اب وہ یارائے پرافشانی کہاں

شکوہ سنجیِ تغافل کیش اے دل ہے عبث
روح فرسا درد سے کر فکرِ درمانی کہاں

خوب سمجھے ہیں مآلِ وحشتِ جوشِ بہار
پا بہ زنداں چھوڑ کر جائیں گے زندانی کہاں

ہو چکی جمعیتِ خاطر میانِ جلوہ زار
دیکھئے لیجائے تاروں کی پریشانی کہاں

زاہدِ نازاں مری تر دامنی کے سامنے
پر نیاز و عجز تیری پاک دامانی کہاں

رازِ اخفا ہو چلا خاموش اے شمعِ مزار
دیکھ پہنچا ہے ترا دردِ پریشانی کہاں

چشمِ گریاں قلبِ مضطر نالۂ آتش فشاں
لیکے جائیں ہم اتنا اسبابِ ویرانی کہاں

مشتری

نظام شمسی میں چھٹے درجہ پر جو سیارہ ہے اس کو مشتری (Jupiter.) کہتے ہیں۔ اس کا فاصلہ اوسطاً آفتاب سے اڑتالیس کروڑ تیس لاکھ اور زیادہ سے زیادہ چون کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ اس کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ اور قطر ہماری زمین سے پانسو بچانوے گنا زیادہ ہے۔ وہ چار ہزار تین سو تینتیس دن میں اپنا سال پورا کرتا ہے۔ مشتری کی چال سے اس قانون کی تصدیق ہوتی ہے کہ جو سیارہ آفتاب سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر سست رفتار ہوگا اس کا قطبی قطر چوراسی ہزار چار سو اور استوائی قطر نواسی ہزار چھ سو میل ہے۔ اپنی جسامت و محوری گردش کی سرعت کے سبب سے قطر پر چپٹا اور استوا پر موٹا ہے۔ نو گھنٹے پچپن منٹ کے دن رات ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے محور پر نو گھنٹہ پچپن منٹ میں گردش کرلیتا ہے۔ اس کے نو توابع یا اقمار (Satellites) ہیں۔ زمین کے چاند کی مانند ان کی ایک سمت ہمیشہ مشتری کی جانب اور دوسری اس کے خلاف رہتی ہے۔

سنہ ۱۶۱۰ء میں پہلی مرتبہ دوربین کا استعمال گلیلو(۱) (Galileo) نے اجرام فلکی کے مطالعہ کے لئے کیا تھا۔ چنانچہ ایسے چار اجرام کا انکشاف ہوا جو مقابلۃً تمام نظام شمسی میں روشن و عظیم الجثہ اقمار (Satellites) ہیں اور کمزور سے کمزور دوربین میں بھی بہ آسانی نظر آسکتے ہیں۔ وہ سب مشتری سے ایسے ہی ملحق ہیں جیسے ہمارا چاند زمین سے ہے۔ انکے نام یہ ہیں۔
آئو۔ یوروپا Europa Io گنی میڈ Ganymede اور کیلسٹو Callesto دیگر اقمار (Satellites) بھی شامل ان چاروں کے جب کہ گلیلیو

---

(۱) Galileo ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

Galileo نے ان کا انکشاف کیا تو خیال تھا کہ پہلا قمر (Satellite) بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا اور پروفیسر برنارڈ Prof.Barnard نے ۱۸۹۲ء میں مشتری کے پانچویں مدہم قمر (Satellite) کا انکشاف کیا جو پہلے قمر (Satellite) کے مدور orbit میں واقع تھا۔ اب یہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہوگیا۔ بعد ازاں چار اقمار Satellites کا انکشاف ۱۹۱۴ء تک وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے کیا۔ جب سے اب تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشتری سے اس کے اقمار کے فاصلے یہ ہیں۔

دو لاکھ سرسٹھ ہزار۔ چار لاکھ چوبیس ہزار۔ چھ لاکھ اٹھتر ہزار۔ گیارہ لاکھ اکوانے ہزار۔ ایک لاکھ پندرہ ہزار۔ بہتر لاکھ تیس ہزار۔ پچھتر لاکھ چالیس ہزار۔ ایک کروڑ انچاس لاکھ دس ہزار اور ایک کروڑ پچپن لاکھ ساٹھ ہزار میل ہے۔

اقمار Satellites کے قطر (Dia) تقریباً دو ہزار پانسو سے تین ہزار چھ سو تک ہیں۔ تیسرے کا قطر سب سے زیادہ ہے اور نویں کا صرف پندرہ میل تخمینہ کیا گیا ہے۔ اول کے چاروں بڑے اقمار (Satellites) کے قطر تقریباً گول ہیں اور مشتری کے استوا کی سطح مستوی میں واقع ہیں۔ جب وہ مشتری کے نیچے جا کے اس کے سایہ سے گذر جاتے ہیں۔ تو وقتاً فوقتاً خسوف واقع ہوتا ہے۔ مگر چوتھے قمر (Satellites) کا مدار Orbit قدرے مختلف واقع ہوا ہے وہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے زیادہ جھک گیا ہے جب وہ قمر (Satellite) اوپر یا نیچے سے گزرتا ہے تو اس کے جھکاؤ کے سبب سے اس میں گہن نہیں لگتا۔ آج کل مشتری رات کو ۱۱ بجے تقریباً بالکل سر پر ہوتا ہے اور اقمار Satellites سب سے زیادہ روشن چمکدار سیارہ ہے۔ دو گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں چھٹے اور ساتویں کا مشتری سے تقریباً یکساں تفاوت ہے۔ اور دور کا وقت بھی قریب قریب ایک ہی سا ہے علاوہ بریں انکے مدار (Orbits) ایک دوسرے سے منسلک و وابستہ ہیں۔ اور سیارے

کی ستوائی سطح مستوی کی طرف بہت مائل ہیں آٹھویں اور نویں قمر (Satellite) کے نظام میں بھی مطابقت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان کی گردشی حرکت میں یہ خصوصیت ہے کہ جب یہ اقمار (Satellites) سیارے کے گرد چرخ کھاتے ہیں تو یہ دونوں خلاف سمت اختیار کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت معکوس کا نام رجعت قہقری ہے۔

ان اقمار (Satellites) کی دریافت سے کوپرنکس Copernecus کا نظام شمسی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ اقمار (Satellites) مشتری کے خسوف سے روشنی کی رفتار نہایت صحیح طور سے ناپی گئی ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے رسالۂ جامعہ بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۰ء ملاحظہ فرمائیں۔ علاوہ مشتری کے سات بڑے سیارے اور بھی ہیں وہ یہ ہیں۔

عطارد (Mercury) زہرہ (Venus) زمین (Earth)
مریخ (Mars) زحل (Saturn) یورنس (Uranus) نیپچون (Neptune ;

عطارد (Mercury) یہ سیارہ آفتاب سے بہت ہی قریب ہے۔ اس لئے نظر نہیں آتا۔ اس کا مدار (Orbit) دیگر سیاروں سے بہت چھوٹا ہے۔ آفتاب سے تین کروڑ ستر لاکھ میل فاصلہ ہے۔ بوجہ قرب آفتاب اس میں اس قدر حرارت ہے کہ وہاں پانی صرف بحالت ابخرات رہ سکتا ہے۔ کم و بیش اٹھاسی دن میں اپنی محوری گردش آفتاب کے گرد تمام کرتا ہے۔

زہرہ (Venus) نہایت ہی خوبصورت سیارہ ہے۔ اس کی حالت سطحی زمین سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں بھی عظیم الشان پہاڑوں کا لا انتہا ہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض پہاڑوں کا ارتفاع ہمارے ہمالیہ سے بھی چار گنا زیادہ ہے۔ یہ بھی مثل چاند کے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ صبح کے وقت مشرق سے نہایت روشن سیارہ طلوع ہوتا ہے۔

گلیلیو Galileo نے ان کا انکشاف کیا تو خیال تھا کہ پہلا قمر (Satellite) بہ نسبت
دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا اور
پروفیسر برنارڈ Prof.Barnard نے ۱۸۹۲ء میں مشتری کے پانچویں مدہم قمر
(Satellite) کا انکشاف کیا جو پہلے قمر (Satellite) کے مدار (orbit) میں واقع
تھا۔ اب یہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے مشتری سے زیادہ قریب ہوگیا۔ بعد ازاں
چار اقمار Satellites کا انکشاف ۱۹۱۴ء تک وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے کیا۔ جب سے
اب تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشتری سے اس کے اقمار کے فاصلے یہ ہیں۔

دو لاکھ سڑسٹھ ہزار۔ چار لاکھ چوبیس ہزار۔ چھ لاکھ اٹھتر ہزار۔ گیارہ لاکھ اکیانوے ہزار۔ ایک لاکھ
پندرہ ہزار۔ بہتر لاکھ تیس ہزار۔ پچھتر لاکھ چالیس ہزار۔ ایک کروڑ انچاس لاکھ دس ہزار اور ایک کروڑ
پچپن لاکھ ساٹھ ہزار میل ہے۔

اقمار Satellites کے قطر (Dia) تقریباً دو ہزار پانسو سے تین ہزار
چھ سو تک ہیں۔ تیسرے کا قطر سب سے زیادہ ہے اور نویں کا صرف پندرہ میل تخمینہ کیا گیا ہے۔
اول کے چاروں بڑے اقمار (Satellites) کے قطر تقریباً گول ہیں اور مشتری کے
استوا کی سطح مستوی میں واقع ہیں۔ جب وہ مشتری کے نیچے جاکے اس کے سایہ سے گذر جاتے
ہیں۔ تو وقتاً فوقتاً خسوف واقع ہوتا ہے۔ مگر چوتھے قمر (Satellites) کا مدار Orbit
قدرے مختلف واقع ہوا ہے وہ بہ نسبت دیگر اقمار (Satellites) کے زیادہ جھک گیا ہے
جب وہ قمر (Satellite) اوپر یا نیچے سے گزرتا ہے تو اس کے جھکاؤ کے سبب سے
اس میں گہن نہیں لگتا۔ آج کل مشتری رات کو ۱۱ بجے تقریباً بالکل سر پر ہوتا ہے اور اقمار
Satellites سب سے زیادہ روشن چمکدار سیارہ ہے۔ دو گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں
چھٹے اور ساتویں کا مشتری سے تقریباً یکساں تفاوت ہے۔ اور دور کا وقت بھی قریب قریب ایک ہی سا ہے
علاوہ بریں انکے مدار (Orbits) ایک دوسرے سے منسلک و وابستہ ہیں۔ اور سیارے

کی ابتدائی سطح مشتری کی طرف بہت مائل ہیں آٹھویں اور نویں قمر (Satellite) کے نظام میں بھی مطابقت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان کی گردشی حرکت میں یہ خصوصیت ہے کہ جب دیگر اقمار (Satellites) سیارے کے گرد چرخ کھاتے ہیں تو یہ دونوں خلاف سمت اختیار کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت معکوس کا نام رجعت قہقری ہے۔

ان اقمار Satellites کی دریافت سے کوپر نکس Copernecus کا نظام شمس زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ اقمار Satellites مشتری کے خسوف سے روشنی کی رفتار نہایت صحیح طور سے ناپی گئی ہے جس کی تفصیل کے لئے رسالہ جامعہ بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۷ء ملاحظہ فرمائیں۔ علاوہ مشتری کے سات بڑے سیارے اور بھی ہیں وہ یہ ہیں۔

عطارد (Mercury)، زہرہ (Venus)، زمین (Earth)، مریخ (Mars)، زحل (Saturn)، یورنس (Uranus)، نیپچون (Neptune)

عطارد (Mercury) یہ سیارہ آفتاب سے بہت ہی قریب ہے۔ اس لئے نظر نہیں آتا۔ اس کا مدار (Orbit) دیگر سیاروں سے بہت چھوٹا ہے۔ آفتاب سے تین کروڑ ستر لاکھ میل فاصلہ ہے۔ بوجہ قرب آفتاب اس میں اس قدر حرارت ہے کہ وہاں پانی صرف بحالت ابخرات رہ سکتا ہے۔ کم و بیش اٹھاسی دن میں اپنی محوری گردش آفتاب کے گرد تمام کرتا ہے۔

زہرہ (Venus) نہایت ہی خوبصورت سیارہ ہے۔ اس کی حالت سطح زمین سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں بھی عظیم الشان پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض پہاڑوں کا ارتفاع ہمارے ہمالیہ سے بھی چہار گنا زیادہ ہے۔ یہ بھی مثل چاند کے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ صبح کے وقت مشرق سے نہایت روشن سیارہ طلوع ہوتا ہے۔

زمین (Earth) اس کا فاصلہ آفتاب سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً سوا تین سو پینسٹھ دن میں تمام ہوتی ہے۔

مریخ (Mars) یہ سیارہ مدار ارض کے باہر گردش کرتا ہے۔ آفتاب سے اسکا بُعد تقریباً دو کروڑ اکتالیس ہزار میل ہے اس میں بھی مثل زہرہ (Venus) کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مزید براں جنگل و دریا بھی معلوم ہوتے ہیں۔ نہریں بھی جا بجا جاری ہیں۔ جوزی حیات مخلوق کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔

زحل (Saturn) اس کا بعد آفتاب سے تقریباً نوے کروڑ میل ہے۔ اس کی سالانہ گردش کم و بیش انتیس سال میں تمام ہوتی ہے اس کو ایک نورانی مادہ محیط کئے ہوئے ہے

یورینس (Uranus) قدیم ہیئت داں اس کے وجود سے بالکل بے خبر تھے اس کو سر ولیم ہرشل (۱) (Sir William Herschel) نے ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا۔ یہ تقریباً ایک ارب اکہتر کروڑ میل آفتاب سے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔

نیپچون (Neptune) یہ سیارہ موجودہ معلوم شدہ سیاروں میں سب سے زیادہ دور ہے۔ ۱۸۴۶ء میں اس کا انکشاف ہوا۔ سب سے آخر میں گزشتہ سال جنوری ۱۹۳۰ء میں ایک اور سیارہ معلوم ہوا جس کا فاصلہ آفتاب سے چار ارب میل ہے۔

ان آٹھ سیاروں کے علاوہ تین سو ساٹھ چھوٹے سیارے اور بھی ہیں جن کے مدارات Orbits بہت ہی قریب قریب واقع ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں جذب مادی سے آپس میں منطبق ہو کے مثل زمین (Earth) یا زہرہ (Venus) کے ایک جداگانہ سیارہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ان میں بڑے سے بڑے کا رقبہ ریاست حیدرآباد کے برابر اور چھوٹے سے چھوٹے کا رقبہ پانچ میل ہے۔ سیاروں کے علاوہ کروڑہا تارے اور دمدار

---

(۱) Sir William Herschel ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۲ء میں فوت ہوا

تاسے وشہاب ثاقب وغیرہ ہیں۔ کوئی کہاں تک شمار کرے۔ بقول سر اسحاق نیوٹن (Sir Issac Newton) میں نے اپنی حیات میں جو کچھ کیا وہ بہت تھوڑا کیا کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم ایک وسیع سمندر ہے جس کے کنارہ پر میں بچے کی طرح کبھی سیپ اور کبھی گھونگے چنتا رہا ہوں۔

آخر میں انسان اپنی جہالت اور لاعلمی کا اعتراف کر کے مجبوراً کہتا ہے۔

(سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم)

---

(۱) Sir Issac Newton. ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں پچاسی برس کی عمر میں فوت ہوا۔

۱۷۲۷
۱۶۴۲
۸۵

بیوقوف

بہارستان ایک چھوٹی سی بستی تھی جو چاروں طرف عظیم الشان پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی یہاں کے رہنے والے کسی دوسرے مقام سے واقف ہی نہ تھے۔ ان کی دنیا چند ہی میل کے اندر محدود تھی۔ یہاں دس مہینے خزاں رہتی اور صرف دو مہینے بہار۔ بہار آتے ہی ساری وادی رشک فردوس بن جاتی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں پہاڑوں سے بہہ نکلتیں۔ زمین سبزے سے ڈھک جاتی سوکھی جھاڑیاں جنگلی پھولوں سے سج جاتیں اور ساری وادی ان کی خوشبو سے مہک اٹھتی۔ تناور درختوں پر کونپلیں پھوٹ نکلتیں۔ ان کی شاخوں اور تنوں پر عشق پیچاں کی بیلیں پھیل جاتیں۔ دور دور سے چڑیاں آتیں جو دن رات درختوں پر چہچہایا کرتیں۔ بھونرے اور تیتریاں پھولوں پر منڈلاتے۔

اسی موسم میں یہاں کے رہنے والوں کی فصل تیار ہوتی۔ اس میں صرف اتنا پیدا ہوتا تھا کہ وہ لوگ سال بھر کھا سکتے تھے۔ اسی لئے بہارستان میں نہ کوئی محتاج تھا اور نہ کوئی داتا۔ اگر کسی وجہ سے کسی کی فصل تباہ ہو جاتی یا کھلیان جل جاتا تو اس کو سال بھر پتیاں ابال کر کھانا پڑتیں۔ لوگ اس کی حالت کو دیکھتے اور ترس کھا کر رہ جاتے۔ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اگر کوئی دو ایک روز کا اناج دے دیتا تو اس کو خود اتنے دنوں پتیاں ابال کر کھانا پڑتیں۔

اس وادی میں ہمیشہ ہوشیار، سمجھ دار لوگ پیدا ہوتے تھے۔ ایک بار ایک بیوقوف پیدا ہوا۔ وہ سوچتا بہت اور کرتا کم۔ اکثر اپنی کھیتی چھوڑ کر دوسروں کی کھیتی درست کرتا۔ ایک دفعہ ایک آدمی کا کھلیان آدھا جل گیا۔ بیوقوف نے اس کو اپنا آدھا اناج دے دیا اور خود چھ مہینے پتیاں ابال کر کھائیں۔

جب بہار کا زمانہ نکل جاتا تو وادی کی گھاس زرد ہو جاتی۔ پتیاں جھڑ جاتیں چڑیاں اور تیتریاں چلی جاتیں۔ برف گرنے لگتی اور ساری بستی اجاڑ معلوم ہوتی۔ بستی والے ان تماشوں

ے دیکھنے کے عادی تھے مگر کبھی کبھی وہ بھی اس منظر سے اکتا جاتے اور بہار کی یاد میں گیت گانے لگتے۔

بہار کے موسم میں یہاں کے رہنے والے رنگ کھیلتے۔ جلسے کرتے۔ باغوں میں ناچتے مگر خزاں میں گھروں سے بھی نہ نکلتے۔

ہر قوم میں کچھ نہ کچھ روایتیں ضرور ہوتی ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں میں ایک یہ روایت مشہور تھی کہ پہلے اس وادی میں ایک دریا بہتا تھا جس سے وہ سدا بہار تھی مگر کسی وجہ سے دریا خشک ہو گیا۔ ایک جادوگر ان پہاڑوں میں رہتا ہے اگر وہ چاہے تو دریا پھر جاری کر دے اور پھر وادی سدا بہار بن جائے۔ یہ روایت بیوقوف نے بھی سنی۔ خزاں کے دس مہینوں میں جب لوگ گھروں سے نہ نکلتے، بیوقوف جادوگر کی تلاش میں پہاڑوں میں گھوما گھوما پھرتا۔ آخر ایک دن اس کو جادوگر مل گیا۔ بیوقوف نے کہا

"میں اپنی وادی کو سدا بہار بنانے آیا ہوں"

جادوگر نے جواب دیا

"اگر کوئی شخص مجھ کو چار سال تک برابر اپنا کھلیان دے تو میں وادی میں اگلا دریا چھوڑ دوں گا اس سے وادی پھر سدا بہار بن جائے گی۔

بیوقوف نے کھلیان دینا منظور کر لیا۔

جب بہار کا زمانہ آیا۔ کھیتیاں لہلہانے لگیں۔ باغوں میں جلسے ہونے لگے۔ لڑکے تیتریاں اور چڑیاں پکڑنے کے لئے جنگلوں میں گھومنے لگے تو بیوقوف نے جادوگر سے جا کر کہا:۔

"کھلیان تیار ہے"

جادوگر اس وقت کچھ نہ بولا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ بیوقوف کا کھیت کٹا ہوا ہے لوگوں نے بے وقوف سے پوچھا۔

"کھیت کیا ہوا؟"

بیوقوف نے خوش ہوکر کہا۔
"میں نے جادوگر کو دے دیا۔ اگر چار سال تک میں برابر اپنا کھلیان دیتا رہوں گا تو وادی
پھر سدا بہار بن جائے گی۔"
"دیکھو کتنا بیوقوف ہے۔ اگر وادی سدا بہار بن گئی تو اس کو کیا مل جائے گا یہ تو چار سال
میں مرجائے گا۔"
بیوقوف سال بھر تک پتیاں کھاتا رہا۔
پھر جب بہار کا زمانہ آیا۔ کھیتیاں لہلہانے لگیں باغوں میں ناچ ورنگ ہونے لگا۔
بچے بوڑھوں نے رنگین کپڑے پہن لئے تو بیوقوف کا بھی کھیت تیار ہوا۔ اس نے جادوگر سے
جاکر کہا۔ کھیت تیار ہے۔ جادوگر اس وقت کچھ نہ بولا۔ صبح کھیت کٹا ہوا تھا۔
لوگوں نے جب بیوقوف کا کھیت کٹا ہوا دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔
"کتنا بیوقوف ہے ایک سال اور پتیاں کھائیں۔
پھر بہار آئی۔ تیتریاں اور بھونرے پھولوں پر منڈلانے لگے۔ شاداب کھیتیاں لہلہانے لگیں
وادی کی لڑکیاں باغوں میں ناچنے لگیں۔ اب کی بیوقوف بہت کمزور ہو گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے
کھیت گوڑا، بیج ڈالے۔ آخر خزاں کے ابتدائی زمانے تک کھیت تیار ہو گیا۔ بیوقوف جادوگر
سے کہا کھیت تیار ہے۔
دوسری صبح کو کھیت کٹا ہوا تھا۔
لوگوں نے جب بیوقوف کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔
"بیچارا کھیلوں میں بھی نہیں شریک ہونے پاتا ہے۔ افسوس بالکل بیوقوف ہے!"
چوتھی دفع بہار آئی۔ بستی والے خوشی خوشی گھروں سے نکلے اور کھیت گوڑے ان ہی
لوگوں میں بیوقوف بھی شامل تھا مگر زار و نزار۔ اٹھتا بیٹھتا آتا اور ایک گھنٹے کا کام ایک دن میں
کرتا۔ اس طرح جب دوسروں کے کھیت تیار ہو گئے اور وہ رنگ رلیاں منانے لگے تو اس کے

کھیت میں صرف بیج پڑے تھے۔

ایک روز جب باغوں سے واپس آرہے تھے تو دیکھا کہ بیوقوف کھیت میں مرا پڑا ہے سب نے ترس کھایا اور کہا " افسوس بچارے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی اور وادی کو سدا بہار نہ دیکھ سکا۔ بیوقوف تو تھا ہی۔ مفت میں اپنی جان گنوائی۔

دوسرے دن بہارستان کے رہنے والوں کا جلسہ تھا جب ناچ شروع ہوا تو باجوں سے بھرائی ہوئی آواز نکل رہی تھی اور ناچنے والی لڑکیوں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

ایک شخص بولا۔ لڑکیاں آج کتنا خراب ناچ رہی ہیں۔

ایک ناچنے والی لڑکی بولی۔ بانسری سے کتنی خراب آواز نکل رہی ہے۔ جیسے ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہو۔

ایک بانسری بجانے والا بولا۔ موسم کتنا خراب ہے۔ سورج بادلوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بیوہ ماتمی لباس میں۔

اس دن پانی برسنے کے بعد لڑکے بیر بہوٹیاں چننے جنگلوں میں گئے۔ زمین پر یہاں سے وہاں تک سرخ سرخ چتیاں تھیں۔ لڑکوں نے کہا۔

" شاید بیر بہوٹیوں کو کسی نے کچل ڈالا "

شام کو لڑکوں نے پہاڑوں کے اندر گڑگڑاہٹ سنی جیسے کوئی کراہتا ہو۔ رات کو جب بہارستان کے رہنے والے جلسے سے واپس آرہے تھے تو ان کے بجوروں سے خوشبو نکل رہی تھی۔ ان کے ستار خاموش اور ان کی گانے والی لڑکیوں کے گلے پڑے ہوئے تھے سارے مجمع پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

ایک لڑکا بولا " پہاڑ کے اندر ہم نے دریائی غرغراہٹ سنی "

دوسرا لڑکا " افسوس۔ اگر بیوقوف ایک مہینہ اور زندہ رہتا تو وادی سدا بہار

بن جاتی اور بیر بہوٹیاں نہ مرتیں "

پہلا لڑکا "ہم اپنا کھلیان برابر چار سال تک جادوگر کو دیں گے"

ایک اور لڑکا "اور ہم بھی دیں گے"

سبھوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

تنقید و تبصرہ

کتب :

مخزن ادب ۔ قواعد مضمون نویسی ۔ کردار اور افسانہ ۔ محمود گاوان
یورپ میں ایک سال ۔ مولود ہمایوں ۔ قرآن اور نئی روشنی

مخزن ادب مصنفہ مولوی حافظ ڈاکٹر محمد عبدالشہید ۔ این ۔ ایس ۔ ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ آئی ۔ جی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ ۔ ملنے کا پتہ ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔ شمشاد مارکیٹ ۔ سول لائن علیگڑھ

یہ کتاب ہائی اسکول اردو کورس کے لئے شائع کی گئی ہے ۔ اس میں سب سے پہلا مضمون انشا پردازی اور ضروری کاروباری خطوط نویسی کے متعلق ہے جس کے سلسلے میں مشاہیر ادب اردو کے بعض خطوط اور رقعات بھی دئے گئے ہیں ۔ پھر معاملات کے متعلق ضروری تحریری معلومات جو طلبہ کے لئے لابدی ہیں درج کی گئی ہیں ۔ اس کے بعد مختصر مضامین ادب عالیہ کے بڑے بڑے اہل قلم کی تحریروں سے منتخب کئے گئے ہیں ۔ پھر نظم کا حصہ ہے جو مشہور شعرا کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے ۔ آخر میں ان حضرات کے مختصر حالات دئے گئے ہیں جن کے مضامین نظم و نثر اس کتاب میں لئے گئے ہیں ۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے ۔ کاغذ اوسط ہے ۔ اور چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر ختم ہوتی ہے ۔ اس کی ترتیب میں یہ امر خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جو کچھ درج کیا جائے وہ طلبہ کے لئے کارآمد اور مفید ہو ۔ موجودہ طریقہ کتب نصاب کا جو مروج ہے اس پر اگرچہ ہم کو اعتراض ہے کہ صرف چند پائے کے اہل قلم ہیں وہی انتخاب کئے جاتے ہیں اور موجودہ دور کے ادبا جو قدما سے بہتر اچھی اردو لکھتے ہیں متروک و مہجور ہیں اور اس کتاب میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے

مگر چونکہ انتخاب اچھا ہے اور افادیت کا خیال رکھا گیا ہے اس لئے ہم کو یہ کورس پسند آیا۔ ہم اس کو بمقابلہ دیگر کتب کے جو اسی غرض کے لئے لکھی گئی ہیں مرجح سمجھتے ہیں۔

قواعد مضمون نویسی حصہ دوم | مصنفہ مولوی محمد مظفر الدین صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ قصبہ مانوت (حیدرآباد دکن) مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدرآباد دکن چھوٹی تقطیع صفحات ۸۰ قیمت ۲/
اس کتاب میں مدارس تحتانیہ کے طلبہ کی حالت کو پیش نظر رکھ کر مضمون نویسی کے اصول سلاست کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ عام طور پر اسکول کے لئے اس کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔

کردار اور افسانہ | مصنفہ عبدالقادر سروری۔ ایم اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ مددگار پروفیسر اردو و فارسی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔ چھوٹی تقطیع تعداد صفحات ۲۳۲۔ مجلد۔ قیمت فی نسخہ عہ
یہ کتاب دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ ہے جن کو مصنف نے مذکورہ بالا نام سے شائع کیا ہے اس میں افسانہ کی کردار نگاری۔ اشخاص اور ان کی سیرت اور ان کے تشخصات ممیزہ کی بحث تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور اردو کے مقبول اور پسندیدہ افسانوں سے کردار افسانہ کے نمونے اور مثالیں دکھائی گئی ہیں۔ افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

محمود گاوان | مصنفہ محمد ظہیر الدین صاحب۔ بہ سلسلہ مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ۔ تعداد صفحات ۵۵ تقطیع خورد۔ قیمت فی نسخہ ۸/ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط
اس کتاب میں محمد ظہیر الدین صاحب متعلم بی۔ اے کلاس جامعہ عثمانیہ نے سلاطین بہمنیہ

کے مشہور وزیر محمود گاوان کے تاریخی واقعات تفصیل کے ساتھ مختلف زبانوں کی تاریخی کتابوں سے اخذ کر کے فراہم کئے ہیں ۔ اور نہایت خوبی کے ساتھ ان کو مرتب کیا ہے۔ ان کی محنت قابل داد ہے۔ لیکن ابھی وہ طالب علم ہیں اس لئے میں ان کی توجہ ایک ضروری امر کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے بزرگوں کی تاریخ کے ساتھ جو عقیدت ہے وہ غلو تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں کے اکثر مورخین جنھوں نے زمانہ حال میں سلف کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اسی مفاخرانہ عقیدت کے ساتھ لکھی ہیں لیکن اصول تاریخ کے مطابق یہ صیت پسندیدہ نہیں ہے۔ تاریخ میں واقعات کی صداقت کو اس سے کہیں زیادہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس قدر کہ اس کی عظمت جس کی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ تعصب یا پاسداری سے مورخ کو قطعاً سروکار نہ ہونا چاہئے۔

یورپ میں ایک سال | نوشتہ نصیرالدین صاحب ہاشمی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ ایل۔ (لندن) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرچار مینار حیدرآباد دکن۔ قیمت ندارد۔ تعداد صفحات ۹۰۔ تقطیع خورد۔

اس کتاب میں سید صاحب موصوف نے ایک سال تک یورپ میں رہ کر وہاں کے حالات جو ہندوستانی طلبہ کے لئے ضروری اور مفید ہیں لکھے ہیں۔ مختلف راستے اور بود و باش کے طریقے درج کئے ہیں تاکہ ہندوستان سے جانے والے لوگوں کو رہبر کا کام دے۔

مولود ہمایوں | مصنفہ حاجی محمد موسیٰ خاں شروانی رئیس دتاولی ضلع علیگڑھ۔ تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۶۲ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ۸ ملنے کا پتہ۔ مطبع عہد آفریں۔ ترپ بازار حیدرآباد دکن

حاجی صاحب نے جو مشہور قومی کارکن اور ممتاز اہل قلم ہیں اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحقیق و اختصار کے ساتھ جمع کئے ہیں۔ مولود میں عام طور پر جو باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کا اکثر حصہ غلط ہوتا ہے۔ غالباً یہی سوچ کر حاجی صاحب نے صحیح حالات

فراہم کردئے ہیں کہ لوگ بجائے رسمی مولودوں کے اس کو پڑھیں۔ انھوں نے اس کتاب میں قلب اور نیت اور تمدن و معاشرت کی اصلاح کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا ہے۔ اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جس کو مصنف نے نظر ثانی کر کے صحت کے ساتھ طبع کرایا ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کی مشہور کتاب کارنامہ خلافت کے دوسرے حصہ کی پہلی جلد ہے۔ اس میں صرف ولادت سے ہجرت تک کے حالات ہیں۔

قرآن اور نئی روشنی | مترجمہ سید حبیب احمد کاظمی امروہی۔ پبلشر قاضی عبدالرزاق صاحب سندھی ترقی بک ڈپو۔ جھونا مارکیٹ۔ کراچی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ قیمت عمہ

مصر کے مشہور اسلامی فلسفی علامہ طنطاوی جوہری نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کا شوق دلانے کے لئے قرآنی آیات سے ایک کتاب " القرآن والعلوم العصریہ " لکھی ہے۔ سید حبیب صاحب نے اسی کا ترجمہ اردو میں عمدگی کے ساتھ کر کے شائع کرایا ہے۔ اس کتاب میں علوم جدیدہ کی ضرورت اور اتحاد بین المسلمین پر تعلیم قرآن کی روشنی میں خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا ہے جملہ مسلمانوں کو اس کتاب کو غور سے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ علامہ طنطاوی نے اس بات کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک علوم مفیدہ جدیدہ سے جہالت اور دوسری فرقہ بندی۔ اس لئے ہر مسلمان کو ان دونوں یعنی جہالت اور فرقہ بندی کے خلاف جہاد کرنا چاہئے۔

رسائل

پیشوا (رسول نمبر)۔ مادر وطن۔ مرغ سحر

پیشوا (رسول نمبر) | سید عزیز حسن صاحب بقائی ہر سال اپنے رسالہ پیشوا دہلی کا خوبصورت اور پر از معلومات رسول نمبر نکالا کرتے ہیں۔ اس سال بھی ربیع الاول کا پیشوا رسول نمبر ہے جس میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نثر و نظم کے مضامین تقریباً سوا سو صفحہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سب مفید اور سب دلچسپ نصیحت آمیز اور سبق آموز۔ رسالہ پڑھنے کے بعد سید صاحب موصوف کی کوشش نہایت قابل قدر معلوم ہوتی ہے۔ اس خاص پرچہ کی قیمت ۸؍ ہے جو ان قیمتی مضامین کو دیکھتے ہوئے جو اس رسالہ میں درج ہوئے ہیں۔ بہت کم ہے۔

رسالہ پیشوا کی قیمت سالانہ کل ۶؍ ہے۔ سید صاحب اعلان کرتے ہیں کہ جو لوگ رسول نمبر سے خریداری شروع کریں گے ان کو ستمبر میں دو صفحہ کا نساء نمبر بھی مفت دیا جائے گا۔

آئندہ سے وہ پیشوا کا سستا ایڈیشن بھی شائع کر رہے ہیں جس کی ضخامت میں کوئی فرق اصل ایڈیشن سے نہ ہوگا صرف کاغذ ہلکا ہوگا۔

مادر وطن | یہ رسالہ مسلمان خواتین کی ترقی و بہبود کے لئے الہ آباد سے ایم اے سکینہ بیگم کی ادارت میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اوسط تقطیع ضخامت ۲ جز۔ لکھائی اور چھپائی عمدہ قیمت سالانہ دو روپیہ رسالہ زیر تنقید ماہ جولائی ۱۹۳۱ء کا ہے جس کو دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ انشاء اللہ یہ خواتین کی ترجمانی اور ان کی بہتری کی کوشش میں کامیابی حاصل کرے گا۔

مرغ سحر | یہ رسالہ ماہوار لکھنؤ دلکشا روڈ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد مرغی پالنے کی تعلیم اور پنجاب و اور صوبہ متحدہ کے مرغی پالنے والوں کو اس کے مفید طریقے سکھلانا ہے۔ ضخامت ایک جز قیمت درج نہیں ہے۔

بارگاہِ رسالت میں

زمیں تمھارے ہی قدم سے رشکِ خلد بن گئی
تمھیں نے بیکر جہاں میں آکے روح پھونک دی
تمھارے ہی تو پرتوِ کرم کی ہے یہ روشنی
تمھارے ہی لئے تو ہے یہ ساری انجمن سجی
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو تم پہ اے نبی ہوا دل اور جان سے فدا
وہی جہاں میں کامیاب اور سرخرو رہا
حیاتِ بے ثبات کا اسی کو کچھ مزہ ملا
مجھے بھی دو جہاں میں تمھارا ہی بس آسرا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

زباں کو جرأتِ بیاں نہیں وہ اضطراب ہے
کہ خوشگوار زندگی بھی اب مجھے عذاب ہے
تمھارے رنج ہجر میں جیوں کہاں یہ تاب ہے
تمھارے ہی لئے تو دل تباہ ہے، خراب ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

بتاؤں آہ کیا کسی کو جو جگر کا حال ہے
ہر ایک زخم وہ کہ غیر ممکن اندمال ہے
سلام ایسی زندگی کو جس کا یہ مآل ہے
نگاہ لطف اب تو ہو کہ آہ بھی محال ہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو یہ ہجوم یاس ہو تو دل کو کیا سکوں رہے
یہ حال ہو تو چشم تر سے کیوں نہ جوئے خوں بہے
کہاں تک ایک دردمند ایسے درد دکھ سہے
سوا تمھارے اور کس سے اپنا حال دل کہے
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جگر میں داغ، دل میں زخم، اف مجھے یہ کیا ہوا
تلاطم ایک حسرتوں کا سینے میں ہے اب بپا
یہی کشاکشِ حیات ہے تو آہ میں چلا
بس اب تمھارے ہاتھ ہے مری فنا مری بقا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

مژہ پہ اشک لالہ گوں نہیں یہ دل کا خون ہے   مگر ستم زدہ کو یہ نجات کا شگون ہے
کہاں تمہارے غم میں جان کو سکون ہے   دوا ہے خاک طیبہ جس کی وہ مرا جنون ہے
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

یہ آفتیں غم حبیب! ایک جاں نثار پر   خدا کے واسطے نہ ڈھا جفا وفا شعار پر
خدا کے واسطے ستم نہ ہوں دل فگار پر   خدا کے واسطے کرم ہو میرے حال زار پر
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

مریض عشق کو عطا ہو آج تو کوئی دوا   کہ بڑھتے بڑھتے ہو گیا ہے درد دل کا جاں گزا
نہیں ہے خیر جان کی یہ غم جو کچھ دنوں رہا   کرو کچھ اب تو التفات سن کے میرا ماجرا
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

مری طرح جہاں میں کوئی جیئے تو کیا جئے   کہ بیشمار جرم اور رات دن گنہ کئے
نگاہ شرم سوئے روضہ ہے مری اس لئے   سوا تمہارے اور کون چاک زخم دل سیئے
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

نصیب ہو وہ عیش کیا جو چاہتا ہے میرا دل   کہ میرا عشق تام اور میرا شوق مضمحل
مگر ہوں اپنے جرم اور معصیت پہ منفعل   جو چاہو تم تو ہوں ابھی تمام زخم مندمل
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

حلیم بھی، رؤف بھی، رحیم بھی تمہیں تو ہو   نذیر بھی، بشیر بھی، کریم بھی تمہیں تو ہو
نسیم باغ قدس کی شمیم بھی تمہیں تو ہو   کہ بارگاہ خاص کے ندیم بھی تمہیں تو ہو
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

تمہارے ہاتھ ہی میں بس ہماری سب کی لاج ہے   تمہاری چشم لطف ہی فراق کا علاج ہے
تمہارا ہی تو دو جہاں میں اے حبیب! راج ہے   شفاعت گناہ کا تمہارے سر پہ تاج ہے
تمہیں تو ہو مرے نبی، تمہیں تو ہو مرے نبی!

جبیں تمہاری خاکِ آستاں سے زیب پائے گی   وہیں یہ چشمِ خوں چکاں بھی میری رنگ لائے گی
وہیں بجائے اشکِ شرم، اشکِ خوں بہائے گی   جو زخمِ دل تمھیں نہیں، تو پھر کسے دکھائے گی
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

گناہ اور معصیت سے حال ہو بہت زبوں   وہ بار ہے کہ پشت زخم ہو اور میں ہوں سرنگوں
کہوں نہ تم سے دردِ دل تو اور کس سے پھر کہوں   تمہارا بندۂ وفا، تمہارا میں غلام ہوں
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

ہوئی جو پرسشِ گناہ کیا جواب دوں گا میں   عمل جو پوچھے گا کوئی تو کیسے چپ رہوں گا میں
حضور کا غلام ہوں، فقط یہی کہوں گا میں   تمہارا نام لوں گا میں تمہارا نام لوں گا میں
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جو روزِ حشر ہو گا سر پہ ظلِ شاہِ انبیا   امید ہے بر آئے گا ضرور دل کا مدعا
اگرچہ ہوں گناہ گار معصیت میں مبتلا   مگر سوا تمہارے کون میرا ہو گا آسرا
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

جہاں کے سارے مخمصوں کو اب مرا سلام ہے   بس اک تمہارے ذکرِ خیر سے ہمیشہ کام ہے
مری زباں پہ رات دن فقط تمہارا نام ہے   یہی مری عبادت اور یہی مرا کلام ہے
"تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!"

سفر دراز آخرت کا، بارِ جرم پشت پر   نہ آہ کوئی راہبر، نہ زادِ راہ و ہم سفر
تمہاری ہی نگاہِ لطف پر ہے بس مری نظر   بھلا ہے کون تم سے بڑھ کے اور مرا چارہ گر
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

حسین بھی، وجیہہ بھی، جمیل بھی تمھیں تو ہو   ہر ایک گناہ گار کے وکیل بھی تمھیں تو ہو
ہمارے عفوِ جرم کے کفیل بھی تمھیں تو ہو   شہِ رُسل، پیمبرِ جلیل بھی تمھیں تو ہو
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

امام انبیاء بھی تم ہو، شاہ دیں بھی ہو
رسول دوسرا بھی تم، شفیع مذنبین بھی ہو
حبیب کبریا بھی تم ہو، ختم مرسلیں بھی ہو
رہین لطف خاص، کاش محو حزیں بھی ہو
تمھیں تو ہو مرے نبی، تمھیں تو ہو مرے نبی!

رباعیات فراق

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے
دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرہ ذرہ
سرشار مجاز ہو حقیقت کیا ہے

ہوں عشق سیاہ کار مجھ میں ہیں نہاں
صد جلوۂ بیقرار حسن جاناں
چشمک زن برق طور ظلمت ہے مری
سرتاسر ہوں فراق سحر لرزاں

ممکن ہو تو فرض عشق پورا کر لیں
ممکن ہو تو دل میں درد پیدا کر لیں
اپنا کر لیں تجھے یہ قسمت ہے کہاں
دکھتے دل سے تری تمنا کر لیں

سوتے رہے میٹھی نیند سونے والے
کھوتے رہے جان، جان کھونے والے
بڑھتا ہی رہا سکوت شام ہجراں
روتے ہی رہے کسی کو رونے والے

ہستی کو کسی طرح سے یہ راز ملے
ہستی کو کسی ساز سے یہ ساز ملے
ہستی کو تو ہم دیتے سکون جاوید
کچھ دل کے دھڑکنے کا بھی انداز ملے

رہتی ہے جان لے کے پیاری دنیا
رہتی ہے خراب کر کے اچھی دنیا
دنیا میں ہر اک ہی ایک جانی دنیا
ہے کوئی ادا تمھاری کیسی دنیا

کچھ حال مرا مری زبانی سن لو
کس طرح کٹی ہے زندگانی سن لو
ارباب نشاط کے ترانے تو سنے
دکھتے ہوئے دل کی بھی کہانی سن لو

پیا جو نہیں تو خیر پینے کا ہے نام
ترکرے لبوں کو کیوں ہی رہتا ناکام
پیمانۂ دل کی تہ میں کچھ تو ہے تری
قسمت میں کہاں فراق چھلکا ہوا جام

شذرات

اس سال کے شروع میں ہم نے رسالہ جامعہ میں اعلان کیا تھا کہ مئی یا جون کے مہینہ میں ہم محمد علی نمبر نکالیں گے۔ لیکن ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے عارضی رخصت پر چلے جانے کی وجہ سے اس کے لئے پوری کوشش نہ ہو سکی اور جس قدر مضامین اور جس پایہ کے مضامین اس نمبر کے لئے درکار تھے وہ مہیا نہ ہو سکے۔ اس لئے اب خاص نمبر نکالنے کا خیال چھوڑ دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں جو مضامین وصول ہوئے ہیں ان کو بتفاریق رسالہ جامعہ میں ہم شائع کر دیں گے

صوبہ بہار و اڑیسہ کے شعبہ تعلیم کی طرف سے اس کمیٹی کی رپورٹ جو مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نصاب کی اصلاح اور ترمیم کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ تنقید اور رائے لینے کی غرض سے شائع کی گئی ہے تاکہ حکومت کو کمیٹی مذکورہ کی تجاویز کے متعلق رائے عامہ معلوم ہو جائے جو زیادہ سے زیادہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء تک شعبہ مذکورہ کے سکرٹری کے پاس پہنچ جانی چاہیے۔

یہ کمیٹی اگرچہ صرف ترمیم نصاب کے لئے مقرر کی گئی تھی لیکن اس کے حدود زیادہ وسیع کر دئے گئے اور اس نے نصاب کے ساتھ عربی نظام تعلیم پر بھی رائے زنی کی کہ ہندوستانی مدرسوں میں اسلامی علوم کی تعلیم کن اصولوں پر دی جائے اور کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔

کمیٹی مذکورہ کے ارکین میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور مولنا عبد العزیز المیمن۔ وغیرہ و دیگر ممتاز اہل علم حضرات شامل تھے مختلف نشستوں میں ان حضرات نے مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نقائص کو دیکھ کر اس میں ترمیم کی سفارشات کیں اور نظام میں بھی اصلاح کی۔

کمیٹی نے اپنی سفارشات میں ایک ہی اصول کو پیش نظر رکھا ہے یعنی موجودہ زمانہ میں اسلامی علوم کا احیار۔ اس اصول کے لحاظ سے ان کی جملہ تجاویز ہیں۔

کمیٹی نے جو سفارشات منظور کر کے پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جونیر چہارم اور اوپر کے کل درجوں میں انگریزی لازمی کر دی جائے۔

(۲) مدرسہ کی انتہائی تعلیمی مدت ۱۵ سال سے ۱۲ سال کر دی جائے۔

(۳) فاضل کے درجہ میں ایک فن مکمل طور پر پڑھایا جائے

(۴) فاضل کے بعد ایک درجہ اعلیٰ کا اضافہ کیا جائے۔

(۵) سینیر کے ہر درجہ کی مدت تعلیمی دو سال رکھی جائے۔

(۶) سینیر کے ہر امتحان میں طلبہ کا امتحان پورے نصاب میں لیا جائے۔

(۷) عالم اور مولوی کا نصاب سب کمیٹی کی سفارشات کے مطابق مقرر کیا جائے اور طلبہ اختیاری فنون میں سے دو فن اختیار کریں۔

(۸) جونیر کے درجوں میں ریاضی و تاریخ و جغرافیہ و علم الصحت کا وہی معیار ہو جو مڈل انگلش اسکولوں میں ان کے مقابل درجوں میں ہے۔

(۹) دینیات کے علاوہ دوسرے فنون میں ایسی کتابیں مقرر کی جائیں جن میں کسی خاص فرقہ کی تعلیم نہ ہو۔

(۱۰) شیعہ اور سنی طلبہ کے لئے دینیات کی تعلیم کا انتظام علٰحدہ علٰحدہ کیا جائے

(۱۱) جونیر چہارم سے ہفتم تک تاریخ اور جغرافیہ ایک فن قرار دیا جائے اور اردو۔ قواعد۔ ترجمہ اور انشار ایک فن سمجھا جائے۔ ان سب درجوں میں اردو نظم اور نثر کی مناسب کتابیں نصاب میں رکھی جائیں۔

(۱۲) منطق جونیر ششم اور ہفتم کے نصاب سے خارج کر دی جائے۔

(۱۳) جونیر درجوں میں ہر فن لازمی ہو۔

(۱۴) جونیر چہارم سے ہفتم تک کے نصاب میں عربی اور فارسی ادب کی جو کتابیں اس وقت ہیں ان کے عوض میں مناسب معیار کی کتابیں رکھی جائیں جو عرب اور فارس کے مصنفوں کی ہوں۔

(۱۵) موجودہ نصاب چونکہ بار گراں ہے اس لئے اس کی مقدار کم کردی جائے۔
(۱۶) تاریخ اسلام میں شیعہ اور سنی طلبہ کے لئے مختلف کتابیں مقرر کی جائیں۔
(۱۷) موجودہ ملا امتحان کے عوض میں ایک دوسرا امتحان جونیر درجوں کی تعلیم کے اختتام پر ہو۔ یا امتحان بورڈ کے زیر اہتمام ہو اور درجہ مولوی کے داخلہ کا امتحان قرار دیا جائے۔

ان کے علاوہ سب کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ جونیر چہارم اور پنجم میں تجوید کی عملی تعلیم دی جائے یعنی فن قرأت سکھایا جائے اور نصاب کی تیاری میں ہر فن کے مستند مصنفوں کی طبع زاد تصانیف کو فوقیت دی جائے۔ اور خالص علم ادب کے علاوہ دوسرے فنون میں صرف ایسی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں جن میں خالصۃً اسی فن کے اصول سے بحث کی گئی ہو۔

کمیٹی کی مندرجہ بالا سفارشات کی معقولیت میں کوئی شک نہیں ہے۔ جس ظرف جس ماحول بلکہ جن مجبوریوں کے ساتھ ان اراکین کو نظام اور نصاب میں ترمیم کرنی تھی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں کرسکتے تھے۔

حیرت ہے کہ جونیر ششم اور ہفتم سے منطق کے خارج کردینے پر خان بہادر مولانا ابو نعیم نے اختلاف کیا اور اختلافی نوٹ لکھا۔ ہم کو ان کے اس اختلاف میں کوئی معقولیت نظر نہ آئی بجز رسم اور قدامت پرستی کے کوئی دوسرا جذبہ منطق کی حمایت میں کارفرما نہ تھا۔ انھوں نے کلکتہ مدرسہ۔ مدرسہ عالیہ رامپور اور دیوبند کی مثالیں دی ہیں لیکن کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ان مدارس نے اپنے نصابوں کی کامیاب اصلاح کرلی ہے۔

بیشک جونیر چہارم اور اس کے اوپر کے درجوں میں انگریزی لازمی کردینے پر خان بہادر موصوف نے جو اختلاف کیا ہے وہ معقول دلائل پر مبنی ہے۔ ہم خوش ہوتے اگر کمیٹی نے ان کے بیان کو با معان نظر دیکھا ہوتا۔ جہاں بعض لوگ مذہبًا انگریزی سے نفرت رکھتے ہوں۔ یا بعض مدارس مالی مجبوری سے اس کا بندوبست نہ کرسکتے ہوں وہاں انگریزی لازمی کردینے کے کچھ معنی نہیں۔ اب

کو صرف اختیاری ہی مضمون رکھنا چاہئے تھا۔

تعلیمی مدت میں بھی دو سال کی کمی کی گئی ہے۔ اس کی تلافی نصاب کی تخفیف ہو سکتی ہے۔ ابتک عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نصاب تعلیم عالم و فاضل بلکہ کامل بنا دیتا ہے۔ حالانکہ نصاب سے یہ غرض نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ نصاب کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا فارغ التحصیل طالب علم ہو جائے اور اس قدر قابلیت اس میں آجائے کہ اپنی کوشش سے ان فنون میں سے جو اس نے پڑھے ہیں کسی فن میں پختگی پیدا کر سکے۔ اس لئے جن لوگوں نے مدت کم کرنے پر اعتراض کیا ہے انھوں نے دراصل نصاب کی غرض کو پیش نظر نہیں رکھا۔

نصاب کی جو شکل ابھی تک کمیٹی نے پیش کی ہے وہ خام ہے یعنی صرف علوم گنا دئے ہیں اور کتب نہیں مقرر کیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہی کمیٹی جس میں ایسے علم والے لوگ شریک تھے کتب کی بھی تعیین کرے گی۔

تجویز میں ایک بات یہ بھی اچھی رکھی گئی ہے کہ نصاب پر ہر سال نظر ثانی کی جائے اور بشرط ضرورت کتابیں بدلی جائیں جس سے امید ہے کہ سال بسال نصاب اچھا ہوتا جائے گا۔

لیکن تعلیم میں سب سے بڑا عنصر نہ نظام ہے نہ نصاب ہے بلکہ استاد ہے۔ وہ استاد جس دماغ صحیح ہو جس کی عقل ماؤف نہ ہو جو اپنے علم سے کام لینا جانتا ہو اور اس پر عمل کرتا ہو۔

افریقیہ کی طرف روانہ ہوئے ان میں سے السفیانی الثارا اور ولید بن یزید کے بیٹے العاصی و موسیٰ اور حبیب بن عبدالملک بن مروان قابل ذکر ہیں۔ ان سے پہلے جو لوگ افریقیہ جا چکے تھے ان میں جسری ابن عبدالعزیز بن مروان اور عبدالملک بن مروان ہیں جو خلیفہ مروان کے قتل کے وقت گئے تھے۔ اس کے بعد سے افریقیہ میں کثرت سے اموی وشامی پہنچ گئے۔

عبدالرحمٰن ابن حبیب گورنر افریقیہ

اس زمانہ میں افریقیہ کے گورنر عبدالرحمٰن ابن حبیب ابن عبیدہ فہری تھے۔ عبدالرحمٰن نے ان لوگوں کی آمد افریقیہ میں بری نظر سے دیکھی پھر عبدالرحمٰن ابن معاویہ ابن ہشام نے بھی یہیں پناہ لی۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی باقی سرگزشت

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی آمد کے واقعات یہ ہیں کہ جب ابی فطرس کے باشندوں کو امن ملا تو عبدالرحمٰن سترہ سال کے نوعمر لڑکے تھے سیاہ جھنڈوں کی (عباسی لشکر کی آمد) خبر سن کر اپنے مکان واقعہ دیر حنا ضلع قنسرین میں واپس آگئے اور یہاں ٹھہر کر اپنے بعض بھائیوں اور عزیزوں کو جمع کیا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے ساتھ ان کا بیٹا سلیمان ابوایوب بھی تھا جو مروان کے زمانہ میں سنہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ مجھے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی فراری کے واقعات ایک ایسے شخص سے معلوم ہوئے ہیں جس نے خود عبدالرحمٰن کو ایک جماعت سے اپنے واقعات بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔ ذیل کے واقعات اس شخص کے حوالے سے عبدالرحمٰن کی زبانی نقل کئے جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی اپنے متعلق روایت خود ان کا ایک زبانی بیان

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ جب ہمیں امن کی خبر ملی تو میں تفریح کے لئے باہر روانہ ہو چکا تھا۔ یکایک میری غیبت میں خاندان والوں پر آفت نازل ہوئی میں گھر واپس آیا اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات ومصالح کا انتظام کرکے گھر سے نکلا اور فرات کے کنارے ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ یہ گاؤں بہت سرسبز اور آباد تھا مگر میں تو مغرب کا ارادہ کرکے چلا تھا یہاں کیوں ٹھہرتا۔ علاوہ اس کے میرے کانوں میں ایک روایت ایسی پڑی ہوئی تھی جس نے مجھے مغرب کے

طویل سفر کے لئے اچھی طرح آمادہ کر دیا تھا۔ یعنی میرے والد خدا اُن پر رحم کرے میرے دادا مرحوم و مغفور کے زمانے میں انتقال کر چکے تھے جس وقت اُنکی وفات ہوئی میں لڑکا ہی تھا ان کی وفات کے وقت مجھے اور میرے بھائیوں کو میرے دادا کے پاس رصافہ میں پہنچا دیا گیا۔ مسلمہ بن عبدالملک اس وقت زندہ تھے۔ ہم اپنی سواریوں پر ان کے دروازہ پر کھڑے تھے کہ مسلمہ نے ہمارا حال پوچھا کہ کون ہیں، جواب میں اُن سے کہا گیا کہ یہ معاویہ کے یتیم بچے ہیں یہ سن کر مسلمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انھوں نے دو دو کر کے سب کو بلایا جب میری باری آئی تو مجھے لیا اور پیار کیا پھر اپنے داروغہ سے کہا کہ ان کو لو اس نے مجھے سواری سے اتار کر انکے پاس کھڑا کر دیا انھوں نے بے اختیارانہ مجھے چومنا اور رونا شروع کر دیا میرے بعد جو لوگ مجھ سے چھوٹے تھے ان کو نہیں بلایا۔ میری طرف متوجہ رہے اور اپنے پاس ہی رہنے دیا۔ میں انکے آگے ان کی زین پر بیٹھا ہوا تھا اسی اثنا میں میرے دادا کا ادھر سے گذر ہوا جب انھوں نے مسلمہ کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا کہ اے ابو سعید یہ کیا ہے انھوں نے کہا کہ یہ ابو مغیرہ کے بیٹے ہیں۔ پھر میرے دادا کے قریب ہو کر ان سے کہا "وقت قریب آگیا ہے وہ یہی ہیں" انھوں نے پوچھا کہ واقعی یہی ہے مسلمہ نے جواب دیا "بخدا یہی ہے میں نے اس کی پیشانی اور گردن سے علامات امارت پہچان لی ہیں۔ پھر داروغہ نے مجھے مسلمہ کے حکم سے میرے دادا کے حوالہ کر دیا۔
اس وقت میری عمر دس سال کے قریب تھی۔ اس وقت سے میرے دادا میرے ساتھ بہت رعایت کرنے لگے۔ ہر ماہ میرے پاس جیب خرچ اور قاصد بھیجتے تھے ہم لوگ ضلع قنسرین میں رہتے تھے اور ہمارے اور اُنکے درمیان ایک دن کی مسافت تھی۔ میرے ساتھ ان کا یہ طریقہ آخر وقت تک رہا۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا ان کے انتقال سے دو سال پہلے مسلمہ وفات پا چکے تھے۔

ان واقعات کی بنا پر مسلمہ کا قول میرے ذہن میں چند! ور مذکورہ واقعات کے ساتھ جم گیا۔ جب یہ موقع آیا تو میں ایک گانوں میں اپنے مسکونہ گھر کے ایک تاریک حصہ میں بیٹھا ہوا

تھا اس وقت تک ہمیں سیاہ جھنڈے والوں کی آمد کا علم نہ ہوا تھا۔

اس دن میری آنکھیں سخت آشوب کر آئی تھیں۔ میرے پاس ایک سیاہ کپڑا تھا میں اس سے اپنی آنکھوں کی کچھ صاف کرتا جاتا تھا۔ میرا لڑکا سلیمان جو تقریباً چار سال کا تھا باہر کھیل رہا تھا یکایک وہ دروازے سے آکر میری گود میں گر پڑا اور بچوں کی طرح آواز سے رونے اور بیقراری ظاہر کرنے لگا۔ میں نے اپنی تکلیف کی وجہ سے اسے ڈھکیل دیا پھر میں نے باہر نکل کر دیکھا تو مجھے بڑے بڑے سیاہ جھنڈے نظر آئے میں ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہوا مگر میرے بھائی نے آکر مجھے مطلع کیا کہ میں نے سیاہ پوش لشکر کو آتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے میں بھی لڑکے کی حرکت سے متاثر ہوکر باہر دشمنوں کو دیکھ آیا تھا۔ غرض میں انتظام سفر کے لئے جستجو کی تو مجھے چند دینار سے زیادہ کچھ نہ ملا۔ ان دیناروں کو لے کر میں نے اپنے لڑکے اور بھائی کو ساتھ لیا اور ام الصبیغ واثنہ الرحمٰن کو اپنے ارادہ سے مطلع کرکے ہدایت کی کہ میرے غلام کو مناسب سامان کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا جائے اگر زندہ رہا تو مل جاؤں گا"

یہ کہہ کر میں نکل کھڑا ہوا اور ایک ایسی جگہ چھپ گیا جو گاؤں کے ایک جانب تھی۔ جن لوگوں سے ہم کو اندیشہ تھا انھوں نے بڑھ کر گاؤں کا اور پھر میرے گھر کا محاصرہ کرلیا مگر انھیں میرا کوئی پتہ نہ چلا۔ چلتے چلتے ہمیں ہمارا اغلام بدر بھی مل گیا۔ اس کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے ایک شخص سے ملے اور ہم نے اس سے سواری وضروری سامان خریدنے کے لئے کہا۔ ہم اس کا انتظار کرہی رہے تھے کہ سامان ملجائے تو چلیں کہ اتنے میں اس شخص کے غلام نے آکر خبر دی کہ آپ کے دشمن تعاقب میں ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم نے تیزی سے دوڑنا شروع کیا اب دشمن ہمارے اتنے قریب آپہنچے کہ اُن کے گھوڑوں کی چاپ کانوں میں آنے لگی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور پاپیادہ بھاگ کر فرات میں کود پڑے۔ سوار گھومتے ہوئے وہاں پہنچے مگر ہم ان سے پہلے فرات میں کود چکے تھے ہمیں دیکھ کر سواروں نے غل مچایا کہ "پلٹ آؤ تمھیں کوئی خطرہ نہیں ہے مگر میں نے اور میرے بھائی نے تیرنا شروع کردیا جب ہم نے تقریباً نصف فرات طے کرلیا

تو میں نے اپنے بھائی کو ہمت ہارتے دیکھ کر چلاکر تیرنے اور اپنے پہنچنے کی ہدایت کی مگر وہ ڈوبنے کے اندیشہ سے اتنا خائف تھا کہ ان کے امان کے وعدہ سے دھوکے میں آگیا اور دریا سے مع کر موت کے منہ میں جا پڑا وہ میرے بار بار کہنے سے بھی نہ مانا اور ان کے ہاتھوں پڑ کر میرے سامنے مارا گیا۔ اُس وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ میں تیرتے تیرتے فرات کو عبور کر گیا۔ میرے تعاقب میں اگرچہ ایک دو شخصوں نے دریا میں کودنا چاہا مگر ان کی رائے پلٹ گئی اور میں سلامت نکل گیا۔

دوسروں کے بیانات یہ سارا بیان امیر عبدالرحمٰن الداخلؔ کا ہے۔ ان کے سوا جن لوگوں سے ان کے واقعات معلوم ہوئے وہ یہ ہیں کہ عبدالرحمٰن یہاں سے آگے چل کر فلسطین پہنچے یہاں ان کی بہن ام اصبغ ان کا غلام بدر اور ام اصبغ کا غلام سالم ابو شجاع آئے ام اصبغ عبدالرحمٰن کی سگی بہن تھی ان دونوں غلاموں کے ساتھ کچھ جواہرات اور خزانہ وغیرہ تھا۔ ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے عبدالرحمٰن افریقیہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک افریقیہ میں ان کے خاندان کی ایک جماعت پہنچ چکی تھی۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے متعلق ایک یہودی کی پیشین گوئی اس زمانے میں افریقیہ کے گورنر عبدالرحمٰن ابن حبیب کے پاس ایک یہودی تھا جو مسلمہ بن عبدالعزیز کا دوست تھا وہ اکثر ابن حبیب سے کہا کرتا تھا کہ اندلس پر ایک شہزادہ کی حکومت قائم ہوگی جس کا نام عبدالرحمٰن ہوگا اور اس کے دو زلفیں ہوں گی یہ سن کر ابن حبیب نے اس پیشین گوئی کو اپنی طرف منسوب کرنے کے لئے اپنی زلفیں چھوڑ دی تھیں۔ عبدالرحمٰن ابن حبیب کی اس حرکت پر یہودی ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بادشاہوں کی نسل سے نہیں ہو۔ ابن حبیب جواب دیتے کہ نہیں بخدا میں ہوں۔

عبدالرحمٰن ابن حبیب کی مضحکہ خیز عبارت جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ، عبدالرحمٰن ابن حبیب کے پاس آئے اور ابن حبیب نے دیکھا کہ ان کی زلفیں چھٹی ہوئی ہیں تو یہودی کو بلا کر کہا کمبخت یہ وہی ہیں جس کو تو کہتا ہے اب میں اس کو قتل کئے ڈالتا ہوں۔ یہودی نے کہا کہ اگر تو نے اس کو قتل کر ڈالا تو میں کہوں گا کہ یہ وہ نہیں ہے اور اگر چھوڑ دیا تو بیشک وہی ہے۔ پھر

ابن حبیب نے ولید ابن یزید کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا کے اسمٰعیل ابن زیان ابن عبد العزیز کو گرفتار کیا اور اسکے مال پر بھی قبضہ کر کے اسمٰعیل کی بہن سے زبردستی نکاح کر لیا۔ اس کے بعد عبد الرحمٰن ابن معاویہ کی فکر میں رہنے لگا۔

کچھ لوگوں نے عبد الرحمٰن ابن حبیب کے منصوبوں سے عبد الرحمٰن ابن معاویہ کو آگاہ کر دیا۔ عبد الرحمٰن ابن معاویہ فوراً اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھے اور یہ سب بربری شہروں میں منتشر ہو گئے۔ عبد الرحمٰن ابن معاویہ ایک گاؤں بارتی نامی میں آئے اور قبیلہ مکناسہ میں مقیم ہوئے مگر اس قبیلہ والوں سے انھیں کچھ تکلیف پہنچی اس لئے ان لوگوں کو چھوڑ کر دریا کے پاس مقام سبتہ میں پہنچے یہاں قبیلہ نفزہ کے مہمان ہوئے اس قبیلہ کے لوگ ان کے ماموں تھے کیونکہ ان کی والدہ نفزیہ تھیں۔

سالم غلام کا تعاقب ان سفروں میں ان کا غلام بدر ساتھ رہا۔ سالم افریقیہ میں جدا ہو گیا جس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک زود غضب اور تند مزاج غلام تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا کہ عبد الرحمٰن ابن معاویہ کے پاس ان کے بعض چچیرے بھائی ملنے آئے عبد الرحمٰن نے سالم کو چلا کر آواز دی۔ سالم کو خبر نہ ہوئی جب عبد الرحمٰن کے حکم سے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دئے گئے تب وہ ہوش میں آیا مگر یہ بات اسے ناگوار ہوئی اور وہ خفا ہو کر شام کو واپس چلا گیا۔

سالم ابو شجاع اندلس کے حالات سے واقف تھا کیونکہ وہ موسیٰ ابن نصیر کے ساتھ یا انکے بعد اندلس آ چکا تھا اور اسی اندلس کے صیفی لشکروں میں رہ کر لڑنے کا تجربہ تھا، اس لیے عبد الرحمٰن ابن معاویہ کو اس کی جدائی شاق گزری۔ غرض سالم ابن معاویہ کو چھوڑ کر ام الاصبغ کے پاس چلا گیا۔

ابو الخطار کی امارت کے بقیہ حالات اب پھر ابو الخطار کی ولایت اندلس کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ ابو الخطار

صمیل کی آمد چار سال چھ ماہ تک اندلس کے والی رہے یعنی ۱۲۸ھ تک ان کے زمانے میں اہل شام کی مدد کے لئے صمیل بن حاتم بن شمر بن ذی الجوشن کرقی اندلس میں آ چکا تھا جب شمر نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو مختار نے انکے انتقام میں شمر کو قتل کر دیا۔ اس زمانے

میں شمر کا بیٹا حاتم کوفہ سے نکل کر مغرب کی طرف چل پڑا اور جزیرہ میں سکونت اختیار کی۔ پھر جب قنسرین کا لشکر تیار ہوا تو صمیل اس میں داخل ہوکر اپنے ساتھیوں کے خیال سے اندلس پہنچ گیا۔

ابوالخطار اور صمیل کی کشیدگی اور اس کے نتائج

اندلس میں صمیل نے بڑا مرتبہ حاصل کیا۔ قبیلہ قیس والوں نے صمیل کے ساتھ تعلقات بہت بڑھا لئے ان کی امداد سے صمیل کو نمایاں کامیابی ہوئی اور وہ اندلس میں اپنی جرأت و سخاوت کے لحاظ سے بہت نامور ہوگیا۔ اس کی اس ناموری سے ابوالخطار آزردہ ہوئے۔ ایک دن صمیل انکے یہاں گیا اس وقت ابوالخطار کے لشکر والے بھی ان کے پاس جمع تھے ابوالخطار نے اس موقع پر صمیل کی توہین کرنا چاہی اور گفتگو بہت بڑھ گئی آخر صمیل گالیاں اور گھونسے کھا کر ابوالخطار کی مجلس سے نکلا اور اپنے گھر آکر اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگ جمع کئے اور جو کچھ گزری تھی اس کی شکایت کی ان لوگوں نے کہا "ہم تمہارے ساتھ ہیں جیسا کہو ویسا کریں۔ صمیل نے کہا خدا کی قسم میں یہ نہیں چاہتا کہ بنی مضر کو بنی قضاعہ اور یمنی قبائل سے ٹکرا دوں لیکن ہم حسن تدبیر اور نرمی کے ساتھ قوم مرج راہط کو البتہ دعوت دیتے ہیں اور بنی اخم و جذام کو مدد کے لئے بلاتے ہیں اور انھیں میں سے ایک شخص کو انتخاب کرکے سردار بناتے ہیں۔ نام اس کا ہوگا کام ہم سب کریں گے۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور صمیل کے حکم سے ثوابہ بن سلامہ جذامی کو لکھا گیا۔

امارت کے لئے جنگ۔ ابوالخطار کی شکست اور ثوابہ ابن سلامہ کا امارت پر تقرر

ثوابہ فلسطین کے باشندے تھے مراسلت کے ساتھ ایک وفد بھی ثوابہ کے پاس بھیجا گیا۔ بنی اخم و بنی جذام کی رفاقت اور صمیل کی اس تیاری کا علم ابوالخطار کو ہوا تو انھوں نے اہل اندلس کی ایک جماعت ساتھ لے کر جنگ کی تیاری کی۔ دریائے شذونہ کے کنارے ثوابہ نے ابوالخطار سے مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں ابوالخطار کو شکست ہوئی اور وہ قید ہوگئے۔ اس جنگ میں ابوالخطار کے آدمی کم مارے گئے تھے پھر ابوالخطار کے قید ہونے پر ثوابہ نے اہل اندلس پر تلوار نہ اٹھائی اور بڑھتا ہوا قصر اندلس میں داخل ہوگیا۔ ابوالخطار ثوابہ کی نگرانی میں یہیں قید رہے یہاں ثوابہ نے ایک سال تک حکومت

کر کے ۱۲۹ھ میں انتقال کیا۔

یوسف ابن عبدالرحمن فہری کا انتخاب ثوابہ کے بعد اہل اندلس نے بڑے اختلاف کے بعد یوسف ابن عبدالرحمن ابن عقبہ ابن نافع فہری کی حکومت پر اتفاق کیا۔ لیکن ان کے انتخاب میں کوئی معرکہ آرائی نہیں ہوئی

یوسف اور عمرو بن ثوابہ کا امارت کے متعلق معاہدہ یوسف ابن عبدالرحمن کے دو حریف تھے ایک یحییٰ ابن حریثہ جذامی باشندہ اردن نے اپنی اہلیت کا دعویٰ کیا تھا دوسرے عمرو ابن ثوابہ(۱) تھے جو یحییٰ پر اپنی ترجیح کے مدعی تھے۔ انکے باہمی اختلاف سے تصفیہ میں دیر ہوئی آخر یوسف کا انتخاب ہوگیا اور طے پایا کہ ضلع ریہ یحییٰ ابن حریثہ کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اہل اردن اس میں سکونت اختیار کریں۔ یحییٰ نے بھی اس تصفیہ سے اتفاق کیا۔

عبدالرحمن ابن نعیم کلبی پھر بنی قضاعہ جمع ہوئے تو انھوں نے اپنا رئیس عبدالرحمن ابن نعیم کلبی کو مقرر کیا عبدالرحمن نے دو سو پیادے اور چار سو سوار لے کر قصر قرطبہ پر شبخون مارا قصر کے سواروں کو ہٹا کر قید خانے پر چڑھ آیا اور ابوالخطار کو قید سے نکال کر ان کے ساتھ رات کو بھاگ نکلا پناہ کے لئے بنی کلب اور حمص کے قبائل میں ٹھہرنا چاہا تو ان لوگوں نے مزاحمت کی اور مدد دینے سے انکار کردیا مجبوراً یہاں سے بھی بھاگا۔ اس کے بعد عبدالرحمن ابن نعیم نے کوئی نئی بات نہیں کی اور سب لوگ بلا اختلاف یوسف کی حکومت سے متفق ہوگئے

یحییٰ ابن حریث کے ساتھ یوسف ابن عبدالرحمن کا نقض عہد یوسف نے حکومت میں استقلال پیدا کرتے ہی ابن حریث کے ساتھ بے وفائی کی اور ریہ سے معزول کردیا اس لئے یحییٰ ابن حریث نہایت خفا ہوا اور ابوالخطار سے گفت و شنید و مراسلت شروع کردی۔

ابوالخطار و ابن حریث کا اختلاف جب ابوالخطار اور ابن حریث یوسف کے خلاف سعی امارت کے لئے

(۱) اصل کتاب میں ثوابہ ابن ہے مگر صحیح عمرو ابن ثوابہ ہے۔

جمع ہوئے تو ان میں آپس میں اختلاف ہوگیا۔ ابوالخطار نے کہا میں امیر ہوں ابن حریث نے کہا نہیں بلکہ مجھے امارت کا حق زیادہ ہے۔ کیونکہ میری قوم تمھاری قوم سے زیادہ ہے جب بنی قضاعہ نے ابن حریث کے دعوے پر غور کیا تو انھوں نے چاہا کہ یمنیوں میں اتحاد ہو جائے اس غرض سے انھوں نے ابن حریث کا دعوے تسلیم کرکے ابن حریث کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کے یمنیوں

ایک عظیم الشان خانہ جنگی کی تیاریاں

میں قبائل حمیر کندہ مذحج اور قضاعہ نے ابن حریث پر اتفاق کیا اور قبیلہ مضر و ربیعہ کے لوگ یوسف کے طرفدار ہو گئے کیونکہ ربیعہ کی تعداد اندلس میں بہت کم تھی اس لئے ہر فوج میں سے یمنی سردار ابن حریث کے ساتھ ہو گئے۔ بلدئین بھی اہل شام کی ناراضگی کے خیال سے یوسف سے ناراض ہو گئے صرف مضر کے سرداروں نے یوسف اور صمیل کی حمایت قبول کی۔

غرض اس فرقہ بندی کے ساتھ تمام لوگ اپنی اپنی قوم کی جماعتوں میں داخل ہو گئے یعنی یمنی الگ ہو گئے اور بنی مضر الگ۔ اس موقع پر یہ بھی ہوا کہ فریقین کے لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے اور باہم مزاحمت نہ کرتے تھے یہاں تک کہ ہر فریق کے آدمی اپنی اپنی جماعت میں جا کر مل گئے۔ اسلام میں اپنی شان کی یہ پہلی جنگ تھی اس سے پہلے کبھی ایسی جنگ نہ ہوئی تھی اس کی تباہ کن نوعیت سے اندلس میں اسلام کے تباہ ہونے کا اندیشہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی۔

جنگ اور یمنیوں کی شکست

راوی کا بیان ہے کہ اس تیاری کے ساتھ ابن حریث اور ابوالخطار نے یوسف و صمیل پر قرطبہ میں دھاوا بول دیا۔ ادھر یہ دونوں قریہ شقندہ سے ہوتے ہوئے دریائے قرطبہ پر اترے ادھر یوسف و صمیل اپنے لشکر کے ساتھ دریا کو عبور کرکے ابوالخطار و ابن حریث کی فوجوں کی طرف بڑھے۔ صبح کو نماز کے وقت مقابلہ شروع ہوا پہلے سواروں میں نیزہ بازی شروع ہوئی اور اتنی دیر تک رہی کہ نیزے بیکار ہو گئے گھوڑے تھک گئے اور دھوپ میں تیزی پیدا ہوگئی۔ اب لڑنے والوں نے دست بدست جنگ کی خواہش کی اور سب نے گھوڑوں سے اتر کر

تلواروں سے لڑنا شروع کیا جب تلواریں بھی ٹوٹ گئیں تو ہاتا پائی اور نوچ کھسوٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی جنگ میں اتنی سخت استقلال کی مثال سوائے جنگ صفین کے دوسری نہیں ملتی (صفین کے سردار تک بھی گھٹنے ہوئے تھے، دونوں پلے برابر کے معلوم ہوتے تھے۔ صرف یمنیوں کی تعداد کسی قدر زائد تھی۔ جب یہ لڑنے والے دست بدست لڑائی سے بھی تھک گئے تو ایک نے دوسرے کے منہ پر خالی کمان اور ترکش مارنا شروع کئے اور دھول اڑائی۔ اسی ہنگامے میں یکایک صمیل کو ایک بات سوجھ گئی اور اس نے یوسف سے کہا کہ "ہم کو اس کا خیال ہی نہ رہا کہ ہم ایک لشکر اور چھوڑ آئے ہیں اور ہم اس سے اب تک غافل رہے یوسف نے پوچھا وہ کونسا لشکر ہے صمیل نے کہا قرطبہ کے بازار والے۔

یہ سن کر یوسف نے اپنے مولیٰ خالد بن زید اور ایک دوسرے شخص کو اہل بازار کو لانے کے لئے بھیجا۔ ان دونوں نے بازار والوں میں سے تقریباً چار سو پیادے جمع کئے ان لوگوں کے پاس لکڑیاں اور ڈنڈے تھے کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور برچھیاں بھی تھیں۔ میدان جنگ میں پہنچتے ہی قصابوں نے چھریاں ہاتھ میں لے کر دفعتہً حملہ کر دیا۔ اب ظہر و عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ لڑنے والوں نے نماز امن ادا کی تھی نہ نماز خوف سب لڑائی میں نہایت سختی سے مشغول تھے۔ جدید حملہ آوروں نے ان کو سخت مرعوب کر دیا۔ اور بکثرت آدمیوں کو قتل و اسیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمنی گروہ کو شکست ہوئی۔ ابوالخطار و ابن حریث قید ہوئے یہ دونوں فریق ثانی یعنی یمنی گروہ کے امیر تھے۔

ابوالخطار و ابن حریث کی قید کا دلچسپ واقعہ | ابن حریث و ابوالخطار کی اسیری کا واقعہ بہت دلچسپ ہے جب ابن حریث نے دیکھا کہ قرطبہ کے بازار والے اس کے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں تو وہ چھپ گیا اور ایک چکی کے نیچے بیٹھ رہا جو لکڑیوں کی ایک ٹال پر نصب تھی جب بنی مضر نے ابوالخطار کو قید کیا اور اسے قتل کرنا چاہا تو ابوالخطار نے کہا "میں کہیں بھاگا نہیں جاتا ہوں، "تم پہلے ابن سوداء(۱) ابن حریث کی تو خبر لو جو تمھارے ہی قبضہ میں ہے"، یہ کہہ کر ابن حریث کا پتہ بتا دیا تلاش

(۱) طنزیہ فقرہ ہے، چونکہ ابن حریث کی ماں حبشن تھی اس لئے ابوالخطار نے یہ چوٹ کی۔ (مترجم)

کرنے سے ابن حریث مل گیا پھر ابوالخطار وابن حریث دونوں قتل کردیے گئے۔

پہلے ابن حریث کہا کرتا تھا کہ "اگر اہل شام کا خون میرے لئے کسی بڑے پیالے میں جمع ہوجائے تو میں یقیناً سب پی جاؤں گا" قتل ہوتے وقت نے اس سے طنزیہ کہا "اے ابن سوداتیرے پیالے میں کچھ بچ تو نہیں رہا"

صمیل کی ستمگری | انکے قتل کے بعد قیدیان جنگ طلب ہوئے۔ صمیل ان کے تصفیہ کے ایک گرجے میں بیٹھ گیا جو شہر قرطبہ کے اندر واقع تھا اب اس جگہ مسجد جامع بنی ہوئی ہے۔ یہیں سے اس نے ستر آدمیوں کو مارا جب قاسم ابوعطا ابن حمدری نے یہ حالت دیکھی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور جوش میں آکر صمیل سے کہا "اے ابوجوش بس اب اپنی تلوار میان میں کرلو" صمیل نے جواب دیا "اے ابوعطا بیٹھ جاؤ اسی میں تمھاری اور تمھاری قوم کی عزت ہے" ابوعطا بیٹھ گئے مگر صمیل نے تلوار میان میں نہ کی تھی۔ اس لئے ابوعطا پھر اٹھے اور کہا "اے اعرابی بخدا تو ہم کو صفین کی عداوت میں قتل کرنا چاہتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس ارادے سے باز آ ورنہ پھر ہم اہل شام کو دعوت دیتے ہیں" یہ سن کر صمیل نے تلوار میان میں کرلی اور قیدیوں کو ایک بڑی مصیبت کے بعد ابوعطا کی بدولت خطرہ قتل سے نجات ملی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۳۱ھ سے پہلے کا ہے اور اس واقعہ نے لوگوں پر اتنا اثر ڈالا کہ آپس میں قرابت و رشتہ کے تعلقات منقطع ہوگئے۔

قحط اور عیسائیوں سے مقابلے | ان بے عنوانیوں کے عذاب میں اللہ تعالیٰ نے اہل اندلس کو ۱۳۱ھ میں قحط کی بلا میں مبتلا کیا۔ انھیں دنوں اہل جلیقیہ نے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ عیسائیوں کے بادشاہ بلائی کو مسلمانوں نے حقیر جان کر غفلت سے کام لیا تھا اس کا نتیجہ اب ملا۔ شاہ بلائی پہاڑوں سے نکل کر ضلع واستورس پر قابض ہوگیا۔ اس سے جلیقیہ کے مسلمانوں سے جنگ ہوئی اور اہل استرقہ سے بھی عرصہ تک لڑائی رہی۔ ابوالخطار و ثوابہ کے فتنہ تک یہی حالت رہی جب ۱۳۳ھ شروع ہوا تو شاہ بلائی نے مسلمانوں کو شکست دی اور جلیقیہ سے سب کو نکال دیا جو لوگ اپنے عقیدہ میں پختہ نہ ہوئے تھے وہ سب پھر عیسائی ہوگئے۔ جتنے قتل ہوئے ان کا حساب نہیں

جو مسلمان بچ کر نکل آئے وہ پہاڑ کے پیچھے استرقہ وغیرہ کی طرف چلے گئے جب قحط سخت ہوگیا تو جلیقیوں نے مسلمانوں کو استرقہ سے بھی نکال دیا اور یہ لوگ سنہ ۱۳۶ھ میں دوسرے درہ ہائے کوہ اور قوریہ و ماردہ میں منتقل ہونے پر مجبور ہوئے جب یہاں بھی قحط کی سختی ناقابل برداشت ہوگئی تو اکثر مسلمانان اندلس طنجہ و اصیلا و ریف کی طرف چلے گئے۔ شذونہ کے ضلع میں ایک دریا تھا اس سے گزر کے یہ لوگ روانہ ہوئے تھے اس دریا کو وادی برباط کہتے ہیں اور ان واقعات کی بنا پر ان سالوں کو سنین برباط کہا جاتا ہے۔ غرض ان وجوہ سے اندلس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگئی اور قریب تھا کہ دشمن ان پر غالب آجائیں لیکن وہ خود بھوک کی بلا میں پریشان تھے اس لئے زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔

صمیل کی ناموری | یوسف نے صمیل کو ملک کی بڑی سرحد سرقسطہ پر روانہ کر دیا تھا وہاں کے باشندے اچھی حالت میں تھے اس وقت یہ سرحد یمنی قبائل کے قبضہ میں تھے۔ یوسف نے یمنیوں کو ضعیف سمجھ کر انھیں ذلیل کرنے کے لئے کو سرقسطہ کی طرف بھیجا۔

صمیل اس مہم پر گیا تو اس کے خدم و حشم وغیرہ کے علاوہ اس کے ساتھ دو سو آدمی اور گئے صمیل نے اس جمعیت کے ساتھ مالی و ملکی فتوحات حاصل کیں، غریبوں کے وفد اس کے پاس آئے تو اس نے ان کو روپیہ اور غلام تقسیم کئے اور ایسی فیاضی سے کام لیا کہ دوست دشمن میں سے کوئی محروم نہ رہا۔ اس فراخدلی سے اس کی عزت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد صمیل نے سرقسطہ میں کئی سخت سال بسر کئے۔

عامر اور قبیلہ بنی عبدالدار | ان دنوں قرطبہ کے لوگوں میں قبیلہ بنی عبدالدار کا ایک نوجوان بہت زیادہ نامور و ممتاز ہوگیا تھا۔ اس کا نام عامر تھا اور یہ ابو عدی برادر مصعب ابن ہاشم صاحب لواء رسول مقبول صلعم کی اولاد سے تھا۔ یہ مصعب وہی ہیں جن کو جنگ بدر و احد میں لواء مبارک کی خدمت تفویض ہوئی تھی۔

عامر کی تیاریاں | مقبرۂ عامر جو شہر قرطبہ کے مغربی فصیل کی طرف واقع ہے اسے عامر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ عامر یوسف سے پہلے صوائف کے لشکروں کا افسر رہ کر ناموری حاصل کر چکا تھا۔ یوسف

کو اس کی عزت و مرتبہ پر حسد ہوا۔ عامر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے جیسا کہ مشہور ہے ابو جعفر منصور (خلیفہ عباسی) سے درخواست کی کہ میرے پاس اندلس کی گورنری کا فرمان بھیجدیا جائے۔ اس کارروائی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عامر کو قبائل یمن میں یوسف کی خونریزی وغیرہ سخت ناگوار گزری تھی اور وہ اس کی زیادتیوں کی وجہ سے اس پر خار کھائے بیٹھا تھا۔

اس کے بعد عامر نے اپنی اراضی میں جس کو قناعت عامر کہتے تھے اور قرطبہ کے مغرب میں واقع تھے۔ ایک چھوٹا سا احاطہ بنوایا وہاں کی تعمیرات میں اتنا غلو کیا کہ اس حصہ کو ایک مضبوط و محفوظ شہر بنا دینا چاہا تاکہ اس کو حسب ضرورت اپنی حفاظت کے لئے بھی کام میں لا سکے اور اطمینان کے ساتھ یوسف کی فوجوں پر اس وقت تک چھاپے مارتا رہے جب تک اس کے پاس یمن والوں کی امداد نہ آجائے۔

یوسف کا ضعف حکومت ادھر یوسف کی قوت میں ضعف پیدا ہو گیا اور اس کی طاقت اتنی کمزور ہو گئی کہ اس کے باڈی گارڈ میں ۵۰ سوار بھی نہ رہے۔ اندلس میں سب نے اس کا ضعف محسوس کر لیا اس میں اس نے چاہا کہ عامر کو گرفتار کرے مگر عامر کو اس کا ارادہ معلوم ہو گیا اور وہ مدافعت کی تدبیروں میں مصروف ہوا۔ یوسف چونکہ بزدل تھا اس لئے اپنی موجودہ طاقت کو دیکھتے ہوئے عامر سے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کا منتظر رہا کہ صمیل آجائے تو کچھ کروں۔ چنانچہ صمیل کو عامر کی حالت و جرأت سے مطلع کر کے مدد چاہی۔

صمیل نے جواب میں یوسف کو جرأت دلائی اور عامر کے قتل پر ابھارا برخلاف یوسف کے عامر باخبر تھا اس سے یوسف کی کوئی حالت پوشیدہ نہ تھی وہ اس کی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ بہت فیاض۔ ہوشمند اور ادیب تھا۔ اسے ایک مخبر نے خبر دی اور کہا کہ اپنی جان بچاؤ کیونکہ یوسف کے پاس صمیل کا خط آیا ہے جس میں اس نے یوسف کو تمہارے قتل پر ابھارا ہے۔

یہ خبر سن کر عامر قرطبہ سے نکل کر سرقسطہ روانہ ہوا جہاں صمیل موجود تھا کیونکہ عامر نے یمنیوں کی کثرت کی وجہ سے اپنے لئے سرقسطہ سے بہتر محفوظ جگہ نہ سمجھی تھی اور اضلاع کے لشکروں پر

ان کے ضعف اور واقعہ شقندہ[1] کی وجہ سے عامر کو کوئی اعتماد نہ رہا تھا۔

سرقسطہ میں بنی زہرہ کلابی کا ایک شخص بہت مغرور تھا۔ عامر نے اس کو لکھا اور بنی زہرہ والی ولد قصی کے ساتھ اپنی قرابت جتائی اس نے عامر کو مدد دینا منظور کر لیا اس لئے عامر سرقسطہ کے بعض نواح میں آگیا اور یہاں عامر اور زہری نے مل کر لوگوں کو دعوت دی کہ ابو جعفر منصور کا فرمان نافذ ہوا ہے سب لوگ اس کی تعمیل کے لئے جمع ہوں اس دعوت پر یمن کے کچھ لوگ اور بربری اور بعض دوسری قومیں جمع ہوگئیں۔ صمیل کو معلوم ہوا تو اس نے غیر مسلم مطیع فوج میں سو سوار و پیادہ سپاہیوں کا لشکر بھیجا جس نے عامر اور اس کے گروہ کو شکست دی مگر اس کے بعد عامر و زہری کی حمایت میں لوگ کثرت سے اکٹھا ہوگئے اور انھوں نے یورش کر کے صمیل کو شہر سرقسطہ میں گھیر لیا۔

یوسف کی فوجی تیاریاں | صمیل نے مدد کے لئے یوسف کو لکھا۔ یوسف کو لڑنے میں آنی سکت نہ معلوم ہوئی (یہ واقعہ ۱۳۶ھ کا ہے) اس لئے اس نے قبیلہ قیس کو مدد کے لئے لکھا جن کی فوجیں قنسرین یعنی جیان[2] اور دمشق یعنی البیرہ میں پڑی ہوئی تھیں اور اہل قبیلہ پر اپنے حق کی عظمت ظاہر کر کے انھیں توجہ دلائی کہ اس موقع پر تمھاری تھوڑی مدد بھی بہت ہو جائے گی۔ اس بنا پر عبید اللہ ابن علی کلابی اور کلاب و محارب و سلیم و نصر و ہوازن کی تمام جماعتیں یوسف کی طرفداری پر تیار ہو گئیں صرف بنی کعب ابن عامر و عقیل و قشیر و حریش نہ شریک ہوئے ان میں اور بنی کلاب میں جنگ تھی کیونکہ اندلس کی ریاست اس میں رہ چکی تھی۔ بلج قشری تھا بعد ازاں اندلس کی ریاست کلاب

---

(۱) واقعہ شقندہ سے وہ جنگ مراد ہے جس میں یمنی قبائل اور بنی مضر سے جنگ ہوئی تھی یمنی قبائل کے دو سردار تھے ابو الخطار و ابن حریث اور مضر کا امیر یوسف تھا۔ اسی جنگ میں آخر کار یمنیوں کو ہزیمت ہوئی تھی۔ فقرہ زیر بحث میں اسی جانب اشارہ ہے۔ (مترجم)۔

(۲) عرب فاتحوں نے وطن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اندلس کے بہت سے مقامات کے نام عربی مقامات سے موسوم کئے تھے مثلاً جیان کو قنسرین اور البیرہ کو دمشق کہتے تھے (مترجم)

ابن عامر کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس زمانے میں بنی کعب ابن عامر کا سردار دمشق یعنی البیرہ میں سلیمان ابن شہاب اور قنسرین یعنی جیان میں حصین ابن دجن عقیلی تھا اور قبیلہ غطفان والے اس معاملے میں مذبذب تھے۔ ان کا کوئی رئیس نہ تھا جو انھیں مطمئن کرتا۔ ان کے سردار ابوعطار کے بعد سے اس قبیلہ کی یہی حالت ہوگئی تھی۔

عبید ابن علی کی تیاریاں قبائل قیس کی امداد

جب عبید ابن علی کمربستہ ہوگیا اور اس نے صمیل کی اعانت کے لئے لشکر والوں کو متوجہ کیا تو ابن شہاب وابن دجن نے شرکت سے انکار کردیا اور تمام بنو عامر عبید ابن علی کی امداد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں کلاب ونمیر وسعد اور تمام قبائل ہوازن وسلیم بن منصور شریک تھے بعد میں غطفان بن سعد بھی شامل ہو گئے۔ پھر جب سلیمان وحصن کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں کا بیٹھ رہنا صمیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تو یہ دونوں بھی شرمندہ ہوکر عجلت کے ساتھ اپنی قوم کو لئے ہوئے عبید ابن علی کی فوج میں آملے۔ جب اسی طرح تمام قبیلہ قیس صمیل کی مدد کے لئے تیار ہوگیا اور قرطبہ کے قریب کے دونوں لشکر لے کر روانہ ہوا تو بھی تین سو ساٹھ یا اس سے کچھ زیادہ سوار بدقت مہیا ہو سکے۔ یہ حالت دیکھ کر ان لوگوں نے اپنا ضعف اور تعداد کی قلت محسوس کی تاہم دل مضبوط رکھا اور عبید ابن علی سے کہا "ہم ہلاک ہی کیوں نہ ہوجائیں مگر تجھ ایسے شخص کو چھوڑ نہیں سکتے۔

البیرہ والے بنی امیہ کی امداد

اس زمانے میں اکثر بنی امیہ دمشق یعنی البیرہ میں تھے ان میں سے تیس سوار عبید ابن علی کی مدد کے لئے فوراً روانہ ہوئے۔ اس گروہ کے سردار ابوعثمان عبید اللہ ابن عثمان اور عبد اللہ ابن خالد یہ دونوں یکے بعد دیگرے بنی امیہ کے علمبردار ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ یوسف ابن بخت بھی تھے یہ سب معرکہ شقندہ میں یوسف وصمیل کے ساتھ شریک تھے اور اس معرکہ میں بڑا صبر واستقلال دکھا چکے تھے۔ اس لئے یوسف وصمیل اور تمام قیس ومضر کی طرف سے ان کی بڑی مدارات ہوتی تھی اور یہ بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے غرض قبیلہ قیس کے ساتھ بنی امیہ کے تمام مستطیع وطاقتور لوگ شامل ہوگئے تھے۔

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی باقی سرگزشت	اب یہاں پھر کچھ بیان عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا کیا جاتا ہے ۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے صمیل کے محصور ہونے کا ذکر کر دیا ہے تاکہ واقعات مرتب رہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ علاقہ سبرہ کے موضع نفزہ میں داخل ہوئے تو انھیں فی الجملہ اطمینان ہوا اور انھوں نے اندلس میں اپنے موالی کو لکھ کر ان کی مصیبت پر اپنی ہمدردی ظاہر کی اور ان پر اپنا حق ثابت کرتے ہوئے اپنے آنے اور اپنے ساتھ ابن حبیب کے سلوک اور افریقیہ میں اپنی قوم کی سرگزشت کے تمام واقعات لکھے اور لکھا کہ اگر میں یوسف کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے امن سے نہ رہنے دے گا ۔ اس لئے میں تم لوگوں کے ذریعہ سے مدد حاصل کرنا اور کامیاب ہونا چاہتا ہوں

عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا بنی امیہ سے مدد چاہنا بنی امیہ کی باہمی مشاورت	یہ خط اپنے غلام بدر کے ہاتھ بھیجا۔ جب بدر ان لوگوں کے پاس پہنچا تو وہ جمع ہوئے اور باہم مشورہ کرکے یوسف ابن

بخت کو بلایا جو ان لوگوں میں ایک بہادر جوان شمار ہوتا تھا اور ان دنوں قنسرین یعنی جیان کے لشکر میں تھا۔ بعض مصالح کی بنا پر ان سب کی رائے یہ ہوئی کہ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اس وقت جواب نہ دیا جائے جب تک صمیل سے اس بارہ میں مشورہ نہ کرلیا جائے بدر و یوسف ابن بخت کو اعتماد تھا کہ اگر صمیل نے شرکت نہ منظور کی تو بھی وہ ہمارے خلاف نہ کرے گا ۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے صمیل کی امداد کرکے اس پر اور قبیلہ قیس پر احسان کیا ہے اس لئے ہمیں اس سے مخالفت کی امید نہیں ہے ۔

بنی قیس کے خروج کا ذکر صمیل کی بروقت امداد	اب پھر بنی قیس کے خروج کا ذکر کیا جاتا ہے یہ لوگ تقریباً تین سو ساٹھ سواروں کی جمعیت سے روانہ ہوئے ابن شہاب اور حصین ابن دجن ان کے

ساتھ تھے ۔ بنی قیس نے ابن شہاب کی تالیف قلب کے لئے اپنا رئیس اسی کو مقرر کیا تھا۔ اس انتخاب کی تحریک عبید ابن علی نے کی تھی جو اس زمانے میں صمیل کے بجائے بنی کلاب کا سردار تھا جب بنی قیس دریائے آنا تک پہنچے جہاں عقدہ بن بکر بن وائل اور بنی علی کا دخل تھا تو انھوں

نے دریائے انا کے قریب رہنے والوں سے بھی مدد مانگی اور یہاں سے بھی چار سو یا کچھ زائد آدمی ساتھ لے کر آگے بڑھے جب طلیطلہ پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ محاصرہ سے صمیل کو نقصان پہنچے گا اس خبر سے انھیں اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ صمیل مدد سے مایوس ہو کر ہمت ہار دے اور ہلاک ہو جائے۔ اس لئے بڑی عجلت کے ساتھ ایک ایلچی کو صمیل کے پاس بھیجا اور اسے سمجھا دیا کہ بنی عامر وزہری کے سواروں میں بغیر ظاہر ہوئے شامل ہو کر فصیل کے سامنے جانا اور یہ پتھر جو ہم دیتے ہیں اس کو فصیل پر پھینک دینا۔ اس پتھر پر یہ شعر لکھے تھے۔

تبشر بالسلامة یا جدار ۔۔۔ اتاک الغوث وانقطع الحصار

اتتک نبات اعوج بلمات ۔۔۔ علیها الاکرمون وهم نزار

(اے دیوار خوش ہو کہ تیرا مددگار آگیا اور محاصرہ ختم ہوا۔ تیرے پاس وہ گھوڑیاں آپہنچیں جن پر قبیلہ نزار کے شرفا سوار ہیں۔)

ایلچی یہ پتھر لے کر روانہ ہو گیا اور ہدایت کے مطابق فصیل پر پھینک دیا۔ اس پتھر کی اطلاع صمیل کو ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے پڑھ کر سنایا جائے کیونکہ صمیل پڑھا ہوا نہیں تھا جب یہ شعر اس نے سنے تو اپنی قوم سے کہا "لوگو تمھیں بشارت ہو"، یہ کہہ کر حصار کمک کی آمد اور ابن معاویہ کے خط کا ضمنی تذکرہ | کی طرف خصوصیت سے توجہ کی اور پردل ہو کر مدافعت میں مصروف ہوا۔ اتنے میں کمک آگئی جس میں ابو عثمان وعبداللہ ابن خالد وابن بخت وغیرہ بنی امیہ کے لوگ تھے اور ابن معاویہ کا ایلچی بدر بھی تھا جس کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابن معاویہ نے اپنے موالی کو جو خط لکھا تھا اس کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب لوگوں سے مراسلت کی جائے جو ہماری فتح کے امیدوار ہیں۔ اس خط کے ساتھ ابن معاویہ کی مہر بھی تھی ابو عثمان وغیرہ نے ابن معاویہ کے خط کی تعمیل کی اور صمیل کو بھی بنی امیہ کے احسانات یاد دلا کر امداد کے لئے توجہ دلائی۔

محاصرہ کا اختتام اور اہل کمک کے ساتھ صمیل کا سلوک | جب عامر وزہری نے دیکھا کہ صمیل کے پاس کافی

(باقی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۷ — بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا۔

مولانا محمد علیؒ جوہر کی شہادتِ عظمیٰ

(نفسیاتِ اجتماعی کی روشنی میں)

ہمارا بے بہا اور لازوال ترکۂ ملّی!

ہر شک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے ، جسے پروردگار دے!

" رہرو تمھاراہِ عشق کا منزل کو پا لیا ! " — اب اور کیا نشان ، میری لوحِ مزار دے!!

جوہر

ملّی زندگی اور ملّی " روایات " انسانی معاشرہ و ملل کی نفسی زندگی کا ایک بڑا اصل ہے ۔ ماہرینِ نفسیاتِ اجتماعی نے " روایات " کو تسلیم کیا ہے ۔ " روایات " سے ایک جماعت کی کلچر کے وہ عناصر ، علمی و دماغی مراد ہیں جو ماضی کے اعمال و افکار سے چھن چھن کر بعد تنازع للبقا ، باقیاتِ صالحات کی صورت میں نسل بعد نسل منتقل ہو کر اس تک پہنچتے ہیں اور جن کو حال کے اربابِ فکر و عمل کچھ اضافہ اور جلا کے بعد مستقبل کو سونپتے ہیں ۔ روایات دراصل اجتماعی توریث کے مصنوعی میکانزم ہیں ، ٹھیک جیسا کہ جرمی خلیات (cells) ، نسلی توریث کے طبعی میکانزم ہیں ۔ جس طرح خلیات کے واسطہ سے اسلاف اپنے اخلاف کی رگوں اور خونوں میں زندہ ہیں ۔ اسی طرح ماضی کے خیالات و عقائد بصورت وحیات اصولِ اخلاق و نمونہ ہائے عمل اور موسسات و معاہد اور عادات و مراسم حال کے حافظہ میں " روایات " کے وسیلہ سے محفوظ ہیں ۔ حیاتِ ملّی ایک شے واحد ہے جس کا گذشتہ ، موجودہ اور آئندہ روایات و سنن ملّی کے اعصاب سے عضواً (organically) باہم پیوستہ اور مربوط ہیں ۔ جوہر " ملت " نفسی وحدت ہے اور اس نفسی وحدت کی آبیاری و بقا روایاتِ ملّی سے وابستہ ہے ۔ امر بدیہی یہ ہے کہ ملت کا اصل الاصول " روایاتِ ملّی " ہیں ، ٹھیک جس طرح حیوانی

اور نباتی زندگی کا اصل الاصول" اجرام حیوانی" ہیں۔ مگر زندگی خواہ حیوانی ہو یا انسانی شخصی ہو یا سماجی
جمود کی نفی اور حرکت کا وجود چاہتی ہے، پس روایات ملی بقا کے لئے تنہا کافی نہیں ہیں۔ ان
کی کیفیت وکمیت میں تغیر ضروری ملازمی اور لابدی ہے، اگر تغیر کسی اخلاقی نصب العین یا
عقلی مقصد کے لئے ہوا ہے اور اس سے قدر منسوب ہو سکتے ہیں اور اس کے وجود میں لانے
کا باعث انسانی ضمیر ارادہ اور عمل ہو تو پھر اس کو اجتماعی ترقی کا موزوں نام دیا جا سکتا ہے۔ ملی زندگی
کی تکوین کے لئے "ملی روایات" اور اُن میں مناسب حال "ترقی" دونوں ضروری ہیں۔
اجتماعی عبادت اور اجتماعی ترقی | اجتماعی ترقی اپنی پیدائش اور بالیدگی کے لئے ایسے صاحبان فکر و
عمل اور ارباب ایمان وعزم کی ہدایت چاہتی ہے جو اپنی زندگی یا موت یا دونوں کے ذریعہ روایات
ِ میں بلحاظ ظرف زمانہ بہتر سے بہتر اضافہ کرنے کے قابل ہوں، جو نئی راہوں کے باز کرنے
والے ہوں، نئے خیالات و رجحانات کی برقی لہروں کا اجرا کرنے والے ہوں، پرانی عمارات کے
مصلح اور نئی اساسات کے مؤسس ہوں اور جن کو سماج کو چلانے کی صلاحیت حاصل ہو یعنی جو اپنی
زندگی اور موت کے نمونے سے اپنی ملت اور جماعت کو بہتری کی طرف بڑھانے والے اور برتری
کی طرف اٹھانے والے ہوں۔ جو ملتیں ایسے نفوس بکثرت پیدا کرتی ہیں وہ اپنی روایات کو مالا
مال کرتی ہیں، بطن ملی کو زرخیز بناتی ہیں اور اس لئے جہاد زندگی میں باقی رہتی اور ترقی کرتی
ہیں، اس طرح تاریخ ملی بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔ بالعکس جن جماعات کے اعصاب اجتماع —
روایات ۔۔۔۔ میں ضعف اور اضمحلال جاتا ہے اور جو قائدین کو پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں اور
اس لئے روایات میں نئے خون کا دوران کر کے اُن کا اعادۂ شباب نہیں کر سکتی ہیں وہ طبعاً
رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتی ہیں اور سڑنے والی لاش کے اعضا کی طرح، معمولی سے خارجی دباؤ پر ان کے اجزا
پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ مقاً بحیثیت ملی فنا ہو جاتی ہیں

تاریخ ملت کی تخلیق میں جوہر کا شاہکار

مولانا محمد علی جوہر ایسے ہی ملی قائدین میں سے تھے جن کا کام، روایات ملی کو روشن تر زرخیز تر

اور بلند تر بنا نا تھا۔ آپ نے ایک سے زیادہ ملی راہوں کو باز فرمایا ہے۔ کئی تحریکوں کی امامت کی ہے کئی رجحانات کو جاری کیا ہے اور کئی مؤسسات ملی کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ آپ فکر و عمل کے ایک پاور ہاؤس تھے اور آپ کی ذات سے لوگوں کو روشنی اور زندگی، ایمان و عزم کے روحانی انوار حاصل تھے۔ آپ نے کامریڈ اور ہمدرد۔ سیاسی بیداری اور شعور کی پیدائش، مسلم لیگ، کانگریس خلافت کمیٹی۔ علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ۔ موتمر اسلامی۔ دار الخلافت بمبئی وغیرہ کے لئے کام کیا ہے اور ان سب پر جوہر کا احسان عظیم ہے۔ مگر سوالوں کا سوال یہ ہے کہ دنیا کو اور علی الخصوص اسلامی دنیا کو محمد علی جوہر نے وہ کونسی چیز دی ہے جو ان کی زندگی کے تمام وسیلوں اور عطیوں سے بہتر تمام کارناموں سے روشن تر اور تمام حاصل زندگی سے برتر ہے؟ وہ کونسا مخصوص کام ہے جو جوہر کی زندگی کا شاہکار ہے۔ ایک ایسا شاہکار جس میں شہید کربلا کے بعد وہ یکتا اور اکیلا ہے۔ . . ایک ایسا شاہکار جس کی توقیر پر موجودہ دنیا کے سب سے بڑا شہنشاہ[1] اور سب سے بڑا فقیر[2] ہم زبان ہیں . . . . ایک ایسا شاہکار جس کی تعظیم میں ایشیا، یورپ اور افریقہ تینوں براعظموں کی گردنیں فرط احساس سے ادباً جھکی ہیں؟

ایک نئی "دنیائے کربلا" کی روایت آفرینی صاحبان دل! محمد علی جوہر کا سب سے بڑا دین، اُس کی مجاہدانہ زندگی اور اُس کے کارنامے نہیں ہیں جو بہت اور بلند ہیں اور بلاشبہ تاریخ ملت کو روشن تر کرنے والے ہیں، بلکہ ہمارے لئے اُس کا سب سے بڑا ترکۂ ملی اُس کی بے نظیر شہادتِ عظمیٰ ہے جس نے تاریخ انسانیت کو ایک دوسری "دنیائے کربلا" کی روایت کبریٰ بخشی ہے۔ دنیا میں ہر لمحہ زندگی کی پیدائش اور فنا ہو رہی ہے اور جس طرح یہاں انگنت قسم کی زندگیاں ابھرتی ہیں اسی طرح بے شمار قسموں کی موت مرتی ہیں۔ مگر محمد علی جوہر کی "موت" ان سب سے بالکل نرالی اور انوکھی

---

(۱) ملک معظم، جارج پنجم۔

(۲) مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی۔

شان کی موت ہے کیونکہ تاریخ انسانیت میں وہ ایک عجیب اور بے عدیل شہادت ہے اور خود ستوئی کی ساری زندگی کی تمناؤں اور تیاریوں کا حاصل ہے یہ معمولی موت، تو وہ ہے جو دنیا میں ہر لمحہ واقع ہو رہی ہے اور جس سے لوگ ہر دم خائف، ہراساں اور نفور ہیں یہ "شہادت" وہ ہے جو آمد نہیں آورد ہے یعنی جس کے لئے راہِ حق میں خود گزرنے والے نفس کا پاک ارادہ اور روشن عمل . . . اور یہ عمل خواہ کسی نوع کا عمل ہو مگر راہِ حق میں ہو . . . ذمہ وار ہو۔ جوہر اس معنی میں جیسا کہ آوازہ خلق اور نقارہ خدا نے اعلان کیا ہے "چودہویں صدی کا شہید اعظم ہے" مگر کس نوع کا شہید؟ اس کی شہادت بھی اس کی زندگی کی طرح ایک نرالی شان کی شہادت ہے کیونکہ وہ میدان قتال میں نوع کشی کے خون سے رنگین شہادت نہیں ہے بلکہ نوع خواہی وصلح جوئی اور حق پرستی وحریت طلبی کے لئے قلب کے آخری قطرۂ خون کو خرچ کرنے اور دماغ وحواس کو ان کے بالکل معطل ہونے تک استعمال کرنے اور زبان کو اس کے بالکل بند ہو جانے تک راہ مولیٰ میں کام لانے کے غیر معمولی فشار سے واقع ہوئی ہے۔ پھر یہ کوئی مرگِ مفاجات، حادثہ کی موت اور سقوط قلب نہیں ہے بلکہ ایک ارادی کارنامہ، ایک اخلاقی عمل اور ایک محبوب منزل کا پالینا ہے، ساری زندگی کی کاشت کا پھل! تمام عمر کی طلب صادق کا مطلوب! اور ایک بالکل طبعی نتیجہ اور واجبی حق ہے!!!

اللہ کے رستے ہی میں موت آئے مسیحا
اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے!

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہیں بانیوں میں ہم

بہار خون شہادت دکھا گئے جوہر
خزاں میں اور یہ رنگ شباب دیکھ تو

کربلا ہے بہانہ کوثر
جائے صدقے اس بہانے کے

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ — دین ہے امی وعالم کا اب ایمان حسینؓ
گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر — رہے کوثر پہ بھی وابستہ دامان حسینؓ

جوہر

والہانہ تمنائے شہادت !

جوہر کی "اسلامیت" اور جوہر کی شاعری | حضرت جوہر ایک مبصر حیات تھے اور آپ کی فطانت اور بصیرت کو ایچ جی ویلز، جارج برنارڈ شا، چیسٹرٹن جیسے عہد حاضر کے ارباب کمال نے عرصے سے تسلیم کیا تھا۔ اس بنا پر کئی بار آپ نے اس امر حق کا اظہار کیا تھا کہ حق کے لئے زندہ رہنا، حق کے لئے مرنے سے زیادہ سخت، اہم اور ضروری ہے۔ تاہم اگرچہ ان کی زندگی میں حق کے لئے جینے کی زبردست خواہش کارفرما ہے مگر حق یہ ہے کہ ان میں حق کے لئے مرمٹنے کی آرزو، ان کی سب آرزوؤں پر غالب نظر آتی ہے اللہ کے رستے میں مرنے کی دعا اُن کی سب سے پرانی دعا ہے جو تحریر و تقریر، نظم و نثر، جلوت خلوت اور قید و آزادی میں بے اختیار اُن کے عمق روح سے نکلتی رہی ہے۔ ایک فاضل[1] نے آپ کی شاعری کو "سیاسی تصوف" سے ملو بتایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شاعری بھی آپ کے "اسلام" اور "شوق شہادت" کی مظہر ہے مگر چونکہ آپ کی روح اسلام اور آپ کے سودائے شہادت کا میدان عمل اجتماعی زندگی کے مختلف شعبے رہے ہیں لہذا ان کی روحانیت انہیں وادیوں اور گھاٹیوں میں جلوہ گر رہی ہے اور حق یہ ہے کہ حقیقی روحانیت اور حقیقی تصوف بجز اجتماعی زندگی کے دوسری جگہوں میں ناممکن اور ناپید ہے۔ خانقاہ نشین خداوندان تصوف کے بارے میں خود فرماتے ہیں :-

کہہ دو ان گوشہ نشینوں سے جو ہیں گوشۂ قبر — نہیں دنیا میں جگہ آپ سے بیکاروں کی!
کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبیٰ درکار — اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی!

جوہر

---

(۱) پروفیسر سید عبداللہ ایم اے

یہ آپ کے "اسلام" ہی کا کرشمہ ہے کہ زندانِ بیجاپور میں اپنی عزیز بچی آمنہ کی مہلک علالت کی خبر سن کر تڑپ جاتے ہیں اور ایک دردناک دعا اسیری لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن "اس کو"　　نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اور دوسری جگہ:

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں　　زندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے:

اس سے آگے بڑھ کر وہ خود دین وملت کی نسبت شکست اور کامیابی وناکامیابی سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

ہم اس کے ہو لئے تو پھر اب اس سے کیا غرض　　وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے؟

سینچا تھا اس چمن کو لہو سے حسین نے　　اب چاہے اس چمن کو خزاں دے بہار دے! جوہر

رفتہ رفتہ یہ روحِ اسلامیت "عشق" میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آپ اس کی تصویر اور ساتھ ہی خود اپنے نفس کی تصویر ان اشعار میں کھینچتے ہیں:

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل!　　تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بیکاری کا!

عاشقوں کے لئے ہے دار ہی دارو ئے شفا　　عشق کی صف میں دوا نام ہے بیماری کا

دل وجاں سونپ چکے ہم تجھے لے جان جہاں　　اب ہمیں خوف ہی کیا اپنی گرفتاری کا

اجل استادہ ہے بالیں پہ مریضِ غمِ عشق!　　آنکھ تو کھول ذرا، وقت ہے بیداری کا

عشق بن گر جئے تو خاک جئے　　زندہ وہ ہے جو اُن پہ مرتا ہے!

نام پر اس کے سب جو دے بیٹھا　　وہی اک ہے جو نام کرتا ہے!

وقف مومن ہے آزمائشِ عشق　　اس میں پورا وہی اترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا　　وہی ناکام کام کرتا ہے؟

قلزمِ عشق میں گرا جو گرا　　اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے؟

مئے اسلام کا بھلا جو نشہ　　نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے؟

اقبالؔ اور جوہرؔ "قال" اور "حال"

اس ذیل کی ایک دوسری عجیب حقیقت اقبالؔ اور جوہرؔ کی روحانی وحدت ہے۔ عموماً جوہرؔ کی زندگی اقبالؔ کے آتش فشاں "قال" کا زلزلہ انگیز "حال" رہی ہے مگر خصوصی طور پر ان کی "زندگی"۔ ۔ ۔ اقبالؔ کے ان اشعار شعلہ آفریں کی عملی تفسیر ہے کہ :

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی !

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی !

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی !

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی !

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی !

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی !

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی !

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنگار تو !

ہو صداقت کے لئے مرنے کی جس دل میں تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے !

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے !

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے !

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے !

اقبالؔ

ان آتشیں اشعار کا اگر کوئی نورانی مصداق ہوا ہے تو پھر وہ جوہرؔ کے سوا اور کون ہے ؟ حضرت علامہ اقبالؔ خود فرماتے ہیں :

جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہ خاور از خاور گزشت

"داستانِ عشق" ذرا جوہرؔ کی اپنی زبان سے

۲۰ ؍ ۱۹۲۷ء کے ۱۳ جون کو آپ نے اپنی عمر کی پنجاہ سالہ سالگرہ کی

تقریب پر ہمدرد میں اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی پر ایک تبصرہ لکھا اور اپنی آئندہ کی تمناؤں کو بھی پیش کیا۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"جس سال سے میدان صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابیطس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت و آرام سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لئے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے حافظہ اب بیحد خراب ہو گیا ہے۔ . اور گو سال گذشتہ میں چار مہینے صاحب فراش بھی رہا، تب بھی ملک و ملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگریس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا اور اسی دن جس دن موتمر اسلام نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا۔ آدھے جسم پر بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصہ میں اور میں سمجھا کہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ کے لئے مہمان نوازی فرمائی مگر موت نصیب ہو کر "جنت المعلیٰ" میں سونا نصیب نہ ہوا دوسرے ہی دن سے موتمر کے جلسہ میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارت روضۂ رسول کے لئے نکلا تو راستہ میں وہ ذبل نکلا جس سے خیال ہوا کہ شاید اس سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المعلیٰ کی جگہ جنت البقیع" میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہانداری کرائی جائےگی۔ مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی۔ . . . اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخواں کے لئے دو مشت خاک پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہوگا لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندۂ خدا کا نام محمدؐ اور علیؓ کے اسماء گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمدؐ اور علیؓ کے دین کے لئے جلایا جائے . . . اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمدؐ اور علیؓ کو موت آئی تھی

(۱) جنت المعلیٰ۔ مکہ معظمہ کا مشہور تاریخی قبرستان جہاں اصحاب رسول کے مقابر ہیں۔

(۲) جنت البقیع مدینہ منورہ کا مشہور تاریخی قبرستان جس میں اکثر اکابر، انصار مہاجرین اور اہل بیت مدفون ہیں

از ہمدرد سالگرہ نمبر ۱۰؍ جون ۱۹۲۸ء جبکہ مولانا جوہر پچاس سال کی عمر کو پہنچے تھے۔

"دنیائے کربلا" | مگر ہر آئیڈیلیسٹ کے آگے ایک اسوۂ عمل مشخص ہوتا ہے اور جوہر کے آئیڈیل راہ حق میں شہادت کے آگے بھی ایک نمونۂ عمل تھا جو اُن کی روح کو متحرک متلاطم اور ان کے قلب کو مضطرب وملتہب رکھا کرتا تھا اور وہ "کربلا" کا اسوۂ عالی تھا۔ کربلا کو جوہر ایک طرف راہ حق میں قربانی، فداکاری اور جانسپاری یعنی "کامل اسلام" کا عالی شان آئیڈیل یقین فرماتے تھے اور دوسری جانب، اس حادثۂ کبریٰ کو تاریخ اسلام اور تاریخ انسانیت کا ایک عظیم الشان اجتماعی انقلاب تصور فرماتے تھے کیونکہ نظام اسلام، خلافت راشدہ پر آخری ضرب رومانی ہرقلیت اور ایرانی کسرائیت نے کربلا ہی میں لگایا تھا جس کے صدمہ سے اسلام یا الٰہی نظام اجتماع، پھر ابھر نہ سکا مگر جس کی تجدید جوہر کی زندگی کی سب سے بڑی مثبت اور ایجابی آرزو تھی۔ پس کربلا جوہر کی نگاہ میں راہ حق میں قربانی اور شہادت اور سب سے اول و آخر اسلامی جمہوریت کا کلمہ تھی۔ جوہر شہادت کربلا کی صحیح روحانیت اور حقیقی معنویت کے نشہ سے سرشار تھا اور جوہر کا خانوادہ ایک خدمت گذران حق کا خانوادہ ہے جس کی بانی اور مربیہ حضرت بی اماں رحمۃ اللہ علیہا تھیں اور جس کے چھوٹے بڑے تمام اعضائے خدمت حق کو اپنی اپنی زندگیوں کا مآل قرار دے رکھا۔ آج اس ملک میں وطن خواہی، حق دوستی اور فی سبیل اللہ خدمتِ خلق کے اندر کوئی خاندان اُن سے ممتاز نہیں ہے۔ خدمت ملی کے جذبہ کی انتہائی ترقی یہ ہے کہ علی برادران اور ان کے کنبہ کی پبلک اور پرائیویٹ لائف ایک ہی ہے، مولانا جوہر اور شوکت کے نجی اور گھریلو خطوط بھی جو بستر مرگ تک سے تحریر ہوئے ہیں وہ درد ملت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خصوصیت حضرتِ مولانا محمد علی جوہر کو کربلا کے اولیا۔ حق سے کتنا قریب کر دیتی ہے اور پھر اُن کی راہ حق و حریت اور جادۂ حب انسانی و اخوت جہانگیری میں غریب الوطنی کی شہادت اُن کو دراصل ان کی منزل کربلا سے کا ملاً ہمدوش اور ہمکنار بنا دیتی ہے کیونکہ کربلا جوہر کی بصیرت میں ایک منزل اور مطلوب کا نام ہے نہ کہ ماتم و شیون کی چیز ہے۔ یہ تشنگان شہادت اور عشاق حق کی ایک "دنیائے راز" ہے

۱۰؍ جون ۱۹۲۸ء کو حضرت جوہر نے اپنی پنجاہ سالہ سالگرہ منائی تھی اور اس تقریب پر اپنی پچاہ نام

ندگی پر ایک ریویو ہمدرد میں لکھا تھا جس کا ایک اقتباس اوپر درج ہوا۔ اس سالگرہ کے بعد مولنا جوہر
سخت علیل ہوئے اور بغرض یورپ صحت یابی کے لئے بھیجے گئے۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں یورپ
اور ترکیہ سے واپسی میں آپ نے فلسطین، سوریہ اور عراق عرب کے تمام شہدائے اسلام کے مشہدوں
پر حاضری دی اور ہر جگہ آنسوؤں کا سیلاب بہا بہا کر خلافت راشدہ کی احیا کی دعا اور اس راہ میں
خود شہید کربلا کے اسوۂ شہادت کی پیروی میں جاں بحق ہونے کی آرزو کا اظہار کیا اور جب سید الشہدا
حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہد پر پہنچے تو بے اختیار ہو گئے! اور حالت بیخودی میں
زندانِ بیجاپور کے یہ اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو گئے اور یہ در اصل روح جوہر کی ایک عریاں
تصویر اور قلب جوہر کا ایک عکس ناطق ہے۔

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا — یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا!
ہے مقتلِ حسین کی اب تک وہی بہار — ہیں کس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا!
اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گزر کبھی — کیا رنگ دیکھئے ابھی دکھلائے کربلا!
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی — ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا!
روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات — جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا!
جو رازِ کیمیا ہے نہاں خاک میں اسے — سمجھا ہے خوب ناصیہ فرسائے کربلا!
مطلب فرات سے نہ آبِ حیات سے — ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا!
کوثر کے انتظار میں ہوں کب سے تشنہ کام — مجھ پر بھی اک نظر شہِ والائے کربلا!
کرنے کو یوں ہزار کریں سینہ کوبیاں — ہے چند ہی کے واسطے زیبائے کربلا!

جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا!

یہ والہانہ تمنائے شہادت کس بے نظیر شان سے پوری ہوئی۔ کچھ قریب کے ناظرین اور شرق و
غرب کی زبان خلق سے ہی سننے کے لائق ہے:-

ڈیلی ایکسپریس لندن | " میں اپنے وطن عزیز کی آزادی، سرسبزی، خوشی اور امن وسکون کا خواہشمند ہوں اور دنیائے اسلام میں ایک عالمگیر اتحاد و اتفاق کا متمنی ہوں "

" یہ آخری الفاظ تھے جو مولانا محمد علی کی زبان پر مرتے دم جاری رہے۔ مولانا محمد علی موت کے آغوش میں انگلستان تشریف لائے تاکہ گول میز کانفرنس میں شرکت فرما کر اپنے ملک وملت کی بہترین خدمت انجام دیں۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے اور اُن کو بتایا گیا کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے لیکن باوجود اس کے روحانیت کے اُس جذبہ کے ماتحت جو اہل مشرق سے مخصوص ہے آپ نے زندگی کی آخری رات بھی ڈیلی گیٹوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیغام لکھوانے میں گزار دی۔ تاکہ کسی طرح سے فرقہ وارانہ پیچیدگی کو سلجھا کر اور وطن کی آخری خدمت انجام دیں۔ آپ نے لندن ہوٹل میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، والیان ملک اس قائد اعظم کی بالیں پر اشکبار تھے۔ ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ میں اور دوسرا اپنے شیدائی برادر بزرگ کے ہاتھ میں، جو کہ تمام ترکیہ سے سفر کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے۔"

" ہندوستانی شاہزادے بار بار کمرے میں آتے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے! لیکن موت آہی پہنچی اور وہ ابدی نیند میں سوگیا! "

نیوز کرانیکل لندن | " آپ کی وجیہہ اور پرشوکت وضع قطع، دیوہیکل زبردست شخصیت اور رعد کی سی گرجنے والی آواز قصر سینٹ جیمس کے حاضرین کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ ڈھیلا ڈھالا بھورا سا منقش اور قراقلی کی خوشنما ٹوپی چمکتے ہوئے ہلالی نشان کے ساتھ کیسی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ جب نومبر گزشتہ کی ابتدا میں آپ برطانیہ تشریف لائے تو موت کے مونھ میں تھے لیکن اس سے جنگ کرتے ہوئے چنانچہ جب گول میز کانفرنس میں آپ تقریر کر رہے تھے تو آن کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی اپنی گرانڈیل اور پُرہیبت جسم کے ساتھ سہارا دئے کھڑے تھے۔۔۔ موت مونھ کھولے سامنے کھڑی ہے اور آپ درحقیقت اُس کے مونھ میں ہیں لیکن ہندو مسلم مصالحت کے لئے تادم واپسیں مصروف جہاد ہیں "

ڈیلی ہیرالڈ، لندن۔ آرگن سرکاری لیبر پارٹی | " مولانا محمد علی کی موت سے کل صبح گول میز کانفرنس کا سب سے بڑا بہادر عظیم الشان اور نہایت دلیر لیڈر چل بسا! اس دیو ہیکل اور جانباز لیڈر کا جسم عنصری تو ہندوستان سے چلتے وقت ہی متعدد مہلک بیماریوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی کہ ایسا لمبا سفر خطرناک ہے۔ لیکن جانباز سپاہی موت کے آغوش میں وطن کی خدمت کے لئے چل ہی پڑا۔ ساتوں سمندر پار کا صعوبت خیز سفر ایک زبردست قوت ارادی کے ساتھ کٹ گیا تو آپ نے انگلستان پہنچتے ہی کہا کہ " میری بیوی جو کہ غیر زبان کا ایک لفظ بھی بول نہیں سکتی آج پہلی مرتبہ پردہ سے باہر آ کر میرے ساتھ آئی ہے کہ میری تیمارداری کرے یا مجھے سپرد خاک کرے " ہم زبردست قوت ارادی اور استقلال کا ایک عظیم الشان مظاہرہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حالت میں وہ بستر سے اٹھ کر گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور وہاں وہ شاندار تقریر فرمائی جو صفحہ تاریخ پر آب زر سے لکھی جائے گی "

لارڈ پیل (رکن قدامت پسند پارٹی) سابق وزیر ہند | " ہم مولانا محمد علی کی جرأت و استقلال کے قائل ہیں کہ آپ نے اس حالت میں یہ طویل سفر اختیار کیا جبکہ وہ موت کو ہر دم اپنے ساتھ ساتھ دیکھ رہے تھے کس جوانمردی اور ہمت کے ساتھ آخری وقت تک اس کو بنا ہتے رہے خدمت عامہ کا کبھی کم نہ ہونے والا جذبہ آپ کے دل میں تھا "

لارڈ ریڈنگ (رکن لیبرل پارٹی) سابق وائسرائے ہند | " مولانا محمد علی کی معجز بیان اور زبردست شخصیت سے ذاتی طور پر ملاقات مجھے انگلستان میں ہی حاصل ہوئی ہے۔ جب وہ ایک بات کو یقینی طور پر تسلیم کر لیتے تھے تو پھر اس کے لئے ڈٹ بندھ جاتی تھی۔ بسا اوقات ہمیں ان کی وجہ سے مشکلیں پیش آئیں لیکن اب میں ان کی جرأت، استقلال اور صبر کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ باوجود صحت کی انتہائی خرابی کے وہ مادر ہند کی آئینی ترقی کے لئے اس کانفرنس میں شامل ہوئے اور اپنے اصول پر جان لڑاتے ہوئے ایک " شاندار موت " سے ہمکنار ہوئے! "

لارڈ سانکی (رکن لیبر پارٹی، لارڈ چانسلر یعنی صدر ہاؤس آف لارڈ۔ صدر پریوی کاؤنسل اور صدر فیڈرل ترکیبی کمیٹی)

" محمد علی ایک ایسا لیڈر تھا جس کو لوگ تہ دل سے پیار کرتے تھے اور جو بات اس نے اپنے خیال میں

حق اور مناسب سمجھی اس کو پورا کرنے کے لئے جان لڑا دی۔ افسوس ہے کہ اپنے قول و فعل سے اپنے ملک کی آخری خدمت کرتا ہوا یہ جانباز سپاہی اپنی سرزمین سے اتنی دور غریب الوطنی میں فوت ہو گیا۔ مجھے فخر ہے کہ آپ نے مجھے اپنے بستر مرگ پر تبادلۂ خیالات کے لئے بلایا۔ ضعف اور نقاہت تو اس قدر تھی کہ میں بیان کرنے سے قطعاً قاصر ہوں۔ لیکن اُس نازک ترین وقت میں بھی آپ کو اپنی مطلق فکر نہیں تھی اگر فکر تھی تو ہندوستان کی۔ امیدیں تھیں تو ہندوستان کے متعلق اور آرزوئیں تھیں تو ہندوستان سے وابستہ۔ ہم میں سے بہت سے اصحاب ایسے ہیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھتے تھے اور ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ آپ اصول کے لئے جئے۔ اصول کے لئے صعوبتیں اٹھائیں۔ اور اصول کے لئے مر مٹے!"

وجوڈ بین (وزیر ہند) نے وفات سے ایک مہینہ قبل مولٰنا سے پرائیوٹ ملاقات کے بعد یہ بیان دیا۔ "جس طرح ہندوستانی اور اسلامی معاملات کو مولٰنا محمد علی نے مجھے سمجھایا وہ ابتک کسی نے بھی نہیں سمجھایا تھا۔ مولٰنا نے عجیب و غریب انکشافات کئے، قوت استدلال مولٰنا محمد علی سے بہتر کسی میں نہیں۔ اور صاف گوئی تو ایسی ہے کہ اس شخص کے نزدیک شاہ و گدا دونوں برابر ہیں۔ حاکم کے سامنے اُس کی یا اس کی حکومت کی خامیاں اس طرح بیان کر دیتا ہے جس طرح غریب کے سامنے اُس کے معائب کی تشریح" وفات کے بعد وزیر ہند نے اعلان کیا: "مولٰنا محمد علی کو خوب معلوم تھا کہ دست اجل اُن کی طرف دراز ہو چکا ہے مگر انھوں نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ ہندوستان کی خدمت میں انھوں نے ہنسی خوشی حدود عالم کو عبور کیا۔ پرانے سال کے آخری دن اپنے معالجوں کی عدول حکمی کرتے ہوئے احباب کی ایک جماعت کو مدعو کیا اور اپنے بستر مرض سے جو اُن کا بستر مرگ ثابت ہوا انھوں نے ہمیں خطاب کیا۔ انھوں نے کمال اخلاص سے دسیع ترازادی اور بہتر مفاہمت کے لئے اصرار کیا۔ مولٰنا محمد علی ایک عظیم الشان "مسلم"، ایک عظیم الشان "وطن خواہ" اور ایک عظیم الشان "پیغامبر انسانیت" تھے اور انھوں نے بڑی شجاعت سے عالم مفاہمت و مصالحت کی خاطر جان دی ہے!"

انگلشمین کلکتہ "ہندوستانی سیاست کا طوفانی پٹر دل" The strong Petrol of Indian Politics.

کلکتہ میونسپل گزٹ | "ایک پیدائشی مجاہد۔ ایک عظیم الشان فرزند ہند۔ جس نے ملک کے لئے دکھ جھرا اور ملک ہی کے واسطے جان قربان کر دی ۔ ۔ ۔ ایک شہید وطن خواہی۔ ایک شہید بین الملی اور ایک شہید فریضۂ عامرہ!"

تاریخ انسانیت میں بے نظیر عالمگیر ماتم!

"تاریخ انسانیت میں بہتیرے دوستداران بشر اور شہدائے حق ہو گزرے ہیں مگر حق یہ ہے کہ آج تک مشرق و مغرب میں اُن کا ایسا وسیع پر خلوص اور عام اور عالمگیر ماتم نہیں ہوا ہے جیسا کہ اس شہید انسانیت کا کیا گیا ہے۔ سلطنت برطانیہ عظمیٰ کے شہنشاہ جارج پنجم اور اُن کے وزرا وامرا اور مشہور لیبرل لیڈر مسٹر لائڈ جارج جیسے برطانوی اعظم و اکابر اور جارج برنارڈ شا وغیرہ جیسے ائمہ ادب وفکر سے لے کر غلام ہندوستان کے وائسرائے بہادر اور وطنی زعما مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، پنڈت مالوی اور والیان ملک سب نے ان کا پر خلوص ماتم شخصی محبت اور پریم کے ساتھ کیا ہے۔ مسلمانان ہند کا ماتم چنداں قابل تعجب نہیں کہ مرحوم اُن کے اپنے تھے اور انھوں نے اپنے آبا واجداد کا گھر اجاڑ کر ملت کی آنکھوں میں اپنا گھر بنایا تھا۔ البتہ بقول مسٹر ہنری واٹسن (ایڈیٹر اسٹیٹس مین کلکتہ) "یورپ، ایشیا اور افریقہ کے براعظموں اور تمام دنیا کی ملتوں اور مذہبوں کے زعما کا بیت المقدس میں ایک ہندوستانی "معلم وطن خواہ" (Teacher Patriot) کی شہادت پر لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ماتم کرنا اور آنسو بہانا ایک ایسا عجیب، اہم، اعظم اور اثر انگیز منظر پیش کرتا ہے جس کو چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔ بیت المقدس یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مشترکہ حرم ہے اور مولانا محمد علی کے مدفن نے پہلی بار ان کو ایک مشترکہ ماتم میں متحد کیا ہے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ مدفن ہند اور قدس کو مربوط کرے گا اور آئندہ اتحاد عالم اور اتحاد انسانیت کا ایک نشان اکبر ثابت ہوگا کیونکہ مرحوم کا آئیڈیل در اصل وحدت انسانی تھا۔ دنیا کے شاہوں اور شہنشاہوں کی اموات پر سرکاری رسمی ماتموں کو اس جہانگیر ماتم سے کیا واسطہ جو حب انسانیت اور خدمت خلق کی راہ میں بہادرانہ اور رضا کارانہ شہادت کے اعتراف میں شرق و غرب میں آپ سے ظاہر ہوا۔ مولانا جوہر مصری نہیں تھے مگر سلطنت مصر، اُس کے قومی لیڈر و اکابر و جمہور کا والہانہ

محبت کے ساتھ ایک دو شب کے لئے نعش جوہر کو اپنی آنکھوں اور دلوں میں پذیرائی کرنے کا منظر اُس گوشۂ مصر سے بھی ممتاز بنا رہا تھا۔ ممالک اسلامیہ سے مصر، نجد و حجاز، یمن، شرق یردن، عراق، سوریہ، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، ایران، ترکستان، افغانستان، ترکیہ وغیرہ کے نمائندگان اس شہید حق کے ماتم میں شریک ہیں جس طرح ایک بھائی دوسرے کے غم میں شریک ہوتا ہے ہز ایکسیلنسی حافظ وہبہ وزیر مختار سلطنت عربیہ و نجد و حجاز وغیرہ، حسین رؤف بے اجو یونانی ترکی جنگ کے دوران میں انگورہ گورنمنٹ کے صدر اعظم اور جنگ عظیم میں انور پاشا کی حکومت میں وزیر بحر تھے اور اس سے پہلے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں حمیدیہ کے کپتان کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں) ہز ایکسیلنسی جنرل محمد ولی محمد خاں فاتح کابل، وزیر مختار افغانستان، ہز ایکسیلنسی عفیفی پاشا وزیر مختار مصر اور ہز ایکسیلنسی آقائے وزیر مختار سلطنت ایران پایتان لندن میں آپ کے جنازہ کو سنوارنے اور کندھا دینے میں شریک اور سلطان فواد مصری، پرنس محمد علی پاشا برادر عباس حلمی پاشا سابق خدیو، شاہ نادر افغانی، رضا شاہ پہلوی، امیر فیصل شاہ عراق، پرنس عمر طوسون پاشا، علامہ عبد العزیز ثعالبی قائد اعظم تونس، آل عبد القادر الجزائری اور سلطانی خانوادۂ عثمانیہ کے شاہزادے سب اس جہانگیر غم ملت میں ماتم گسار تھے! آخر اس غلام ہندوستان کے اس فرزند میں وہ کونسی بات تھی جس نے مشرق و مغرب کے دلوں کو ہلا دیا اور اُن کے تخئیل پر قابض ہو گیا؟ آخر آپ کی موت میں وہ کونسی ادائے خاص تھی جس پر سفید فام مغرب، سیہ فام افریقہ اور زرد فام ایشیا لوٹ گیا؟

جواب یہ ہے کہ محمد علی جوہر کی زندگی ایک کامل مومن و مسلم اور سچے محب ملک و ملت و انسانیت کی زندگی تھی۔ آپ کی عظیم فطانت و ذہانت وسیع علم و رسحر بیان و زبردست قوت فکر و عمل سب کچھ اللہ اور اس کی مخلوق کے لئے وقف تھی۔ ملت اسلام اور ہندوستان سے وطنی اور مذہبی قربت کی وجہ سے خاص لگاؤ تھا مگر حقیقۃً آپ کی زندگی ایک محب حق و انسانیت کی زندگی تھی۔ آپ نے زندگی بھر جہاد کیا اور مرتے دم تک جہاد کیا اور اپنے ارادہ، ضمیر، عشق اور ایمان کی تمام طاقتوں کے ساتھ حق کے لئے اپنا سب کچھ کھونے، تجنا و مٹانے کا فیصلہ کیا اور حقیقۃً آپ نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

سب کچھ تج دیا اور سب کچھ مٹا دیا۔ دولت بھی! صحت بھی!! اور آخر کار اپنی جان مستعار بھی!!! ایسی عظیم الشان قربانی اور اُس کی ایسی جہانگیر توقیر و تعظیم! ایک ہندی کا انتقال اور عرب و عجم، شرق و غرب کا ماتم و شیون! قدس میں جامعہ اسلامیہ بیادگار جوہر کا قیام اور ہندوستان میں اس کی تیاری! کیا ماضی و حال میں کسی نے ایسی شاندار موت ایک ایسی شاندار زندگی کے بھراتام کی صورت حاصل کی ہے! اور کیا اس شہادت کبریٰ نے "روایات علیہ" میں ایک زندگی بھر کے مجاہد حق اور شہادت فی سبیل اللہ کی ایک دوسری دنیائے کربلا، کی روشن، ایمان پرور، اور زندگی بخش روایات کا باب نہیں تیار کیا ہے؟

میں اس سرسری مطالعہ کو تین مزید اقتباسات پر ختم کروں گا جس سے یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ مولانا جوہر نے "روایات علیہ" میں کتنا بے بہا اور لازوال ترکہ کا اضافہ کیا ہے۔

محمد علی کے آنسوؤں کا سیلاب!

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی فاضل مصر: "کوئی نہیں جس نے مسلمانوں کی خدمت محمد علی سے زیادہ کی ہو، کوئی نہیں جس نے مسلمانوں پر محمد علی سے زیادہ آنسو بہائے ہوں۔ وہ کون مجلس ہے جس نے محمد علی کے آنسوؤں کا سیلاب نہیں دیکھا! وہ کون مسلمان ہے جس نے محمد علی کی روح کی بیقراری نہیں دیکھی؟ روتے روتے اُس کی آنکھیں تقریباً پھوٹ چکی تھیں۔ کڑھتے کڑھتے اس کے اعضائے رئیسہ تقریباً معطل ہو چکے تھے۔ ایک طرف بیماریوں کی یورش، دوسری طرف افکار کا ہجوم! آخر شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی!"

ہمارے آنسوؤں کا دریا!

"ہم رو رو کر آنسوؤں کا دریا بھی بہا دیں مگر محمد علی کے ایک آنسو کا بھی معاوضہ ادا نہیں کر سکتے جو اس نے درد امت میں بہایا تھا! ہم ماتم کرتے کرتے اپنے سینے پاش پاش بھی کر ڈالیں، مگر محمد علی کی ایک آہ کی قیمت بھی پوری نہیں کر سکتے جو غم ملت میں اس نے کھینچی تھی!"

"ہمارے آنسو اور ہماری آہیں اپنے محسن کے لئے ہوں گی لیکن محمد علی کے آنسو اور آہیں ایک

غافل اور ناشکرگزار قوم کے لئے تھیں۔ ہم اس لئے روتے ہیں کہ فیض کا دروازہ ہم پر بند ہوگیا۔ اور وہ اس لئے روتا تھا کہ ہماری بلا طلب ہم پر اپنے فیض کا دروازہ کھول دے۔ ہم اپنی محرومی پر ماتم کرتے ہیں اور وہ اپنی عطائی تعمیم کے لئے ماتم کرتا تھا!"

شاہزادہ محمد علی پاشا برادر عباس حلمی پاشا سابق خدیو مصر نے تابوت کے سامنے فرمایا: "اللہ کا سلام اُس روح طاہر پر۔ ہمارے جلیل القدر بھائی۔ اسلامی مجاہد۔ محمد علی رہنمائے ہندیہ.... مرحوم اپنے جسم کے ساتھ ہم سے جدا ہوگئے ـــــ وہ جسم جسے جہاد نے کمزور اور بالآخر فنا کر ڈالا۔ لیکن انھوں نے اپنے جسم کی قربانی سے ایک ایسا "روحانی نور" پیدا کر دیا ہے جس کی روشنی ہمیشہ مسلمانوں کو راہ حق دکھلائے گی!

محمد علی پورے استحقاق کے ساتھ شہدائے مجاہدین کے درجے پر فائز ہوئے ہیں کیونکہ وہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کے حقوق کی مدافعت پر بلند ہمتی اور بے نظیر شجاعت کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ جب کبھی جہاد کی دعوت بلند ہوتی تھی، محمد علی، اللہ کے راستے اور اللہ کے دین حق پر جان و مال سے قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے تھے!"

وزیر محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف دولت مصریہ نے تابوت کے سامنے کھڑے ہوکر فرمایا:۔

اُس رہنما کی تاریخ حیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی بلند نفسی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اُسے مجبور کیا کہ اپنے وطن اور دنیائے اسلام کے لئے انصاف حاصل کرنے کے واسطے جہاد کرے وہ انصاف سے واقف ہوا، اور اُس کا عاشق بن گیا اور عمر بھر اس کی طلب میں سرگرداں رہا! لیکن اس عشق میں اُس نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اتنی محنت کی جو برداشت سے زیادہ تھی آخر وطن اور اسلام کی راہ میں جان قربان کر ڈالی!

"لہٰذا وہ اپنے وطن، تمام مشرق، اسلام اور پوری انسانیت کا شہید ہے!"

تو نفسی تفسیران آفاق گیر تاثراتِ مرزوجہ کی یہ ہے کہ آج جمعیۃ بشری نے اپنے ایک عظیم الشان

موروثِ ملّی کو کھویا ہے اور ساتھ ہی اس منبعِ عظیم سے ہی ایک ورثۂ غیر فانی حاصل کیا ہے۔
محمد علی جوہر کی نطین، مجاہدانہ اور انقلاب آفریں شخصیت" کو گنوایا ہے اور ایک جہادِ جمیل اور شہادتِ بے عدیل کی "روایت" کو اپنایا ہے۔

حیاتِ انسانی، ایک فردِ حیات سے محروم مگر ایک چشمہ زارِ زندگی سے بہرہ یاب ہوتی ہے:
تو پھر کیا وہ اُمتِ مسلمہ جو ایسی روایت آفریں قیادتِ اجتماعی کی پیدائش پر قادر ہے اپنے روشن اور بلند مستقبل سے مایوس ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ کہ خود انسانیت کی فلاح و نجاح کی آخری امیدگاہ، جیسا کہ جارج برنارڈ شا نے اعلان کیا ہے کہ مذہبِ اسلام اور اس کے جوہر جیسے پیامبرانِ انسانیت کے روایاتِ عمل اور پیغاماتِ ایمان و بصیرت ہیں!

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز

(گذشتہ سے پیوستہ)

فاتحانہ عالی دماغی غیر عرب یعنی جماعت موالی کے مقابلہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ عراق کی اکثریت اہل فارس پر مشتمل تھی اور عرب نسبتہً قلیل تھے۔ یہ تو گذر چکا کہ اس عہد میں سرزمین عراق میں جزیہ دینے والوں کی تعداد ۵ لاکھ ۵۰ ہزار کے قریب تھی۔ اُن کے علاوہ اور بھی اہل فارس تھے جو حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور جزیہ دینے والوں میں اُن کا شمار نہ تھا۔ یہ لوگ موالی کہلاتے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ موالی قبائل عرب کے حلیف بن جاتے اور اُن کی حمایت کے مستحق قرار پاتے۔ یہ لوگ ان قبائل کے موالی کہلائے جاتے تھے اور وہ ان کے لئے روسا کا درجہ رکھتے تھے۔ حلیف ہونے کے بعد موالی بھی اپنے حلیف قبیلوں کی عصبیت میں اُن کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ بلاذری لکھتا ہے "اہل فارس کی فوجی جماعت جو اساورۃ کے نام سے مشہور ہے شروع میں بنی ازد کی حلیف بنی، بعد ازیں انھوں نے دریافت کیا کہ بنی ازد اور بنی تمیم میں آنحضرت صلعم اور ان کے خلفاء کرام کو نسبت میں کون قریب پڑتے ہیں اور نیز ان میں سے کس نے آپ کی زیادہ مدد کی ہے چنانچہ بنی تمیم کا نام بتانے پر وہ ازدیٰ بجائے اُن کے حلیف بن گئے"۔ عراق کی تمام صنعت و حرفت اور تجارت انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب حکمراں عنصر تھا اور تلوار اور سیادت اس کے پاس تھی۔

اہل عرب کی اس قبائلی عصبیت نے جہاں وہ گئے اور جس جگہ وہ آباد ہوئے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کوفہ کے عرب اور اُن کے حلیف موالی کوفہ کی عصبیت کا دم بھرتے تھے اور اسی طرح بصرہ والے بصرہ کو سراہتے تھے۔ ہر جماعت اپنے شہر کے طبعی اوصاف اور محل و قوع کی خوبیوں کو فخریہ بیان کرتی اور جو جو معرکے انھوں نے سر کئے تھے اُن پر فخر کیا جاتا اور جس کسی کو آنحضرت

صلعم کے صحابہ کرام کی تشریف آوری اور نزول اجلال کی سفارت ملی بھی وہ اس پر رجز خوانی کرتا اور تو اور علم و فضل میں بھی مفاخرت اور چشمک کا بازار گرم تھا۔ اس بیان کی تفصیل اور اہل بصرہ و کوفہ کی باہم چشمک آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے لئے بلاذری کی کتاب البلدان کا مطالعہ کیجئے۔

اس مفاخرت علمی اور باہمی نوک جھونک، رشک و چشمک اور اپنے اپنے شہر کے علماء کی طرفداری و عصبیت کے مظاہر علوم کی متعدد شاخوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ علم نحو میں بصری و کوفی فقہ میں بصری و کوفی، مذاہب دینی میں بصری و کوفی اور ادب و شعر میں بصری و کوفی کی تقسیم علاوہ فرماتے ہے۔ اعشی انی کہتا ہے۔

اکسع البصری ان لاقیتہ	انما یکسع من قل و ذل
واجعل الکوفی فی الخیل و ا	تجعل البصری الا فی النفل
واذا فاخر تمونا فاذکروا	ما فعلنا بکم یوم الجمل
بین شیخ خاضب عثنونہ	وفتی ابیض وضاح غل
جاء نا یخطر فی سا بغۃ	فذبحناہ ضحی ذبح الحمل
وعفونا فنسیتم عفونا	وکفرتم نعمۃ اللہ الرجل

۱۔ جہاں کہیں کسی بصری سے ملاقات ہو اس کے پیٹ رسید کرو۔ کیونکہ قلیل التعداد اور کم سوادوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔

۲۔ کوفی کو شاہسواروں میں جگہ دو اور بصری کو ہمیشہ فالتو لوگوں میں رکھو۔

۳۔ جب تمھیں ہم سے مفاخرت کا خیال ہو تو جنگ جمل[1] میں جو ہمارے ہاتھوں سے تم پر گذری تھی اس کو یاد کرو۔

---

(۱) یہ جنگ حضرت علی اور حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر کے درمیان واقع ہوئی۔ آخرالذکر فریق کو ہزیمت ہوئی یہ اصل میں بصرہ کی کوفہ کے سامنے پسپائی تھی۔

۴۔ صاحب قریش کی داڑھی خون میں رنگین تھی اور سفید رو حسین نوجوان بڑی طمطراق والا۔

۵۔ زوردار زرہ پہنے اینٹھتا ہوا ہماری طرف آیا۔ ہم نے تڑکے ہی دنبے کی طرح اس کو ذبح کر ڈالا۔

۶۔ اس کے بعد ہم نے تم سے درگذر کیا۔ لیکن تم ہمارے عفو و کرم کو بھول گئے اور تم نے خدائے بزرگ و برتر کی نعمت کی ناشکری کی۔

مجموعی حیثیت سے عراق کو تمام بلاد اسلامیہ سے زیادہ علمی و ادبی سرمایہ نصیب ہوا۔ البتہ بعض باتوں میں اہل حجاز اس سے بازی لے گئے۔ عراق کی اس فراوانی علم کے کئی ایک اسباب ہیں

۱۔ اسلامی عراق کی تکوین جیسا کہ ہم اس سے پیشتر عرض کر آئے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات پر عمل میں آئی تھی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اسلامی فتح کے بعد اہل عراق بیدار ہوتے اور اپنے قدیم تمدن اور علوم کو جو انھیں ورثہ میں ملے تھے زندہ کرتے، فتح سے قبل عراق کے طول و عرض میں سریانی عنصر پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی درسگاہیں بھی تھیں جہاں یونانی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، نیز عراق میں مسیحی فرقے بھی تھے اور ان میں عقائد کے متعلق بحث و جدل کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خاص حیرہ میں یونانی تہذیب کی تربیت یافتہ افراد جو رومی و ایرانی جنگوں میں اسیر ہوئے تھے، بھی موجود تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ ان اجتماعی کیفیات سے جدید افکار و آرا کو معرض وجود میں نہ لایا ہو۔ خیالات تھے اور ضرور تھے۔ اسلامی فتوحات کے تموج میں یہ خیالات وقتی طور پر دب گئے لیکن مٹے نہیں اور امن و امان کی بحالی پر انھوں نے سر نکالا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اہل عراق کی کثیر التعداد آبادی زمرہ اسلام میں منسلک ہو گئی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے ان کے قدیم افکار و آرا کو آہستہ آہستہ اسلامی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ جو خیالات اسلام کے موافق تھے اُن کو فروغ حاصل ہوا اور مخالف خیالات دن بدن مرجھاتے گئے۔

یہ حقیقت بھی مخفی نہ رہے کہ عراق جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے زرخیز اور شاداب خطہ تھا وسائل زندگی کی یہاں افراط تھی اور لوگ بآسانی تحصیل علم کے لئے وقت نکال سکتے تھے۔

۲- دولت امیہ کے عہد میں عراق باغی جنگ، جدل اور فتنہ وفساد کا میدان کارزار بنا رہا
اس میں سلطنت اسلامیہ کے تمام حصے اس سے پیچھے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے
عراق برابر مشتعل رہا۔ حضرت عائشہؓ، طلحہؓ و زبیرؓ نے بصرہ کا رخ کیا اور حضرت علی نے کوفہ کو مرکز بنایا۔
پھر کوفہ و بصرہ کے درمیان جمل کا معرکہ ہوا۔ حضرت امام حسینؓ حجاز سے کوفہ روانہ ہوئے اور کربلا
میں ان کو شہید کیا گیا۔ مختار الثقفی نے کوفہ ہی سے انتقام حسین کا نعرہ بلند کیا۔ عبداللہ بن زبیر کے
بھائی مصعب نے بصرہ پر قبضہ کر کے کوفہ پر چڑھائی کی اور مختار مقتول ہوا۔ عبدالملک بن مروان
اموی خلیفہ نے شام سے عراق پر فوج کشی کی اور مصعب قتل ہوئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے
اموی خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کوفہ پر متسلط ہو گیا۔ حجاج نے مقابلہ کیا اور شکست دی
اس انقلاب گردی میں قدرتی طور پر لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو گا کہ کون فریق غلطی پر ہے اور کون
راستی پر؟ اور اس بارے میں ایک دوسرے سے دریافت بھی کرتے ہوں گے۔ قاتلین عثمان نہ
حق پر تھے یا وہ گناہ کے مرتکب ہوئے؟ حضرت عثمان کی شہادت میں حضرت علی کا بھی ہاتھ ہے؟
حضرت عائشہ، طلحہ و زبیر حضرت علی کے خلاف جنگ کرنے کے مجاز تھے؟ مسئلہ تحکیم میں حضرت علی
کہاں تک حق بجانب تھے۔ والی عراق حجاج کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کی وجہ سے خلیفہ وقت یعنی
عبدالملک کے خلاف خروج کرنا جائز ہے؟ جن لوگوں نے ایسا کیا اور عبدالرحمٰن بن اشعث کا ساتھ
دیا وہ حق بجانب تھے؟ الغرض اس قسم کے بیسیوں سوالات و بحثیں اٹھتی ہوں گی۔ بلکہ ان کی بہت
کثرت تھی۔ یہاں تک کہ مساجد میں درس و تدریس کے حلقوں میں یہ سوالات پوچھے جاتے تھے
چونکہ عراق میں ان جنگوں کا جولانگاہ تھا اس لئے طبعاً عراقی ان بحثوں میں زیادہ پڑتے تھے۔ چنانچہ
اسی سرزمین سے پیشتر مذاہب دینی کا آغاز ہوا۔ اس بیان کی تفصیل آگے آئے گی۔

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس فتنہ و فساد کے زمانہ میں علماء وقت کے سرتاج حسن
بصریؒ سمجھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چند لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اس سرکش (حجاج) کے
متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے بیجا کشت و خون کیا۔ ظلماً لوگوں کے مال غصب کئے

نماز ترک کی۔ اور ایسا کیا اور ویسا کیا الخ۔ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ ایک شخص نے حسن بصری سے پوچھا کہ اس جنگ میں یزید بن مہلب اور عبد الرحمٰن بن اشعث کا ساتھ دیں یا نہ؟ آپ نے جواب دیا نہ اس کا ساتھ دو نہ اُس کا۔ اس پر اہل شام میں سے ایک شخص بول اٹھا، اور نہ امیر المومنین کا۔ اے ابو سعید (حسن بصری کی کنیت ہے) پھر وہ طیش میں آیا اور ہاتھ کو بڑے زور سے حرکت دے کر کہا اور نہ امیر المومنین کا ساتھ دیں۔" ہاں،" آپ نے کہا "اور نہ امیر المومنین کا،، اس، اس قبیلے کی بیشتر نظیریں صفحات تاریخ پر نظر آتی ہیں۔

۳۔ اہل عراق جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ عربوں اور موالی پر مشتمل تھے۔ عربوں کے ہاتھ میں سیادت تھی۔ موالی دینی اور دنیوی اغراض کے لئے عربی سیکھنے لگے۔ اُن کی قدرۃً یہ خواہش ہوگی کہ عربی سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ علم نحو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ عراق میں علم نحو کی داغ بیل پڑنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہ نسبت حجاز اور شام کے۔ اہل حجاز کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ اُن کی زبان کی درستگی کے لئے قواعد کا وجود عمل میں آتا اور نیز شام کے مقابلہ میں عراق کے موالی عربی زبان کے زیادہ شائق تھے۔ چنانچہ یہ معلوم ہی ہے کہ عربی کی طرف اہل فارس کا سب سے زیادہ رجحان تھا۔ واضح رہے کہ اسلام سے پہلے عراق میں سریانی ادبیات کا چرچا تھا اور اس زبان میں قواعد پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ اُس میں کوئی دقت نہ تھی کہ سریانی قواعد کے طرز پر عربی زبان کے قواعد وضع کئے جاتے اور خصوصاً جب کہ عربی اور سریانی دونوں زبانیں لسانی تھیں۔ کوفہ سے پہلے بصرہ میں علم نحو کی بنیاد پڑی اور بادیہ عرب کی قربت کی وجہ سے اہل بصرہ کوفہ والوں سے جو سرچشمہ فصاحت یعنی صحرائے عرب سے نسبتہً دور تھے بازی لے گئے۔

اب کوفہ و بصرہ کی علمی سرگرمیوں کی مختصر تاریخ ملاحظہ ہو۔

کوفہ یا رسول اللہ صلعم کے صحابہ کرام کی کافی تعداد کوفہ میں رونق افروز ہوئی۔ علمی لحاظ سے ان سب میں مشہور حضرت علی و ابن مسعود تھے۔ حضرت علی تو دوران قیام عراق میں سیاسیات میں الجھے رہے اور جنگ و قتال نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر سکتے۔ البتہ ابن مسعود

نے سرزمین کوفہ میں سب صحابہ کرام سے زیادہ اپنا علمی اثر چھوڑا۔ آپ سابقین اسلام میں سے تھے بلکہ مروی ہے کہ آپ ان افراد میں سے جو آنحضرتؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ چھٹے تھے۔ ابن مسعود ہجرت حبشہ اور بعد ازیں مدینہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے اور آپؐ کی خدمت بجالاتے تھے۔ اور نیز آنحضرت نے ابن مسعود کو اپنے مکان میں اس وقت اجازت دی جب کہ دوسروں کا جانا ممنوع تھا۔ آپ کو قرآن سے غیر معمولی شغف تھا۔ زیادہ تر اسی کو پڑھتے اور اس میں غور کرتے۔ یہی سبب تھا کہ احکام اسلام کے فہم و ادراک۔ معانی قرآن اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں اکابر صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اہل کوفہ کی تعلیم و تدریس ان کے سپرد کی۔ کوفہ کے کثیر التعداد لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کے گرد کافی شاگرد جمع ہو گئے تھے جو آپ سے پڑھتے اور آپ کے نقش قدم پر چلتے۔ اس جماعت کے متعلق سعید بن جبیر کا قول ہے "ابن مسعود اور ان کے رفقا کوفہ کی مشعلیں ہیں" آپ قرآن کا درس دیتے اس کی تفسیر بیان کرتے اور جو کچھ آنحضرت سے سنا تھا اس کو سناتے۔ جب احکام و مسائل ان کے سامنے پیش ہوتے تو قرآن و حدیث سے استنباط کرتے اور فتوے دیتے اور اگر کوئی مسئلہ ان ہر دو میں نہ ملتا تو ذاتی رائے سے کام لیتے۔ اس مدرسہ سے یہ چھ بزرگ مشہور ہوئے ان کا علمی شغل درس قرآن تھا اور احکام و مسائل میں یہی لوگ فتوے دیتے تھے۔ ان کے نام نامی یہ ہیں۔

علقمہ۔ اسود۔ مسروق۔ عبیدہ۔ حارث بن قیس۔ عمرو بن شرحبیل۔ کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے بعد یہ چھوں بزرگ تعلیم و تدریس میں ان کے جانشین ہوئے۔ یہ یاد رہے کہ تمام علماء کوفہ ابن مسعود کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے مدینہ میں رہے اور وہاں حضرت عمرؓ۔ علیؓ۔ ابن عباسؓ معاذؓ اور دوسرے صحابہ سے اکتساب علم کیا۔ مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ تھا کہ کوفہ جلیل القدر علمی گروہوں کا جولانگاہ بنا۔ بعد ازیں اس سرزمین نے شریح۔ شعبی۔ نخعی اور سعید بن جبیر ایسی بلند پایہ شخصیتیں پیدا کیں۔ علمی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ ترقی و پختگی کے منازل طے کرتا ہوا امام ابو حنیفہ کی ذات گرامی

میں اوجِ کمال تک پہنچا۔

بصرہ۔ کوفہ کی طرح بصرہ کو بھی کثیر التعداد صحابہ کے نزول اجلال کی سعادت ملی۔ صحابہ کی اس جماعت کے علمی سرتاج ابو موسیٰ اشعری اور انس بن مالک تھے

ابو موسیٰ اشعری یمنی تھے۔ مکہ میں آئے اور یہیں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت حبشہ میں بھی شریک تھے۔ اہل علم صحابہ میں آپ کی ممتاز حیثیت تھی۔ آپ بصرہ میں اترے اور یہاں مسند تعلیم و تدریس بچھائی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے انس بن مالک سے پوچھا "اشعری کو کس حال میں چھوڑا"، کہنے لگے "لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں"، حضرت عمرؓ فرمانے لگے "ابو موسیٰ ضعیف ہیں لیکن یہ بات ان کو نہ کہنا"، مقدمات میں اُن کے فیصلوں اور فتووں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن و حدیث میں معرفت سے زیادہ اُن کو فقہ میں مہارت تھی۔ انس بن مالکؓ انصاری تھے۔ آپ بچے ہی تھے کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس کے بعد تقریباً دس سال تک حضرت انس کو آپؐ کی حضوری خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ آخر میں بصرہ میں منتقل ہو گئے اور عمر دراز پائی۔ بصرہ کی جماعت صحابہ میں سب سے آخر میں آپ کا وصال ہوا۔ یہ واقعہ اغلباً ۹۲ھ ہجری کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انس بن مالک ابو موسیٰ اشعری اور عبداللہ بن مسعود کے مبلغ علم تک نہ پہنچ سکے۔ آپ کو فقہ سے زیادہ حدیث میں ملکہ حاصل تھا۔

خلافت بنی امیہ میں حسن بصری اور ابن سیرین کی تابناک شخصیتوں نے مدرسہ بصرہ کو خاص امتیاز بخشا۔ یہ دونوں بزرگ موالی تھے۔ ہر دو نے علمی سرمایہ اپنے حلیفوں سے ترکہ میں پایا۔ حسن بصری حضرت زید بن ثابت کے موالی تھے۔ زید موصوف کی عظمت اور اُن کا فضل و کمال صحابہ کرام میں مسلم تھا۔ ابن سیرین کو انس بن مالک کا مولیٰ بننا نصیب ہوا۔ اُن کی شخصیت حضرت انسؓ کی علمیت اور اُن کے فیوض صحبت کی پرتو تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں میں بصرہ میں حسن بصری اور ابن سیرین کا سکہ چلتا تھا۔ اول الذکر پختگی اخلاق۔ نیک روی۔ علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کے اوصاف جمیلہ کے شاندار مظہر تھے۔ اُن کی پختگی اخلاق تو اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اظہار رائے میں

وہ کسی مادی قوت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یزید بن معاویہ کی خلافت کے متعلق آپ سے پوچھا گیا۔ ابن سیرین اور شعبی نے تو اظہار رائے سے احتراز کیا لیکن حسن بصری ہی وہ بزرگ تھے جنھوں نے صریح طور پر اپنی رائے عدم موافقت کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے جنگ و قتال میں شریک کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے دونوں جماعتوں سے علحدہ رہنے کی رائے دی۔ اُس کے مزید اصرار پر کہ کیا امیر المومنین کا بھی ساتھ نہ دیں آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ امیر المومنین کا بھی ساتھ نہ دو۔ حسن بصری زور بیان اور خطابت میں حجاج کے مدمقابل سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا سب سے نمایاں وصف آپ کا زہد و اتقا تھا۔ اسی بنا پر اہل تصوف آپ کو صوفیائے کرام میں شمار کرتے ہیں اور آپ کے کلمات اور دانائی کے مقولوں کو بطور ضرب المثل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معتزلہ آپ کو رئیس المعتزلہ مانتے ہیں کیونکہ آپ نے مسئلہ قضا و قدر پر بحث کی اور نیز یہ کہ آپ شخصی ارادہ کی حریت کے قائل تھے۔ آپ فقیہ بھی تھے جو نئے نئے مسائل روزمرہ کی زندگی میں درپیش آتے۔ ان کے متعلق لوگ آپ سے فتوے طلب کرتے۔ قصہ گوئی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ قصہ گویوں کے سرتاج اور ان میں سے صادق ترین سمجھے جاتے ہیں الغرض حسن بصری کی شخصیت ان تمام گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی اور ہر خصوصیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ سنہ ۱۱۰ھ میں جب حسن بصری کا انتقال ہوا تو تمام اہل بصرہ اُن کے جنازے کی معیت میں تھے۔ یہاں تک کہ نماز عصر پڑھنے کے لئے مسجد میں کوئی نمازی نہ رہا۔

ابن سیرین نے زید بن ثابت، انس بن مالک اور شریح وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔ آپ قابل وثوق محدث اور فقیہ تھے۔ مسائل و احکام میں آپ سے فتوے طلب کئے جاتے تھے۔ ابن سیرین حسن بصری کے معاصر تھے۔ کبھی تو دونوں میں خوب دوستی رہتی اور کبھی ناچاقی بھی ہو جاتی ناچاقی کا سبب ان دونوں بزرگوں کی طبیعتوں کا اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ حسن بصری صاف گو اور برملا کہنے والے تھے۔ آپ عصبی مزاج کے تھے۔ غم و غصہ کے اثرات سے بہت جلد متاثر ہوتے اور اپنے عقیدہ کے اظہار میں خواہ مخواہ خطرناک سے خطرناک سیاسی مسئلہ کے متعلق ہو ذرا باک نہ کرتے

ان کے مقابلہ میں ابن سیرین حلیم الطبع اور نہس مکھ بزرگ تھے۔ ایسی بات کہنے سے جس پر تعزیر و مواخذہ ہو ہمیشہ احتراز کرتے۔ بعد میں ان کو خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی اور ان کے نام سے اس موضوع پر ایک جعلی کتاب بھی منسوب کر دی گئی۔ ابن الندیم نے الفہرست میں کتاب مذکورہ کا ذکر کیا ہے اور اُسے ابن سیرین کی تصنیف گردانا ہے لیکن متقدمین کی تالیفات مثلاً طبقات ابن سعد میں تعبیر رویا کے سلسلہ میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ آپ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی ۔ حسن بصری اور آپ دونوں سرداران بصرہ شمار ہوتے ہیں ۔

ان مذہبی اور علمی سرگرمیوں کے علاوہ سرزمین عراق میں ایک اور تحریک بھی سرگرم عمل تھی جسے ہم عہد جاہلیت کی یادگار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس تحریک میں روح تو عہد جاہلیت کی کام کر رہی تھی، البتہ جامہ اسلامی تھا۔

بصرہ و کوفہ میں جو عرب قبائل آباد ہوئے تھے۔ اُن میں رؤسا کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ان رؤسا کا وجود بہت حد تک عہد جاہلیت کی روایات ریاست کا مظہر تھا۔ قبائل میں اُسی طرح اُن رؤسا کی سیادت تسلیم کی جاتی تھی اور افراد قبیلہ ان کے گرد جمع ہوتے۔ جنگ و صلح میں انھیں کا حکم چلتا۔ شعرا ان رؤسا کے دروازوں پر کھڑے ہوتے اور اُن کی شان میں قصائد کہے جاتے اور اُن کے دشمنوں کی ہجو کی جاتی وغیرہ وغیرہ۔ ان سرداران قبائل میں سے جن کے جاہ و جلال، مروت و کرم اور فیاضی کے شہرے تھے۔ یہ لوگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بنی تمیم بصرہ کے رئیس احنف بن قیس۔ عبدالقیس بصرہ کے رئیس حکم بن منذر۔ بنی بکر بصرہ کے رئیس مالک بن مسمع۔ قیس بصرہ کے رئیس قتیبہ بن مسلم۔ تمیم کوفہ کے رئیس محمد بن عمیر بن عطارد۔ بنی ضبیہ میں حسان بن منذر کندہ کوفہ کے سردار حجر بن عدی اور محمد بن اشعث وغیرہم۔ یہ اور ان کے ہم مثل دوسری شخصیتیں اس عہد کی شاندار ادبی زندگی کا سرچشمہ تھیں۔ انھیں کے دم سے شعر و سخن میں جاہلی رنگ نظر آتا تھا اور اکثم بن صیفی (ایام جاہلیت کے نامور حکیم) کی سی حکیم بیان کی جاتی تھیں

ان ادبی سرگرمیوں کی تفصیل کے لئے اس وقت گنجائش نہیں البتہ ان ممتاز شخصیتوں کا ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ ان کی زندگی اور اُن کے ادبی اثرات کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے لئے احنف بن قیس کی شخصیت کو منتخب کرتے ہیں۔

احنف بن قیس جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بنی تمیم بصرہ کے رئیس تھے ان کے متعلق مشہور تھا کہ احنف کے برافروختہ ہونے پر ایک لاکھ تلواریں نیام سے نکل پڑتی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ برافروختگی کا سبب کیا ہے۔ جس قبیلہ سے احنف کی پرخاش ہوتی بنی تمیم اس سے بھڑ جاتے اور اُن کے ایک اشارہ پر تلواریں نیام میں ہوتیں۔ امیر معاویہ احنف کی قدر و منزلت اور اُن کے اثر و نفوذ سے واقف تھے اس لئے اُن کو اپنا مقرب بنایا اور ان پر اعزاز و اکرام کی بارش کی امیر معاویہ نے اپنے والیوں کو بھی اس امر کی وصیت کر دی تھی اور جس والی پر احنف ناراض ہوتے اس کو معزول کر دیتے امیر معاویہ احنف کی سخت بات بھی برداشت کرتے اور اُن کی مدارات ملحوظ رکھتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر معاویہ نے اُن سے کہا کہ خدا کی قسم احنف! جب جنگ صفین کا خیال آ جاتا ہے تو دل میں سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ (جنگ صفین میں احنف امیر معاویہ کے خلاف حضرت علی کے ساتھ تھے) احنف نے جواب دیا "خدا کی قسم معاویہ! وہ دل جو تم سے نفرت کرتے تھے ابھی تک ہمارے سینوں میں موجود ہیں۔ اور وہ تلواریں جو تمھارے خلاف نکلی تھیں، ہنوز نیاموں میں ہیں۔ اگر تم لڑائی کی طرف ایک انگل بھر اقدام کروگے تو ہم ایک بالشت بڑھیں گے۔ اور اگر تم اُس کی طرف چلو گے تو ہم دوڑیں گے

احنف بن قیس کا وجود بصرہ کے مخالف قبائل کو متحد کرنے میں بہت کام آتا تھا۔ آپ علو ر اخلاق فضل و کرم اور مروت میں ضرب المثل تھے۔ چنانچہ آپ کی وفات پر کہا گیا "آج عرب کا راز جاتا رہا) اور اُن کی بیوی نے بین میں کہا "تو قبیلہ کا سردار تھا اور خلیفہ کے ہاں قوم کا نمائندہ، تیری بات سنی جاتی اور تیری رائے پر چلا جاتا" احنف کی امثال اور پرحکمت مقولوں سے کتب ادب بھری پڑی ہیں۔ اُن میں سے چند ایک مثال کے طور پر بیان کئے دیتے ہیں "وہ لذت لاحاصل ہے جس کا انجام ندامت ہو"، "جس نے بے نیازی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہ ہوا"، "اس سے پہلے کہ تمھارا

کوئی غیر محاسبہ کرے خود آپ اپنا محاسبہ کرلو" وصال کے بعد قطع تعلق کتنی تکلیف دہ چیز ہے" "راہ حق میں خرچ کرو اور دوسروں کے خزانچی نہ بنو" "حاسد کو سکون اور جھوٹے کو عزت کہاں"۔

عراق میں فلسفی سرگرمیوں کا ذکر مذاہب دینیہ کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔ یہ فلسفی تحریک عہد عباسیہ میں اوج کمال کو پہنچی اور سرزمین کوفہ نے بڑے بڑے علماء پیدا کئے۔ اور ادھر بصرہ سے اخوان الصفا کی جماعت پیدا ہوئی۔

شام۔ شام کا خطہ زرخیز اور ذی ثروت ہے۔ یہاں کی زمین سرسبز و شاداب۔ پانی کی کثرت اور آب و ہوا معتدل ہے۔ اس ملک میں کثیر التعداد انبیاء مبعوث ہوئے اور اُن کی تعلیمات کا یہاں خوب اُٹھان ہوا۔ اور نیز یکے بعد دیگرے کئی قوموں اور کئی تہذیبوں نے یہاں ڈیرے جمائے اور اس ملک میں اپنے علمی اور تمدنی اثرات چھوڑتی گئیں، سب سے پہلے فنیقین آئے اور پھر کلدانی، مصری عبرانی، یونانی اور رومانی قوموں نے اس کو آماجگاہ بنایا۔ ان میں سے ہر ایک قوم اپنی مستقل تہذیب و تمدن رکھتی تھی اور اُن کے ہاں علوم و فنون کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ شام میں علوم و فنون بکثرت پھیلے۔ اہل ملک ان علمی سرگرمیوں میں برابر کے ساجھی تھے۔ بلکہ وہ اس میدان میں حکمرانوں کے مدمقابل تھے اور انھوں نے اس میں اپنے جوہر دکھائے۔ سرزمین شام میں صور انطاکیہ۔ صیدا، بیروت، حمص اور دمشق علمی و فلسفی تحریکات کے مرکز شمار ہوتے تھے۔ شام کو فنیقین سے حروف کتابت ترکہ میں ملے۔ بنی اسرائیل نے دینی تعلیمات دیں۔ یونان نے فلسفہ و حکمت کی طرح ڈالی اور رومانیوں نے اس زمین میں قانونیت کا بیج بویا۔ چنانچہ اہل شام کی عقلی تشکیل میں ان اثرات نے گہرا اثر ڈالا۔ علاوہ ازیں شام اور آس پاس کے ممالک میں سریانیوں کی علمی جدوجہد اور ان کی مساعی نشر و اشاعت کا بیان اس سے قبل ہو چکا ہے۔

اسلام سے قبل اہل عرب شام سے کافی واقف تھے اور اس زمین کی زرخیزی اور ثروت

---

(۱) شام میں فلسطین کا خطہ بھی شامل ہے۔ عرب جغرافئین مثلاً یاقوت وغیرہ اسی طرف گئے ہیں۔

کی کشش انھیں اپنے آغوش میں کھینچ بھی لائی تھی۔ چنانچہ دوسری صدی قبل از مسیح حمص اور بطرہ میں عربی ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ بعد ازیں پانچویں صدی عیسوی میں بنی غسان کا دور دورہ ہوا اور انھوں نے اس قطعۂ زمین میں اپنے قدم جمائے اور جب سرزمین شام میں نصرانیت کا پرچار ہوا تو وہ بھی دائرہ عیسائیت میں داخل ہوگئے اور مسیحی تہذیب و تمدن سے بھی کچھ بہرہ ور ہوئے۔ یہ لوگ آرامی و عربی زبانوں سے مخلوط زبان بولتے تھے اور اپنے آپ کو اہل شام میں سے تصور کرتے تھے اور جزیرہ عرب سے زیادہ شام اور اہل شام سے ان کو ارتباط و تعلق تھا۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی شام میں عربی زبان اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت شروع ہوگئی اور شامی عرب قریش کی زبان (قرآنی زبان) سیکھنے لگے نیز دیگر باشندوں نے بھی اپنی مروجہ زبانوں آرامی و یونانی کے علاوہ عربی بولنا اور اس کو سیکھنا شروع کیا۔ اسی طرح نصرانیت اور یہودیت کی جگہ اسلام نے لینی شروع کی اور اہل شام میں سے کثیر التعداد لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ دوسرے نو مفتوحہ ممالک کی طرح یہاں بھی تعلیمات اسلام کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے لیے حضرت عمرؓ نے مبلغ یا معلم بھیجے۔

امام بخاری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یزید بن ابوسفیان نے حضرت عمر کو لکھا کہ اہل شام کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو انھیں قرآن کی تعلیم دیں اور مسائل فقہ بتائیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے معاذ ابو الدردا اور عبادہ بن صامت کو ارسال فرمایا۔ فی الحقیقت یہ تینوں بزرگ مدرسہ شام کے اولین مؤسس ہیں۔ حضرت معاذ کی علمی سرگرمیاں تو آپ مدرسہ مکہ کے سلسلہ میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اُن کی آخری زندگی شام میں درس و تدریس کے شغلہ میں گذری۔ عبادہ بن صامت انصاری تھے اور قرآن جمع کرنے کی سعادت آپ کو بھی نصیب ہوتی تھی۔ ابو عبیدہ بن جراح افواج اسلامیہ کے سپہ سالار نے حمص کی ولایت پر آپ کو متعین کیا۔ اور اس کے ساتھ فلسطین کی کرسی قضا بھی آپ کے سپرد کی گئی۔ عبادہ بن صامت تعلیمات اسلام کی معرفت تامہ رکھنے والے صحابہ میں سے شمار ہوتے تھے۔ اور اس کے ساتھ حق کی حمایت میں بہت سخت تھے۔ آپ نے امیر معاویہ کے بہت سی

کاموں کو ناپسند فرمایا اور حضرت عثمان سے ان کی شکایت کی۔ آپ کا شام میں انتقال ہوا۔
ابوالدرداء انصاری تھے اور اہل علم صحابہ میں سے تھے۔ آپ کو دمشق کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اور اسی شہر میں آپ نے وفات پائی۔

مذکورہ بالا تینوں بزرگ شام کے مختلف شہروں میں تقسیم ہوئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں ان لوگوں نے حمص میں قیام کیا وہاں سے ابوالدرداء تو دمشق چلے گئے اور معاذ فلسطین۔ باقی رہے عبادہ صامت وہ حمص ہی میں رہے۔ بعد ازاں وہ بھی فلسطین پہنچ گئے۔ ان کے بعد حضرت عمر نے عبدالرحمٰن بن غنم کو بھیجا تابعین میں سے اکثر علماء انھیں بزرگوں کے شاگرد ہیں ان میں سے مشہور یہ ہیں۔ ابو ادریس خولانی۔ مکحول۔ عمر بن عبدالعزیز۔ رجاء ابن حیوۃ آخر میں اس مدرسہ سے امام عبدالرحمٰن اوزاعی نکلے۔ یہ امام مالک اور ابو حنیفہ کے معاصر تھے۔ آپ بعلبک میں پیدا ہوئے اور دمشق و بیروت میں پرورش پائی۔ آپ کو امام اہل شام کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہل شام نے ان کا مذہب اختیار کیا اور مراکش اور اندلس میں بھی اس مذہب کو فروغ حاصل ہوا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے مذاہب نے اس مذہب کو پنپنے نہ دیا اور وہ بسرعت راہی فنا ہوا۔

عہد امیہ میں دمشق خلافت کا دارالسلطنت تھا۔ قدرتی بات تھی کہ سلطنت کے طول و عرض سے علماء اس طرف کا رخ کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ نے علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ نہ کی۔ ان کی سرپرستی صرف شعر و سخن، خطابت اور فنون ادب تک محدود رہی۔ علمی تحریکات اپنے آپ بڑھتی چلی گئیں۔ ان میں سے سب سے اہم دینی علوم کی تحریک تھی۔ جس کی ترقی و فروغ کا سب سے بڑا سبب مذہبی حمیت و جوش تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو آئے دن حلال و حرام میں تمیز کرنے کی ضروریات پیش آتی رہتی تھیں اور ان نئے نئے حوادث و معاملات سے جن سے ابتدائے اسلام میں انھیں پالا نہ پڑا تھا دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ان کی بنا پر ان میں مذہبی جستجو اور علمی جدوجہد روز افزوں روبہ ترقی رہی۔

سرزمین شام میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے دین پر قائم رہے اور جزیہ اور مالگزاری کی ادائیگی بطیب خاطر منظور کرلی۔ ان میں سے کثیر التعداد شرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ ایک طرف تو یہ نو مسلم تھے اور دوسری طرف غیر مسلم عیسائی۔ اور یہ دونوں مسیحی تہذیب و تمدن کے تربیت یافتہ تھے۔ ایک طرف گرجے اور کلیسے تھے اور دوسری طرف مسجدیں آباد ہو رہی تھیں۔ اس دوعملی کا لازمی نتیجہ تھا کہ اسلام اور نصرانیت میں ذہنی تصادم ہونا۔ اور بحث و مباحثہ اور تکرار و مناظرہ کی بحثیں گرم ہوتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اس کی شہادت کے لئے مسیحی اہل قلم یحییٰ دمشقی کی تصنیفات مطالعہ فرمائے۔ اس باہمی تصادم اور متضاد خیالات کی آویزش سے قضا و قدر، جبر و اختیار کے مسائل چھیڑے گئے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کہ آیا وہ عین الذات ہیں یا اس کے خلاف، بحث و تمحیص ہونے لگی اور غالباً علم کلام کی بنیادی اینٹ یہیں رکھی گئی۔

مصر۔ مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو ملک کے طول و عرض میں یونانی رومی تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ اس سے قبل مدرسہ اسکندریہ کی علمی و فلسفی جدوجہد پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ جب مصر کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی تو اہل عرب اس کی زرخیزی اور ثروت کا ذکر سن کر جوق در جوق آنے لگے۔ چنانچہ فسطاط آباد ہوا۔ جس کی آبادی میں وہی قبائلی تقسیم مدنظر رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اہل عرب قصبوں اور دیہاتوں میں بھی پھیل گئے۔ اور وہاں اقامت گزیں ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ مصر کے اصلی باشندے یعنی قبطی بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور عربوں اور قبطیوں کے درمیان کثرت ازدواج سے دونوں قومیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئیں اور تفریق نسب مشکل ہو گئی۔

مسلمانوں کے ورود مصر کے فوراً بعد یہ ملک سیاسی مرکز کے علاوہ اسلامی سلطنت کا ایک اہم علمی مرکز بن گیا۔ لیکن ابتدائے عہد میں یہ علمی سرگرمیاں فلسفی اور دنیوی علوم سے بے تعلق رہیں اس علمی ادارہ کی بھی وہی حالت تھی جو اسلامی سلطنت کے دوسرے اداروں کی۔ سب سے اہم اور قابل توجہ چیز مذہب تھی۔ چنانچہ اس عہد میں مذہب اور مذہبی علوم کا ہر طرف چرچا ہونا لازمی امر

تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یونانی رومانی تہذیب وتمدن جو مصر، شام اور عراق میں پھیلا ہوا تھا۔ فتح اسلام سے بالکل مٹ گیا اور اُس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تہذیب اسلامی فتوحات کے سامنے ماند پڑ گئی اور مذہب کی پرجوش رو کے مقابلہ میں اس کی کچھ نہ چل سکی لیکن جوں ہی کہ ملک میں سکون ہوا۔ قدیم رومانی تہذیب نے پھر سر نکالا۔ اور نئی قوت وسرگرمی دکھانی شروع کی۔ یہ تہذیب تھی تو قدیم لیکن اسلامی اثر ونفوذ نے اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس کے علاوہ تہذیب مذکور کی اس حیات نو میں جو خیالات وافکار اسلام کے مخالف پڑتے تھے وہ اسلامی مصر میں جانبر نہ ہو سکے اور خود بخود مٹتے چلے گئے اور غیر مخالف آرار کی نشو ونما میں کوئی قوت حاجب نہ تھی لیکن فلسفی تحریک صحیح معنوں میں دولت امیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی عہد میں پروان چڑھی

صحابہ کرام میں سے جو مصر میں آئے اور یہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مدرسہ مصر کے مؤسس بنے عبداللہ بن عمرو بن عاص سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کو رسول اللہ صلعم کی بہت حدیثیں یاد تھیں۔ آپ اُن صحابہ میں سے شمار ہوتے ہیں جن کو آنحضرت کی سب سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ آپ کی عادت تھی کہ رسول اللہ صلعم سے جو کچھ سنتے قلمبند کرتے جاتے۔ مجاہدؒ کا بیان ہے۔ "میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کے پاس ایک صحیفہ دیکھا۔ میں نے اُس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ سچا صحیفہ ہے۔ اس میں صرف وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلعم سے خود سنیں اور اس میں میرے اور اُن کے درمیان کوئی واسطہ روایت نہیں" حدیث کے علاوہ عبداللہ بن عمرو کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ توراۃ پڑھتے تھے ابن سعد طبقات میں شریک سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ کو سریانی پڑھتے دیکھا۔ آپ سے مدینہ، شام اور مصر میں کثیر التعداد صحابہ اور تابعین نے حدیث روایت کیں جب امیر معاویہ نے ولایت مصر عمرو بن عاص کے حوالہ کی تو یہ بھی اپنے والد کی معیت میں مصر پہنچے۔ عمرو بن عاص نے مرتے وقت مصر میں ان کو اپنا جانشین بنایا۔ امیر معاویہ نے پہلے تو بحال رکھا بعد میں برطرف کر دیا۔

عبداللہ بن عمرو حج وعمرہ کے بعد شام آتے اور وہاں سے مصر۔ مصر میں انھوں نے رہنے

کے لئے مکان بنایا۔ آپ اسی میں رہتے اور یہیں وفات پائی۔ ایک روایت کے بموجب آپ کا انتقال عبدالملک بن مروان کے زمانہ خلافت میں ہوا۔ اور مکان ہی میں مدفون ہوئے۔ عبداللہ بن عمرو مدرسہ مصر کے حقیقی مؤسس تھے۔ مصر کے کثیر التعداد لوگوں نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ آپ کے شاگرد جو کچھ آپ سے سنتے قلمبند کرلیتے۔ مقریزی لکھتے ہیں "حیوۃ بن شریح سے مروی ہے کہ انھوں نے بیان کیا میں حسین بن شفی بن مانع الاصبحی کے ہاں پہنچا اور وہ کہہ رہے تھے کہ خدا تعالیٰ اس کا ایسا کرے۔ میں نے کہا آخر کیا ہے؟ کہنے لگے اُس نے دو کتابوں کا قصد کیا جو ان حدیثوں پر مشتمل تھیں جو شفی نے عبداللہ بن عمرو سے سنی تھیں۔ ایک میں رسول اللہ صلعم نے جو فیصلے کئے اور جو انھوں نے فرمایا تھا درج تھا۔ اور دوسری میں قیامت تک جو حوادث پیش آنے والے تھے ان کا ذکر تھا۔ اس نے دونوں کو لیا اور خولہ اور رباب کے درمیان دریا میں پھینک دیا۔

عہد صحابہ کے بعد مدرسہ مصر میں یزید بن حبیب کی شخصیت نے شہرت حاصل کی۔ آپ نوبہ کے باشندے تھے۔ اصل وطن دنقلہ تھا۔ یزید موصوف نے بہت سے صحابہ سے جو مصر میں اترے تھے علم حاصل کیا۔ کندی لکھتے ہیں کہ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرزمین مصر میں حلال اور حرام میں تمیز اور مسائل فقہ کی نشر واشاعت کی۔ اُن سے قبل صرف فتن وترغیبات پر گفتگو رہتی تھی۔ آپ اور دو اور بزرگوں کو عمر بن عبدالعزیز نے فتوے دینے کے لئے مقرر کیا۔ عربوں نے اس فعل کو ناپسند کیا۔ حضرت عمرؒ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ موالی تو بام ترقی پر چڑھتے ہیں اور تم اس سے قاصر ہو۔ یزید جنگ و قتال کی تاریخ سے بھی ماہر تھے۔ اور فتح مصر کے متعلق تاریخی معلومات اور اُس کے دیگر امور اور والیوں کی تفصیلی حالات میں آپ کو خاص طور پر درک تھا۔ کندی نے اور علما کے علاوہ آپ سے بھی اپنی کتاب (ولاۃ مصر وقضاتہا) کی تالیف میں مدد لی۔ یزید بن ابی حبیب کے شاگردوں میں

---

(۱) مقریزی ج۱ صفحہ ۳۳۳ ابوسعید بن یونس نے کہا کہ خولہ اور رباب دو بڑی کشتیاں تھیں جو فسطاط کے پل کے سرے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ اتنی بڑی تھیں کہ ان کے نیچے سے کشتیاں گذر جاتی تھیں۔

عبداللہ بن لہیعہ اور لیث بن سعد بہت مشہور ہوئے۔ اول الذکر عرب تھے اور حضر موت کے باشندے اس حضر موت مصر میں کثرت سے تھے۔ عبداللہ موصوف بہت سے تابعین سے ملے اور اُن سے علم حاصل کیا، آپ جو کچھ سنتے قلمبند کر لیتے۔ کثیر التعداد محدثین مثلاً بخاری اور نسائی وغیرہ آپ کو ثقہ نہیں مانتے۔ جائے افسوس ہے کہ مصری اسلامی تاریخ کی بیشتر معلومات انہیں کے ذریعہ پہنچیں اور ان تمام روایات کے یہی رکن رکین ہیں۔ تقریباً ۹ سال تک مصر کے منصب قضا پر بھی فائز رہے۔

صحیح ترین قول کے مطابق لیث بن سعد موالی میں سے تھے۔ یہ اصل میں اصفہان کے تھے۔ مرجح قول یہی ہے کہ آپ مصر (قلقشندہ) میں پیدا ہوئے، اور تحصیل علم کی غرض سے بہت سے شہروں کی سیاحت کی۔ آپ مکہ، بیت المقدس اور بغداد تشریف لے گئے اور تقریباً ۹۹ تابعین سے ملاقات کی اور اُن سے حدیثیں روایت کیں۔ امام مالک کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات تھے۔ اُن سے خط و کتابت تھی اور فقہ و تشریع کے متعلق خطوط میں اُن سے بحث آرائی ہوتی۔

روایت ہے کہ امام شافعی نے فرمایا کہ لیث فقہ میں مالک سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں لیکن لیث کے ساتھیوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ لیث کا اپنی قوم میں بڑا اعزاز اور قدر و منزلت تھی۔ اہم اور غیر معمولی معاملات میں والی اور قضاۃ ان سے مشورہ لیتے۔ آپ ثقہ سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی صداقت اور امانت میں کسی نے شک نہیں کیا۔ لیث بن سعد کا اپنا مستقل مذہب تھا جو اُن کے نام سے مشہور رہا۔ اہل مصر نے اُس کو اختیار کیا اور اُس کے نقش قدم پر چلے تو سہی لیکن آخر میں یہ مذہب بھی شام کے مذہب اوزاعی کی طرح زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ فتوحات کے بعد سلطنت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں صحابہ کرام پھیل گئے تھے۔ ان صحابہ کرام میں سے درس و تدریس کی غرض سے مختلف شہروں کو علماء کے طبقہ نے اپنا مرکز بنایا اور وہاں مدرسوں کی بنیاد رکھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک

اپنی مستقل علمی شخصیت رکھتا تھا۔ اُن کی اس انفرادی شخصیت کا مدرسہ پر اثر پڑنا لازمی امر تھا۔ ان علمی مراکز میں باثر و نفوذ کے اعتبار سے یہ شخصیتیں سب سے فوقیت لے گئی تھیں، مدینہ میں عبداللہ بن عمر، کوفہ میں عبداللہ بن مسعود، مکہ میں عبداللہ بن عباس اور مصر میں عبداللہ بن عمرو بن عاص۔

یہ سمجھنا چاہئے کہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے ہر ایک رسول اللہ صلعم کے تمام اقوال اور افعال کے علم پر حاوی تھا۔ اور تعلیمات اسلام کے متعلق ہر ایک کے پاس مکمل معلومات تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض وقت ایک صحابی رسول اللہ کے پاس ہوتا اور دوسرا نہ ہوتا اور وہ آپ کے ایک فعل کو دیکھتا اور آپ سے حدیث سنتا لیکن دوسرا اس سے محروم رہتا۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ معلومات تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ بعض شہروں تک چند حدیثیں پہنچیں اور چند نہ پہنچ سکیں۔ صحابہ کے بعد تابعین آئے انھوں نے اُن سے تحصیل علم کی اور علم کی نشر و اشاعت میں ان کے قائم مقام ہوئے۔ ان میں سے بعض نے محسوس کیا کہ چند شہروں میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔ اس لئے ذخیرۂ علم بڑھانے کی غرض سے ان لوگوں نے بکثرت سفر کئے۔ چنانچہ علما۔ میں تحصیل علم کے لئے سفر و سیاحت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصری مدینہ پہنچتا اور مدینہ کا طالب علم کوفہ۔ اسی طرح کوفہ کے شائقین علم شام کا رخ کرتے اور شامی مصر کا قصد کرتا۔ اس سفر و سیاحت اور علما۔ کے اختلاط و امتزاج نے تمام علمی مراکز کو متحد کرنے میں بڑا کام کیا۔ نیز اس کا یہ اثر پڑا کہ صحابہ کی مختلف علمی شخصیتوں کے پیدا کردہ اثرات کے اختلافات بہت حد تک کم ہو گئے۔ تابعین کے بعد اہل علم کا دوسرا طبقہ آیا اور وہ انھیں کے نقش قدم پر گامزن ہوا۔

اب یہ کہ ان مختلف علمی مراکز میں کیا پڑھایا جاتا تھا؟ اور علمی سرگرمیوں کا دار و مدار کن مباحث پر تھا؟ کیا مختلف شہروں کے ماحول نے علمی زندگی کو متاثر کیا؟ شام اور مصر میں یونانی و رومانی تہذیب و تمدن نے علمی تحریک پر کیا اثر ڈالا؟ عراق میں کہاں تک ایرانی تمدن کے اثرات

پڑے؛ حجازی علمی زندگی کے نشوو ارتقا میں عرب کی سادگی کا کیا اثر پڑا؟ اسلامی سلطنت کے مختلف حصوں میں فتح سے پہلے جو دینی افکار و آرا پھیلے ہوئے تھے کیا اسلام میں مختلف مذہبی فرقوں کا وجود انھیں کے اثر سے عمل میں آیا؟ ان دقیق مباحث کو سلجھانے کی انشاءاللہ آئندہ دو بابوں میں کوشش کی جائے گی۔

غزل

از جلیل قدوائی صاحب بی اے (علیگ)

آپ کو میری وفا یاد آئی
خیر ہے، آج یہ کیا یاد آئی

یاد اُس بت کی بھلائی نہ گئی
ہاں بھلانے سے سوا یاد آئی

پھر مرے سینہ میں اک ہوک اُٹھی
پھر مجھے تیری ادا یاد آئی

خوش ہوا تھا نگہ لطف سے دل
کہ تری طرز جفا یاد آئی

بے رخی پہ تری جب غور کیا
مجھ کو اپنی ہی خطا یاد آئی

ہاتھ میں ساغر آتے ہی
نگہ ہوش رُبا یاد آئی

جس سے اُس در پہ رسائی ہوتی
کوئی ایسی نہ دعا یاد آئی

کیوں کس سوچ میں بیٹھے ہو جلیل
کیا پھر اُس بت کی ادا یاد آئی

وضع حدیث

نومبر ۱۹۳۰ء کے جامعہ میں مولنا اسلم جیراجپوری کا ایک مقالہ عنوان بالا سے شائع ہوا ہے مضمون کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے

"اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح نہیں، اس طرح مخلوط ہو گئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں" جامعہ صفحہ ۳۳۴۔ نومبر ۱۹۳۰ء "

گویا "سچائی کے وہ قطرے" "اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں" اس طرح مدغم ہوئے کہ اس پردۂ عالم پر تحقیق طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے حدیث صحیح کے نام سے باور کیا جا سکے، جس کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ وہ قول رسول ہو، جس کے متعلق یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ لوث کذب و دروغ سے پاک ہو لیکن کیا واقعات بھی اس دعوے پر شاہد ہیں؟ کیا حقیقۃً یہ دعویٰ ایسا ہے کہ جس پر ایمان لایا جا سکتا ہے؟

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر، جذبات کے نام پر، قرآن و حدیث کے نام پر آپ کے احساسات سے اپیل کروں اور یہ چاہوں کہ آپ مذکورۂ بالا دعوے کی صداقت اس لئے تسلیم نہ کریں کہ اس سے حدیث پر زد آتی ہے۔ حدیثیں مشتبہ ہو جاتی ہیں اور اقوال رسول کی جو نعمت عظمٰی ہمارے پاس تھی وہ چھنی جاتی ہے، اگر وہ دعوے دلائل کی بنیاد پر استوار ہو سکے تو یقیناً ہمیں اس "دفتر بے معنی" کو "مے ناب" میں نہیں بلکہ اسی "جھوٹ اور کذب" کے سیلاب میں بلا تامل غرق کر دینا چاہئے۔ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو مقصود ہے کہ آیا وہ "جھوٹ اور کذب کا سیلاب" ہے یا حقائق و معارف کا بحر بیکراں؟

یہ حقیقت ہے کہ عہد رسالت میں احادیث کے ضبط و کتابت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی،

اس لئے کہ احتمال تھا کہ قرآن و حدیث آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں خود "حدیث ناطق" موجود تھی، یعنی سرکار رسالت کا وجود باجود، جب تک رسالت مآب رونق بخش کارگاہ حیات رہے اس وقت تک حدیثیں منضبط نہیں ہو سکیں اس لئے کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ جس وقت تک باقی رہی اس وقت تک استفسار و استصواب، سوال و جواب اور پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہا، نماز کے متعلق کچھ شبہ ہوا کہ "خیط ابیض" اور "خیط اسود" سے کیا مراد ہے، سرکار نے اس کی تشریح فرما دی، امامت کون کرے؟ کس کا حق ہے! کے وقت کی نماز فرض ہوتی ہے، سنتوں کی حیثیت کیا ہے۔ تیمم کس کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ یہ اور اس قبیل کے بیسیوں جزئی سوالات ہیں جن کا جواب قرآن مجید میں نہیں مل سکتا، لامحالہ ہمیں اس "عمل" کو ڈھونڈھنا پڑے گا جسے خود قرآن نے "اسوۂ حسنہ" کے نام سے یاد کیا ہے، اور اس "قول" کی جستجو کرنی پڑے گی جسے قرآن ہی نے "ان ھو الا وحی یوحیٰ" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ جب ہم میں کسی بات میں اختلاف ہو، راہ حق مفقود ہو رہی ہو تو لامحالہ "ردوا الی اللہ و رسولہ" پر عمل کرنا پڑے گا، اب عہد حاضر میں خدا براہ راست ہم پر وحی نازل نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے "تنازعہ" کا خاتمہ کرے، اگر قرآن میں وہ چیز ہمیں نہیں ملتی تو ہم سوا اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ رسول کی طرف رجوع کریں رسول بھی مری اور مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں تو چارۂ کار سوا اس کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ رسول کے اقوال، اس کے اعمال و افعال، اور اس کے بنائے ہوئے راستوں اس کے کئے ہوئے فیصلوں، اور اس کے فرمائے ہوئے ارشادات کو مشعل راہ بنائیں اور اسی کی روشنی میں تلاش و تجسس اور غور و تفحص سے وہ راہ حق ڈھونڈیں جس کے ہم متلاشی ہیں۔

کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"وضاعین و کذابین کی ایک بے شمار فوج پیدا ہو گئی، جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی، بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا صفحہ ۲۲۴"

اس صورت میں بھلا حدیث پر استناد کی کیا صورت ہو؟ اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس

مشکوک و مشتبہ صورت مسئلہ میں کس رخ پر پہلو پر عمل کیا جائے؟۔

جواب نہایت غیر مشتبہ ہے۔ آج ہم بے تامل کذابین وضاعین حدیث کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ پر جتنی حدیثیں وارد ہوتی ہیں وہ غلط ہیں، موضوع ہیں، باطل ہیں۔ لیکن ہمارے قول کی بنیاد کیا ہے، ان "وضاعین وکذابین" سے ہم تنہا ملاقی نہیں، ہم نے نہ انہیں جھوٹ بولتے سنا، نہ وضع حدیث کرتے دیکھا، ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے، نقادانِ فن نے، اور حدیث و اشخاص کے پرکھنے والوں نے متفقہ طور سے ان کے ضعف، کذب اور دروغ گوئی کا پردہ فاش کیا ہے، اس پر اعتماد کریں اور ان لوگوں کو کاذب، وضاع اور نہ معلوم کیا کیا سمجھیں پس معاصرین کے قول کی روشنی میں، مبصرین و نقادانِ اسماء الرجال کی رائے کے مطابق ہم ایک جماعت کو غیر ثقہ قرار دے سکتے ہیں، دروغ گو باور کر سکتے ہیں تو ایک دوسری جماعت کے متعلق اس کی توثیق قبول نہیں کر سکتے؟ اور پھر جب یہ حقیقت بھی ہم پر روشن ہے کہ ان ائمہ جرح و تعدیل نے بلا تذبذب بلا تامل، بلا پس و پیش جس جماعت کی توثیق کی اسے سچا جانا، تنقیدی نظر ڈالنے کے باوجود اسے کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ اس کی ساری زندگی ان کے سامنے گزری پر انھوں نے کبھی بھی اس جماعت کے کسی فرد کو کسی آلودگی میں ملوث نہیں پایا۔ نازک سے نازک موقع پر ان کا اعلان صداقت نرالے انداز قصر طاغوت ثابت ہوا۔ سخت سے سخت آزمائش پر ان کی زبان سے اگر نکلا تو کلمہ حق۔ جرح کرتے وقت انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ امام وقت ہے، علامہ دہر ہے۔ عوام کے نزدیک مقبول و محبوب ہے ان کا دوست ہے، رشتہ دار ہے، عزیز ہے۔ انھوں نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بڑی سے بڑی شخصیتوں پر جرح کی، تنقید کی، ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پبلک کے سامنے پیش کیا، اور بتلا دیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے پھر وہ کون سے اسباب و علل ہیں جو مانع ہوتے ہیں کہ ہم اس توثیق کے بعد انھیں ثقہ نہ مانیں راست گو نہ مانیں، صداقت شعار نہ مانیں، ہم اگر نہ بھی ماننا چاہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ ہم ان کی رائے پر اعتماد کریں اور ان کے فرمودہ حق کو بالکل "حق" مانیں۔ یہ ضرور ہے کہ جب آثار و اخبار کی کثرت ہوئی، اور مکہ شریف و مدینہ منورہ سے باہر قال اللہ و قال

الرسول کا غلغلہ بلند ہوا تو ان میں خرقہ پوشان مکر و سالوس بھی تھے، جو بظاہر مسلمان تھے لیکن جن کے قلوب کفر و شرک کی تاریکی سے ظلمت شب تاب کا منظر پیش کر رہے تھے، انھوں نے اپنے اغراض نامسعود کے لئے اپنے مصالح سیاسی کے لئے اور اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے دنیا میں غلط احادیث کی نشر و اشاعت کرنا چاہی، یہودیت اور علیویت، اسرائیلیات، حدیث کے نام سے پیش کرنا چاہے، لیکن وہ اپنے مقصد میں بالکل کامیاب نہیں ہو سکے۔ فوراً ہی ائمہ جرح و تعدیل کی ایک جماعت پیدا ہوئی۔ اسماء الرجال سے بحث کرنے والا ایک گروہ ہوا اور اس نے ان لوگوں کے عزائم باطلہ کو تار تار کر کے رکھ دیا، اس نے ان کی پردہ دری کی، ان کے سوانح حیات قلمبند کئے، ان کے صدق و کذب کا امتحان کیا، ان کی دیانت و ثقاہت کو جانچا، ان کی صداقت اور راست گوئی کی پڑتال کی اور بالآخر انھیں بے نقاب کر کے چھوڑا، ان کے لئے ایک مستقل تاریخ بنائی جس میں ان کے پوست کندہ حالات ملتے ہیں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

قال سفیان الثوری لما استعمل الرواۃ الکذب استعملنا لهم التاریخ وقال حسان بن زید لم نستعن علی الکذابین بمثل التاریخ اقوال للشیخ کم سنہ وفی لے تاریخ ولدہ فان اقر بمولدہ عرفنا صدقہ من کذبہ وقال الحسن بن الربیع قدمت بغداد فلما خرجت شیعنی اصحاب الحدیث فلما برزت الی الخارج قالوا توقف فان احمد بن حنبل یجئی فقعدت واخرجت الواحی فلما جاء

قال لی فی ای سنۃ مات عبداللہ بن المبارک فقلت سنۃ احدی وثمانین فقیل له ما ترید بهذا؟ فقال ارید الکذابین (۱)

سفیان ثوری کہتے ہیں کہ جب راویوں نے کذب کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کیا۔ اور حسان زید کہتے ہیں کہ کذابین کے لئے تاریخ سے بڑھ کر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ ولادت پوچھتا ہوں، اگر وہ صحیح صحیح کہہ دیتا ہے تو ہم اس کا صدق اس کے کذب سے پہچان لیتے ہیں۔ اور حسن بن الربیع کہتے ہیں کہ ایک بار میں بغداد گیا جب میں چلنے لگا تو اصحاب حدیث نے میری مشایعت کی جب میں باہر پہنچا تو انھوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے۔ احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔

جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس

(۱) ابن عساکر صفحہ ۲۶

سنہ میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا سنہ میں۔ پھر ان سے
دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ فرمایا
میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں۔

علامہ ابن حجر جو اساطین علم حدیث میں ہیں، فرماتے ہیں کہ

قد افرد اسماء المدلسين بالتصنيف من القدماء الحسين بن علي الكرابيسي صاحب الامام الأعظم الشافعي، ثم النسائي، ثم الدارقطني، ثم نظم شيخ شيوخنا الحافظ شمس الدين الذهبي في ذلك ارجوزة وتبعه بعض تلامذته وهو الحافظ ابو محمد احمد بن ابراهيم المقدسي فزاد عليه من تصنيف العلائي شيئا كثيرا فاتت الذهبي ذكره ثم ذيل شيخنا حافظ العصر ابو الفضل بن الحسين في حواشي كتاب العلائي اسماء وقعت له زائدة ثم فيها ولد العلامة قاضي القضاة ولي الدين ابو زرعة الحافظ ابن الحافظ الى من ذكره العلائي واخرج المدلسين بالتصنيف من المتاخرين المحدث الكبير المتقن برهان الدين الحلبي سبط ابن العجمي غير متقيد بكتاب العلائي فزاد عليهم قليلا فجميع ما في كتاب العلائي من الاسماء ثمانية وستون نفسا وزاد عليهم ابن العراقي ثلاثة عشر نفسا وزاد عليه الحلبي اثنين وثلاثين نفسا وزدت عليها ستة وثلاثين نفسا فجملة ما في

قدما کی تصانیف میں مدلسین کی جو تفرید کی گئی ہے ان میں حسین بن علی الکرابیسی صاحب امام شافعی ہیں پھر نسائی پھر دارقطنی۔ پھر ہمارے استاد الاساتذہ علامہ ذہبی نے کچھ اضافہ کیا ہے، پھر ان کے بعض تلامذہ نے اس باب میں ان کی پیروی کی، ان میں حافظ ابو محمد احمد بن ابراہیم مقدسی ہیں، علائی نے اپنی تصنیف میں وہ تمام چیزیں ایزاد کیں جو علامہ ذہبی سے رہ گئی تھیں پھر ہمارے استاد ابو الفضل بن حسین کا ذیل ہے، علائی کی کتاب کے حاشیہ میں زیادہ اسماء کا تذکرہ ہے۔ پھر ان کے فرزند ارجمند علامہ قاضی القضاۃ ولی الدین ابو زرعہ نے ان چیزوں کو شامل کیا ہے جو علائی نے ذکر کی ہیں۔

متاخرین میں جن لوگوں نے مدلسین کی تخریج کی ہے ان میں جلیل القدر محدث برہان الدین الحلبی ہیں جنہوں نے علائی کی پابندی نہیں کی، علائی کی کتاب میں کل اسماء جن کی تخریج ہوتی ہے ۶۸ ہیں ابن عراقی نے اس پر ۱۳ ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔ حلبی نے ۳۲ نام اور ایزاد کئے ہیں اور میں نے ان پر ۳۹ نام اور بڑھائے ہیں۔ پس میری کتاب میں کل ۱۵۲ نفوس

کتابی ہذا مانہ واشتان ونحسون نفسا:"(۱) | کا تذکرہ ہے۔

یہ اتنی تحقیق آپ کو معلوم ہو کس چیز پر کی گئی ہے یہ وہ وضاعین وکذابین نہیں جو اس "جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں "شناوری کر رہے ہوں، وہ بھی نہیں ہیں جن کا پیشہ حدیث کا گھڑنا ہو۔ وہ بھی نہیں ہیں جو اسرائیلیات کی اشاعت کر رہے ہوں، وہ بھی نہیں ہیں جن کا وظیفہ حیات کذب و دروغ کی نشر و ترقی ہو، بلکہ یہ لوگ مدلسین ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو حدیث بیان کرتے ہیں بسلسلہ رواۃ بیان کرتے ہیں، لیکن اپنے شیخ کا معروف نام نہیں ظاہر کرتے۔ بلکہ غیر معروف نام سے انتساب کرتے، یہ ایک قسم کی تدلیس ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اسماء الرجال کے مبصرین کی نگاہ دوررس سے بچ جاتے ان پر بھی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان پر اضافہ کیا گیا، ذیل لکھے گئے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان لوگوں کو منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا گیا۔ آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ جب مدلسین کے ساتھ اتنا شغف کیا گیا تو "وضاعین وکذابین" کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا، ان پر بھی دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے، کتابیں لکھی گئیں، تاریخیں ضبط تحریر میں آئیں اور بالآخر انھیں بے نقاب کر دیا گیا، علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال اور علامہ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب اس پر شاہد عادل ہیں۔ امام بخاری، امام نسائی وغیرہ نے مستقل تصنیفیں لکھیں جن میں، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفا والمتروکین للبخاری اور کتاب الضعفا والمتروکین للنسائی زیادہ قابل ذکر ہیں۔

ان کتابوں میں اور اسماء الرجال کی دوسری کتابوں میں رواۃ پر مفصل بحث ملے گی، ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے بخوف طوالت ان کتابوں سے میں کوئی تفصیلی اقتباس نہیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو کسی آئندہ موقع پر تفصیل سے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان دفاتر میں کیا کیا ہے اور ہم حدیث کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، نیز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ رواۃ حدیث نے

---

(۱) کتاب طبقات المدلسین لابن حجر

جمع حدیث میں کس قدر دقتیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں؟ طاہر جزائری پر مولنا اسلم نے کافی اعتماد فرمایا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

قد کان الصحابۃ رضی اللہ عنہم عنایۃ شدیدۃ فی معرفۃ الحدیث و فی نقلہ لمن لم یبلغہ فقد ذکر البخاری فی صحیحہ فی کتاب العلم ان جابر بن عبد اللہ رحل مسیرۃ شہر الی عبد اللہ بن انیس فی حدیث واحد (۱)

صحابہ رضی اللہ عنہم معرفت حدیث میں بہت توجہ فرماتے تھے اسی طرح نقل و ضبط میں بھی خصوصاً اس حدیث کے بارے میں جو کسی کو اب تک نہ پہنچی ہو، چنانچہ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب العلم میں ذکر کیا ہے جابر بن عبد اللہ عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک مہینہ کی مسافت طے کر کے صرف ایک حدیث کے لئے گئے۔

ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین حدیث کے بارے میں بہت سخت تھے وہ خود بھی روایت بہت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کم کرنے دیتے تھے، اور حضرت ابو ہریرہ پر بھی یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کثیر الروایۃ تھے، چنانچہ حضرت عمر نے انھیں کثرت روایت سے روکا بھی ہے، اس کی صفائی خود حضرت ابو ہریرہ نے بایں الفاظ دی ہے کہ

ان الناس یقولون اکثر ابو ہریرۃ ولو لا آیتان فی کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم تیلو (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والہدی والی قولہ الرحیم) ان اخواننا من المہاجرین کان یشغلہم الصفق فی الاسواق وان اخواننا من الانصار کان یشغلہم العمل فی اموالہم وان ابا ہریرۃ کان یلزم رسول اللہ بشبع بطنہ ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ

لوگ کہتے ہیں ابو ہریرہ کثیر الروایت ہے اگر دو آیتیں میرے پیش نظر نہ ہوتیں تو میں کبھی حدیث بیان نہ کرتا (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والہدی، الی قولہ الرحیم) ہمارے مہاجرین بھائی تجارت میں مشغول رہتے تھے، ہمارے انصار بھائی اپنے مال کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے لیکن ابو ہریرہ رسول اللہ کا دامن پکڑے ہوئے تھا کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس وقت بھی حاضر رہتا تھا جس وقت

---

(۱) توجیہ النظر صفحہ ۱۰

مالا یحفظون(۱) | لوگ غیر حاضر ہوتے تھے، وہ اسے بھی یاد رکھتا تھا جسے لوگ نہیں یاد رکھتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ نے اپنی صفائی میں خود یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، اس جگہ یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ بعض صحابہ جو قلت روایت کے حامی تھے وہ ڈرتے تھے کہ

اذا الاکثار مظنة للخطاء، والخطاء فی الحدیث عظیم الخطر(۲) | کہیں کثرت روایت سے غلطی نہ سرزد ہو اور حدیث میں غلطی ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

برعکس اس کے حضرت ابو ہریرہ قرآن شریف کی اس وعید سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے وہ میں بیان کر دوں تاکہ میں ان لوگوں میں نہ شمار کیا جاؤں جو حق و ہدایت کو چھپاتے ہیں، لہٰذا چونکہ ان کا حافظہ ان کی اعانت کرتا تھا وہ حدیثیں بیان فرماتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتے تھے، لہٰذا یہ بات بالکل "ظاہر و باہر" ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کا مسلک میں اختلاف، اختلاف فی الاجتہاد کی حیثیت رکھتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اختلاف مسلک امت کے لئے باعث رحمت ثابت ہوا، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ اگر اس میں اتنا تشدد آغاز کار ہی میں نہ کرتے تو یقیناً تلبیس و تدلیس کا دروازہ کھل جاتا، لیکن ابتدا ہی میں ان کی اس احتیاط پسندی نے غور و تامل کے دروازے کھول دئے اور اب جو قدم اٹھاتا تھا وہ سوچ سمجھ کر،

مولنا اسلم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

"حضرت ابو بکر نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانسو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہ سے لے کر آگ میں جلا دیا کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو صفحہ۲۴"

(۱) توجیہ النظر صفحہ ۱۱ (۲) توجیہ النظر

خط کشیدہ الفاظ اس پر دال ہیں کہ حضرت ابو بکر کا زیادہ سے زیادہ جذبۂ احتیاط پسندی تھا۔ ورنہ حدیث کو قبول کرنے میں اگر اس کی صداقت ثابت ہو گئی ہو انھوں نے کبھی انکار نہیں فرمایا بلکہ اسے تسلیم کیا، اور نافذ کیا، چنانچہ اسی تذکرۃ الحفاظ میں جس سے مولٰنا نے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے غالباً اسی صفحہ پر اور اس نقل شدہ واقعہ کے ذکر سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی مذکور ہے جو بہر حال ہمارے لئے قابل غور ہے کہ

وکان اول من احتاط فی قبول الاخبار فروی ابن شہاب عن قبیصۃ بن ذویب ان الجدۃ جاءت الی ابی بکر تلتمس ان تورث فقال ما اجد لک فی کتاب اللہ شیئاً وما علمت ان رسول اللہ ذکر لک شیئاً ثم سال الناس فقام المغیرۃ فقال سمعت رسول اللہ یعطیہا السدس، فقال لہ ہل معک احد؟ فشہد محمد بن مسلمۃ بمثل ذلک فانفذہ لہا ابو بکر رضی اللہ عنہ[1]

وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے حدیث کے قبول کرنے میں سب سے پہلے احتیاط برتی، ابن شہاب قبیصہ بن ذویب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت آئی جو "جدہ" کا حق طلب کرتی تھی، حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ قرآن مجید میں تو میں تیرے لئے کچھ نہیں پاتا، اور نہ جانتا ہوں کہ رسول اللہ نے اس بارے میں کچھ فرمایا ہے، پھر آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے وہ سدس عطا فرماتے تھے حضرت ابو بکر نے پوچھا کوئی شاہد؟ محمد بن مسلمۃ نے شہادت دی تو آپ نے اسے نافذ فرمادیا۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر اگرچہ محتاط تھے لیکن بایں ہمہ اگر کوئی بھی حدیث انھیں مل گئی ہے تو انھوں نے اسے قبول کرلیا ہے جب انھوں نے قبول کرلیا تو امت کیوں نہ قبول کرے گی؟ رہا صحت کا معیار سو ارباب نظر نے ایسے ایسے اصول وضع کر دیئے کہ اب احادیث کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہئے۔ اس جگہ ایک "سخن گسترانہ" بات اور عرض کردوں کہ مولٰنا نے حضرت ابو بکر کا جو واقعہ نقل فرمایا ہے کہ انھوں نے احادیث کا ایک مجموعہ جلا دیا اس کو خود صاحب

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی ذکر ابی بکر۔

تذکرۃ الحفاظ نے مراسیل میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایۂ استناد جتنا بلند ہے مولنا مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔

حضرت عمر کا تشدد اس بارہ میں بہت زیادہ واضح ہے ایکبار کثرت روایت پر وہ حضرت ابوہریرہ کو پیٹنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اگر ان کے معیار کے مطابق انھیں کوئی صحیح حدیث مل گئی ہے تو انھوں نے بھی اسے تسلیم فرمالیا ہے امام ذہبی حضرت عمر کے بارے فرماتے ہیں کہ

وھو الذی سن للمحدثین التثبت فی النقل وربما کان یتوقف فی خبر الواحد اذا ارتاب فروی الجریری عن ابی نضرۃ عن ابی سعید ان ابا موسیٰ سلم علی عمر من وراء الباب ثلاث مرات فلم یؤذن لہ فرجع فارسل عمر فی اثرہ فقال لم رجعت قال سمعت رسول اللہ ﷺ اذا سلم احدکم ثلاثا فلم یجب فلیرجع قال لتاتینی علی ذلک ببینۃ او لافعلن بک فجاءنا ابو موسیٰ منتقعا لونہ ونحن جلوس فقلنا ما شانک فاخبرنا فقال ہل سمع احد منکم؟ فقلنا نعم کلنا سمعہ فارسلوا معہ رجلا منہم حتی اتی عمر فاخبرہ (۱)

حضرت عمر وہ بزرگ ہیں جنھوں نے محدثین کے لئے تثبت فی النقل لازم کر دیا، اگر آپ کو شک ہوتا تو خبر واحد میں کبھی کبھی آپ تامل فرماتے، جریری ابونضرہ سے اور وہ ابو سعید سے روایت کرتے ہیں کہ ابوموسیٰ نے دروازے کے پیچھے سے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو وہ واپس آگئے۔ حضرت عمر نے انھیں بلوایا اور کہا کہ تم واپس کیوں گئے انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ تم میں سے جب کوئی تین بار سلام کرے اور جواب نہ ملے تو اسے واپس ہوجانا چاہئے، حضرت عمر نے کہا کہ تمھیں اس قول پر دلیل لانا پڑے گی ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا، تو ابوموسیٰ ہمارے پاس آئے چہرہ کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے پوچھا کیا حال ہے؟ انھوں نے اپنے واقعہ سے مطلع کیا۔ اور دریافت کیا کہ تم میں سے کسی نے اسے سنا ہے؟ ہم نے کہا ہاں ہم میں سے ہر شخص نے سنا ہے، تو ان کے ساتھ ایک آدمی کر دیا اس نے حضرت عمر کو اس کی خبر دی۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمرؓ،

علامہ ذہبی اس واقعہ پر ذیل کی رائے ظاہر فرماتے ہیں جو بڑی حد تک قابل قبول ہے کہ

احب عمر ان يتأكد عن حديث ابى موسى بقول صاحب آخر ففي هذا دليل على ان الخبر اذا رواه ثقتان كان اقوى وارجح مما انفرد به واحد، وفي ذلك حض على تكثير طرق الحديث لكي يرتقي عن درجة الظن الى درجة العلم اذ الواحد يجوز عليه النسيان، والوهم ولا يكاد يجوز ذلك على ثقتين لم يخالفهما احد وقد كان عمر من وجله ان يخطئ الصاحب على رسول الله يأمرهم ان يقلوا الرواية عن نبيهم ولكلا يتشاغل الناس بالاحاديث عن حفظ (۱)

حضرت یہ چاہتے تھے کہ ابو موسیٰ کی حدیث کسی دوسرے آدمی سے اور زیادہ موکد ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی حدیث کو جب دو ثقہ آدمی روایت کریں تو وہ بہ نسبتاً اقوی اور ارجح ہوجایا کرتی ہے بہ نسبت اس کے کہ منفرد اکیلے شخص سے روایت کی گئی ہو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر طرق حدیث کی کثرت کی طرف لوگوں کو مائل کرنا چاہتے تھے تاکہ حدیث درجہ ظن سے درجہ علم تک پہنچ جائے کیونکہ ایک آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس پر نسیان و وہم کا غلبہ ہو اور جب دو ثقہ آدمی روایت کریں تو یہ اندیشہ کم ہوجاتا ہے حضرت عمر اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ بیان حدیث میں کوئی خطا سرزد ہو جائے، انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ روایۃ کم کی جائے تاکہ لوگ حفظ حدیث سے غافل نہ ہوجائیں۔

علامہ ذہبی نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے۔ وہ بہت صحیح ہے، اور یہی وہ جذبہ احتیاط پسندی تھا کہ جس سے حضرت عمر قلت روایت اور کثرت طرق کو پسند فرماتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو بلا تامل وہ حدیث کو تسلیم کر لیتے تھے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے کہ

روى هشام عن ابيه المغيرة بن شعبة ان عمر استشارهم في املاص المرأة يعني السقط فقال له المغيرة قضى فيه رسول الله بغرة فقال له عمر ان كنت صادقا فأت احدا يعلم ذلك قال فشهد

ہشام اپنے والد مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے سقط . . . . . کے بارے میں مشورہ کیا تو مغیرہ نے کہا کہ رسول اللہ نے ایک لونڈی کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے تو حضرت عمر نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دوسرا آدمی

(۱) تذکرۃ الحفاظ۔

محمد بن مسلمہ ان رسول اللہ ﷺ قضیٰ بہ (۱)

لاؤ جو اس سے واقف ہو، محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فیصلہ کیا تھا۔

آگے چل کر دوسرا واقعہ جو پیش کیا جاتا ہے اس میں حضرت عمرؓ نے اپنا مسلک اور واضح کر دیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے مسجد کی توسیع کے لئے حضرت عباسؓ سے ان کی زمین چاہی تو انھوں نے انکار کیا اور حدیث بیان کی کہ تم زیادتی نہیں کر سکتے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس پر دلیل لاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا، پس انھوں نے ایک جماعت انصار سے اس کا تذکرہ کیا۔ انصار نے حضرت عمرؓ سے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

انی لم اتہمک ولکنی احببت ان اتثبت (۲)

میں تمھیں غیر معتبر نہیں سمجھتا لیکن یہ چاہتا تھا کہ حدیث ثابت ہو جائے۔

اسی طرح حضرت علیؓ بھی پورے اطمینان کے بعد حدیث قبول فرماتے تھے یہاں تک کہ وہ تو

انہ یستحلف من یحدثہ بالحدیث (۳)

جو شخص حدیث بیان کرتا تھا اس سے قسم لیتے تھے۔

طاہر جزائری نے حضرت ابوبکرؓ کے اس واقعہ پر جب آپ نے سدس دلایا تھا، بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ

الا تراہ لما نزل بہ امر الجدۃ ولم یجدہ فی الکتاب کیف سال عنہ فی السنن فلما اخبرہ الثقۃ لم یکتف حتی استظہر بثقۃ آخر ولم یقل حسبنا کتاب اللہ کما تقولہ الخوارج (۴)

کیا تم اسے نہیں دیکھتے کہ اس عورت والے واقعہ میں جب حضرت ابوبکرؓ نے قرآن میں اس کے متعلق کچھ نہیں پایا تو اس بارے میں سنن وحدیث کی طرف توجہ کی، اور جب ثقہ نے حدیث بیان کی تو آپ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اسے موکد کر لیا اور یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے تو "کتاب اللہ" کافی ہے۔ جیسا کہ خوارج کہا کرتے تھے۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۲) تذکرۃ الحفاظ (۳) تذکرۃ الحفاظ (۴) توجیہ النظر صفحہ ۱۲)

اور حضرت ابوبکر یہ فرما کیسے سکتے تھے جب کہ اُن کے سامنے یہ بھی تھا کہ

فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون (قرآن مجید) | اگر تم کوئی چیز نہ جانتے ہو تو "اہل ذکر سے دریافت کرو۔

اور اہل ذکر ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا جنھوں نے ایک ایک حدیث کے لئے دور دراز کی مسافتیں طے کیں، طرح طرح کے مصائب برداشت کئے، آفات وحوادث کا مقابلہ کیا، فاقے کئے ہستے باندھے راستے کی الٹینوں میں پڑھا، مسجد کے چراغ میں پڑھا۔ غرض اس راہ میں جو مصیبت آئی اسے انگیز کیا۔ صرف اس لئے کہ اقوال رسول مدون ہو جائیں، ارشادات رسول منضبط ہو جائیں اور سرکار رسالت کا کوئی فعل اور کوئی قول پردہ خفا میں نہ رہے۔

اور مولٰنا نے جو فرمایا ہے کہ

"صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالو، جامعہ صفحہ ۳۲۶

تو جس کتاب سے مولٰنا نے یہ حدیث لی ہے اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ

عن ابن جریج عن عطاء عن عبد اللہ بن عمرو قال قلت یا رسول اللہ اقید العلم؟ قال نعم قال وما تقییدہ قال کتابۃ	ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا علم قید کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا، ہاں، میں نے پوچھا اس کی تقیید کیا ہے فرمایا، کتابت

و — اور

عن حماد بن سلمۃ عن محمد بن اسحٰق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال قلت یا رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک؟ قال نعم قلت فی الرضا والغضب قال نعم فانی لا اقول فی ذلک کلہ الا الحق	حماد بن سلمہ محمد بن اسحاق سے وہ عمرو بن شعیب سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے والد سے دریافت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ میں وہ سب کچھ لکھ لیا کروں جو آپ سے سنوں؟ فرمایا، ہاں، انھوں نے کہا کہ آپ خوشی سے فرماتے ہیں یا غصہ سے؟ فرمایا سوا سچ کے میں اور کچھ نہیں کہتا۔

اور سب سے بڑھ کر بخاری کی یہ حدیث کہ

عن ابی ہریرۃ انہ قال ما من احد من اصحاب النبیؐ اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمر فانہ کان یکتب ولا اکتب۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں باعتبار علم حدیث کے کوئی مجھ سے زیادہ نہیں ہے سوا ابن عمر کے اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے، جو کچھ سنتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

اگر یہ حدیث کتابت حدیث کی مخالفت میں ہو تو ایک سے زائد اس کی تائید میں ہیں۔ یہ تناقض اور تباین کیونکر رفع ہوں؟ اور ان میں سے کسے صحیح سمجھا جائے اور کسے ناقابل عمل؟ اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں اپنی طرف سے کچھ دوں مناسب ہوگا کہ اسی کتاب سے دوں جس کی بعض باتوں سے "وضع حدیث" کے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ کہ

قال ابو محمد ونحن نقول ان فی ہذا معنیین احدہما ان یکون من منسوخ السنۃ بالسنۃ کانہ نہی فی اول الامر ان یکتب قولہ ثم رأی بعد لما علم ان السنن تکثر وتفوت الحفظ ان تکتب وتقید والمعنی الآخر ان یکون خص بہذا عبد اللہ بن عمرو لانہ کان قارئا الکتب المتقدمۃ ویکتب بالسریانیۃ والعربیۃ وکان غیرہ من الصحابۃ امیین لا یکتب منہم الا الواحد والاثنان واذا کتب لم یتقن ولم یصب التہجی فلما خشی علیہم الغلط فیما یکتبون نہاہم ولما امن علی عبد اللہ بن عمرو ذلک اذن لہ[1]

ابو محمد کا اور خود ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اس باب میں جمع قول کی اور رفع تناقض وتخالف کی دو صورتیں ہیں پہلی تو یہ کہ سنت سنت سے منسوخ ہو گو یا یوں ہوا کہ پہلی بار رسول اللہؐ نے اس سے منع فرمایا کہ آپ کے اقوال ضبط تحریر میں آئیں، اس کے بعد جب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سنن کی کثرت ہو رہی ہے، ممکن ہے یہ چیزیں حافظہ سے نکل جائیں لہذا انھیں لکھ لیا جائے اور نقل کر لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ حکم عبد اللہ بن عمرو کے لئے مخصوص ہوا اس لئے کہ وہ کتب قدیمہ کے عالم تھے، سریانی اور عربی لکھنا جانتے تھے، انکے علاوہ جو صحابہ تھے وہ باستثنا چند امی محض تھے اس لئے ان کی کتابت میں یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے کچھ غلطی ہو جائے، لہذا کتابت سے منع فرمایا، لیکن جب ان پر یقین ہو گیا کہ اب ایسا نہیں ہوگا تو اجازت دے دی۔

---

(۱) توجیہ النظر

اب آپ کے سامنے دونوں حدیثیں اور دونوں صورتیں آگئیں کہ اگر سرکار رسالت نے منع بھی فرمایا تو بہ مصالح اور جب وہ مصالح رفع ہوگئے تو خود ہی کتابت کی اجازت دے دی، اب اس میں نہ کوئی تناقص ہے نہ تباین نہ تخالف، اور اس کی مزید توثیق حضرت ابوہریرہ کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے عبداللہ بن عمر کو اپنے سے زیادہ عالم بالحدیث اس بنا پر تسلیم کیا ہے کہ وہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے اور یہ نہیں لکھتے تھے، اور ظاہر ہے یہ فعل کتابت رسول اللہ کی زندگی ہی میں ہوتا تھا۔

لہٰذا جب احادیث و سنن کی کثرت ہوئی اور یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ اذہان و حافظہ میں محفوظ رہ سکیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (جن کا زہد و ورع، حلم و دیانت، راستبازی اور حق پسندی، انصاف و معدلت، خشیۃ فی اللہ اور استقامت علی الحق کا ہر فرد و بشر معترف ہے، اور انھیں اسباب کی بنا پر دنیا انھیں ثانی "عمر بن الخطاب" کے نام سے یاد کرتی ہے) کتابت حدیث کا حکم دیا، اس کی جمع و تدوین کی کوشش، اس کے ضبط و اشاعت کے احکام صادر فرمائے، خدا ان پر اپنی بے شمار رحمت نازل فرمائے کہ ان کی ایک بدعت حسنہ نے امت اسلامیہ کو ایسا خیر کثیر دیا کہ جب تک اس صفحہ ارض پر مسلمانوں کا وجود ہے اس وقت تک مسلمان ان کی اس مساعی حسنہ کا مشکور رہو گا

کتابت حدیث کی تائید میں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں اس پر کچھ گذارش کروں ایک بات پیش نظر رہنی ضروری، مولٰنا نے فرمایا ہے کہ

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئًا فلیمحہ (حدیث)	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے۔

لیکن پوری حدیث یوں ہے، جسے مسلم نے تخریج کیا ہے کہ

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئًا غیرہ فلیمحہ وحدثوا عنی فلا حرج	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے، ہاں مجھ سے حدیث بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور اس کے معاً بعد ارشاد ہوا کہ۔

ومن کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار	جس نے جان بوجھ کر میرے متعلق غلط بیانی کی اسے چاہئے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے۔

اور اس کے بعد طاہر جزائری فرماتے ہیں، کہ

قال کثیر من العلماء نہاہم عن کتابۃ الحدیث خشیۃ اختلاطہ بالقرآن، وہذا لاینافی جواز کتابتہ اذا امن اللبس وبذلک یحصل الجمع بین ہذا وبین قولہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فی مرضہ الذی توفی فیہ ائتونی بکتاب اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بعدہ۔[1]	بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ کتابت حدیث سے اس لئے منع فرمایا کہ قرآن مجید اور حدیث میں اختلاط نہ ہو جائے اور یہ ممانعت جواز کتابت کے منافی نہیں ہے جبکہ لبس و اختلاط کا اندیشہ نہ رہے اور اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوئی ہے کہ اپنے مرض الموت میں خود رسول اللہ نے کاغذ منگایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھ دوں کہ تم اسکے بعد گمراہ نہ ہوسکو۔

طاہر جزائری کی ان تصریحات کے بعد یہ معاملہ اور زیادہ مستحکم ہوگیا ہے اور حالات و واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ لبس فی القرآن کے خوف سے منع فرمایا گیا اور جب یہ اندیشہ رفع ہوگیا تو ظاہر ہے پھر کسی قدغن کی ضرورت نہ تھی۔

ایک جگہ مولٰنا نے فرمایا ہے کہ

> "جملہ اصولیین اور محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے۔ انھوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، منکر، موضوع اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے، ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں، صحیح یا غلط، (جامعہ صفحہ ۲۴۶)

میں مولٰنا کے اس قول سے بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں، محدثین نے احادیث پر

---

(۱) توجیہ النظر۔

جو احکام لگائے ہیں مثلاً ضعیف، موضوع، منکر، مردود، صحیح، حسن، مقبول وغیرہ "ان سے خود" یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ "وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے"۔ بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مثلاً محدثین حدیث متواتر کو قطعی اور یقینی مانتے ہیں تو ایک حدیث ہی جو اپنے شرائط کے اعتبار سے متواتر ہے لیکن چند "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیثیں بھی ہیں جو اس حدیث متواتر کی تائید کرتی ہیں، تو ہم ان کو باصطلاح محدثین متابعات میں داخل کریں گے یعنی کسی "موضوع، منکر و ضعیف" حدیث سے ہم استناد نہیں کریں گے لیکن اگر وہ کسی "صحیح، مشہور اور متواتر" حدیث کی تائید کرتی ہوں تو ان سچی حدیثوں کی وجہ سے ان مشتبہ حدیثوں کی صحت بھی پایہ یقین تک پہنچ جائے گی چنانچہ بخاری میں جو بعض ضعیف رواۃ پائے جاتے ہیں یا علامہ ابن جوزی نے صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، تو اس کا نہایت صاف واضح اور غیر مشتبہ جواب یہی ہے کہ وہ حدیثیں، یا وہ رواۃ، متابعات کے تحت میں ہیں نہ کہ اصل مسئلہ پر استجاج کے لئے اور اس طریقہ پر ان رواۃ یا احادیث پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، مثلاً زید ایک نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو، آپ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ تو دروغ گو ہے، ہمیں تجھ پر اعتماد نہیں، لیکن عمرو، بکر، خالد کی صداقت، دیانت، راست بازی، زہد، تقویٰ، پاکبازی آپ کے نزدیک مسلم ہے، غیر مشتبہ ہے آپنے ان میں محامد کے سوا معائب کبھی نہ دیکھے نہ سنے، سوا اللہ کے غیر اللہ سے انھیں مرعوب و متاثر ہوتے آپ نے کبھی نہ دیکھا، جھوٹ بولتے کبھی نہ سنا، غرض آپ کو ان پر پورا اعتماد ہے وہ آپ سے کہتے ہیں کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو"، اب آپ یقیناً بلا پس و پیش ان کی بات پر اعتماد کریں گے، اور تسلیم کریں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا سچ کہا، ان لوگوں کے کہنے کے بعد اب وہی "زید" جو "نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص" ہے آپ کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو تو بسم اللہ کرلیا کرو" اب آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے۔ اس کے اس قول کو

جھوٹا سمجھیں گے، یا سچا؟ لامحالہ آپ زید کو نہیں بلکہ زید کی اس بات کو سچ سمجھنا پڑے گا، بس یہی متابعات کی کیفیت ہے کہ چونکہ وہ متواتر حدیث کی متابعت میں ہوتی ہیں اس لئے انھیں صحیح سمجھا جاتا ہے۔

یہ جھگڑا تو خیر رُوَاۃ کے متعلق تھا کہ حدیث کی بعض کتابوں میں سلسلۂ رواۃ ذرا طویل ہوتا ہے لیکن ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں اس قسم کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے، مثلاً موطا امام مالک اکثر و بیشتر وہ تین چار واسطوں سے رسول اللہ تک پہنچتے ہیں، مثلاً مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبی ؐ، امام مالک کی صداقت و دیانت میں جمہور امت کو اتفاق ہے، نافع ابن عمر کے مولیٰ ہیں، ان پر بھی زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی، خود ابن عمر وہ ہیں کہ جن کے زہد اور شغف فی السنت کا سارا زمانہ قائل ہے، خود سرکار رسالت کے دربار سے خوشنودی مزاج کا تمغہ انھیں مل چکا ہے۔ ان کے بعد نبی کریم ہیں، اس سلسلۂ رواۃ کو محدثین کرام "سلسلۃ الذہب" کہتے ہیں، لہٰذا ان "سچائی کے قطروں" کو تو "اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب" سے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔

اب میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ اس گفتگو کے بعد جو رائے چاہیں قائم کریں۔ لیکن یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی بساط کے موافق جو کچھ عرض کر سکتا تھا، عرض کر چکا۔ تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام!

تنقید و تبصرہ

کتب :-

تفسیر سورۂ اخلاص - سید الانبیاء - ولی اللہ - اسکول کی زندگی - باغبانی پرجکٹ - آسمانی گھڑی - بس کا روکھ - یتنوی ناسخ - روح جذبات

تفسیر سورۂ اخلاص | مولنا حمید الدین مرحوم فراہی جو اس دور آخر میں بہترین مفسر تھے ان کی لکھی ہوئی سورۂ قل ہو اللہ کی تفسیر چھوٹی تقطیع پر ۴۰ صفحوں میں مطبع معارف اعظم گڈھ سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ قیمت ۵/۴
مولنا فراہی مرحوم جو کچھ لکھتے تھے زیادہ تر عربی میں لکھتے تھے۔ لیکن اس سورۃ کی تفسیر انھوں نے کسی دوست کی فرمائش سے اردو میں لکھی تھی جس کا ناتمام مسودہ پڑا ہوا تھا۔ مولنا کے بھائی حاجی رشید الدین صاحب نے اس کو چھپوا کر اس غرض سے شائع کیا کہ اس کی فروخت سے اگر کچھ رقم جمع ہو جائے تو مولنا فراہی کی دیگر تصانیف شائع کی جائیں۔ اس لئے اس تفسیر کا خریدنا نہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہے کہ سورۂ اخلاص کی بہترین شرح آپ کے ہاتھ میں آجائے گی۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آپ کی دی ہوئی قیمت ایک اعلیٰ دینی اور علمی مصرف میں کام آئے گی

سید الانبیاء | رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مقالے اور آپ کے سوانح غیر قوموں کے مختلف لوگوں نے لکھے۔ مگر جس جرأت، جوش، حدت روح اور خوش بیانی کے ساتھ تھامس کارلائل انگریزی نے اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں حضور اکرم کے بارے میں اپنا لکچر ترتیب دیا ہے اور ان کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف کیا ہے اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے پیکر میں وہ زندہ معانی ہیں جو چشم بصیرت کے سامنے متحرک ہو کر رسول اعظم کی عظمت کے سامنے

والہانہ عقیدت مندی کے سجدے بجالاتے ہیں، اسی کتاب کے دوسرے لکچر کا ترجمہ محمد اعظم خاں صاحب نے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اردو میں کردیا ہے تاکہ اُردو خواں جماعت اسکو پڑھے۔ چھوٹی تقطیع پر ۵۶ صفحوں میں تمام ہوا ہے۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ مجلد عمر غیر مجلد ۱۱ر ملنے کا پتہ۔ محمد اعظم خاں نصیرو لاشان پورہ۔ حیدر آباد (دکن)

ولی اللہ | اس کتاب میں مولانا ابوالعسلا، محمد اسمٰعیل صاحب گودھروی نے محقق ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے سبق آموز حالات اور ان کے اصلاحی و تعلیمی کارنامے جمع کئے ہیں۔ آخر حضرت شاہ صاحب موصوف کا وصیت نامہ بھی درج کیا ہے۔ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی نے اپنے ایک مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ تقطیع ۲۲×۲۰ ضخامت ۵ جزو قیمت فی جلد ۱۰ر ملنے کا پتہ۔ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی۔ قرولباغ۔ دہلی۔ اس کتاب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات میں ایک کتاب "حیات ولی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں زیادہ تر ان کے خاندانی حالات جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں مولانا گودھروی صاحب نے ان کے علمی اور دینی کارناموں کو دکھانے کی خصوصیت کے ساتھ کوشش کی ہے۔ اور عمدگی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اسکول کی زندگی | مصنفہ محمد عبدالغفار صاحب مدھولی۔ استاد جامعہ۔ ضخامت چھوٹی تقطیع پر ۷۵ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ ۸ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی

یہ ایک دلچسپ ڈرامہ ہے جس کو سال گذشتہ ہماری جامعہ کے چھوٹے لڑکوں نے کر کے دکھلایا تھا۔ اس میں اسکول کی زندگی کے مختلف شعبے دکھائے گئے ہیں۔ طالب علم کو علمی شوق دلانے اور صحیح راستہ دکھانے میں۔ یہ ڈرامہ مدد و معاون ہے۔ اہل جامعہ نے اس کو نہایت دلچسپی سے دیکھا اور طلبہ کے لئے مفید خیال کیا۔ چنانچہ عبدالغفار صاحب نے اس کو مرتب کر کے عام فائدے کیلئے شائع کردیا۔

باغبانی پروجکٹ | یہ بھی محمد عبدالغفار صاحب مدہولی کا دوسرا مرتب کردہ رسالہ ہے۔ جو چھوٹی تقطیع پر ۵ جزو میں ختم ہوتا ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ ۵؍ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ دہلی

محمد عبدالغفار صاحب مدہولی جامعہ مرکز منبٹ کے نگراں ہیں، ابتدائی چہارم تک چھوٹے بچوں کی تعلیم ان کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ وہ ایک دلکش استاد ہیں جو اپنی ساری قوت ذہنی تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر صرف کر رہے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بچوں کی دلچسپی کے لئے باغبانی کا سلسلہ بھی اپنے مرکز کے متصل شروع کیا ہے۔ جو کچھ اس باغبانی کی تعلیم میں ہو رہا ہے وہ اس رسالہ میں آپ دیکھ لیں گے۔

آسمانی گھڑی | مصنفہ ڈاکٹر احمد حسن صاحب ایل۔ ایم۔ پی۔ میڈیکل آفیسر۔ ی۔ ایس۔ ایم۔ ایس نخشیز سعادت گنج۔ لکھنو۔

ڈاکٹر صاحب نے اس میں وقت کی شناخت کی کیفیت لکھی ہے۔ یعنی رات کو قطب تارے سے ہر موسم میں وقت پہچانا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جس طرح دن کو آفتاب سے دوپہر، طلوع اور غروب کا وقت معلوم ہو سکتا ہے۔ انھوں نے خود اپنے مطالعۂ نجوم سے یہ باتیں دریافت کی ہیں۔ کل ۱۲ صفحہ کا رسالہ ہے مگر مفید اور دلچسپ ہے۔ قیمت ۴؍ مذکورہ بالا پتہ سے مل سکے گا۔

پس کا روکھ | بنگال کے مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے ایک بے مثل ناول کا ترجمہ جس کو نداعلی خاں ایم اے دھلیگ، صدر شعبۂ فارسی و اردو ڈھاکہ یونیورسٹی نے محنت کے ساتھ اُس زبان میں جو سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے ترجمہ کرکے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے دفتر کتابستان الہ آباد نے اس کو چھوٹی تقطیع پر صاف ٹائپ میں چھپوایا ہے۔ ضخامت ۲۶۵ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ؍

ہم کو یہ کتاب نہ صرف اپنی معنوی دلچسپی بلکہ زبان کی خوبی کے لحاظ سے بھی پسند آئی۔ ہم اس مبارک کوشش کو پسند کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ایک ہی ہو۔ اور وہ وہی اُردو ہو سکتی ہے جو نہایت سلیس

ہوا ثقیل یا وزنی عربی اور فارسی کے الفاظ اس میں استعمال کئے گئے ہوں۔ یہ ترجمہ اسی قسم کا ہے۔ اس کے علاوہ کتابستان نے جو چھپائی کے لئے ٹائپ رکھا ہے یہ بھی اچھا کیا ہے۔ کیونکہ عنقریب وہ دن آنیوالا ہے جبکہ ہر ادارہ کتب کو ٹائپ ہی رکھنا ہوگا۔ دستی خطاطی اردو کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے بلکہ تمام دنیا جو عربی خط میں اپنی زبان لکھتی تھی ٹائپ کو اختیار کر چکی ہے۔

مثنوی ناسخ | مرتبہ حبیب اللہ خاں غضنفر ایم اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی۔

خاں صاحب موصوف نے "سلسلۂ مصنفین" اردو میں شیخ ناسخ کی سوانح عمری تیار کی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اسی ذیل میں شیخ ناسخ کی اس نایاب مثنوی کو شائع کر دیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ان تمام روایات کو اصلی عبارتوں میں درج کر دیا ہے جن کے ترجمے شیخ ناسخ نے اس مثنوی میں کئے ہیں۔ یہ مثنوی بھی ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور کتابستان الہ آباد کے دفتر سے شائع ہوئی ہے۔ تقطیع خورد۔ حجم ۵ جزو قیمت ۱۲؍۔ اس آغاز کو دیکھتے ہوئے ہم اس سلسلۂ مصنفین سے جو خاں صاحب موصوف نے شروع کیا ہے اچھی اچھی تصانیف کی توقع رکھتے ہیں۔

روح جذبات | کلام حضرت اکبر حیدری۔ حجم ۶ جزو۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عہ؍

ملنے کا پتہ۔ عشرت رحمانی۔ اڈیٹر رسالہ نیرنگ۔ دہلی۔

اکبر حیدری نے اس کوچۂ شعر و شاعری کو قطعاً چھوڑ دیا ہے جو جذبات اور ہوس پرستی کا ہے۔ ان کا وافی تخئیل حقائق فطرت کے جمالیاتی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہے اور ان کا قلم چمنستان شاعری کی روشوں پر محو خرام ہے۔ جہاں لطائف فطرت پھول بن کر کھلتے ہیں اور بو بن کر مہکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاہراہ آپ پیدا کی ہے جو شریعت کے ساتھ حقیقت تک پہنچتی ہے۔ کاش ان کا اثر متعدی ہو اور پرانے بھٹکے ہوئے اس راہ پر آجائیں تو اردو شاعری کی زمین آسمان ہو جائے۔

شذرات

اگست کا پرچہ ستمبر کے تیسرے ہفتے میں قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ رہا ہے۔ ستمبر کا پرچہ انشاءاللہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں اور اکتوبر کا آخر اکتوبر تک پہنچ جائے گا۔ امید ہے کہ اس کے بعد وقت کی پوری پوری پابندی ہوا کرے گی۔

اکتوبر سے رسالہ کا حجم ۹۶ صفحے ہو جائے گا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ مضامین بہتر اور زیادہ دلچسپ ہوں۔ اس میں حضرات قارئین کی مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس حلقے میں اچھے اچھے اہل قلم موجود ہیں۔ اگر یہ سب بزرگ توجہ کریں تو مضامین کا معیار کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ علاوہ قلمی امداد کے ہم مفید مشوروں کے بھی طالب ہیں۔

ہمارے ملک میں یہ رسم ہے کہ رسالوں کے مدیر پڑھنے والوں سے اپنے اپنے رسالے کی ترقی اشاعت میں مدد مانگا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اسے کاروبار کے اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مطالبہ محض سینہ زوری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قانوناً رسالے کے مدیر کو کوئی حق نہیں کہ وہ معقول اور شریف آدمیوں کے سر یہ بیگار ڈالے۔ خریداروں کی بھرتی سپاہیوں کی بھرتی سے بھی زیادہ ناگوار اور تکلیف دہ کام ہے لیکن انصاف کی نظر سے دیکھئے تو اردو میں علمی رسالہ نکالنا کاروبار نہیں بلکہ ایک طرح کا جہاد ہے۔ حالت یہ ہے کہ لوگ علمی مضامین پڑھنا نہیں چاہتے۔ مگر علمی رسالے انھیں مجبور کرکے پڑھواتے ہیں۔ لکھنے والے لکھنا نہیں چاہتے مگر رسالوں کے مدیر ان کے پیچھے پڑ کے لکھواتے ہیں غرض اس کام کی بنیاد ہی جبر پر ہے۔ مگر اس جبر کے لئے شرط یہ ہے کہ جس پر کیا جائے وہ خفا نہ ہو بلکہ خوش ہو۔ منطق کی رو سے اس شرط کا پورا ہونا محال ہے مگر واقعات کبھی کبھی منطق کا قانون بھول جاتے

ہیں۔ الحمدللہ یہ بھی ایک ہی واقعہ ہے کہ ہمارے قدر دان ہمارے تقاضوں کو خندہ پیشانی سے سنتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ سن کر ٹال دیں)۔ بہرحال ان کے لطف و کرم نے ہمیں گستاخ کر دیا ہے اور ہم ان سے یہ اصرار ملتجی ہیں کہ رسالے کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کریں۔ انشاء اللہ اس ترقی کے بعد جو اکتوبر سے رسالے میں ہو رہی ہے لوگوں کو اس کا خریدار بنانا پہلے سے آسان ہو جائے گا۔

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں بہت بڑے تغیرات ہونے والے ہیں۔ حکومت کا نظام بدلنے والا ہے۔ نیا دستور اساسی بن رہا ہے کہ بڑے بڑے مدبر سیاست اور حکومت کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس چیز پر جو تمدنی زندگی کی بنیاد ہے یعنی تعلیم کے مسئلے پر اب تک کسی کو غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور تبدیلی ہو کر رہے گی لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تغیر اضطراری حالت میں بجائے اصلاح کے تحریک کی صورت نہ اختیار کرلے۔ اب تک ہمارے ملک میں سرکاری تعلیم محض سطحی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ لوگوں کو مروجہ علوم کی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو جائے اور وہ دفتری یا انتظامی ملازمت کا کام انجام دے سکیں۔ نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل پر اس کا اثر بہت محدود ہے۔ سیاسی آزادی ملنے کے بعد رنگ بدل جائے گا۔ تعلیم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگی اور وہ نوجوانوں کی ذہنی زندگی کے ہر شعبے کی تربیت کرے گی۔ یہ آزادی کا لازمی نتیجہ ہے جو خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے تعلیم کے مسئلے کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی

دستور اساسی کے بارے میں ہماری یہ خواہش اور کوشش ہے کہ ملک میں ہم آہنگ قومی زندگی پیدا ہو لیکن اسی کے ساتھ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے مدنی حقوق محفوظ رہیں اور ان کی تمدنی خصوصیات برقرار رہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو برسوں سر مغزی کرنے کے بعد اب تک حل نہیں ہوا۔

اس کے حل نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس پر اب تک بہت محدود نقطۂ نظر سے غور کیا گیا۔ اس کا سب سے اہم پہلو یعنی یہ سوال کہ ملک کی تعلیمی پالیسی کیا ہوگی بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مدنی اور تمدنی زندگی کی تشکیل زیادہ تر تعلیم سے ہوتی ہے۔ یورپ کے ملکوں میں خصوصاً جرمنی میں ہر سیاسی پارٹی اپنے سیاسی لائحۂ عمل کے ساتھ ایک تعلیمی لائحۂ عمل بھی رکھتی ہے اور جس طرح قومی حکومت کا نظام مختلف پارٹیوں کے سیاسی اصولوں کے امتزاج سے ترتیب دیا گیا ہے اسی طرح قومی تعلیم کی پالیسی بھی ان سب کے تعلیمی خیالات کو سمو کر بنائی گئی ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک کسی پارٹی کے پاس کوئی تعلیمی پروگرام نہیں ہے اور نہ کسی نے اس بات کو محسوس کیا کہ سیاسی اور تمدنی حقوق کی محافظت میں طرز تعلیم کو بہت کچھ دخل ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے تو دستوراساسی کی گتھی کو سلجھانے میں بہت مدد ملے۔

مسلمانوں نے اب سے پچاس برس پہلے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ تمدنی ترقی کے لیے تعلیمی اصلاح کی ضرورت ہے اور عرصے تک ان کی ساری کوشش یہ رہی کہ اپنی جماعت کے نظام تعلیم کو اپنی مخصوص مصلحتوں کے مطابق تشکیل دیں اور اس میں اتنا اہتمام کیا کہ سیاست کی طرف جتنی توجہ کرنی چاہیے تھی نہ کر سکے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کوشش بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری جدوجہد اپنی مرکزی تعلیم گاہ (علی گڑھ کالج) اور اسلامیہ اسکولوں تک محدود رہی۔ سرکاری نظام تعلیم کو ہم نے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اصلاح کی کوشش درکنار موجودہ صورت میں اس سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ بھی نہیں اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی درسگاہوں نے حکومت کے تعلیمی ضابطوں کے شکنجے میں کسے ہونے کے باوجود ملتِ اسلامی کی بڑی خدمت کی لیکن وہ اس کی تعلیمی ضرورتوں کی کفیل نہ ہو سکیں۔ اب دس بارہ سال سے ہم نے زمانے کی رفتار سے مجبور ہو کر سیاست کے میدان میں قدم بڑھایا تو تعلیم کو ایسا چھوڑا کہ کبھی بھول کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری اکثر تعلیم گاہوں کی حالت ابتر ہوگئی اور بدتر ہوتی جاتی ہے۔

ہم سیاست کی اہمیت کے منکر نہیں لیکن ہمارا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ خود سیاست میں بھی ہماری کامیابی ہماری تعلیمی ترقی پر موقوف ہے۔ ہمارے نزدیک ملت اسلامی کی سب سے شدید ضرورت اس وقت یہ ہے کہ تعلیم کے ماہروں اور حامیوں کی ایک جماعت ہماری موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لے اور اس بات پر غور کرے کہ ملک کی آئندہ تعلیمی پالیسی میں ملک کی مشترکہ مصلحتوں کے ساتھ ساتھ ہماری مخصوص مصلحتوں کو پیش نظر رکھنے کی کیا صورت ہونا چاہئے۔ سیاسی "تحفظات" اپنی جگہ پر ضروری ہیں مگر تعلیمی "تحفظات" ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں گو اس شورش کے زمانے میں ہمیں ان کی اہمیت نظر نہ آئے۔ مسلمانوں کا ہندوستان کی قومی زندگی میں وہ حصہ پانا جو ہمارے شایاں شان ہے اور ملک کی وہ خدمت انجام دینا جو ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے بہت بڑی حد تک اس پر موقوف ہے کہ ملک کی تعلیم ہمارے مذاق کی اور ہمارے کام کی ہو اور ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملے۔

کمک آ پہنچی تو محصوران دونوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ صمیل حصار سے نکل کر اہل کمک سے ملا اور ان لوگوں کو نہایت فیاضی کے ساتھ زر و مال دیا۔ ان میں سے نیک اور اچھے لوگوں کو پچاس پچاس دینار اور بڑے بڑے سرداروں کو دو دو سو دینار اور عوام کو دس دس اور ایک ایک تھان ریشم کا تقسیم کیا۔ یہ لوگ صمیل اور اس کا مال و دولت اور خدام کو ساتھ لئے ہوئے قرطبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سرحد یعنی علاقہ سرقسطہ کو خالی کر دیا۔

ابن معاویہ کے متعلق صمیل سے مشورہ کچھ دور بڑھ کر تینوں اموی سردار صمیل کو تنہائی میں لے گئے اور پہلے ابو عثمان عبید اللہ نے اس سے گفتگو کی اور ابن معاویہ کا خط اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ تم ہمارے امیر ہو بغیر تمہارے سیاہ و سفید کچھ نہ ہوگا تم بلا کسی ناگواری و ناخوشی کے اپنی رائے ظاہر کر دو جس بات سے تم متفق ہوگے اسی سے ہم بھی اتفاق کریں گے جس کو تم ناپسند کرو گے ہم بھی ناپسند کریں گے۔ صمیل نے ان سے کہا "اچھا مجھے مہلت دو تاکہ میں غور و فکر کے بعد جواب دوں۔ پھر صمیل نے واپسی کی تیاری کی اور ابن معاویہ کے ایلچی کو دس دینار اور ایک ریشمی تھان انعام دے کر قرطبہ آیا۔ اموی اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ آئے ان کے ساتھ بدر اور چار آدمی اور تھے اور سامان بھی ساتھ تھا۔ سرقسطہ کے حالات سن کر یوسف نے سرحد کی طرف چڑھائی کرنے میں بہت سختی سے کام لیا۔ یہ واقعات ۱۳۸ھ کے ہیں۔

فراہمی فوج کے لئے یوسف کا اضطراب اور اس کے ساتھیوں کا مخالفانہ رویہ جب یوسف تیار ہو کر جنگ کے لئے نکلا تو اس نے عبداللہ ابن خالد اور ابو عثمان کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو ان میں سے ایک کے پاس بیٹھ گیا اور کہا کہ ہمارے معاونین و موالی کو مدد کے لئے توجہ دلاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ ہماری قوم میں خروج کی استعداد نہیں ہے کیونکہ جو لوگ ہمت کے قوی تھے اور ابو جوشن (صمیل) کے ساتھ چلے گئے تھے وہ لڑائی میں سفر اور جاڑے کی مصیبتوں سے ہلاک ہو گئے۔ ساری سعی بیکار رہی۔ مشقت الگ رہی۔

بھرتی کے لئے روپے کی تقسیم یہ عذر سن کر یوسف نے ایک ہزار دینار ان دونوں کو دئے اور کہا کہ اس

رقم سے تم دونوں ان لوگوں کو مضبوط بناکر مدد کے لئے لاؤ۔ انھوں نے کہا وہ تعداد میں پانچسو ہیں یہ رقم ان میں کیونکر تقسیم ہوسکتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ لے لیا اور فوج کو ہموار کرنے کے لئے روانہ ہوگئے مگر جب آگے چلے تو انھیں خیال آیا کہ یہ روپیہ ہم کیوں نہ لے لیں تاکہ اس کی بدولت ابن معاویہ کے متعلق اپنا ارادہ مضبوطی کے ساتھ پورا کرسکیں غرض یہ سوچتے ہوئے منزل پر پہنچے اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ یوسف نکلا تو سیدھا جیان پہنچا۔ وہیں ابوعثمان وعبداللہ آگئے۔

یوسف کے روپے کا خودساختہ مصرف

جیان آنے سے پہلے ان دونوں نے یہ کارروائی کی تھی کہ جب دینار لے کر پہنچے تو دونوں نے ان دیناروں کو بنی امیہ پر تقسیم کردیا۔ فی کس دس روپیہ سے زیادہ حصہ میں نہ آئے مگر ان لوگوں نے یہ تقسیم لڑنے کے لئے نہیں کی بلکہ اپنے مقصد کو پورا کرنے اور تالیف قلوب کے لئے کی تھی۔ جب جیان میں یوسف سے ملے تو یوسف مخاصۂ الفتح پر ٹھہرا ہوا ان کا انتظار کررہا تھا۔ یوسف نے جیان ہی میں اپنے لشکروں اور مختلف گروہوں کو تنخواہیں تقسیم کیں اور انعامات دیے

فوج کے لئے یوسف کا تقاضا اور اس کا جواب

جب ابوعثمان نے سمجھ لیا کہ نہ یوسف آگے بڑھتا ہے نہ مستقل قیام کرتا ہے تو یوسف سے ملا۔ یوسف نے اس سے پوچھا۔ اے عبداللہ ہمارے مددگار کہاں ہیں ابوعثمان نے دعا دے کر کہا "آپ کے مددگار ان ۔۔ دو آدمیوں کے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے اور ان لوگوں نے امیر کے (آپ کے) طلیطلہ پہنچنے تک کی مہلت حاصل کرلی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ امیر کے طلیطلہ پہنچنے تک ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے اس طرح آنے سے انھیں کچھ نئی فصل جو کی آسانی سے مل جائے" یہ سال سنہ ۱۳۶ھ نہایت برا سال تھا لوگ قحط میں مبتلا تھے اسی سال ذیقعدہ کے مہینے میں یوسف نے سرقسطہ پر چڑھائی کی تھی۔

ابوعثمان کے اس جواب پر یوسف کو کوئی بدگمانی نہیں ہوئی اور ان کی بات کو سچ سمجھا اور ابوعثمان سے کہا اب تم پھر ہمارے مددگاروں کے پاس جاؤ اور اپنی طرف سے ان پر ایک داروغہ مقرر کردو یہ انتظام یوسف نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے کیا تھا۔ جب یوسف جانے لگا تو ابوعثمان

بھی اس کے ساتھ ہو گیا تاکہ اسے رخصت کر کے صمیل سے بھی رخصت ہو لے۔

صمیل کی اخلاقی حالت
صمیل سے ابوعثمان وغیرہ کی ملاقات و گفت و شنید

صمیل اپنے لشکر ہی میں پڑا تھا اس نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت نہ کی وہ ہمیشہ شراب میں مست رہتا تھا کوئی رات ایسی نہ گزرتی تھی جس میں مدہوش نہ رہتا ہو۔ جب عبیداللہ ابوعثمان پہنچا اُس وقت بھی بیہوش تھا۔ ابوعثمان تھوڑی دیر منتظر رہا۔ اتنی مدت میں سب لوگ چلے گئے۔ صمیل اور اُس کے خادموں کے سوا کوئی نہ رہا جب صمیل خوابگاہ سے باہر آیا تو عبیداللہ ابوعثمان وعبداللہ ابن خالد دونوں اس کے پاس گئے صمیل نے اُن سے پوچھا "کیا خبر ہے اور تم کیسے آئے ہو"۔ دونوں نے یوسف کی اجازت کے مطابق بیان کیا کہ ہمیں طلیطلہ میں بنی امیہ کے ساتھ پہنچنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ صمیل نے اس بات کو پسند کیا پھر یہ لوگ ساتھ چلے اور صمیل کے قریب آکر کہا کہ "ہمیں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے"۔ یہ سن کر صمیل نے اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا۔

ابن معاویہ کے متعلق صمیل کا حوصلہ افزا جواب

اب ان دونوں نے صمیل سے کہا کہ ہم آپ سے عبدالرحمن ابن معاویہ کے معاملے میں مشورہ چاہتے ہیں ابھی ان کا ایلچی واپس نہیں گیا ہے اور جواب کا منتظر ہے۔ صمیل نے کہا میں اس بات سے غافل نہیں ہوں میں نے ابن معاویہ کے معاملے میں غور کیا ہے اور استخارہ بھی کر چکا ہوں۔ اس کا خیال مجھے عرصہ سے ہے مگر میں نے اخفاء راز کے لئے کسی سے اس معاملے میں کبھی مشورہ نہیں کیا ہے۔ میری رائے میں ابن معاویہ میری مدد کا مستحق ہے اور حکومت کا بھی وہی اہل ہے اس لئے تم دونوں انھیں بسم اللہ کر کے اپنی رضامندی سے مطلع کردو اور یہ لکھ دو کہ وہ اپنے اس معاملے کا انحصار مجھ پر رکھیں۔ میں یوسف کی بیٹی ام موسیٰ بیوہ قطن ابن عبدالملک سے عبدالرحمن ابن معاویہ کا نکاح کر دوں گا بشرطیکہ وہ ہم جیسا ہو کر رہے۔ اگر امیر یوسف نے بھی منظور کر لیا تو کوئی مضائقہ نہیں ہم اس کے ممنون ہوں گے اور اگر انکار کر دیا تو یہ بہت آسان ہے کہ ہم اپنی تلواروں سے یوسف کا خاتمہ کر دیں۔ صمیل کا یہ جواب سن کر دونوں نے اُس کے ہاتھ چومے اور شکریہ ادا کیا۔

مزید غور و فکر کے بعد صمیل کا پہلی رائے بدل دینا | ابو عثمان عبید اللہ ابن عثمان بیان کرتے ہیں کہ ہم صمیل سے رخصت ہو کر تقریباً ایک میل گئے ہوں گے اور دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ہمارا کام بن گیا کہ پیچھے سے کسی شخص کی آواز آئی جو ابو عثمان کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ ہم نے دیکھا تو صمیل کا خادم تھا جو گھوڑا بڑھائے ہماری طرف چلا آ رہا تھا ہم ٹھہر گئے اس نے ہم سے کہا "ابو جوشن کہتے ہیں تم دونوں ہمارے آنے تک ٹھہر جاؤ" ہمیں اس کے بے موقع آنے سے خطرہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مصیبت میں پڑ جائیں، مگر خدا پر بھروسہ کر کے استقبال کو آگے بڑھے دیکھا تو وہ اپنے سفید خچر کوکب پر سوار چلا آ رہا ہے ہم صمیل کو تنہا دیکھ کر مطمئن ہوئے کہ اگر اس کی نیت بری ہوتی تو اس کے ساتھ اس کے مددگار بھی ہوتے ہمیں دیکھ کر صمیل نے قریب بلایا اور کہا جب سے تم نے ابن معاویہ کے خط اور اس کے ایلچی کا تذکرہ کیا ہے میں اسی فکر میں ہوں میں تمہاری رائے کو پسند کرتا ہوں میں جو کچھ جواب دے چکا ہوں تمہیں معلوم ہے۔ مگر جب تم مجھ سے جدا ہوئے تو میں نے ابن معاویہ کے متعلق مزید غور و تدبیر سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتا ہے کہ اگر ان میں کا کوئی اس جزیرہ میں پیشاب کر دے تو ہم تم سب اس کے پیشاب میں غرق ہو جائیں ادھر یوسف کا بھی مالی احسان ہم پر اتنا ہو کہ ہم گردن نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے میں نے اپنی رائے بدل دی ہے بخدا اگر تم دونوں اپنے گھر پہنچ جاتے تب بھی میں تم کو اپنی جدید رائے سے مطلع کر کے رہتا۔ مبادا تم دھوکے میں پڑ جاؤ اور اب میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ سب سے پہلے جو شخص ابن معاویہ پر تلوار اٹھائے گا وہ میں ہوں گا۔ اللہ تمہاری رائے میں برکت دے اور تمہارے آقا کو بھی برکت عطا کرے۔

ابو عثمان کہتے ہیں میں نے صمیل کو جواب دیا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے ہم تو تمہاری ہی رائے کے پابند ہیں۔ صمیل نے کہا نہیں ایسا نہ کہو کیونکہ تمہارا تو مقصد ہی ابن معاویہ کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اور اگر ابن معاویہ حکومت کے سوا کچھ اور چاہیں تو میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ یوسف ان کی غمخواری کرے اور ان کو اپنا داماد بنا لے۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں آگے روانہ ہوئے صمیل ان سے رخصت ہو کر اپنے پڑاؤ پر پہنچا۔

ابن معاویہ کے طرفداروں کی قبائل مضر و ربیعہ سے مایوسی اور یمنی قبائل سے تحریک دعوت

ابوعثمان کا بیان

ابوعثمان کا بیان ہے کہ مضر و ربیعہ کے تمام قبائل سے ہماری امید منقطع ہوگئی کیونکہ صمیل ابن معاویہ کے خلاف ہوگیا تھا اور اب یہ رائے ہوئی کہ اہل یمن سے تحریک کرکے ان کو اپنی رائے میں شریک کرلیا جائے۔" ہم نے فوراً یہی کیا جس یمنی کو قابل اعتماد و دانشمند پاتے اس سے ابن معاویہ کا ذکر کرکے اس تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دیتے۔ انھیں میں ہمیں ایک قوم ایسی ملی جن کے سینے مضر کی دشمنی سے معمور تھے اور وہ خود کسی ایسے حیلہ کے خواہاں تھے جس سے انھیں بنی مضر سے بدلا لینے کا موقع مل سکے اس لئے اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کے دل سے خواہاں تھے بعدازاں ہم اپنے لشکر میں پہنچے چونکہ بنی مضر سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے ان سے کوئی تعرض نہ کیا اور ایک جہاز خرید کر ہم گیارہ آدمی سوار ہوئے جن میں بدر بھی تھا۔ ان گیارہوں آدمیوں کے نام اچھی طرح یاد نہیں رہے بعض کے یاد ہیں۔ ان میں سے ایک ہشام کا غلام شاکر تھا ایک تمام ابن علقمہ ثقفی ہم نے تمام کو پانچسو دینار دئے تھے تاکہ اس کے ضروری مصارف کے لئے کافی ہوں اور بربریوں کو تقسیم کئے جاسکیں۔ جب ہمارا جہاز ساحل پر پہنچا تو ابن معاویہ مقام مغیلہ میں جو ابن قرہ مغیلی کی زیر حکومت تھا۔ اپنے غلام بدر کے منتظر تھے۔ ہم لوگ جہاز میں بیٹھے ہوئے ادھر سے گزرے تو انھیں خبر ہوئی اور وہ مغرب کی نماز پڑھنے لگے۔ ابن معاویہ نے نماز سے فارغ ہوکر اس طرف دیکھا تو جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا۔ اور بدر ان کی طرف تیرتا ہوا آرہا تھا۔ بدر نے آتے ہی اندلس کی ساری کارروائی بیان کرکے کامیابی کا مژدہ سنایا اور ابوعثمان و عبداللہ ابن خالد وغیرہ اہل اندلس کی کوشش و رضامندی کا ذکر کرکے جہاز کی حقیقت بیان کی جو لوگ اس میں سوار تھے ان کے نام بتائے اور خرچ کے لئے جو کچھ مال و دولت اس میں تھی اس کی تفصیل کہی۔ پھر عبدالرحمن ابن معاویہ کے پاس تمام ابن علقمہ پہنچے تو ان سے پوچھا تمھارا کیا نام ہے انھوں نے کہا "تمام" پھر پوچھا تمھاری کنیت کیا ہے تمام نے کہا "ابوغالب" یہ سنتے ہی عبدالرحمن بولے اب ہمارا کام ہوگیا۔ ہم اپنے دشمن پر غالب ہوگئے۔ اس نیک فالی کے صلہ میں عبدالرحمن نے امیر اندلس ہونے کے بعد ان کو اپنا حاجب مقرر کرلیا تھا اور تمام اپنے آخر دم

تک اسی خدمت پر رہے۔

روانگی کے موقع پر ایک بربری سے آویزش ان حالات کے بعد جب عبدالرحمن ابن معاویہ نے چاہا کہ جہاز پر بیٹھ کر روانہ ہوں تو بربریوں نے بڑھ کر تعرض کیا۔ ان کو ہموار کرنے کے لئے تمام نے ان کے مرتبہ کے اعتبار سے ہر ایک کو زر و مال تقسیم کیا۔ بظاہر ان لوگوں میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا جسے کچھ نہ ملا ہو مگر جب جہاز میں بیٹھنے لگے تو اُن میں کا ایک بربری جو اُس وقت موجود نہ تھا اور اُسے کچھ نہ ملا تھا آگے بڑھا اور جہاز کی رسی سے لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر شاکر نے اُس کے ہاتھ پر تلوار ماری۔ اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ اور وہ آدمی سمندر میں جا گرا اور جہاز روانہ ہو گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل کی امارت کی تاسیس

منکب میں داخلہ اور راستے ہاتھ پر بیعت کا آغاز یہ جماعت ماہ ربیع الثانی ۱۳۸ھ میں مقام منکب پر اتری عبداللہ ابن خالد اور ابوعثمان نے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو قصبہ طروش میں ابوالحجاج کے مکان پر پہنچایا ابوالحجاج (یعنی یوسف ابن بخت) اور تمام بنی امیہ عبدالرحمٰن سے ملے۔ ریہ کے باشندے جد او ابن عمرو مذحجی بھی آئے جو بعد میں عبدالرحمٰن کے عساکر میں قاضی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ عاصم ابن سلم ثقفی اور ابوعبدہ حسان نے بھی یہیں بیعت کی موخر الذکر کو عبدالرحمٰن نے اپنا وزیر بنایا۔ پھر عبدی ابوبکر بن طفیل اور اطراف و نواح کے تمام لوگ اکٹھا ہوتے اور عبدالرحمٰن کے گروہ میں شامل ہوتے۔

یوسف کو اپنے طرفداروں کی طرف سے پریشانی عامر و زہری وغیرہ کی گرفتاری اور ان کے قتل کا مشورہ راوی کا بیان ہے کہ یوسف فہری جب طلیطلہ پہنچا تو کہا «کیا بات ہے کہ ہمارے مددگار اب تک نہیں آئے» جب اس نے کئی بار یہی کہا تو صمیل نے جواب دیا یہاں سے چلو یہ لوگ نہ تم جیسوں کی مدد کریں گے نہ تمہیں ان کا انتظار کرنا چاہئے۔ بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وقت ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے اس لئے یوسف سرقسطہ روانہ ہوا۔ وہاں سرقسطہ والوں نے لشکروں کی ایذا سے ڈر کر عامر اور اُن کے بیٹے وہب ابن عامر اور زہری کو یوسف کے سپرد کر دیا۔ یوسف نے انھیں گرفتار کر کے قتل کرنا چاہا۔ اور قبیلہ قیس کے سرداروں سے مشورہ کیا تو سب نے نفی میں جواب دیا۔ بلکہ سلیمان ابن شہاب اور حصین

ابن دجن بہت سختی سے ان کے قتل کے خلاف ہو گئے۔ جب یوسف نے تمام لشکر کو خلاف پایا تو انھیں قید کر دیا۔

امیر یوسف سلیمان ابن شہاب کو ایک خطرناک مہم پر مقرر کرکے کینہ نکالتا ہے۔

سلیمان کا قتل عامر و زہری وغیرہ کا خاتمہ

پھر یوسف کو مناسب معلوم ہوا کہ ایک لشکر نشکنش والوں کی طرف بنبلونہ روانہ کرے کیونکہ نبلونہ کے لوگ بھی جلیقیہ والوں کی طرح خلاف معاہدگی کر چکے تھے اس لئے اس نے ایک لشکر تیار کرکے سلیمان ابن شہاب کی سرداری میں نبلونہ بھیجا کیونکہ وہ سلیمان ابن شہاب کو اپنے پاس سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ سوار فوج اور مقدمہ پر حصین ابن دجن کو افسر مقرر کیا۔ پھر اسی فوج کو ایسی کمزور حالت میں بے سوچے سمجھے مقابلہ پر روانہ کر دیا۔ ان کی تباہی کا کچھ خیال نہ کیا جب یہ لشکر اس مہم پر پہنچ گیا تو یہ یوسف تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ وادی شرنبہ پہنچا۔ یہاں یوسف کو وہ ایلچی ملا جو سلیمان ابن شہاب کے شکست، اس کے قتل اور عامۃ الناس کی خونریزی کی خبر لایا تھا، اس نے یہ بھی اطلاع دی کہ "ہزیمت خوردہ فوج میں سے جو لوگ بچ گئے تھے ان میں سے حصین ابن دجن کے ہمراہی ابو زید عبدالرحمٰن ابن یوسف کے پاس سرقسطہ میں ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو امیر یوسف نے سرحد پر چھوڑا تھا۔ یوسف کو اس خبر سے خوشی ہوئی۔ اب یوسف نے عامر اس کے بیٹے وہب اور زہری کو بلایا جو اس کے قیدی تھے۔ اس وقت صمیل نے یوسف سے کہا "ابن شہاب کا تو کام تمام ہو ہی چکا ہے۔ میں اب ان لوگوں کی بھی گردن مار دو۔ چاشت کا وقت تھا اور یوسف و صمیل دونوں وادی شرنبہ میں قیدیوں کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک دن پہلے سے مقیم تھے یوسف نے صمیل کے کہنے پر عمل کیا اور تینوں کے قتل کا حکم دے دیا۔

جب اس کام سے فرصت ہو گئی تو یوسف اور صمیل نے مل کر کھانا کھایا۔ اس موقع پر صمیل نے یوسف سے کہا سلیمان ابن شہاب مارا گیا اور عامر اور زہری کو تم نے مار ڈالا بخدا اب تم اور تمھاری اولاد دجال کے خروج تک محفوظ رہے گی اور اب تم سے کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں ہے۔

قرطبہ کے ایلچی کی آمد

یوسف وہاں سے اٹھ کر اپنے بیٹوں کے پاس آرام کی غرض سے چلا اور گھر میں جا کر

اپنا دایاں پاؤں بائیں پاؤں پر رکھ کر فکر کے عالم میں لیٹ گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کا دایاں پاؤں بائیں پاؤں پر اسی طرح رکھا تھا کہ اہل لشکر نے قرطبہ کے ایلچی کی آمد کا نعرہ لگایا۔ یہ سن کر یوسف اٹھ بیٹھا۔ لوگوں نے کہا بخدا افلاں کا غلام ام عثمان کے خچر پر بیٹھا ہوا ہے۔ ام عثمان یوسف کی ام ولد یعنی اس کی مدخولہ لونڈی تھی اور اس کی حکومت کے شریک ان دنوں ڈاک کے ہرکارے قحط سالی کی وجہ سے نہ ملتے تھے اور ڈاک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ایلچی آگیا اور اس کے پاس ایک شقہ نکلا جس میں عبدالرحمن ابن معاویہ کے داخل ہونے اور طروش میں عبداللہ ابن عثمان کے پاس مقیم ہونے کی خبر درج تھی اور یوسف کو لکھا تھا کہ بنی امیہ ابن معاویہ کی امارت پر متفق ہو گئے ہیں۔ تمھارا نائب متعینہ البیرہ اہل طاعت (غیر مسلم رعایا) کی جماعت لے کر ابن معاویہ پر حملہ آور ہوا تھا تاکہ اسے یہاں سے نکال دے مگر نائب کو شکست ہوئی اور اس کے ساتھی زخمی ہوئے لیکن کوئی قتل نہیں ہوا۔ اب جیسی مصلحت ہو۔

قرطبہ کے حالات پر صمیل سے مشورہ افشائے راز پر یوسف کے لشکر میں شورش

یوسف نے مشورہ کے لئے صمیل کو بلایا وہ اس ناوقت طلبی سے خوف زدہ سا ہو گیا۔ اگرچہ اسے ایلچی کے آنے کی خبر مل چکی تھی لیکن اصل معاملے سے بےخبر تھا اس نے یوسف سے کہا اصلح اللہ الامیر۔ آپ اس وقت کیوں ملول ہیں کیا کوئی حادثہ ہوا ہے یوسف نے کہا۔ بیشک بڑا حادثہ ہے "میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آج کے واقعہ قتل پر خدا کا عذاب ہم پر نہ آتا ہو" صمیل نے کہا انھیں کا نہیں بلکہ سب کا انتقام اللہ کے لئے آسان ہے" خیر کہئے کیا بات ہے یوسف نے خالد سے کہا کہ صمیل کو ام عثمان کا خط پڑھ کر سنا دو یہ خط سن کر صمیل نے کہا معاملہ سخت ہے اور ہماری رائے یہی ہے کہ ہم فوراً اپنی موجودہ جمعیت کے ساتھ ابن معاویہ کا مقابلہ کریں۔ اس کو قتل کر لیں گے یا پسپا کر دیں گے اگر وہ پسپا ہو کر بھاگ گیا تو حکومت اس کی کبھی نہیں ہو سکتی۔ یوسف اور صمیل وغیرہ اس رائے سے متفق ہو گئے مگر نائب کی شکست کی خبر عام فوج میں پھیل گئی اور راز محفوظ نہ رہ سکا۔ اس شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر والوں میں برہمی پیدا ہو گئی کیونکہ یوسف کے آدمیوں میں سے پہلے ہی بہت سے لوگ بنبلونہ کی مہم میں سلیمان ابن شہاب کے ساتھ قتل ہو چکے تھے جو ان میں

سے بچ آئے تھے وہ اس وقت سرقسطہ میں مقیم تھے اس لئے لوگوں نے شورش مچاکر اپنے گروہوں سے کہنا شروع کیا کہ ابھی تو ہم ایک لڑائی سے آرہے ہیں۔ اب دوسری کی فکر ہو رہی ہے" یہ ایک ہی موقع پر دو دو لڑائیاں کیسی"

فوج کا جائزہ اور یمنی سپاہیوں کی علٰحدگی | اس کے بعد جب شام کو یوسف کی فوج میں جائزہ ہوا تو یمنی سپاہیوں میں سے دس آدمی بھی نہ ملے صرف وہی لوگ رہ گئے جو نہ اپنی قوم کا ساتھ دے سکتے تھے نہ افسری سے ہاتھ اٹھا سکتے تھے۔ البتہ قبیلہ قیس کے لوگ تھے اور کچھ تابع بعض کے رہ گئے تھے جو تعداد میں تھوڑے اور سفر کے تکان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ان لوگوں نے یوسف کو تسلی دی اور قرطبہ چلنے کا مشورہ دیا مگر صمیل اس وقت تک ابن معاویہ سے لڑنے ہی پر مصر تھا۔ انھیں مشوروں میں بارش شروع ہوگئی اور سردی کا موسم آنے کی وجہ سے دریاؤں میں طغیانی آگئی مجبوراً یوسف عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی طرف جانے کا ارادہ ترک کرکے قرطبہ روانہ ہوا۔

امیر یوسف ابن معاویہ کے پاس وفد بھیجتا ہے | راستہ میں ایک شخص نے یوسف سے کہا ابھی تک عبدالرحمٰن بن معاویہ کا ارادہ حصول ملک کی نسبت معلوم نہیں ہوا وہ تو حصول معاش اور پناہ لینے کی غرض سے آیا ہے اگر تم اس کو اپنا داماد بنانا چاہو گے اور رعایت وسلوک سے پیش آؤ گے تو یقین ہے کہ وہ اسے منظور کرلے گا اس لئے مناسب تو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک وفد بھیجو یوسف نے قرطبہ پہنچ کر عبید بن علی، خالد بن زید اپنے کاتب اور مولی اور عیسٰی ابن عبدالرحمٰن اموی منتظم ذخائر رسد و افسر فوج خاصہ (باڈی گارڈ) کا ایک وفد بھیجا اور تحائف میں کچھ سامان دو گھوڑے دو خچر دو غلام اور ایک ہزار دینار ساتھ کئے اور عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو لکھا کہ آپ کے اجداد نے ہمارے دادا عقبہ ابن نافع اور ان کے خاندان کے ساتھ سلوک کئے ہیں وہ بھولنے کے قابل نہیں۔ اس عبارت کے بعد عبدالرحمٰن کو اپنا داماد بنانے اور رشتہ قبول کرنے کے لئے بھی لکھا تھا۔

ارکان وفد کی ہوشیاری | یہ وفد یوسف سے رخصت ہو کر ارش پہنچا جو ضلع ریہ کے قریب واقع ہے یہاں عیسٰی ابن عبدالرحمٰن ملقب بہ تارک الفرس نے دوسرے ارکان وفد سے کہا کہ اسی عقل و دانش پر

یوسف اور صمیل زندہ ہیں تم نہیں جانتے کہ اگر ہم اس ہدیہ کو لے کر پہنچے اور عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو ناگواری ہوئی تو کیا وہ ہمارے پاس کا سارا مال و دولت لے کر اور مضبوط و قوی نہ ہو جائے گا۔ اور اس سے ہمارے امیر کو نقصان نہ پہنچے گا۔ لوگوں نے غور کیا تو اپنی رائے کی غلطی معلوم ہوئی اس لئے ان میں سے بعض نے کہا "تم اس سامان کے ساتھ یہیں ٹھہرو ہم ابن معاویہ کے پاس جاتے ہیں اگر ہم نے عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو راضی پایا تو اپنے کسی آدمی کو بھیج کر تم کو بلالیں گے تم یہ سب کچھ لے کر آجانا اور اگر اس کے سوا کچھ ہوا تو امیر یوسف کے پاس مع ان اشیا کے واپس ہو جانا۔ کیونکہ اپنے مال کا وہی زیادہ مستحق ہے" اس مشورہ کے بعد عبید و خالد طروش میں ابن معاویہ کے پاس پہنچے جو ابو عبداللہ کے یہاں ٹھہرے تھے ابو عثمان کے پاس اس وقت بنی امیہ کی جماعت مقیم تھی اور یمن کے لوگ برابر آتے رہتے تھے اور اپنا مرتبہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں دمشقی یعنی البیرہ والے، اردنی یعنی مالقہ والے اور قنسرین یعنی جیان والے بھی تھے۔ ان دونوں عبید ابن علی اور خالد ابن زید نے جداگانہ اپنے آقا امیر یوسف کا مدعا بیان کیا اور محبت و تعلقات کی دعوت دی اور یوسف کے ساتھ رشتہ کا ذکر کر کے حق سفارت ادا کیا پھر دونوں بیٹھ گئے ——

خالد ابن زید کی بیجا جسارت اور اس کا نتیجہ

اب خالد ابن زید نے خط پیش کیا اس سے ابن معاویہ نے خط لے کر ابو عثمان کی طرف بڑھا دیا اور کہا "اسے پڑھو اور جو کچھ ہماری رائے تمہیں معلوم ہے اس کے مطابق جواب لکھو" لوگ پہلے ہی وفد کے اغراض سے ہمدردی رکھتے تھے یہ سن کر لوگوں نے ایلچیوں سے کہا کہ "تمہاری تحریک بہت اچھی ہے مگر عبدالرحمٰن ابن معاویہ تو اپنے ورثہ کے طالب ہیں" جب ابو عثمان نے خط لیا تو اس سے خالد نے کہا "اے ابو عثمان کس خیال میں ہو جواب لکھنے سے پہلے بغل سے پسینہ آجائیگا" خالد بڑا ادیب و دانا تھا اس خط کا مضمون اسی کا مرتب کیا ہوا تھا مگر عجب و خود بینی کی ترنگ میں اس موقع پر لغزش کھا گیا۔ ابو عثمان کو خالد کے یہ الفاظ ناگوار گزری۔ اس نے خالد کو گالی دے کر خط اس کے منہ پر پھینک مارا اور کہا "نہ میں لکھوں گا نہ میری بغل سے پسینہ آئے گا" پھر لوگوں کو حکم دیا کہ خالد کو گرفتار کرلو خالد فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے عبدالرحمٰن ابن معاویہ سے کہا "یہ پہلی فتح ہے، یوسف کی کائنات

حکومت معلوم ہوگئی۔ خالد کے ساتھی عبید ابن علی نے کہا کہ "خالد ایلچی ہے اور ایلچی کو زوال نہیں۔" لوگوں نے جواب دیا "یہ کافر بچہ(۱) اپنی حد سے بڑھ گیا تھا تم ایلچی تو ایلچی ہو تمھیں کسی نے کچھ نہیں کہا اگر وہ دشنام و بدگوئی کی ابتدا نہ کرتا تو ایسا کیوں ہوتا۔ بعد ازاں ان سب نے عبید کو جانے دیا اور خالد کو قید میں رہنے دیا

وفد کے اموال پر قبضہ کی کوشش وفد کا جو مال ارش میں رہ گیا تھا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے لوگوں کو اُس کی اطلاع مل گئی۔ انھوں نے اس پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے تیس سوار بھیجے مگر عیسیٰ کو پہلے ہی خالد کے گرفتار ہوجانے کا علم ہو چکا تھا اس لئے وہ سب سامان لے کر قرطبہ واپس ہو گیا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے اس واقعہ کے بعد جب وہ امیر اندلس ہو گئے عیسیٰ کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ وہ عیسیٰ سے اکثر کہا کرتے تھے "تمھارے تقرب و محبت میں کوئی شک نہیں مگر تم نے جو کچھ کیا کیا اب اس کا کیا ذکر کریں" وہ یہ عذر کر دیا کرتے تھے کہ "وفاداری کا تقاضا تھا اس لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔" ابن معاویہ چونکہ عموماً اپنے موالی (مددگاروں) کا خیال کرتے تھے اس لئے انھوں نے امیر اندلس ہوکر عیسیٰ کی یہ خطا معاف کر دی اور جیسا سلوک اپنے دوسرے موالی کے ساتھ اس قسم کی خطا پر کیا تھا ویسا اُن کے ساتھ نہیں کیا۔

ابن معاویہ کے لشکر کی تنظیم اور یوسف کی فوج میں تفریق ابن معاویہ سے رخصت ہوکر عبید ابن علی یوسف کے پاس پہنچا اور یوسف کو خالد کی سرگزشت سے مطلع کیا یہ سن کر یوسف صمیل کو سخت ناگواری ہوئی اور صمیل نے یوسف کو ملامت کی تم نے میری رائے پر عمل کیوں نہ کیا اور عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی خبر پہنچتے ہی میرے مشورہ کے مطابق اس پر حملہ کیوں نہ کر دیا۔

غرض اس زمانے میں شدت سرما کی وجہ سے فریقین میں سے کوئی حرکت نہ کر سکا۔ جاڑے ختم ہونے تک ابن معاویہ تمام لشکروں اور بربریوں سے خط و کتابت کر چکے تھے۔ یمنی سب بالاتفاق

---

(۱) خالد کا باپ عیسائی تھا اور خالد نے یوسف کے یہاں پرورش پائی تھی اس لئے اس پر یہ چوٹ کی گئی۔

ابن معاویہ کے ساتھ ہو گئے۔ قبیلہ قیس میں سے جابر ابن علاء، ابن شہاب اور ابو بکر بن بلال عبدی اور حصین ابن وجن کے سوا کوئی ابن معاویہ کی طرفداری پر آمادہ نہیں ہوا۔ یہ تینوں بھی اس لئے طرفدار ہو گئے تھے کہ یوسف اور صمیل نے ابن شہاب کو قتل کرا کے جو بدسلوکی کی تھی یہ لوگ یوسف و صمیل سے اس کا انتقام چاہتے تھے علاوہ ازیں ان کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صمیل نے عبدی بلال اور بعض بنی ثقیف اور بنی امیہ کے تین سردار تمام بن علقمہ، عاصم عریان اور اس کے بھائی عمران کو زک پہنچائی تھی۔ الغرض جملہ اہل یمن اور تین سردار بنی قیس کے ابن معاویہ کے ساتھ اور باقی بنی قیس اور کل بنی مضر یوسف کے ساتھ ہوئے۔ اب یوسف نے اپنے لشکر کو شقندہ ضلع قرطبہ میں مجتمع کیا تاکہ البیرہ پر حملہ کر سکے۔ چنانچہ مضر اور یوسف کے حمایتی بنی قیس جمع ہو کر یوسف کا انتظار کرنے لگے۔ یمنی اور اموی ابن معاویہ کے پاس آ گئے۔

ابن معاویہ کی فوج میں اہل یمن و بنی قضاعہ کی شرکت

راوی کہتا ہے کہ جب عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اپنے خلاف یوسف کی تیاری کا علم ہوا اور لوگوں نے ان سے کہا کہ البیرہ میں جو یمنی اور بنی امیہ ہیں ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کی ذریعہ سے ہم قیس کی عداوت اور یوسف کی جمع کی ہوئی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے ہمیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یمنی لشکروں سے مل جائیں جو حمص یعنی اشبیلیہ فلسطین یعنی مدینہ شذونہ، اردن یعنی مالقہ میں ہیں۔ اور ان کو لے کر یوسف کے لشکر پر حملہ کریں۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے اس رائے پر عمل کیا۔ سب سے پہلے اہل اردن یعنی مالقہ والے عرب جو زیادہ قریب تھے ملے پھر تمام اہل یمن و قضاعہ شامل ہوئے اور ان لوگوں نے دوسری فوجوں کی بھی توقع دلائی۔ اہل اردن یعنی مالقہ والوں میں ان کے سردار کم شریک تھے۔ یہاں سے عبدالرحمٰن ابن معاویہ شذونہ کی طرف آئے جہاں لشکر فلسطین کے عرب رہتے تھے۔ شذونہ میں قوم کے سرداروں اور لشکر کے مددگاروں نے بہت جلد تیار ہو کر عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی رفاقت اختیار کر لی لیکن یہاں وہ لوگ جو بنی کنانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے سرداروں کے ساتھ کنانہ ابن کنانہ کی سرکردگی میں یوسف کی امداد کے لئے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔

اشبیلیہ کے لشکر کی شرکت | عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے شذونہ پر اپنے تسلط کے بعد بنی کنانہ کی باقیماندہ اولاد و اقارب سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آگے بڑھا تو اشبیلیہ کا لشکر بھی ملا جس میں حمص کے لشکری تھے۔ اس موقع پر چیدہ چیدہ لوگوں نے جس میں شامی اور بلدی عرب تھے۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ سے ملاقات کی۔ یوسف کو عبدالرحمٰن کی آمد معلوم ہوئی تو وہ بھی پوری طرح تیاری کر کے حملہ آوروں کے مقابلہ کو چلا۔ اس سلسلہ میں جو گروہ جس فریق سے ہمدردی رکھتا تھا اسکی امداد کے لئے اس کے لشکروں میں شامل ہوگیا۔

ابن معاویہ کے لشکر کا علم اور اسکی کیفیت | عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے پاس اس وقت تک کوئی جھنڈا نہ تھا۔ امدادی فوجوں کے پاس اپنے اپنے جھنڈے تھے۔ ان لشکروں نے آپس میں کہا کہ ہمارا کام بھی کتنا الٹا ہے، ہمارے پاس تو جھنڈے ہیں مگر ہمارے امیر کے پاس نہیں یہ سن کر ابو الصباح یحییٰ یحصبی ایک نیزہ اور ایک عمامہ لے آئے۔ نیزہ حضرموت کے ایک شخص کا تھا۔ پھر ان لوگوں نے انصار کے ایک نامعلوم شخص کو بلا کر اس کے نام و نسب سے فال لی اور قریہ قلنبیرہ ضلع طشانہ علاقہ اشبیلیہ میں یہ جھنڈا اس کے سپرد کیا۔ مجھ سے کئی بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ نامعلوم شخص حقیقت میں ابو الفتح صدفوری مشہور عابد تھے۔

ابو الفتح صدفوری اور فرقد العالم | ابو الفتح صدفوری پر شوق جہاد غالب تھا۔ یہ کبھی کبھی جہاد ہی کے لئے سرقسطہ کی سرحد پر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے اور کبھی اپنے سکونہ سرحد قلنبیر پر قیام کرتے تھے۔ ان کے تعلقات دونوں زمانوں میں فرقد العالم کے ساتھ دوستانہ رہے جس سرحد میں جاتے فرقد ان کے ساتھ ہوتے تھے، جب فرقد چلے جاتے تو یہ قلنبیرہ میں منتقل ہو جاتے تھے غرض یہ دونوں تقریباً ہر زمانے میں ساتھ رہے۔

علم کے متعلق فرقد العالم کی پیشگوئی | ابو الفتح کہا کرتے تھے کہ ایک بار فرقد ہمارے ساتھ جا رہے تھے جب شہر قسطونہ کے ضلع جیان میں پہنچے تو فرقد العالم نے کہا مجھے اس شہر کی نسبت ایک بری خبر کا خطرہ ہوا ہے۔ میرے پاس آؤ تو کہوں،، میں ان کے قریب ہو لیا۔ اس وقت انھوں نے مجھ کو اسی واقعہ کی پیشین گوئی کی جو امیر ابن معاویہ اور امیر ابوالاسود ابن یوسف کے درمیان پیش آنے والا تھا چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ پھر فرقد العالم نے ابن معاویہ کی آمد

کا حال بیان کیا اور کہا جب ہم صوبہ اشبیلیہ میں پہنچیں گے تو تمھیں وہ جگہ دکھائیں گے جہاں عبدالرحمٰن ابن معاویہ کا جھنڈا باندھا جائے گا اور اس کے پاس ایک فرشتہ اُن فرشتوں میں کا آئے گا جو جھنڈوں کی فتح و نصرت پر مقرر ہیں اور اس کے ساتھ چالیس ہزار فرشتے ہوں گے جن کے پیش پیش فتح و نصرت چلتی ہے اور چالیس دن کے اندر دشمن مقہور ہو جاتے ہیں اور فتح کامل ہو جاتی ہے۔

علم کا احترام اور اس کا خاتمہ امیر ہونے کے بعد عبدالرحمٰن ابن معاویہ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس عمامہ کی اتنی عزت کی کہ جب اس کا کوئی حصہ پرانا ہو جاتا یا پھٹ جاتا تو اس پر دوسرا کپڑا چڑھا دیتے اور پیوند پر پیوند لگا کر اسی طرح پھر نیزہ پر باندھ دیتے تھے۔ ہشام و حکم و عبدالرحمٰن کے زمانہ تک جنگ ہائے مارہ میں اس نیزہ کا احترام اسی طرح ہوتا رہا۔ جب عبدالرحمٰن ثانی کے زمانہ میں لوگوں نے عمامہ کو بدلنا چاہا تو اس میں بہت سے پرانے پیوند لگے ہوئے دیکھے۔ عبدالرحمٰن ابن غانم اور اسکندرانی نے ان کو نیزہ سے اتار کر پھینک دیا اور ان دونوں نے اس کے بدلے ایک نیا عمامہ باندھا اس وقت جمہور وہاں موجود نہ تھے جب آئے تو انھوں نے اس حرکت کی مخالفت کی اور ان چیتھڑوں کے اوصاف بیان کر کے ان کو منگوالیا مگر وہ تلاش کرنے پر بھی کسی کو نہ ملے۔

قرطبہ پہنچنے میں تعجیل کی کوشش اس زمانے میں یوسف مدور صدف میں تھا جب فریقین کی فوجیں حرکت میں آئیں تو دونوں کے درمیان ایک دریا حائل تھا۔ ابن معاویہ طشانہ میں اتر گئے یہ واقعہ ابتدائی ذی الحجہ ۱۳۸ھ کا ہے چونکہ دریا طغیانی پر تھا پانی بہت تھا اس لئے عبور کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے دریا کا زور کم ہو جانے کے خیال سے تھوڑے دن اور انتظار کیا۔ پھر ابن معاویہ نے چاہا کہ قرطبہ پہنچنے میں یوسف سے سبقت کریں کیونکہ ان سے یہ کہا گیا تھا کہ وہاں عموماً آپ کے موالی رہتے ہیں جو بکثرت ہیں اس لئے عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے راتوں رات تیاری کر کے کوچ کر دیا تاکہ یوسف سے پہلے قرطبہ پہنچ جائیں۔ قرطبہ کا فاصلہ طشانہ سے پینتالیس میل تھا۔

ابن معاویہ کے ارادہ سے واقف ہو کر یوسف کا سبقت کی سعی کرنا عبدالرحمٰن ایک میل بھی نہ چلے تھے کہ یوسف کو ایک واقف کار نے عبدالرحمٰن کے ارادہ سے مطلع کیا اور یوسف بھی قرطبہ کی طرف

چل پڑا۔ اب یہ دونوں گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح تیز تیز چل رہے تھے۔ دریا ان کے درمیان حائل تھا۔ دریا کے ایک جانب ابن معاویہ اور دوسری جانب یوسف اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ اس گھوڑ دوڑ میں مصروف تھے اور دونوں کی منزل قرطبہ پر ختم ہوتی تھی۔ ابن معاویہ نے یوسف کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ میرے ارادے سے واقف ہو گیا ہے اس لئے آگے نہ بڑھے اور اب یوسف بھی دریا پار وہیں ٹھہر گیا۔ اس کے بعد پھر یہ دونوں سفر کرتے رہے آخر یوسف مسارہ میں اترا اور ابن معاویہ دریا کے اس پار بلش میں ٹھہر گئے۔

اس وقت ابن معاویہ کے ہمراہیوں میں سے جو لوگ کم ظرف اور ان کے رتبۂ امارت سے ناواقف تھے وہ ان سے علٰحدہ ہو گئے یہ لوگ صرف اس امید پر ساتھ ہو گئے تھے کہ عبدالرحمٰن قرطبہ آئیں گے تو ہماری معاش وسیع ہو جائے گی اور اہل قرطبہ کو بھی مدد پہنچے گی۔ درحقیقت یہ لوگ معاش کی طرف سے سخت مصیبت میں تھے۔ صرف ساگ پات پر بسر کرتے تھے۔ چونکہ یوسف کی وجہ سے ان لوگوں کو فی الحال یہ امید پوری ہوتی نظر نہ آئی۔ اس لئے یہ لوگ عبدالرحمٰن ابن معاویہ سے علٰحدہ ہو گئے۔ برخلاف ابن معاویہ کے یوسف نہایت آرام سے اپنی منزل پر پہنچا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے جہاں چاہا قیام کیا۔

مقابلہ کے لئے ابن معاویہ کے لشکر کی تیاری اور ترتیب عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی جماعت برابر ترقی پر تھی۔ جن لوگوں کے دل ذرا بھی مضبوط تھے وہ سب مثلاً قرطبہ کے بنی امیہ اور یمنی۔ عبدالرحمٰن کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ یوم پنج شنبہ ۹ ذی الحجہ کو یعنی عرفہ کے دن دریا کا زور کم ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی جماعت سے کہا اے لوگو ہم یہاں ٹھہرنے کے لئے نہیں آئے ہیں اور یہ تم جانتے ہو کہ ہم کو یوسف نے کس بات پر توجہ دلائی ہے اور ہم سے کیا چاہا ہے۔ اب میں تمہاری رائے میں متفق ہوں جیسا تم مشورہ دو گے اس پر عمل کروں گا۔ اگر تم مضبوط و قوی ہمت ہو اور مقابلہ کو پسند کرتے ہو تو مجھے مطلع کرو اور اگر امن و صلح کی طرف مائل ہو تو ویسا کہدو۔ تمام یمنی قبائل نے متفق ہو کر جنگ پر آمادگی ظاہر کی بنی امیہ نے بھی یہ دیکھ کر علٰحدہ علٰحدہ لشکر ترتیب دئے اور اہل شام کے سوار فوج پر عبدالرحمٰن ابن نعیم

کلبی اور یمنی پیادوں پر بلوحہ لخمی جو اہل فلسطین سے تھا۔ اور بنی لمہ کے پیادوں اور بربری سپاہیوں پر

عاصم العریان | عاصم العریان سردار بنائے گئے۔ عاصم کو عریاں اس لئے کہتے ہیں کہ ایک موقع پر وہ صرف پاجامہ پہن کر لڑا اور اللہ نے اسے فتح دی بنی امیہ کی سوار فوج پر حبیب ابن عبدالملک قرشی جو عمر بن عبدالولید کی اولاد سے تھا سردار مقرر ہوا۔ بربریوں کی سوار فوج میں سے جو لوگ عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے ان پر ابراہیم ابن ہجرہ اودی افسر بنایا گیا۔ جھنڈا ابوعثمان کو تفویض ہوا۔ اس وقت عبدالرحمٰن ابن معاویہ بنی امیہ کے گروہ میں گھرے ہوئے کھڑے تھے اور کمان ہاتھ میں لئے ہوئے ایک اشقر گھوڑے پر سوار تھے۔

صلح کی امید موہوم پر یوسف کے یہاں دعوت کا انتظام | ان تمام تیاری کے بعد حملہ آوروں نے دریا کو عبور کیا۔ مگر یوسف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اسی شام کو اپنے مخالفوں سے صلح کے لئے مراسلت شروع کی قریب تھا کہ تمام مراحل طے ہوجائیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعض بنی امیہ صلح پر حریص تھے۔ اس لئے یوسف نے بکریاں اور گائیں ذبح کرکے سب کے لئے راتوں رات کھانا پکوایا تاکہ دونوں لشکروں کو دعوت دے کیونکہ اس کے نزدیک فیصلہ صلح میں کوئی شک نہ تھا۔ برخلاف اس کے ہمارا گمان یہ ہے کہ ابن معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے یوسف کو صلح کی امید اس لئے دلائی تھی کہ وہ ابن معاویہ کی فوجوں کے دریا سے اترنے میں مزاحمت نہ کریں۔

ابن معاویہ اور یوسف کی فوجوں کا مقابلہ یوسف کی فوج کا انتظام | جمعہ کی صبح کو جب کہ عیدالضحیٰ کی صبح بھی تھی صلح کی توقعات موہوم ثابت ہوئیں اور دفعۃً جنگ شروع ہوگئی۔ یوسف کی فوج کا انتظام یہ تھا۔ تمام اہل شام اور اہل مضر کی سوار فوج پر عبید ابن علی اور پیادہ فوج پر کنانہ ابن کنانہ کنانی اور جوش بن صمیل افسر تھے۔ پیادہ فوج پر یوسف نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی مقرر کیا تھا اور اپنے غلاموں اور پروردوں کے گروہ پر اپنے غلام خالد سودی کو نگران بنایا تھا۔ خالد کی زیر کمان فوج میں یوسف کے موالی اور بربری اور عوام کثرت سے تھے۔ عبید بن علی کے ساتھ میسرہ میں بنی قیس کے سوار تھے۔

(باقی)



بقائے صحت کی

نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے ناآشنا تھے آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتی ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنسدانوں نے ہر گھر میں اس کو لیجانے کی کوشش کی ہے۔ ایک بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت، حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج، گٹھیا، ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بےمثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیا لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: زنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ نمبر ۲۸ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۷ بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء نمبر ۳

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا۔

فی پرچہ ۸ر

منکرینِ حدیث

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اسی وقت سے اہلِ علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اس کی حقیقت ہی کو نہیں مانتے یا اس کو بالکل جھوٹ جانتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے۔ دینِ خالص ان کے نزدیک سوائے قرآن کریم کے اور کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں جس سے عہدِ رسالت اور زمانہ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور بس۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اُس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا۔

"قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عائد کیے گئے ہیں ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص، اور کسی کو صرف مباح، اور یہ سب کچھ اُن روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو اُن لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ ان سے ملے اور باوجود اس کے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جن کی عدالت اور ثقاہت تمہارے نزدیک مسلم ہے تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے، پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الٰہی کے احکام اور فرائض میں ان کے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو۔"

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے، اور سنت وہی ہے جس کو قرآن نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ یَتْلُوْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۳/۱۵۹ (۱)

مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو ان کے اندر انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری آیت ہے

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا ۵۹/۸

رسول جو تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سن کر اس منکر نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کا اعتراض روایت اور ذریعۂ خبر کے متعلق تھا کہ مشتبہ ہے اس لئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ علاوہ بریں "الحکمۃ" سے جو انھوں نے سنت مراد لی ہے کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت قرآن میں شامل اور منزل من اللہ ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات میں جا بجا تصریح ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۴/۱۱۳

اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی

سورۂ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشرہ کے مقابل احکام سیزدہ گانہ نازل کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے

ذٰلِکَ مِمَّا اَوْحٰی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ۱۷/۳۹

یہ اس حکمت و دانشمندی کی باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ

---

(۱) ہر آیت کے ساتھ اوپر شمار سورہ کا ہے نیچے آیت کا۔

واذکرن ماتتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمہ	تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد کرو۔

سے معلوم ہوا کہ "الحکمۃ" بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون تلاوت کرتا ہے، مگر باوجود اس کے شافعی جیسے امام نے جو ائمہ مذاہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پر مصر رہے، حالانکہ ان کا خود قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے۔ پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہو سکتی ہے۔

دوسری آیت "ما آتاکم الرسول" مال فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اس کو سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہل حدیث علما آج تک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار وقد استدل بذالک من یقول بعدم الاعتماد علیہا فی الدین	بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہ کا توقف کرنا ثابت ہو چکا ہے۔ اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے، مگر ان کا کوئی جداگانہ فرقہ کبھی نہ تھا، بلکہ یہ ارباب فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال وافکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کے دلائل و براہین دیکھے ہیں جو اس کثرت سے ہیں کہ ان کے لکھنے کے لئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے۔ اس لئے میں ان کی جزوی باتوں کو چھوڑ کر صرف سات اصولی دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو ان کا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہئے کیونکہ وہی فریقین کی مسلم کتاب ہو۔ جو آیات سند میں لکھی جائیں ان کی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہئے نہ کہ روایات سے۔

(۱) گزشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا، اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا ہے۔

قولوا امنا باللہ وما انزل الینا الآیہ ۲/۱۳۶	کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی
آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ۲/۲۸۵	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی، اور مومنین بھی
وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب ۴۲/۱۵	اور کہدو کہ میں ایمان لایا اس پر جو اللہ نے اتارا یعنی کتاب

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے۔ بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

فبای حدیث بعدہ یومنون ۷/۱۸۵	اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟
فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ۴۵/۶	اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر وہ ایمان لائیں گے؟

زیادہ تصریح اس آیت میں ہے۔

ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذ ہا ہزوا۔ اولئک لہم عذاب مہین ۳۱/۶	بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم (یقین) کے۔ اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے خوار

کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں "لہوالحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے یعنی گانا۔ اور اس کی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں لہوالحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنا کی غرض نشاط وطرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کی راہ کو مذاق بنانا ہے اور نہ اس کو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لہوالحدیث ہیں۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے، اس لئے اس کے اقوال و اعمال جن کا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بن گئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بے شک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۲۸۵ | اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا۔ اُسی کی اتباع۔ اُسی کی تلاوت۔ اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اُسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا۔ اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا۔ اس کے اتارنے والے نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا کیا حدیثوں کے لئے ان میں سے کوئی ایک بات بھی تم ثابت کر سکتے ہو؟ - حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اس کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بہ سلسلہ امت میں پھیلیں۔ ایک زمانہ کے بعد تم نے اصول مقرر کر کے ان میں سے کسی کو قابل تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد کر دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان کے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح ان کو جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو درانحالیکہ وہ اصول بھی جن کے اوپر حدیث کی

صحت کا دار و مدار تم نے رکھا ہے یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں۔ رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی امت کے لئے ان کا پیغام ہے۔

واوحی الی ہذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۱۹/۶	مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کردوں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں ماموربہ ہے۔

اَطِیْعُوا اللہ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ واُولی الاَمرِ مِنکم فَاِنْ تنازعتم فی شیءٍ فردّوہ اِلی اللہ والرَّسول ۵۹/۴	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امرا ہوئے ہیں ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک مجموعہ احادیث ہونا چاہئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت، باذن الٰہی، اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۶۴/۴	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۸۰/۴	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور زبانی بالمشافہہ اطاعت مراد ہے۔ اس کے لئے دفاتر تیار کرنے کی

ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے۔

يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله ورسوله ولا تولوا عنه وانتم تسمعون ۸/۲۰	اے مومنو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہو گی اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے جو اس کی جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کی طرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اس کی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے۔

فاحكم بينهم بما انزل الله ۵/۴۸	ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کر
انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله ۴/۱۰۵	ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر۔

دراصل حَکَم کتاب اللہ ہی ہے۔ رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور ہیں اسی لئے فرمایا۔

ان اختلفتم فی شیٔ فحکمه الی الله ۴۲/۱۰	اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے

اللہ کے فیصلہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کی رو سے فیصلہ کیا جائے۔

افغير الله ابتغى حكما وهو الذى انزل اليكم الكتاب مفصلا ۶/۱۱۵	کیا اللہ کے سوا کوئی حکم تلاش کروں اور وہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی
ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون ۵/۴۷	جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں

(۲) اتباع کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم یہ ہے۔

اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم ولا تتبعوا من دونه	اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کے یہاں

اولیاء ﷺ | سے اتار گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ﷺ | کہدے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے۔

اتبع ما اوحی الیک من ربک ﷺ | پیروی کر اس کی جو تیرے رب کے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی

پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے

قل انما اتبع ما یوحیٰ الی من ربی ﷺ | کہدے کہ میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

لہذا رسول بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا۔ اس لئے اس کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے۔

یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا جس کے ثبوت میں آیت

ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ ﷺ | وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

پیش کی جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی۔ چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک ﷺ | اور پڑھ کر سنا دے جو وحی کی گئی ہے تیری طرف۔ یعنی اپنے رب کی کتاب۔

واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ﷺ | اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تم کو اس کے ذریعے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک وہ پہنچے۔

قل انما انذرکم بالوحی (۲۱/۴۵) | کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار قرآن ہی ہے۔ اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے
جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں، متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں وہ محض ان کی خیالی تقسیم ہے۔ بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی کی ہیں لیکن ہمارے رسول کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

نَزَلَ بِہِ الرُّوحُ الاَمِینُ علیٰ قلبِک (۲۶/۱۹۵) | روح الامین اس کو لے کر تیرے قلب پر اترا ہے

(۳) قرآن خالص اور دائمی حق ہے۔

وَیَرَی الَّذِینَ اُوتوا العِلمَ الَّذِی اَنزَلَ اِلَیکَ مِن رَّبِّکَ ھُوَ الحَقُّ (۳۴/۶) | اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا ہے وہی حق ہے

یقینی ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ (۲/۲) | یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

روح الامین اس کو لاتا ہے اور رسول امین پر اتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگائے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہو سکے چنانچہ وہ جن جنہوں نے قرآن سنا تھا کہتے ہیں۔

کُنَّا نَقعُدُ مِنہَا مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد لہٗ شہابا رَّصَدا (۷۲/۹) | ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر، مگر اب جو سنتا ہے تو شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اس کے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے

انا علینا جمعہ وقرآنہٗ (۷۵/۱۷) | یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اس کو یاد کرا دیں گے اور پڑھا دینگے

اس بات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرا دینے کے بعد تم اس کو بھولو گے نہیں۔

سَنُقرِئُکَ فلا تنسیٰ (۸۷/۶) | ہم تمہیں پڑھا دیں گے پھر تم اس کو نہ بھولو گے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (۱۵/۹) | ہم ہیں کہ ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہیں کہ اس کے نگہبان

ہیں۔

وہ اس کے لفظ لفظ کا محافظ ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے کلمات کو بدل سکے۔

وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِہٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ۱۸	اور سنا جو کچھ تیری طرف وحی کی گئی ہے یعنی اپنے رب کی کتاب۔ کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں۔ اور اس کے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملے گی۔

اور حدیثیں بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے(۱) باتفاق ائمہ حدیث تمامتر ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔

خبر الواحد لا یفید العلم (المستصفیٰ جزو اول صفحہ ۱۴۵)	خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی

خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے

انا نرید بخبر الواحد فی ہذا المقام ما لا ینتہی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فہو خبر الواحد	ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے۔ مثلاً جس خبر کو ایک جماعت پانچ چھ آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں۔

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۱۱۶	روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے گا تو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔
وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُھُمْ اِلَّا ظَنًّا۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ	اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق

---

(۱) جن حدیثوں کی بابت بعض علماء حدیث نے تواتر لفظی کا دعوے کیا ہے ان کی تعداد تین چار سے زائد نہیں۔ ان میں بھی دین کی کوئی اہم بات نہیں ہے اور ان کا تواتر بھی قصداً ظہور میں نہیں آیا بلکہ اتفاقی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ایک حدیث بھی متواتر موجود نہیں۔

شیئاً ۵۳/۲۸ | کا کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ۱۷/۳۶ | اور اس کے پیچھے نہ چل جس کا تجھ کو علم نہیں۔

اس لئے حدیثیں دینی امور میں کار آمد نہیں۔ صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

(۴) سرچشمۂ دین اللہ ہی ہے۔

شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّینِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوحاً وَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ ۴۲/۱۳ | اللہ نے تمہارے لئے وہی دین شروع کیا جس کی وصیت اس نے نوح کو کی تھی اور جس کو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اولین رسل حضرت نوح علیہ السلام سے خاتم رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک وہی دین ہے جو اللہ نے شروع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْہَا ۴۵/۱۸ | پھر ہم نے تجھ کو (عالم)[1] امر کی شریعت پر لگا دیا ہے۔ اسی کی اتباع کر۔

قرآن اتار کر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور یہ اعلان فرمایا

---

(۱) عالم امر جس کے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات عہمہ میں سے ہے۔ اسکے سمجھ لینے سے عرش۔ ملائکہ۔ روح۔ وحی۔ دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہو جاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کی طرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا۔ جس کے وجہ سے بہت سے اختلافات پڑے اور نزاعین واقع ہوئیں منجملہ انکے فتنۂ خلق قرآن تھا جس میں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے۔ خاص کر امام احمد ابن حنبل جیسے بزرگ اٹھائیس مہینے تک قید و ضرب کی سختی جھیلتے رہے۔ اگر اس وقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہو جاتا اور نزاع نہ ہوتی نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم ثابت کرنے کے لئے حدیثیں بنائیں۔ کیونکہ اس رسول اعظم و مہبط وحی سے جس کی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور جو اپنی نورانی چشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا فیضان عالم امر سے ہے جو سراسر حادث ہے قطعاً ناممکن تھا کہ اس کو قدیم کہدے۔ اسی طرح استوا علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں رہی بلکہ آجتک ہے اور علماء کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آگئی اور ہم نے نور مبین تمہاری طرف اتارا۔ دیا اب جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو وہ ان کو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دے گا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتاب حقیقت نے اس کے افق قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سرمایۂ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا۔ اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴿۱﴾ کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا۔ اسی کو سناتا اسی کو لکھاتا، اسی کو یاد کراتا۔ اسی کو سکھاتا اور اسی پر عمل کر کے امت کے لئے نمونہ قائم کرتا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴿۲۱﴾ | تمہارے لئے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ نکاح و طلاق۔ جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کر کے طریقہ بتا دیا جو امت میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر متوارث چلا آ رہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے تمہارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے۔ آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کئے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان و زمین کا فرق ہے تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی ہے۔ تعامل احکام قرآن پر عمل کی صورت ہے اور حدیثیں اس سے

دس گنی بلکہ سو گنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں اور قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کی ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف ہنگامی یا مقامی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالمگیر فطرتی دین کو جو ہر ملک اور ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے۔ مگر حدیثیں مسلمان کے لئے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں۔ انھوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اس کو چھوڑو اور اس کو منڈاؤ۔ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں جن کی وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے مالدار مسلمان پر مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۲	تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ اہل تقوے پر یہ ایک حق ہے۔

مگر حدیث کہتی ہے۔

لا وصیۃ لوارث	کسی وارث کے لئے وصیت نہیں۔

علما نے اس ظنی حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقوے پر ایک حق قرار دیا ہے۔ منسوخ کر ڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہی خود بعض جگہ اس کے برخلاف ہیں۔ مثلاً۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ الآیہ ۱۵	ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے۔

"صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے

دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا "چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں" دوسرے نے کہا "پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا)۔ اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئیں۔ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ زنا نہ کرو۔ کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ۔ سود نہ کھاؤ کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ۔ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔(۱)

یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن جریر میں ہے امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری "باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل" اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح" (سیرۃ النبی جلد سوم طبع دوم صفحہ ۱۳۴)

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا قطعاً محال ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اس وقت ملیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو رسول بنا کر فرعون کی طرف بھیجا۔ اور اس وقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي | موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نو نشانیاں دیں (تو بنی اسرائیل سے

---

(۱) نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لئے تھے۔ توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا وامر قومک یاخذوا باحسنہا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کو بہترین طریقہ سے لیں۔

اسرائیل، اذ جاءہم فقال لہ فرعون انی لاظنک یا موسیٰ مسحورا۔ قال لقد علمت ما انزل ھٰؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض بصائر ۱۰۲ | پوچھ لے، جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے اس نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ان کو نہیں اتارا آسمان اور زمین کے رب نے مگر نشانیاں۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لے کر حضرت موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورۂ نمل میں ہے۔

فی تسع آیات الیٰ فرعون و قومہ | نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مسلسل بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کر دی گئی ہے۔

فالقیٰ عصاہ فاذا ہی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ہی بیضاء للناظرین ۱۰۸ | موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدہا ہو گیا۔ اور اپنا ہاتھ نکالا وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید تھا۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳۰ | آل فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا۔

فارسلنا علیہم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم آیات مفصلات ۱۳۱ | پھر ہم نے بھیجا طوفان۔ ٹڈی۔ چچڑیاں۔ مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں۔

عصا ۱ - ید بیضا ۲ - قحط ۳ - نقص ثمر ۴ - طوفان ۵ - ٹڈی ۶ - جوئیں ۷ - مینڈک ۸ - خون ۹

اس کے مدتوں بعد فرعونی ہلاک کئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے طور ایمن کی طرف پہنچتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ ان کو توریت عطا کرتا ہے۔

یا موسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی وبکلامی فخذ ما اتیتک وکن من الشاکرین وکتبنا لہ فی الالواح | اے موسیٰ! میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کے لئے چن لیا۔ جو میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر۔ اور ہم

مِن کُلِّ شَيْءٍ مَوعِظَۃً وَتَفصِیلًا لِّکُلِّ شَيْءٍ ۱۳۵ | نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھدی۔

یہ تمام تفصیلات اس قدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی۔ مگر پھر بھی ان کے خلاف یہ "چار آنکھوں والی" حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؛ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی۔ اسی پر یہ معاملہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ چونکہ ان یہودیوں نے خوش ہو کر آنحضرتؐ کے دست و پاکو بوسہ دیا تھا اس لئے حدیث میں ایک باب "تقبلۃ الید والرجل" کا اور اضافہ ہوجاتا ہے جس سے علما کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا جاتا ہے۔ اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لئے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک اس کی ضمانت کرتی ہیں۔

۲۔ ان ائمہ کے حسنٌ صحیحٌ کہنے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

۳۔ جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور جاودانی حق کے خالص دین ماننے کو الحاد و بیدینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا۔

لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن الخ | مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابوشاہ کو لکھوا دیا یا کسی خاص صحابی کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا۔ عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے۔ اور یہی صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔ چنانچہ ابو داؤد کتاب العلم میں ہے۔

وقد زید بن ثابت علی معاویۃ فسالہ عن حدیث | حضرت زید بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے انھوں

فامرنا ان نکتبہ فقال لہ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لا نکتب من حدیثہ فمحاہ

نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ اس کو لکھ لے زید نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہو کہ ہم ان کی حدیث نہ لکھیں۔ اس لئے اس کو مٹا دیا۔

اس سے علماء حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہو جاتی ہے جو انھوں نے کی ہے کہ ممانعت کتابت حدیث کا حکم صرف اس لئے تھا کہ حدیثیں آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔

بے شک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اس کو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا۔ جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کرکے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو، آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔(۱)

انھوں نے خود تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا۔ اس کو بھی آگ میں جلا دیا۔(۲)

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اور بھی زیادہ سختی برتی۔ اگر کوئی روایت کرتا تو درے لے کر اس کو مارنے کو تیار ہو جاتے اور جب تک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

قال عبداللہ بن علا، سالت القاسم بن محمد بن ابی بکر ان یملی علی الحدیث۔ فقال ان الاحادیث قد کثرت علی عہد عمر بن الخطاب فانشد الناس ان یاتوہ بہا۔ فلما اتوہ بہا امر بتحریقہا۔ ثم

عبداللہ بن علا کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائیے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثیں زیادہ ہو گئی تھیں انھوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں ان کے پاس لائیں، جب لائے تو حکم دیا کہ ان کو جلا دو۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابوبکر۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ۔

قال مشناة کمشناۃ اہل الکتاب۔ قال فنسی القاسم یومئذ ان اکتب حدیثا(طبقات ابن سعد جز خامس صفحہ ۱۱)	پھر فرمایا کہ سنت جیسے اہل کتاب کی سنت (۱) علماء کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم لکھا ہوا تھا جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو (۲) حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لے لیتے تھے (۳)

حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابوہریرہ کی حدیث "الوضوء مما مستہ النار" اور حضرت علی کی حدیث "نہی عن المتعہ" اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا (۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ قرآن کی طرح اس کی بھی حفاظت کرتے۔ بے شک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روایتیں قبول کی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو عینی گواہ مل جاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس کو سنا ہے۔ مگر عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہوگیا اور شہادت در شہادت در شہادت عقلاً۔ عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۶) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے۔ حدیث کے جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرطیں رکھی ہیں ان میں جو فرق مراتب ہے وہ رواۃ کی ثقاہت ہی کا ہے۔

---

(۱) یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جس کا نام مشناۃ رکھا تھا۔

(۲) توجیہ النظر صفحہ ۱۰۔ (۳) توجیہ النظر صفحہ ۱۱ (۴) توجیہ النظر صفحہ ۱۰

امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت لیتے ہیں[1]۔ امام مسلم کہیں کہیں درجہ دوم والوں کی بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کونسی میزان ہے۔ کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں؟ پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق ایک باطنی[2] وصف ہے جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہو سکتی۔ لہذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابۂ کرام کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔

علامہ ابن صلاح کہتے ہیں۔

للصحابة باسرهم خصيصة، وهي ان لا يسال عن عدالة احد منهم بل ذلك امر مفروغ عنه (مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۹)	جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ بلکہ ایسا امر ہے کہ طے شدہ ہے۔

پھر اسی صفحہ میں ہے۔

ان الامة مجمعة على تعديل جميع الصحابة ومن لابس الفتن منهم كذالك.	تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا اجماع ہے۔ ان میں سے جو فتنوں میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

صحابہ کی تعریف بھی انہیں کی زبان سے سن لیجئے۔

المعروف من طريقة اهل الحديث ان كل مسلم رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو من الصحابة	طریقۂ اہل حدیث کے مطابق مشہور یہی ہے کہ ہر مسلم جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا وہ صحابی ہے۔ (مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۰)

---

(۱) امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں صرف ۷۲۷۵ شرط کے مطابق تھیں جو انھوں نے درج کیں۔ ان میں سے اگر مکررات نکال دی جائیں تو یہ تعداد چار ہزار سے بھی کم رہ جاتی ہے (مقدمہ صحیح بخاری)

(۲) عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ راسخہ ہے جو عقل علم دینداری اور تقوے سے پیدا ہو کر جھوٹ سے باز رکھے۔

صحابہ کرام کی عظمت وجلالت شان کی وجہ سے ہم اس اصول پر جو غیر صحیح۔ قرآن کے خلاف اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طرف تو یہ فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دے دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بخل کہ ان کی تعریف میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۹/۱۰۲	اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کو تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا۔ نیز واقعہ "افک" میں جو لوگ شریک تھے جن پر حد قذف پڑی جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

لا تقبلوا لهم شهادة ابدا ۲۴/۴	نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے۔ علاوہ بریں ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض	میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑ کر باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا ان کو بھی ابوبکر وعمر کے ساتھ ثقاہت کے پلہ میں ہم وزن رکھ دیا جاتا ہے۔

صحابہ کے بعد ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح وتعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے۔ بہت سے کذاب۔ خبیث اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں۔ اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے۔ پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کمتر ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں۔ ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اسی کو کاذب بناتا ہے[1]۔ اور یہ سب

(۱) کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بیداغ نکل گیا تو تدلیس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا۔ بڑے بڑے ائمہ

کچھ محض ظن۔ تری تخمین اللہ نے فرمایا ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۵۱/۱	اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے

آپ کہیں گے کہ شک کی دوا اتقان کے پاس بھی نہیں۔ مگر منکرین کو شک کی بیماری نہیں ہے۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ اپنے نبی پر نازل کردیتا ہے۔ اس علیم و حکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ بزرگوں کو جرح و تعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں(۱) پھر دین کا پتہ لگائیں۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۵/۱۹	لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں ان کو اللہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اس کا پیغام ایک۔ اس کی راہ عمل ایک اور اس کی منزل مقصود ایک ہی۔ وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا ہے بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعۂ وحدت بنانا چاہتا ہے۔ اس نے جملہ انبیاء و رسل کی امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۲۱/۹۲	یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

مثلاً حسن بصری۔ مکحول شامی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور دارقطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑ کر روک لیا۔ (طبقات المدلسین ابن حجر)

(۱) مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے۔ تعدیل میں زیادہ کارفرما یہی جذبہ تھا۔ ذرا بھی کوئی مخالف نکلا کہ مجروح ہوا۔ جرح و تعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھلانے کے قابل ہے۔

فرقہ بندی کو وہ کفر وضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۶/۱۶۰

جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کرلیا اور گروہ گروہ ہوگئے ان سے (اے محمد) تجھکو کوئی واسطہ نہیں۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۳/۱۰۵

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے نشانیوں کے آجانے کے بعد تفریق ڈالی۔ وہ لوگ تو وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۳۰/۳۲

تم مشرک نہ ہو یعنی وہ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے ان کی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور آج تک ہیں۔ جملہ مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں گنائی جاتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہائے اسلامی کے مورخین نے اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بنا کر اپنے اصول مضبوط کئے ہیں۔ اس لئے روایات تفرق و تشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہوسکتی تھی۔ ہر چند کہ انسانوں میں اختلاف ہمیشہ رہے گا۔

لَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۱۱/۱۱۸

ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر تیرا رب مہربانی کرے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ "من رحم ربک" یعنی اہل حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

کہا جاسکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلافات ممکن ہیں اس لئے پھر بھی فرقے پیدا ہوسکتے ہیں۔ بے شک فہم معانی میں اختلافات ہونگے لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہوسکے گی۔ کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک۔ تعلیم ایک۔ مفہوم ایک اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہی۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کرے گا۔ علماء قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد گر

وہ صحیح ثابت ہوگی تو تسلیم کرلی جائے گی ورنہ مسترد ۔ بجنسہ اسی طرح جس طرح اس عالم مادی میں علماء طبیعی وغیرہ الگ الگ نظرئے قائم کرتے ہیں پھر ایک مدت تک غور وفکر کرتے کرتے ان پر اس کی صحت یا غلطی نمایاں ہوجاتی ہے ۔ قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کرسکے ۔ وہ کتاب "مفصل" اور "تبیاناً لکل شئی" ہے ۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اس قدر وسیع اور روشن ہے کہ اس میں سوائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی ۔ اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرن اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی خالص عمل بالقرآن کا دور تھا ۔ جس نے ہر لحاظ سے اس کو خیر القرون بنادیا تھا ۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی ۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کرلیا پھر اس میں تمہارے لئے بحث کی گنجائش کہاں رہی ، جواب یہ ہے کہ تمہارے نزدیک چار دلیلیں ہیں ۔ کتاب ، سنت اجماع اور قیاس ۔ اور اسی ترتیب سے انکے مدارج ہیں ۔ کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے اجماع سے جو فروتر حجت ہے ۔ ثابت کرنا چاہتے ہو یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو ۔ اگر ایسا ہے تو تمہارا مشعل تاریک ہے ۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے ۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اس کو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے ۔

ان دلائل کے علاوہ منکرین حدیث نے ان مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کے ساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں ۔ اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انھوں نے حدیثوں کی بے اعتباری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس مضمون میں ان باتوں کو قصداً چھوڑ دیا ۔ کیونکہ موضوع بحث یعنی حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے ان کو زیادہ تعلق نہیں ۔

طالب العلم کی دُعا

محبت سے تری یارب، یہ دل معمور ہو جائے
سراسر ہے یہ تاریکی، سراسر نور ہو جائے
مرے سوزِ دروں کو وہ تجلی زارِ عرفاں کر
کہ اس کا ہر شرارہ اِک چراغِ طور ہو جائے
تجھے چشمِ بصیرت سے میں دیکھوں خانۂ دل میں
ترے جلوے سے یہ جانِ حزیں مسرور ہو جائے
فروغِ زندگی وہ لے کے اٹھوں بزمِ ہستی میں
کہ جس کے نور سے دنیا کی ظلمت دور ہو جائے
گلستانِ عمل میرا پھلے پھولے زمانے میں
ترے ابرِ کرم سے یہ چمن معمور ہو جائے
بہارِ تازہ باغِ آفرینش میں کروں پیدا
متاعِ زندگی خلد و قصور و حور ہو جائے
تمنائے دلی یارب دعا بن کر نکلتی ہے
عجب کیا ہے تری درگاہ میں منظور ہو جائے

ستاروں کا بعد

ہم جب تاروں بھری رات میں آسمان کو دیکھتے ہیں تو ہمکو ہزاروں ستارے آسمان پر بکھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں بظاہر کوئی ترتیب معلوم ہوتی ہے اور نہ نظام۔ اور بقول غالب "بے شورہ کا کام ایسا ہی ہوتا ہے" ہم کو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ستارے ایک ہی فاصلہ پر ہونگے۔ مگر ہم ان کے فاصلوں کا تعین اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہمارے پاس موجودہ سائنس کے اور رصد خانے کے آلات نہ ہوں اور ہم ان ریاضی کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوں جن کے ذریعہ سے ان استادوں کا بعد امکانی صحت کیساتھ ناپا جا سکتا ہے۔

ایک مضمون میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ کل روشن ستارے جو ہمکو نظر آتے ہیں تین قسموں پر تقسیم ہوتے ہیں (۱) ثوابت۔ (۲) سیارے۔ (۳) اقمار۔ (یہاں ہم سحابیوں سے بحث نہیں کرتے) مزید وضاحت کے لئے ان کی مختصر تعریف پھر ایک دفعہ کئے دیتے ہیں

(۱) ثابت جمع ثوابت۔ وہ بعید ترین اجسام فلکی ہیں جو اپنی انتہائی بعد کی وجہ سے ایک ہی جگہ قائم نظر آتے ہیں۔ ان میں ذاتی روشنی اور حرارت ہے انہیں ستارے بھی کہتے ہیں

(۲) سیارہ وہ جسم ہے جو کسی ثابت کے گرد گھومتا ہے اور ثابت سے روشنی لیکر منور ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں آہیں ذاتی روشنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے مشتری میں۔ مگر علی العموم یہ بذاتہ سیاہ ہوتے ہیں یعنی ان کی ذاتی روشنی ضائع ہو چکی ہے۔ یا بہت کم ہو گئی ہے۔

(۳) قمر جمع اقمار:۔ وہ اجسام فلکی جو کسی سیارے کے گرد گھومتے۔ اور اس ثابت

سے روشنی لیتے ہیں جس کے گرد وہ سیارہ گھوم رہا ہے جس کے تابع یہ قمر ہو وقت اپنے سیارے کی روشنی سے بھی منور ہو جاتے ہیں مثلاً پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند۔ اس میں دو حصے منور ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ باریک زیادہ منور ہلالی خط جسے پہلی یا دوسری تاریخ کا چاند کہتے ہیں یہ تو سورج سے منور ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ حلقہ جو کم منور ہوتا ہے۔ اور ہلال کے ایک جانب گول دائرہ کی شکل میں نظر آتا ہے یہ حصہ زمین کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔

زمین سے قریب ترین ستارہ اور اسوقت تک جتنے ستارے دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے چھوٹا ستارہ سورج ہے۔ یہ محض اپنی نزدیکی کی وجہ سے ہمکو اسقدر بڑا معلوم ہو رہا ہے۔ اور گرم ہے۔ اسکا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل کا ہے۔ زمین کا قطر آٹھ ہزار میل کا ہے۔ بظاہر چاند اور سورج ایک ہی جسامت کے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور چاند کا قطر صرف سوا دو ہزار میل کا ہے اور زمین کی جسامت اس سے تقریباً ۵۰ گنی زیادہ ہے۔ یعنی سورج سے تقریباً پانچ کروڑ پچاس لاکھ گنا چھوٹا ہے مگر پھر بھی بظاہر دونوں برابر معلوم ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سورج زمین سے ۹ کروڑ بیس لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے اور چاند صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل پر۔ اس لئے کسی ستارہ کا چھوٹا بڑا نظر آنا اس کے بعد کو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح بہت سے ستارے ایسے ہیں جو سورج سے کئی کروڑ گنے بڑے ہیں، اور گرم تر ہیں۔ مگر اپنے بعد کی وجہ سے چھوٹے اور سرد معلوم ہوتے ہیں۔

معروف ادیب مسٹر ولز Mr. Wells' کی مشہور تاریخ Outlines of History سے ذیل کی مثال لیکر ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اس مثال سے سیارے اور ستارے کا بعد معلوم ہو سکے گا۔

فرض کیجئے۔ ایک بہت بڑے وسیع میدان میں جو صحرائے اعظم افریقہ سے

کئی ہزار گنا بڑا ہے۔ ایک گیند ایک انچ کے قطر کی رکھی ہے۔ یہ زمین ہو۔ اس سے تین سو تیس گز کے فاصلہ پر ایک گولہ نو فٹ کے قطر کا ہے وہ سورج ہے۔ زمین سے ۲۴ انچ کے فاصلہ پر ایک مٹر کا دانہ ہے۔ یہ چاند ہے۔ زمین سو سو گز کے فاصلہ پر عطارد ہے۔ اور دو سو گز کے فاصلہ پر زہرہ۔ پانسو گز کے فاصلہ پر مریخ۔ آٹھ سو پچاس گز پر مشتری۔ تین ہزار گز کے فاصلہ پر یورینس۔ دس ہزار گز کے فاصلہ پر نیپچون۔ اور چودہ ہزار دو سو گز یا تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر پلوٹو (نو دریافت شدہ سیارہ ہو گا۔ گویا نظام شمسی کی انتہائی حد ۸ میل ہے۔ اب آگے اگر ہم دیکھنا چاہیں گے تو دس بارہ میل یا سو دو سو میل نہیں بلکہ نزدیک ترین ستارہ جو ہم کو نظر آئیگا وہ اسی نسبت سے جو پہلے ہم قائم کر چکے ہیں۔ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر نظر آئیگا۔ اب ایک طرف ان فاصلوں کو دیکھئے جو نظام شمسی کے دوسرے ارکان سے اس کو حاصل ہے اور دوسری طرف اس ستارہ کو دیکھیئے۔ اور وہ بھی سورج کے بعد نزدیک ترین ستارہ ہے

اب فرض کیا اس فضا میں بیس ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلیں تو بارہ سکنڈ میں ہم چاند سے گزر جائیں گے۔ اور سوا گھنٹہ میں سورج پر پہنچ جائیں گے۔ اور ۲۰ گھنٹہ کے بعد نظام شمسی کی حد کے باہر ہو جائیں گے۔ اور اسی رفتار سے چلے جائیں تو ۱۴ برس کے بعد سب سے نزدیک ستارہ پر پہونچیں گے۔ اس کے بعد ابھی فضا میں اور چلیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ بعض ستارے اسقدر بعید فاصلہ پر ہیں کہ ہم انہیں میلوں میں نہیں ناپ سکتے بلکہ سال میں ناپیں گے یعنی جو فاصلہ روشنی ایک سال میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے ایک سال میں طے کرتی ہو وہ سال نور کہلاتا ہے۔ اور یہ سال نور ۶۰ کھرب میل کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں سے جو فاصلہ ستاروں کا ناپا جائیگا وہ سال نور سے ناپا جائے گا مثلاً قطب تارہ پچاس سال نور کے فاصلہ پر ہے کہکشان میں بعض سحابیہ ہیں جن کی روشنی کئی کروڑ برس میں یہاں تک پہونچتی ہے یعنی یہ سحابیہ کئی کروڑ برس پہلے سحابیہ تھے اسوقت ممکن ہو کہ یہ ستارہ بن گئے ہوں مگر زمین والوں کو کئی کروڑ برس گزر جانے کے بعد یہ خبر ہوگی

کہ یہ ستارے بنے۔

جنکو ہم ستارہ کہہ رہے ہیں یہ خود قائم نہیں ہیں۔ ان میں بعض ستارے ہزار میل اور بعض کم و بیش رفتار سے فضائے عالم میں متحرک ہیں مگر ان کا فاصلہ اسقدر بڑا ہے کہ یہ ستارے بادی النظر میں ہمکو ایک ہی جگہ قائم نظر آتے ہیں۔ ہم کل فضا میں سلوم معلوم ہوگا کہ سیارے اور خود زمین سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا فاصلہ ہم سے زیادہ سے زیادہ آٹھ میل ہے۔ مگر اس نزدیک ستارہ کا اندازہ کرو جس کا فاصلہ اسی نسبت سے چالیس ہزار میل ہوگا بعض ایسے ہیں اسی نسبت سے ان کا بعد کروڑوں میل ہے۔

رفتار کے متعلق ہم کو ایک مثال اور سمجھ لینی چاہیے۔ اگر ایک چیز ایک ہی رفتار سے متحرک ہو۔ تو بادی النظر میں اگر وہ چیز قریب ہے تو ہم کو زیادہ تیز چلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اور اگر زیادہ دور ہے تو وہ سست چلتی ہوئی معلوم ہوگی حالانکہ رفتار یکساں ہی رہی۔ یہی مثال سیاروں اور ستاروں کی ہے جو سیارے ہم سے قریب ہیں وہ ہم کو زیادہ تیز چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً زہرہ۔ عطارد۔ چاند۔ مشتری سست معلوم ہوتا ہے۔ اور نیپچون اور پلوٹو کی رفتار معلوم کرنے کے لیے تو کئی مہینے چاہئیں۔ چہ جائیکہ ان ستاروں کی چال جو کئی کئی ہزار سال نور کے فاصلہ پر ہوں۔ اسی وجہ سے وہ ہم کو قائم معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کو ہم ثوابت کہتے ہیں۔ ورنہ ان میں بعض ستارے ایسے ہیں جو کئی کئی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں ایک ستارہ ذنب الدجاجہ (Cygnus) ہے جسے فلکی اڑنے والا ستارہ کہتے ہیں۔ یہ دو سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے متحرک ہے۔ خود سورج مع اپنے کل نظام کے مجمع النجوم نسر واقع (Lyra) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر یہ حرکتیں رصدگاہوں کی اعلیٰ دوربینوں اور بہت صحیح آلات حساب کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں۔

ابھی ہم بیان کر آئے ہیں کہ نظام شمسی نسر واقع کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں یہ اعتراض ہوگا کہ جب ستارے اسقدر بعید ہیں اور کل مجمع النجوم ایک ہی حالت میں نظر آ رہے ہیں اور نہ

معلوم کتنے زمانہ دراز سے نظر آرہے ہیں اور نہ معلوم کبتک نظر آتے رہیں گے تو ہم کو کیسے معلوم ہوا کہ نظام شمسی نسر واقع کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے بعید ترین ستاروں کی دوری معلوم کرنے میں اسوقت اور زیادہ وقت ہوتی ہے جب وہ حرکت کے رخ سے خط مستقیم میں ہوں خواہ حرکت اس مجمع النجوم کی سمت میں ہو رہی ہو۔ یا مخالف سمت میں۔ اگر حرکت زاویہ بنائیگی تو فاصلہ معلوم کرنے کا امکان زیادہ قرین قیاس ہے۔

مگر اسے معلوم کرنیکا ایک بہت عمدہ طریقہ ہے۔ جسے ہم پہلے ذیل کی مثال سے سمجھاتے ہیں فرض کیجئے آپ ایک وسیع میدان میں ہیں جس کے کنارے پر درخت لگے ہوئے ہیں۔ آپ ایک سمت روانہ ہوئے جس طرف آپ جائیں گے اس سمت کے درخت پھیلتے ہوئے معلوم ہونگے یہ معلوم ہوگا کہ ان کے درمیان کا فاصلہ زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ اور آپ کے پیچھے کے درخت سکڑتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ حالانکہ یہ یقینی امر ہے کہ درخت سب اپنی جگہ قائم ہیں اور وہ متحرک نہیں ہیں اسی طرح سالانہ ارتصاد سے ہمکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسر واقع کے ستارے ایک دوسرے سے پھیل رہے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ کی سمت میں جو مجمع النجوم مثلاً الجبار (Orion) ہے۔ وہ اس کے ستارے ملتے جارہے ہیں۔ مگر نسر واقع کا فاصلہ اسقدر بعید ہے کہ نہ معلوم کتنے لاکھ یا کرور برس میں ہمارا سورج مع اپنے نظام کے وہاں تک پہونچے گا۔

اس نظریہ کو Doppler نے ایک اور مثال سے سمجھایا۔ اور طیف نما Spectroscope کے ذریعے ثابت کردیا کہ واقعی سورج مع اپنے نظام کے بڑھے جارہا ہے۔ اور طیفی خطوط سے رفتار کا بھی اندازہ لگا لیا۔ ڈوپلر کا طریقہ یہ ہے کہ جو اجسام تم سے پرے جارہے ہوں ان کی روشنی یا طیفی رنگ سرخ زیادہ معلوم ہوگا۔ اور جو جسم تمہاری طرف بڑھ رہا ہو اس کے طیفی خطوط بنفشی کے قریب قریب معلوم ہون گے۔ اس طیف نما سے اور رصدگاہ جبل ولسن (امریکہ) میں پروفیسر ہبل (Hubble) اور پروفیسر ہوماسن Dr. Humason نے بہت سے ستاروں کی رفتاریں معلوم کرلی ہیں۔

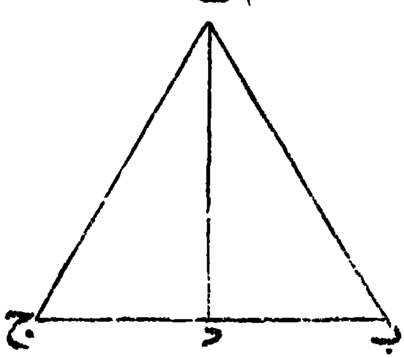
ہم کو اب یہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر اپنے بعید ترین فاصلوں کو یہاں سے بیٹھے بیٹھے تم نے کس طرح ناپ لیا جب کہ سب کو معلوم ہے کہ عرصہ تک نظام بطلیموس Ptolemy یورپ میں رائج تھا اور ہندوستان میں اب تک بعض عربی مدارس میں ملتا ہے۔ اس میں زمین کو مرکز عالم بتایا جاتا ہے، اور سورج کو صرف ایک سیارہ کے مانند مانتے ہیں اس نظام بطلیموس کے خلاف نظام فیثا غورث Pythagoras تھا جس میں سورج کو مرکز مانا جاتا ہے۔ اس کی تجدید مسلمانوں میں حکیم بو علی سینا نے اور یورپ میں ایک راہب کوپرنیکس Copen icus نے کی۔ کوپرنیکس اور بعد کے حکما کے اقوال سے پتہ لگتا ہے کہ وہ شیخ ابن سینا کی تعلیم سے فائدہ اٹھا چکے تھے۔ جب گلیلیو نے دوربین ایجاد کی تو نظام شمسی فیثاغورث کا ثبوت عینی مل گیا۔ اس وقت سب سے پہلے آفتاب کے بعد کا اندازہ لگایا گیا پہلے کسی نے پچاس لاکھ میل لگایا۔ ٹائیکو براہے Tyoho-Brahe اور کیپلر Kepler ایک کروڑ تیس لاکھ میل کا اندازہ لگایا۔ ۱۶۲۰ء میں کاسینی نے آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل کا حساب لگایا۔ مگر ۳ جون ۱۷۶۹ء کو جب زہرہ کو گہن لگا تو چونکہ اس کا علم پہلے ہو چکا تھا۔ اس لئے امریکہ، ایشیا، افریقہ، فلکیوں کی مہمیں روانہ ہوئیں۔ تاکہ اس گہن کو دیکھیں اور اس سے نتائج اخذ کریں۔ اس گہن سے اور بعد کو بہت سے فلکیوں نے اور طبیعیوں نے پوری ایک صدی کی محنت کے بعد اب نو کروڑ تیس لاکھ میل فاصلہ متعین کیا ہے جب ہم کو نزدیک ترین ستارے کا علم ہو گیا تو ہم اسی نسبت سے اور فاصلے بھی متعین کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ناقص تدبیر روشنی پیما (Photometer) سے کی گئی مگر اسے فوراً ہی مسترد کر دیا گیا۔ کیونکہ بہت سے ستارے سورج سے لاکھوں مرتبہ زیادہ روشن ہیں اور بالکل ایک نقطہ کے مانند بوجہ اپنے بعد کے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری ترکیب سے گلیلیو نے بتائی۔ اور اس پر عمل ہرشل نے کیا۔ یعنی دوربین کی ایک ہی فضا میں دو ستاروں کو دیکھ کر ان کا زاویوی فاصلہ دیکھ لیا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر فاصلہ دیکھا۔ اگر زاویوی فاصلہ میں

کچھ فرق معلوم ہوا تو سمجھ لیا کہ ان کا فاصلہ بھی کم و بیش ہے۔ ورنہ ایک ہی فاصلہ پر ہیں۔ میونک Munich کے عینک ساز فراون ہافر Frauenhoffer نے بنشن پیما (Heliometer) ایجاد کیا۔ ان ترکیبوں اور آلات نے ثوابت کی فاصلے ناپنے میں مدد کی۔ مگر یہاں سے اب ہم عام فہم ریاضی کے اصول بتا کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

ہر اسکول کا بچہ زاویہ پیما Protractor کو جانتا ہے۔ یہ ایک نصف دائرہ کی شکل ٹین یا لکڑی کی پٹی ہوتی ہے جس پر ایک سو اسی ۱۸۰ درجے کٹے ہوئے ہوتے ہیں جہاں اس کی تنصیف ہوتی ہے۔ اسے زاویہ قائمہ کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے ہم زاویہ کو ناپ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ زاویہ اتنے درجے کا ہے۔ اسی طرح پیمایش والوں کے پاس اور رصد گاہوں میں ایک آلہ Theodolite ہوتا ہے جس کے ذریعہ دو نقطوں کے درمیان کا زاویہ ناپ سکتے ہیں۔

اب فرض کرو ایک نقطہ الف ہے جس کا فاصلہ ہم کا ب سے کھڑے ہو کر ناپنا چاہتے ہیں۔ الف تک نہیں پہونچ سکتے۔ اگر کاغذ پر ہے تو پہلے زاویہ ج۔ الف۔ ب ناپ لیں گے ج۔ ایک اور نقطہ افق پر خط مستقیم میں ہے۔ ب اور ج کا فاصلہ ناپنے سے ہم کو ب۔ الف کا فاصلہ معلوم ہو جائیگا۔



اس فاصلہ ناپنے کے لئے ب ج کی د پر تنصیف کر لو زاویہ الف بھی دو حصوں میں برابر تقسیم ہو گیا ہے۔ اصول علم مثلث Trignometry کے تحت میں ب جـ الف زاویہ ب الف د کا مماس Tangent کہلاتا ہے۔

اور اصطلاحاً اس طرح لکھتے ہیں مس د ا ب جسقدر زاویہ ہیں سب کی مماس کی ایک جدول ریاضی دانوں نے بنادی ہے۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے اور اس لئے کہ جسے شوق ہو زاویہ پیمانے سے ناپ کر دیکھ لے اور اس جدول سے اس کی قیمت معلوم کرکے صرف فاصلہ ب د ناپ کر اس ضابطہ سے د الف اول ریاضی کے اصول سے نکال لے۔ اور پھر پیمانہ سے ناپ کر تطبیق کرلے ایسے کئی مثلث بنا کر مشق کرے تو یہ ضابطہ زیادہ مستحضر ہوجائے گا۔ چونکہ بخوف طوالت ہم نے یہ جدول تین تین درجہ چھوڑ کر دی ہے۔ اس لئے تھوڑی سی غلطی کا احتمال رہے گا جسقدر زاویہ صحت کے ساتھ ناپا جائیگا۔ اور چھوٹے درجہ کا مماس لیا جائے گا یعنی درجہ دقیقہ اور ثانیہ تک اسی صحت کیساتھ ب د کا فاصلہ صحت سے ناپا جائیگا۔

اب فرض کیجئے مماس زاویہ ب الف د = (ب د) / (الف د) کے۔ لہذا د الف = (ب د) / (مماس ب الف د)۔ ب د تو ہم ناپ سکتے ہیں اور زاویہ کا مماس ہم کو مندرجہ ذیل جدول سے معلوم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہم خواہ الف تک نہ پہونچ سکیں۔ مگر ہم زاویہ ب د ناپ سکتے ہیں۔ فی الحال اسے آپ زاویہ پیمانے سے ناپئے۔ تو اس ضابطہ کی رو سے آپ فاصلہ الف د معلوم کرسکتے ہیں۔

جدول یہ ہے

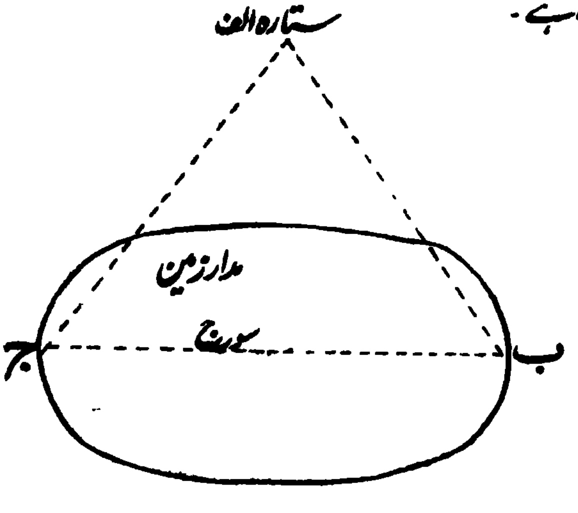
زاویہ	مماس	زاویہ	مماس
٠ صفر	٠ صفر	١٩	٫٣٤٤٣
١	٫٠١٧٥	٢٢	٫٤٠٤٠
٤	٫٠٦٩٩	٢٥	٫٤٦٦٣
٧	٫١٢٢٨	٢٨	٫٥٣١٧
١٠	٫١٧٦٣	٣١	٫٦٠٠٩
١٣	٫٢٣٠٩	٣٤	٫٥٧٤٥
١٦	٫٢٨٦٧	٣٧	٫٧٥٣٦
		٤٠	٫٨٣٩١
		٤٣	٫٩٣٢٥
		٤٥	١٫٠٠٠٠

فرض کیجئے آپ نے ایک مثلث بنایا جس میں آپ نے ب د تین انچ کا بنایا اور زاویہ ب الف د ۳۶ درجہ کا بنایا۔ آپ کے پاس جدول میں ۰٫۷۳ ہے۔ فی الحال ۰٫۷۳ ہی لے لیجئے۔ اگر زیادہ صحت منظور ہو تو ۳۶ درجہ کا مماس بھی کہیں کتاب میں مل جائیگا۔ اب جدول میں ۳۶ کا مماس دیکھا۔ تو ۰٫۷۲۶۵ نکلا۔ لہذا د الف فاصلہ برابر ہے

$\frac{۳}{۰٫۷۲۶۵}$ = تقریبًا چار انچ کے۔ یہ فاصلہ ہم بغیر ناپے بتا سکتے ہیں۔ اب ناپ کر صحت کر لیجئے

یہ اصول ریاضی کا سب سے آسان طریقہ ہے جس سے ہم کسی ناقابل گزر فاصلہ کو ناپ سکتے ہیں۔

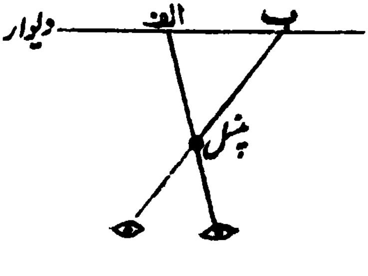
اب فرض کیجئے ایک ستارہ ہے۔ اس کا ہم صرف زاویہ ناپ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کا زاویہ ب سے ناپ لیا۔ اور چھ مہینہ کے بعد جب زمین دوسرے سرے ج پر پہونچ گئی۔ تو پھر اس کا زاویہ ناپا۔ یا تین مہینہ کے بعد اسے ہم نے بالکل سمت راس پر دیکھا۔ اب ہم کو علم ہے کہ ب ج کا فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل کا دوگنا ہے کیونکہ زمین زیادہ سے زیادہ اسی قدر فاصلہ طے کر سکتی ہے اس کے بعد وہ اپنے مدار پر لوٹ کر بعد چھ ماہ اسی جگہ ب پر آجائے گی۔ اگرچہ اس وقت اس کی شکل اس طرح کی ہوگی۔ مگر غور سے دیکھا جائے گا تو مثلث پھر بھی بنجاتا ہے منقوطہ خطوط ہمارا مثلث ہے۔



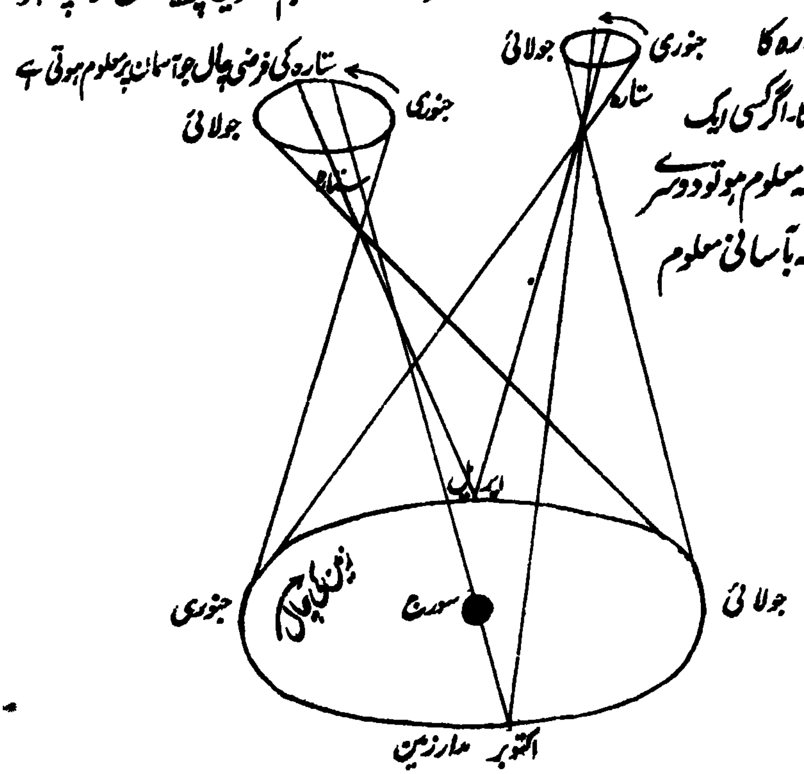
اگر آپ پانچ چھ مرتبہ مختلف مثلث بناکر ناپیں گے تو معلوم ہوگا کہ جیسے جیسے زاویہ چھوٹا ہوتا جائے گا فاصلہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر صفر ہو جائے یعنی زاویہ کی کوئی قدر نہ رہے تو فاصلہ لامتناہی بڑا ہو جائے گا۔ مگر اسوقت تک کوئی ستارہ نظر نہیں آیا ہے جس کا زاویہ صفر ہو۔ یہاں تک کہ کہکشان کے بعض سحابیہ (Nebula) جو بکھرے ہوئے دود کی طرح ہمکو نظر آتے ہیں ان کی روشنی زمین تک کئی کئی لاکھ برس میں آتی ہے ان کا زاویہ بھی کچھ قدر ضرور رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا امثال میں ہم نے کوشش کی ہے کہ آسان طریقہ سے سمجھا دیں کہ جو لوگ ریاضی نہیں جانتے ہیں وہ بھی ایک فٹ رول اور زاویہ پیما لیکر مختلف مثلث بنا کر فاصلہ ناپ کر سمجھ لیں۔ اسے اختلاف منظر (Parallax) بھی کہتے ہیں۔ یہ اختلاف منظر اس مثال سے اور واضح ہو جائے گا

ریل میں سفر کرتے وقت جو درخت قریب ہیں وہ ریل کے خلاف سمت میں بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے پیچھے کے درخت ریل کے ساتھ ساتھ آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے کے خلاف سمت وغیرہ علی ہذا القیاس۔ حقیقت میں درخت نہیں دوڑتے ہیں بلکہ اختلاف منظر سے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ کمرہ میں بیٹھکر کرلو۔ ایک پنسل ہاتھ میں لیکر دو فٹ کے فاصلہ پر کھڑی کرو۔ اور ایک آنکھ سے یہ دیکھو کہ سامنے دیوار پر یہ کسی نقطہ الف کو چھپائے ہے۔ بغیر ہاتھ ہلائے یا سر ہلائے دوسری آنکھ کھول کر پہلی آنکھ بند کرلو۔ اور اب دیکھو کہ وہی پنسل بجائے نقطہ الف کے چھپائے ہوئے نقطہ ب کو چھپاتی ہے۔ اور یہ نقطہ الف سے بہت ہٹ گیا ہے جو اس شکل سے واضح ہوگی۔ آنکھ بند کرتے ہی دوسری آنکھ سے یہ معلوم ہوگا کہ پنسل فوراً ہٹ گئی اور اس نے فوراً جگہ چھوڑ دی۔ تھوڑے تجربہ اور ناپنے سے ہمکو یہ معلوم ہو جائے گا۔



کہ الف اور ب کا فاصلہ پنسل کے فاصلہ اور آنکھ کے فاصلہ کی تناسب پر موقوف ہے۔ اگر بجائے آنکھ کے ہم ذرا ایک آدھ قدم آگے پیچھے بڑھکر ناپیں تو ہم کو اور فرق معلوم ہوگا جیسے جیسے پنسل دور ہوتی جائے گی۔ زاویہ پنسل چھوٹا ہوتا جائے گا۔ یہ تجربہ کرہ میں اچھی طرح کرلو یا کاغذ پر مختلف شکلیں بنا کر اسے خوب سمجھ لو۔ اب فرض کرو کہ بجائے پنسل کے ایک ستارہ ہے جو فضائے آسمان پر ایک نقطہ کو چھپائے ہوئے نظر آرہا ہے یا کسی دوسرے ستارے سے ایک نسبت فاصلہ پر نظر آرہا ہے۔ اسے ہمنے جنوری میں دیکھا اور ہر تین تین ہفتہ کے فاصلہ پر اس کا ارتصاد کرتے رہے تو جس طرح ہم بیضاوی شکل میں سورج کے گرد گھومتے جائیں گے۔ یہ ستارے بھی ہم کو مخالف سمت میں وہی بیضاوی شکل میں نظر آتا جائیگا۔ اور ہم کو اب معلوم ہوگا کہ فضا میں یہ بھی ایک بیضاوی شکل بنا رہا ہے۔ حالانکہ وہ قائم ہے جیسے جیسے یہ ستارہ دور ہوگا اس کا زاویہ چھوٹا ہوگا پھر دیکھو پنسل والے تجربہ کو۔ اس وقت اس کی شکل ایسی نظر آئے گی۔ ایک وقت میں چونکہ کئی کئی ستاروں ارتصاد کرتے ہیں۔ لہذا اسوقت دو ستاروں کی فرضی شکلیں بنا کر ہم ناظرین پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔ بعید تر ستارہ کا زاویہ چھوٹا ہوگا۔ اگر کسی ایک ستارہ کا فاصلہ معلوم ہو تو دوسرے ستارے کا فاصلہ بآسانی معلوم کرسکتے ہیں۔



اسی طرح ہم بہت سے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کا زاویہ ناپتے ہیں تو چھ مہینہ کے بعد با سانی ان کا فاصلہ زمین سے بتا سکتے ہیں۔ اگر ہماری زمین کا مدار بجائے ۱۸ کروڑ پچاس لاکھ انتہائی بعد کے برابر ہو۔ یا ہم اسوقت نیپچون یا پلوٹو (نو دریافت شدہ سیارہ) سے ناپیں تو ان فاصلوں میں زیادہ صحت ہم کو معلوم ہوگی۔ ان زاویوں کے ناپنے کے نسبت صحیح آلات رصدگاہوں میں ہوتے ہیں اور یہ ہماری مضمون کی حد سے باہر ہیں اس لئے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

قدیم فلکیوں نے تقریباً خاصی صحت کے ساتھ بغیر کسی آلات کے بھی محض بعض سیاروں کی چال سے مختلف اجسرام فلکی کے فاصلے ناپ لئے تھے۔ زحل کو سب سے بلند سیارہ سمجھتے تھے اسوقت یورینس کہاں تھا۔ چاند کو سب سے قریب سمجھتے تھے۔ اور اسی اعتبار سے ان کے آسمان مقرر کر دیئے تھے۔ سورج کو چوتھے آسمان پر رکھا تھا۔

ہم اس مضمون کو ایک ضابطہ پر ختم کرتے ہیں۔ اگر ناظرین اسے یاد رکھیں گے تو یہ کام دیگا۔ ہر رصدگاہ میں ہر ستارہ کی زاویہ اختلاف منظر (Parallax) کی ایک جدول رہتی ہے جسے وقتاً فوقتاً ناپتے رہتے ہیں۔ اگر زاویہ معلوم ہو تو فاصلہ اس ضابطہ سے معلوم ہو جائیگا۔

$$\text{فاصلہ میلوں میں} = \frac{۹۳۰۰۰۰۰۰ \times ۲۰۶۲۶۵}{\text{زاویہ اختلاف منظر}}$$

اس فاصلہ کو اگر سال نور میں جو تقریباً ۶۰ کھرب میل کے برابر ہوتا ہے تحویل کریں تو یہ ضابطہ ہوگا۔

$$\text{سال نور} = \frac{۳۰۲۶}{\text{زاویہ اختلاف منظر}}$$

جیسے جیسے زاویہ اختلاف منظر چھوٹا ہوتا جائیگا یہ قدر بڑھتی جائے گی۔ اس طرح

ہم دور سے دور ستارہ کا فاصلہ خواہ میلوں میں خواہ سال نور میں بتا سکتے ہیں۔

طلبا سے ہم ضرور درخواست کریں گے کہ وہ مثلث کئی کئی بنا کر یہ دیکھیں کہ ریاضی سے اور اصلی ناپ سے کس قدر فیصدی کا فرق پڑتا ہے۔ اگر انہیں زیادہ صحت منظور ہو تو مماس کی جدول اپنے اسکول کی لائبریری یا ریاضی کے استاد سے لیکر یہ دلچسپ مشغلہ کریں اور صحت کا نشان لگائیں جس قدر صحت کے ساتھ زاویہ ا و۔ قاعدہ ناپیں گے۔ اور مماس کو تقسیم کریں گے اتنے ہی صحت کے ساتھ فاصلہ معلوم ہوگا بعض صورتوں میں ہزار میں ایک درجہ غلطی کا ہوگا۔ اسی لنسبت سے ستاروں کا فاصلہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ لاکھ میل ادہر یا ادہر کچھ قدر نہیں رکھتے۔ فقط

قیس ولبنیٰ

لیلی مجنوں قیس ولیلی شیریں فرہاد اور وامق وعذرا کا ذکر اتنی بار ہمارے لٹریچر میں آیا ہے کہ اب یہ قصے تقریباً ہمارے ادب کا ایک جزو بن گئے ہیں تلمیحات سے گذر کر ان پر مستقل افسانے اور ناول تصنیف ہو چکے ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر ان پر نقد ونظر کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

علمی حلقے مصر کے نقاد اور منکر قدامت "ڈاکٹر طٰہٰ حسین" کے نام سے نا آشنا نہ ہوں گے مدت ہوئی السیاست اور دوسرے مصری جرائد میں ان کے مقالات تنقیدی شائع ہوئے تھے جس میں بہت سے مشہور قدیم اور زبان زد خاص وعام حقایق سے انکار کیا گیا تھا۔ بعد میں یہی مقالات حدیث الاولیاء کے نام سے کتابی صورت میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ الہلال کلکتہ دور جدید کے کسی نمبر میں لیلی ومجنوں کے متعلق ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ اب میں اس سلسلہ کا دوسرا مضمون قیس ولبنیٰ پیش خدمت کر رہا ہوں اس مرتبہ صاحب مضمون سے اتفاق یا اختلاف رائے مقصود نہیں ہے اس کے لئے کسی آیندہ فرصت کا منتظر ہوں۔

عبد المجیب ندوی

قیس ولبنیٰ کی داستان حسن وعشق میں بھی لیلیٰ ومجنون، اور جمیل وثمینہ کی طرح آغاز محبت کی دلچسپیوں، آتش عشق کی شرر باریوں، لطف صحبت اور غم ہجر، روز وصل اور شب فراق، جور اعدا اور گردش زمانہ اعزا کی ریشہ دوانیوں، لوگوں کی نکتہ چینیوں، دل کی بے تابیوں اور پھر ان حوصلہ شکن اور جاں گسل تکالیف سے عاجز آکر اس بے کیف زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس اشتراک کیوجہ سے قیس ولبنیٰ کا فسانہ لیلی مجنون کا مثیل خیال کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے لیلی مجنون اور قیس ولبنیٰ کے قصہ میں عظیم الشان فرق ہے وہ محض ایک پر درد فسانہ اور عشقیہ قصہ ہے جس کے اندر ایسے واقعات ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے دور کا بھی نہیں۔ ان واقعات کو اگر عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یقیناً اس کا فیصلہ بالکل ان کے خلاف ہوگا۔ اگرچہ قیس ولبنیٰ کا قصہ کوئی واقعی اور حقیقی قصہ نہیں ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ وہ دور از کار اور بعید از عقل قصے ہیں جن میں حقائق سے قطع نظر کر لی گئی ہے لیکن قیس ولبنیٰ کی خصوصیت ہے کہ اس میں واقعات حقیقت کے رنگ میں پیش گئے گئے ہیں۔ رسم ورواج کا لحاظ رکھا گیا۔ انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی گھڑا ہوا قصہ یا فسانہ ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کا مرقع کھینچا گیا ہے اور انہیں واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو آئے دن ہمیں پیش آیا کرتے ہیں۔ کیا ساس بہوؤں کی نوک جھونک کوئی نئی بات ہے۔ اگر کسی ماں نے لاڈ دلار سے پال پوس کر بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنے بیٹے کو بیاہا تو اب اس کی بے اعتنائی اور بے التفاتی پر اس جان نثار ماں کا بیٹے سے خفا ہونا اور بہو کو اس بے التفاتی کا باعث سمجھنا اور اس کے درپے ہونا کوئی خلاف عادت اور نادر الوقوع امر نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کی تمام توجہات کا مرکز بنی رہے اور اس کی محبت میں کوئی شریک وسہیم نہ ہو۔ لیکن بہو کا وجود اس کی

میں حائل ہوتا ہے اور یہی بنیاد ہوتی ہے اس کشمکش کی جو آج تک ساس بہوں میں چلی آ رہی ہے۔ بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جو ماں اور بیوی دونوں کے خوش رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں ورنہ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی نے والدین کے جذبات خواہشات کے پورا کرنے کی کوشش کی تو مجبوراً اسے بیوی کی حق تلفی کرنی پڑی اور جس نے بیوی کی رضامندی کا خیال کیا اسکو والدین کے خواہشات کو نظر انداز کرنا پڑا۔ ہمارے ہیرو قیس کو بھی یہ کٹھن منزل پیش آئی لیکن وہ باوجود انتہائی جدوجہد کے عدل و انصاف کے ساتھ اس منزل کو طے نہ کر سکا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیس و لبنیٰ کا فسانہ بنانیوالے نے اپنی وسعت معلومات اور جدت طبع سے اس قصہ کو عام عشقیہ قصوں سے بہت ممتاز اور بلند کر دیا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ تو مبالغہ اور تعلی سے کام لیکر قصہ کو حقیقت سے دور ہونے دیا ہے اور نہ بعید از قیاس واقعات بیان کر کے حیرت و استعجاب میں ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن نہیں معلوم کیوں شرفائے قریش اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما جیسی شخصیتوں کو طلاق کے بارے میں بیچ میں لایا گیا ہے اس سے بجائے اس کے کہ ان بلند مرتبت شخصیتوں کی وجہ سے قصہ کی اہمیت میں کچھ اضافہ ہو اس کی واقعیت میں شبہہ ہوتا ہے اس لئے کہ شرفائے قریش اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کا اس معاملہ میں پڑنا ان کے مراتب سے کہیں فروتر معلوم ہوتا ہے۔

دوران سفر میں قیس کو لبنیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوا باتوں ہی باتوں میں پیمان محبت مستحکم ہو گیا۔ اور قیس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس کو اپنی رفیقۂ حیات بنائے گا لیکن اس کے والد نے اس کی سخت مخالفت کی اس لئے کہ وہ ایک دولتمند شخص تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کی شادی اپنے ہی قبیلہ کی کسی لڑکی سے کرے تاکہ گھر کی دولت گھر ہی میں رہے جب قیس والد کی مخالفت سے مایوس ہو گیا تو وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جو اس کے دودھ شریک بھائی تھے انکی خدمت میں حاضر ہوا اور

اپنا فسانۂ غم سنا کر سفارش کی استدعا کی۔ آپ نے اس کی درخواست قبول کی اور دیارِ لبنیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ لبنیٰ کا باپ آپ کو دیکھتے ہی آپ کے استقبال کے لئے بڑھا اور بہت عزت و احترام سے پیش آیا۔ آپ نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا اس نے بلا تامل جو آپ نے فرمایا قبول کر لیا لیکن اس نے عرض کیا کہ میں عربی ہوں اور عربوں کے مخصوص رسوم و عادات ہوتے ہیں جن سے تجاوز کرنا ناپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے اس لئے نکاح کے وقت قیس کے والد کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ وہ اسے نامناسب سمجھتا تھا کہ کسی مالدار نوجوان سے بلا اس کے والدین کی رضامندی کے اپنی بیٹی بیاہ دے۔ آپ نے اس کے عذر معقول کو قبول فرمایا۔ اور قیس کے ہمراہ اس کے والد کی طرف روانہ ہوئے قیس کا والد آپ کو آتے دیکھکر سروقد کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت تعظیم و تکریم کی آپ نے قیس کی شادی کے متعلق اس سے کہا آپ کے فرمانے کے بعد اسے لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی اور فوراً سامان سفر درست کر کے لبنیٰ کے یہاں جا کر شادی کی رسم ادا کی۔

قیس کے لئے یہ شادی ایک سعادت ابدی اور مسرت دائمی تھی۔ وہ مجنون اور جمیل اور اسی قسم کے عاشقانِ ناکام سے کہیں زیادہ کامیاب تھا زمانہ نے اس کے لئے وہ اسباب پیدا کر دی تھی جو اُن مریضانِ عشق کو حاصل نہ تھی۔ فلک کج رفتار نے اس کی پاکیزہ محبت میں کوئی رخنہ اندازی نہ کی اور نہ لبنیٰ کے قبیلہ والے لیلیٰ اور بثینہ کے قبیلہ والوں کی طرح چہ میگوئیوں کا موقع پا سکے۔ ان متضاد اور متغائر باتوں کو ہم کیونکر تطبیق دے سکتے ہیں کہ ایک طرف عرب اپنی بدویانہ زندگی کے رسم و رواج کے اسقدر پابند کہ عاشق و معشوق کی شادی اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتے تھے اور دو چاہنے والوں کی آپس میں شادی ذلت و خواری کا باعث تصور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں کی انگشت نمائی اور ہم چشموں کے سامنے سرنیچا ہونے کے خیال سے دونوں کے درمیان قطع محبت کی غرض سے مداخلت کے لئے طیار ہو جاتے تھے۔ اور انتہائی کوشش کرتے تھے کہ

دونوں اپنی محبت سے باز آجائیں۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لبنیٰ کے قبیلے والے بغیر کسی تامل و تکلف کے اور بغیر کسی عذر و معذرت کے بطیب خاطر شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس قصہ کے مصنف نے اپنی طبع اختراع پسند اور کمال قابلیت کی بنا پر امام حسین رضی اللہ عنہ جیسی اعلیٰ و ارفع شخصیت کو درمیان میں لاکر اس تضاد کی گتھی کو بالکل ہی سلجھا دیا ہے حسین ابن علی کی سفارش کے بعد رسول کے نواسے کے ارشاد کے بعد کون ہے جسے تاب مجال اور طاقت انکار ہو۔ اسی طرح قیس کو اپنی مقصد میں کامیاب اور اپنی آرزو کے پورا کرنے میں کامران دکھا کر قدیم طرز اور پرانی روایات سے انحراف کی کوشش اور اپنے قصے کو ان عام قصوں اور فسانوں سے ممتاز کرنے کی سعی کی ہے جن میں آج تک ناکامیابی و مایوسی دکھاتے چلے آتے ہیں جن کی وجہ سے محبت کی کامیابی چاہنے والوں کا وصال غیر مستحسن اور ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا اور یہ رنگ قصوں اور فسانوں کا ایک جزء لاینفک قرار پا گیا قیس اپنی اس مناسب اور خواہش کے مطابق شادی سے حد درجہ مسرور تھا۔ اس لئے اب دنیا کی ہر مسرت و شادمانی اس کے مقابلہ میں بے وقعت اور ہیچ تھی۔ ایسی ہی لبنیٰ بھی اپنے گوہر مقصود اور سرمایۂ حیات کے پالینے کے بعد تمام چیزوں سے مستغنی ہو گئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے محبت تھی بے لوث و بے غرض ہو دونوں میں عشق تھا۔ سچا اور پاکیزہ جیسا کہ لیلیٰ و مجنوں اور جمیل و بثینہ میں۔ لیکن افسوس کہ وہ ناکام رہے۔ ان کی آرزوئیں پوری نہ ہوئیں ان کی تمنائیں بر نہ آئیں۔ اور اسی کی حسرت دل میں لئے ہوئے وہ مریضان عشق محبت پر قربان ہو گئے لیکن قیس و لبنیٰ نے اپنی مطلوب کو پالیا۔ ان کے نالۂ نیم شبی رائگاں نہ گئے۔ ان کی آہ بے اثر نہ رہی ان کا عشق محض حزن و ملال ہی ثابت نہ ہوا وہ شادی کرکے دنیا کی تمام چیزوں سے بے نیاز ہو گئے اور وہ ایک دوسرے کو ملکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ شادی قیس کے قبیلے اور گھرانے کی مرضی کے خلاف ہوئی

تھی۔ وہ کبھی بھی اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ ان کا مال و اسباب غیر قبیلہ میں جائے۔
پھر لیلیٰ کے ساتھ ان کا معاندانہ برتاؤ کچھ خلاف امید نہ تھا ساس بہوؤں کی لڑائی ایسا ہی
مشہور ہے اس پر طرفہ یہ کہ اب قیس کو لیلیٰ کی محبت نے ایسا سرشار کر دیا تھا کہ اب اس
کی توجہ اپنی ماں کی طرف اتنی نہ رہی تھی جتنی کہ شادی سے قبل تھی۔ یہ چیز لیلیٰ کی طرف سے
اس کی ساس کی بیزاری اور نفرت سمجھنے کے لئے کافی تھی۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ
وہ لیلیٰ کو نکال کر رہے گی۔ اس نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں اس کے خلاف
صرف کر دے گی اور عزم صمیم کر لیا تھا کہ اس کے وجود کو اپنی راہ سے الگ کر کے رہے
گی۔ وہ عورت تھی اور عورتوں کا مکر و فریب مشہور ہے اس نے اپنی ناراضگی و خفگی کا اظہار
قیس سے نہ کیا اس لئے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ وہ یہی ہو سکتا ہے
کہ قیس اس کی طرف توجہ کرے اور اپنی بے اعتنائی اور بے التفاتی پر نادم ہو۔ یا پھر
اس کی مرضی اور مقصد کے بالکل برعکس اس شکوہ شکایت سے قیس پر برا اثر پڑے اور
بجائے اس کے کہ لیلیٰ کی طرف سے بے التفاتی برتے اس کی محبت کی چنگاری شعلہ زن
ہو جائے اور ماں کی رہی سہی محبت بھی خاک میں مل جائے اس لئے قیس سے اس کا
اظہار اس نے نامناسب خیال کیا۔ اس کی دلی تمنا تو یہ تھی کہ قیس لیلیٰ کو طلاق دیدے
اور یہ مقصد عالی اس شکوہ شکایت سے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر
یعنی قیس کے والد کو ابھارنا اور اس کے کان بھرنا شروع کیا۔ اس نے اس کو یہ بات
سمجھائی کہ تمہارے سوائے قیس کے کوئی اور بیٹا نہیں اور لیلیٰ بانجھ ہے اس کے معنی
یہ ہیں کہ قیس کے بعد تمہارا نام مٹ جائے اور تمہاری نسل منقطع ہو جائے اور نہ صرف یہ
بلکہ گھر کا تمام مال و اسباب لیلیٰ کے گھرانے میں منتقل ہو جائے۔ اس لئے قیس کو چاہئے
کہ لیلیٰ کو طلاق دیکر دوسری شادی کرے لیکن اگر اس کو محبت نے اس قدر از خود رفتہ
کر دیا ہے کہ وہ طلاق دینے کے لئے نہیں طیار رہ سکتا تو خیر اس کو بھی رکھے لیکن اس کے

ساتھ ساتھ دوسری شادی بھی ضرور کرے تاکہ اس کے بعد نسل قائم رہے، نام باقی رہے اور مال و دولت بھی اپنے ہی گھر میں رہے۔ شیخ نے اپنی بیوی کی اس رائے سے پورا اتفاق ظاہر کیا اور وہ کیوں نہ اس سے متفق ہوتا۔ اس لئے کہ انسان اپنی نسل کی بقا اپنی دولت کے استحکام اور اپنی یادگار کا طبعاً خواہشمند اور طلبگار رہتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس بات کو پسند کیا۔ اور تمام بزرگان قوم کو جمع کر کے قیس کے سامنے یہ تجویز پیش کی قیس کی تو یہ حالت تھی کہ لیلیٰ کی محبت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز خیال کرتا تھا اس کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتا تھا۔ بغیر لیلیٰ کے اس کی زندگی بے کیف اور بے مزہ تھی ایسی صورت میں لیلیٰ کو طلاق دینا یا اس کی سوکن لانا قیس کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اس تجویز کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے والد نے کہا اچھا اگر تم اس کو گوارا نہیں کر سکتے تو ایک سے ایک خوبصورت لونڈیاں ہیں لیکن قیس نے کہا کہ کیا میں اس کو گوارا کر سکتا ہوں کہ میں لیلیٰ کے علاوہ کسی عورت پر ایک نظر غلط انداز بھی ڈالوں اس جواب سے قیس کا والد برافروختہ ہو گیا اور اس نے بگڑ کر کہا کہ اب تجھے صرف لیلیٰ کو طلاق دینا ہوگا اس کے علاوہ اور تمام صورتیں مسترد۔ اس پر قیس نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ طلاق پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اپنے والد کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تین صورتیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ان میں سے جو چاہیں آپ منظور فرمالیں۔ اول تو یہ کہ آپ اپنی دوسری شادی کر لیں۔ تاکہ شاید خدا آپ کو کوئی دوسری اولاد دے اور وہ آپ کے گھر بار کی مالک ہو اور اگر یہ نہیں تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں لیلیٰ کو لیکر کسی طرف نکل جاؤں اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر مجھے میری حالت پر چھوڑ دیجئے شاید اس طرح میں لیلیٰ کی محبت کو اپنے دل سے دور کر سکوں۔ اور آپ یہ سمجھ لیجئے گا کہ قیس مر گیا لیکن قیس کے والد نے ان تینوں صورتوں کو نامنظور کیا اور قسم کھائی کہ جب تک قیس لیلیٰ کو طلاق نہ دیدیگا۔ اس وقت تک میرے لئے سایہ میں بیٹھنا حرام ہے جب صبح ہوئی سورج نکلا اور دھوپ پھیلنے لگی تو قیس چادر لیکر اپنے والد

پہ سایہ کرنے کی غرض سے کھڑا ہو گیا اور جب تک سورج ڈھل نہ گیا وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ سورج ڈھلنے کے بعد قیس لبنی کے پاس آیا گلے ملکر دونوں خوب روئے۔ اس کے بعد لبنیٰ نے کہا کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری بالکل صحیح ہے لیکن اس وقت جہاں تک اپنی جان کا خطرہ نہ ہو مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں اس طرح اپنی جان نہ کھو بیٹھو۔ اس کا جواب قیس نے صرف اسقدر دیا کہ جہاں تک ہو سکے ہمیں صبر و استقامت سے کام لینا چاہیئے اور پھر اسی طرح روزانہ چادر تانے کھڑا رہتا۔ اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں کہ صورت حال کب تک قائم رہی بعض کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ گرہ چالیس روز تک ہوتی رہی لیکن ابوالفرج اس سے متفق نہیں وہ کہتا ہے کہ چالیس دن کا کہیں بھی ذکر نہیں اس کے متعلق صرف دو روایتیں ہیں ایک ایک سال کی اور ایک سات سال کی لیکن ہمیں تو قرین قیاس چالیس ہی دن کی روایت معلوم ہوتی ہے بہر حال ایک مدت کے بعد آخر کار قیس کو حقوق والدین اور بر بالوالدین کے صاف و صریح احکامات نے اپنے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ دینی احکامات اور قوانین اسلام کے احترام کا خیال قیس کے دل میں بچپن ہی سے راسخ ہو گیا۔ اس کا عہد طفلی نبیرہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ صحبت میں گذرا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ والد کو ایسی حالت میں چھوڑ کر اس کی مرضی کے خلاف کرتا۔ اور اس کی ہلاکت کا باعث ہوتا۔ بادل نخواستہ والدین کی خاطر وہ اس چیز کے کرنے کے لئے طیار ہو گیا جس پر وہ موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر لبنیٰ کو والدین کے احترام پر قربان کر دیا۔ اس نے جان بوجھ کر لبنیٰ کی گردن پر چھری پھیر دی یہ صحیح ہے کہ اسوقت کو شکست اور والدین کے جذبہ احترام کو فتح حاصل ہوئی لیکن دراصل یہ فتح نہیں شکست تھی، کامیابی نہیں ناکامیابی تھی جس نے قیس کے قوائے عقلی کو برباد کر دیا۔ اور اس کی قوت حافظہ کو تباہ کر دیا۔ اب اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے اپنی اقلیم دل کی ملکہ کو تخت سے اتار دیا ہے۔ اپنے سرمایۂ حیات کو خود ہی لٹا دیا ہے جب لبنیٰ ایام عدت گذار چکی اور اس کے گھر والے اس کو لینے آئے تو اس سرشار محبت نے اُن کی مزاحمت کرنی چاہی اور جب

وہ دولہن کا ڈولا نہیں کشتۂ محبت کا جنازہ لے کر چلے تو ان کے ساتھ جانا چاہا لیکن جب اس سے بھی روکا گیا تو وہ دیوانۂ محبت جب تک لبنیٰ کا ناقہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا اپنی نظروں سے اس کی مشایعت کرتا رہا اور جب اس سے بھی محروم ہو گیا تو نقشِ قدم کو آنکھوں سے لگاتا اس کی مٹی اٹھا کر منہ میں ملتا۔ گھر میں اس کی چیزیں دیکھ کر سینہ سے لگاتا۔ اور اپنی حسرت نصیبی پہ چیخیں مار مار کر روتا۔ جگر شق ہو جانے والے اشعار پڑھتا۔ اس جگہ سے یہ قصہ لیلیٰ و مجنوں اور جمیل بثینہ کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ لیلیٰ مجنوں کے قصہ کی طرح اس میں بھی دوراز کار باتوں اور محال و مستبعد واقعات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو یا جمیل بثینہ کی طرح تکلف و تصنع، مبالغہ و تعلی سے قصہ کو واقعیت سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک حسرت ناک، پر درد انسانی قصہ ہے جس کے سننے کے بعد بجائے حیرت و استعجاب کے دل میں ایک درد اور جگر میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں وہی واقعات و حادثات اور وہی جذبات و واردات ہمارے سامنے ایک موثر انداز میں پیش کئے گئے ہیں جو ہم بسا اوقات خود اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ ایک شخص جان سے زیادہ عزیز اور دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ پسندیدہ چیز کے چھوڑ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے پھر اگر اس کو دست کش ہونے کے بعد وہ اپنی عقل و خرد، اپنے ہوش و حواس اور اپنی دماغی قوت کھو بیٹھتا ہے تو اس میں کون سی حیرت و استعجاب کی بات ہو۔ لبنیٰ کو طلاق دینے کے بعد قیس کے ہاتھ سے بھی دامن عقل و ہوش چھوٹ گیا۔ وہ گریہ و زاری کرتا آہ و نالے بھرتا، سینہ کوبی و سرگردانی کرتا، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ صبر و سکون، تسکین اطمینان اور راحت و آرام اب اس دنیا میں حاصل ہونے کا نہیں پھر بھی اس کی سعی لاحاصل کرتا۔ مگر محبت کہیں چین لینے دیتی ہے۔ اگر کسی بات سے کچھ سکون حاصل ہوا تو کسی نئے خیال نے آکر فوراً اس کو بے چین کر دیا۔ اگر ایک مصیبت سے کچھ چھٹکارا ملا تو دوسری مصیبت فوراً آن کھڑی ہوئی۔ ان ہی مصائب و آلام حسرت آگیں طرز پر ان اشعار میں ظاہر کرتا ہے۔

أُحِبُّكِ اِثنَينِ فَمِنَ الحُبِّ لَم اَجِد | لَها شَكلَةً فی سائرِ النّاسِ يُوصَف
فَمِنهُنَّ حُبُّ لِلحَبيبِ وَرَحمَةٌ | بِمَعرِفَتي مِنهُ بِما يَتَكَلَّف
وَحُبٌّ بَدا بِالجِسمِ وَاللَّونِ ظاهِرٌ | وَحُبٌّ لَدى نَفسي مِنَ الرُّوحِ أَلطَف

گرچہ میرا بھی خیال ہے کہ ان اشعار میں تصنع ہے لیکن دلکشی ان کو مصنوعی کہنے سے روکتی ہے اور کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے یوں تو پھر سارا کا سارا قصہ ہی مصنوعی ہے۔ جیساکہ مجنون وجمیل اور تمام رہروان راہ عشق کو پیش آتا رہا ہے کہ گھر والے اس کی محبت پر معترض اور اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اس پر پابندیاں عائد کرتے ہیں اور اس کو مقید رکھنا چاہتے ہیں حتی کہ اس کو جان سے بیزار اور زندگی سے عاجز کر دیتے ہیں ہمارے قیس کو بھی یہ مرحلہ پیش آیا۔ لیکن اگر وہ مجنون کی طرح ان تکالیف ومصائب سے دیوانہ نہیں ہوا تو کم از کم وہ مرنے کے قریب تو ہو ہی گیا۔ اس کی دگرگوں اور خطرناک حالت دیکھ کر چارہ گروں نے اطبار کیطرف رجوع کیا۔ لڑکیوں سے طبیعت بہلانے کی کوششیں کیں۔ سیر وسیاحت سے لبنیٰ کی محبت بھلانے کی سعی کی گئی۔ لیکن تمام سعی بیکار۔ اور تمام کوششیں بے سود صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ خود قیس نے یا مجنون وجمیل میں سے کسی نے اس مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا ہے

أُرِيدُ لِأَنسىٰ ذِكرَها فَكَأَنَّما | تَمَثَّلُ لِي لَيلىٰ بِكُلِّ سَبِيلِ

آخر کار قیس نے دیار لبنیٰ کے چکر لگانا اور تلاش یار میں سرگرداں رہنا شروع کردیا لبنیٰ کے قبیلہ والوں کو اپنا فسانۂ غم سناتا اور لبنیٰ کا حال دریافت کرتا۔ لبنیٰ کے گھر والوں کو دیوانۂ محبت کا یہ دیوانہ پن برا معلوم ہوا اور انہوں نے وہی کیا جو لیلیٰ کے قبیلہ والوں نے مجنوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ دربار شاہی میں جاکر فریادی ہوئے اور انہوں نے قیس کے خون کی معافی کا حکم دربار خلافت سے صادر کرادیا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی وارفتگان عشق کے ساتھ اس سے قبل ایسے ہی برتاؤ کیا جاچکا ہے۔ قیس بن ملوح اور جمیل کا خون بھی اسی طرح مباح کر دیا گیا تھا۔

اس جگہ سے قیس کا فسانہ جمیل و مجنوں کے قصہ سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے مجنوں اور جمیل اور اسی قسم کے دوسرے عشقیہ قصوں میں عام طور پر ایک عجیب و غریب بات دکھلائی جاتی ہے وہی وفا شعار اور جاں نثار عورت جس نے محبت کی خاطر لوگوں کی انگشت نمائی ہمجولیوں کے طعن و تشنیع، گھر والوں کی زجر و توبیخ، گھرانے کی عزت او قبیلہ کے ناموس غرض دنیا کی کسی چیز کی پروا نہ کی۔ کس کے لئے صرف ایک ذات کے لئے محض اس شخص کے لئے جس سے پیمان محبت بندھ چکا تھا۔ اور جس کی محبت کے گہرائی اثر نے دل کو بے قابو کر دیا تھا، اب وہی پیکر محبت عذاری پر اتر آتی ہے پیمان محبت او عہد وفا کو توڑ کر دوسرے سے رشتہ محبت جوڑتی ہے اس کی محبت کا دم بھرتی ہے اس پر جان نثار کرتی ہے محبوب کی اس بیوفائی پر گرفتار عشق اور فریب خوردہ محبت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ طعنہ زنی کیجاتی ہے اور اس طرح اس کے زخموں کے لئے سامان نمک پاشی فراہم کیا جاتا ہے اسی موقع پر تو مجنوں کہتا ہے۔

قضاها لغیری وابتلانی بحبها   فهلا بشئ غیر لیلی ابتلانیا

قیس کا قصہ عام المیہ قصوں کی طرح نہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ لبنیٰ کی شادی کسی دوسرے کے ساتھ ہو جائے اور قیس بھی جمیل اور مجنوں کی طرح درد فراق اور غم جدائی کی صبر آزما تکلیف سے اپنی تمام حسرتوں اور تمناؤں کے ساتھ راہ محبت میں جان بحق ہو جائے۔ اس قصے کا واضع اپنی جدت طراز اور اختراع پسند طبیعت کیوجہ سے مجنوں اور جمیل کے قصوں کے واضعین سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جگہ سے اس نے کس خوبی سے قصہ کا رخ بدلا ہے۔

شاہی حکم کی بنا پر قیس کا خون مباح ہو ہی گیا تھا۔ وہ سرگردان و پریشان لبنیٰ کی تلاش میں اور اپنی کھوئی ہوئی دولت کی جستجو میں قریہ قریہ اور قبیلہ قبیلہ پھرتا رہتا۔ ایک مرتبہ کہیں قبیلہ فزارہ میں جا نکلا بنی فزارہ کی ایک دوشیزہ جو لبنیٰ سے بہت مشابہ تھی اسطرف

سے نکلی قیس سے بھلا کب رہا جاتا۔ اس کے قلب مضطر نے اس کا نام دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔ حسن اتفاق سے اس کا نام بھی لبنیٰ تھا۔ قیس نام سنتے ہی بے خود و از خود رفتہ ہو گیا۔ لڑکی بھی اس کی اس ادائے دیوانگی سے متاثر ہوئی۔ لڑکی کے بھائی کو جب معلوم ہوا کہ یہ قیس بن ذریح ہے تو اس نے اس کی بڑی دلدہی کی۔ اور انتہائی کوشش کی کہ وہ اس کی بہن سے شادی کرے۔ قیس اس کے اصرار نیز لبنیٰ کی مشابہت سے بہت کچھ متاثر ہوا۔ اور آخر کار شادی پر رضا مند ہو گیا۔ شب عروس میں جب کہ قیس کے روبرو لباس عروس میں ملبوس نئی لبنیٰ جلوہ آرا تھی۔ سوگوار لبنیٰ کی خیالی تصویر ماتی لباس میں قیس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ قیس کو تاب دیدار اور یارائے ضبط نہ رہا۔ جو چنگاری دب گئی تھی پھر شعلہ زن ہو گئی۔ جو زخم روبہ اندمال ہونے لگے تھے۔ پھر ہرے ہو گئے۔ اور جو خوشگوار خواب وہ دیکھ رہا تھا اس سے گویا کسی نے جھنجھوڑ دیا۔ پھر آنے کا وعدہ کر کے فوراً وہاں سے چل کھڑا ہوا اور کبھی اس طرف کا رخ نہ کیا۔ قبل اس کے کہ ہم آگے چلیں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات کا دکھانا فنی حیثیت سے کوئی غریب اور نادر چیز نہیں۔ اکثر و بیشتر قصوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مشابہ و مماثل دکھا کر قصہ کو زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

لبنیٰ کا والد جب دربار شاہی میں گیا تھا اور وہاں سے خون کے معافی کا حکم لایا تھا اس وقت خلیفہ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس شخص کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اس کے ساتھ لبنیٰ کی شادی کر دو لیکن اس وقت لبنیٰ شادی کے لئے کسی طرح رضا مند نہ ہوئی تھی۔ البتہ جب اسے قیس کی شادی کی خبر معلوم ہوئی تو اس سے اس کو بہت رنج و افسوس ہوا اور اس نے بھی قیس کو جواب بالمثل دینے کا ارادہ کر لیا۔ معاملات طے تھے ہی۔ صرف لبنیٰ کی رضامندی کی ضرورت تھی اتفاق سے وہ بھی حاصل ہو گئی اور اب لبنیٰ اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ میں زندگی بسر کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی خبر قیس کے کانوں تک پہونچی۔ اس خبر سے اس کو روحانی صدمہ ہوا۔ وہ غمگین و افسردہ، مغموم و محزوں تو پہلے ہی سے تھا

لیکن اس غم میں ایک لطف تھا۔ اس درد میں ایک لذت تھی۔ اور اس کرب میں مزہ تھا۔ مگر اب غم تھا اس سے زیادہ اور درد تھا اس سے سخت لیکن لذت سے خالی اور لطف سے معرّی۔ قصہ کے واضع نے آخر میں اس نقطہ کو بھی تقریباً اسی رنگ میں لاکر نمایاں کیا ہے لیکن ایک مخصوص انداز کے ساتھ۔ اور ایک امتیازی پہلو لئے ہوئے لیلٰی کی شادی کا حال معلوم ہونے کے بعد قیس نے بجائے صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کے کوچہ نوردی اور مدینہ کی گلیوں کی خاک چھاننا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے مختلف دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے اونٹوں کا قصہ بھی ہے۔ مدینہ اب قیس کی منزل مقصود اور اس کے تمام توجہات کا مرکز تھا وہ اب اس سرزمین میں ایک خاص جاذبیت محسوس کرتا تھا اس نے اپنے والد کے اونٹ لئے۔ اور یہ ظاہر کیا کہ وہ انہیں مدینہ بیچنے کی غرض سے لئے جا رہا ہے لیکن اس کا یہ فقرہ چل نہ سکا۔ اور اس کا والد حقیقت واقعہ سے واقف ہو گیا لیکن اس سے قیس کے ارادہ میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا اور وہ اونٹ لیکر مدینہ کیطرف روانہ ہو گیا۔ مدینہ پہونچکر بازار میں ایک شخص سے اونٹوں کی خریداری کے متعلق بات چیت ہوئی معاملہ طے ہو گیا۔ اور اس شخص نے وعدہ کیا کہ صبح تم میرے گھر پر آکر ان کی قیمت لے جانا قیس کو کیا معلوم کہ وہ کس سے معاملہ طے کر رہا ہے۔ اسے کیا علم کہ وہ اپنے رقیب سے گفتگو کر رہا ہے۔ یہ معاملہ جس سے طے ہوا تھا وہ لیلٰی کا شوہر تھا لیکن ایک دوسرے سے ناواقف تھے قیس حسب وعدہ صبح اس کے مکان پر گیا اور لونڈی سے پکار کر کہا کہ اندر جا کر میرے آنے کی خبر اپنے آقا سے کر دے لیلٰی کی کانوں میں جب یہ آواز پہونچی تو اس نے محسوس کیا کہ اس آواز سے تو کان آشنا ہیں لونڈی اندر گئی تو لیلٰی نے اس سے کہا کہ اس شخص سے جا کر دریافت کرو کہ تم اسقدر پریشان حال کیوں ہو۔ لونڈی کے اس سوال پر قیس نے کہا کہ فراق یار نے یہ حالت کر دی ہے لیلٰی نے پھر لونڈی سے کہلا بھیجا کہ وہ ہمیں اپنا فسانۂ غم سنائے قیس اپنی داستان سنا ہی رہا تھا کہ یکایک پردہ اٹھا اور لیلٰی سامنے کھڑی تھی۔ لیلٰی نے کہا کہ بس کافی ہے۔ اب اپنا فسانۂ غم رہنے دے۔

قیس یہ منظر دیکھکر مبہوت سا ہوگیا۔ زار و قطار رونے لگا اور پھر تاب نہ لاکر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ صاحب خانہ ہر چند بلاتا اور پکارتا رہا لیکن نہ اس نے کوئی جواب دیا اور نہ مڑکر اس طرف دیکھا لبنیٰ نے اپنے شوہر سے کہا حیف تجھے نہیں معلوم یہ قیس تھا۔ اس نے کہا۔ کیا کہوں افسوس کہ میں نے نہیں پہچانا۔ انہیں قصوں میں سے بُریکہ نامی ایک عورت کا قصہ ہے یہ شرفا قریش میں سے ایک شخص کی بیوی تھی قیس نے چاہا کہ اس کے ذریعے سے لبنیٰ سے ملنے کی کوشش کرے یہ عورت اس معاملے میں بہت ہوشیار تھی قیس کے کہنے سے وہ طیار ہوگئی اور اس نے ایک دن دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا پہلے تو شکوہ شکایت کا سلسلہ رہا اسی سلسلہ میں قیس کی شادی کا بھی ذکر آیا قیس نے قسم کھا کر کہا کہ میں نے لبنیٰ فرازیہ کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا اور نہ حقیقتاً مجھے اس سے محبت تھی۔ اور اگر کچھ انس تھا بھی تو صرف ع

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسی واری

کی بنا پر۔ یہ خوشگوار صحبت اس وعدے پر ختم ہوئی کہ لبنیٰ پھر یہیں آکر ملے گی لیکن نہیں معلوم کیوں پھر وہ نہیں آئی۔ قیس اپنی ناکامی و نامرادی کیساتھ مدینہ سے واپس آیا۔

اسی قسم کی اور بہت سی روایتیں مشہور ہیں لیکن اب ہم صرف ایک واقعہ بیان کریں گے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لبنیٰ شادی کے بعد بھی ویسی ہی وفا شعار و جاں نثار رہی جیسی کہ شادی سے قبل تھی۔

قیس عالم بے خودی اور از خود رفتگی میں اپنے واردات قلب، اپنے جذبات محزون اور اپنے پر درد خیالات ایک نغمۂ موزوں کی صورت میں عجیب والہانہ طرز پر ادا کرتا جو دل سے نکلتا اور دل ہی میں اُتر جاتا۔ ایک دُکھے ہوئے دل کی صدا تھی، ایک ستم رسیدہ کی آہ دلدوز تھی اور ایک زخم خوردہ کی کراہ تھی جو دلوں کو بغیر شق کئے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر تھے۔ قوال اور گوئیے محفل رقص و سرود میں اس کے اشعار سے ماتم بپا کر دیتے، عورتیں اور لڑکیاں گھروں میں گاتیں اور دلوں کو تڑپا دیتیں۔ اس مجذوب محبت کی بڑ اس قدر مقبول ہوئی

کہ مدینہ کے ہر در و دیوار سے اسی کی صدائے پر درد نکلتی لبنیٰ کے شوہر کو فطری طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے تھا اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار لبنیٰ سے بھی کیا لبنیٰ نے اس کا جواب نہایت صفائی اور جسارت سے دیا۔ اس نے کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی نہ مال و دولت کے لالچ میں اور نہ کسی دلچسپی اور انس کی بنا پر کی ہے بلکہ شادی کرنے سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ مجھے خطرہ تھا کہ قیس اپنی دیوانگی میں میرے قبیلہ والوں سے پھر کوئی معاندانہ نہ کرے جس کے بدلے اس کی جان زا ہلاک ہو جائے اس لئے کہ بادشاہ وقت نے اسکا خون مباح کر دیا تھا۔ اور پھر میں اس کے دیوانہ پن کی اداؤں سے بھی محروم ہو جاؤں۔ تمہیں اختیار ہے۔ تمہارا جس وقت دل چاہے تم مجھ سے کنارہ کش اور دست بردار ہو جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اب مجھے دنیا کی کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس گفتگو کے بعد اس کے شوہر کا برتاؤ لبنیٰ کے ساتھ بہت ہمدردانہ اور غمگسارانہ رہنے لگا۔ لبا اوقات وہ خود گانے والیوں کو بلوا کر لبنیٰ کے سامنے قیس کے اشعار سنتا۔ اسوقت تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قیس بن ذریح کا قصہ کیا باعتبار جدت اور کیا باعتبار پاکیزگی اور کیا باعتبار دلچسپی ہر حیثیت سے تمام قصوں سے ممتاز اور بلند ہے اس کی بنیاد مستحکم ہے اس لئے اس کا آغاز شاندار، اس کا طرز سادہ اور دور از کار باتوں سے پاک اس کا اس کا سیاق دلنشین۔ اب رہا اس کا انجام اس کے متعلق دو قول ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ قیس کا انجام بھی ناکامی و نامرادی پر ہوا جیسا کہ جمیل و مجنون کا۔ مجنون نے صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کی حالت میں اپنی تمناؤں اور حسرتوں کا مدفن کسی وادی کو قرار دیا۔ اور جمیل مصر میں غربت اور مسافرت کی حالت میں شہیدان محبت کی صف میں داخل ہوا۔ اسی طرح قیس بھی راہ محبت میں خاک راہ ہو گیا لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ قیس کا انجام جمیل و مجنون کے انجام سے بالکل مختلف ہے وہ ناکام محبت نہیں کامران محبت ہے، وہ اپنے عشق صادق اور پاکیزہ محبت میں کامیاب رہا۔ اس کی زندگی محض حزن و ملال ہی نہیں۔ اس کی حیات محض غم و الم کا مجموعہ

ہی نہیں، اُس کا عشق محض ناپسندیدگیوں اور غم انگیزیوں ہی سے مملو نہیں۔ بلکہ اس کی مجموعی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و محبت ناخوشگواریوں اور سختیوں سے بے لطفیوں اور مصیبتوں ہی کا نام نہیں، بلکہ اس میں مصیبت و تکلیف بھی ہے لطف و مسرت بھی ہے بے چینی و اضطراب بھی ہے سکون و راحت بھی۔

یہاں تک سب متفق ہیں کہ قیس لبنیٰ سے مل کر جب مدینہ سے واپس آیا تو وہ شام اپنے خون کی معافی کے حکم کو منسوخ کرانے کی غرض سے گیا وہاں یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑی مہربانی سے پیش آیا، اس نے خلیفۂ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس کی سفارش کر کے حکم کو منسوخ کرا دیا۔ اب قیس کو آزادی مل گئی کہ جہاں چاہے جائے اور جس جگہ چاہے رہے کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یزید قیس کے حال زار پر اس قدر مہربان ہوا کہ وہ چاہتا تھا کہ والی مدینہ کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ لبنیٰ کے شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ کرے۔ لیکن قیس نے اس عنایت بے پایاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتنی ہی عنایت کیا کم ہے۔ اور صرف تنسیخ کا حکم لیکر چلا آیا۔ اس جگہ پر متعدد روایتیں ہیں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی آئندہ زندگی مدینہ کی گلیوں کی خاک چھاننے اور لبنیٰ کے فراق میں تڑپنے میں صرف ہوئی۔ وہ مدینہ آتا، لبنیٰ کے مکان پر حسرت بھری نگاہیں ڈالتا، آہ و فغاں، نالہ و شیون کرتا، اور پھر واپس جاتا حتیٰ کہ دست اجل نے یا تو لبنیٰ کی زندگی ہی میں قید حیات سے رہائی دلا دی یا لبنیٰ کے انتقال کے بعد وہ اس صدمہ جانکاہ سے جانبر نہ ہو سکا۔

لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ جب قیس دربار خلافت سے تنسیخ کا حکم لے آیا تھا تو اس کا دوست ابو عتیق، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم اور شرفائے قریش کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ لوگوں سے میری

ایک گذارش ہو اگر کامیابی کی امید ہو تو اظہار کی جرأت کروں اجازت پانیکے بعد اس نے کہا کہ مجھے ایک شخص سے ایک امر کی استدعا کرنی ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اگر میں نے بلا سفارش اس سے کہا تو وہ انکار کر دے گا اس لئے میں آپ کے وقار، و حترام اور آپ کی وجاہت و عظمت کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ تمام حضرات نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر تمہارا کوئی کام ہمارے ذریعہ سے نکل سکتا ہے تو ہمیں کوئی عذر نہیں۔ اسی وقت ایک دن متعین کر دیا گیا کہ اس روز سب لوگ ابو عتیق کے ہمراہ جا کر اس کی سفارش کر دیں۔ لیکن اب تک کسی کو یہ علم نہ تھا کہ کس معاملہ میں سفارش کے لئے یہ ہم لوگوں کو لئے جا رہے ہیں۔ جب وعدہ وقت معینہ پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ اور ابو عتیق کے ہمراہ مدینہ میں لبنیٰ کے شوہر کے یہاں پہونچے۔ وہ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اس سے ان لوگوں نے ابو عتیق کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس شخص کا تم سے ایک کام ہے اور اسی غرض سے یہ ہم لوگوں کو تمہارے پاس لایا ہے۔ اس نے عرض کیا وہ کام سر آنکھوں پر اور اُسکا پورا ہونا یقینی۔ جب ابو عتیق کو پورا اطمینان ہو گیا۔ تب اس نے لبنیٰ کے شوہر کی طرف مخاطب ہو کر کہا میرا اور کوئی کام نہیں، صرف ایک خواہش ہے وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ ایک گرفتار محبت کے لئے۔ وہ یہ کہ تم لبنیٰ کو طلاق دے دو۔ اس نے فوراً بلا تامل طلاق دے دی لیکن اس واقعہ سے شرفاء قریش اور وہ تمام معزز حضرات جو اس معاملہ میں گئے تھے۔ بہت شرمندہ اور نادم ہوئے۔ وہ طلاق کے معاملہ میں پڑنا کبھی بھی گوارا نہ کر سکتے تھے

ابو عتیق کی سعی پیہم اور ایک مدت کے بعد بچھڑے ہوئے ایک دوسرے ملے۔ اور نہایت لطف و مسرت کے ساتھ پھر دولہا اور دولہن کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے قیس نے اس کے شکریہ میں ابو عتیق کی مدح

میں یہ اشعار کہے۔

جزی الرحمان افضل مایجازی	علی الاحسان خیر من صدیق
فقد جربت اخوانی جمیعا	فما الفیت کابن ابی عتیق
سعی فی جمع شملی بعد صدع	ورأیٍ بعد حدت فیہ عن الطریق
واطفا لوعۃ کانت بقلبی	اغصتنی حرارتہا بریقی

اس تعریف کو سن کر ابو عتیق نے کہا اے دوست تعریف و توصیف رہنے دے ورنہ جو شخص سنے گا مجھے دلال کہے گا۔

مژدہ

یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہمدردان جامعہ رسالہ جامعہ و پیام تعلیم کے خریدار بنانے میں پوری کوشش سے کام لیں گے، حسب ذیل انعامات مقرر کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ہر ایک شخص ان انعامات کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

(۱) جامعہ کے دو خریدار یا پیام تعلیم کے پانچ خریدار بنانے کے لئے۔ "پردۂ غفلت" یا مطبوعات جامعہ میں سے اسی قیمت کی کوئی چیز

(۲) جامعہ کے چار خریدار یا پیام تعلیم کے دس خریدار بنانے والے کے لئے۔ "دیوان شیدا" " " " " " " "

(۳) جامعہ کے پانچ خریدار یا پیام تعلیم کے بارہ خریدار بنانے والے کے لئے۔ "دیوان غالب" " " " " " " "

اس سے زیادہ قیمت کے لحاظ سے ۲۵ فیصدی قیمت کی کتابیں مطبوعات جامعہ سے دی جائیں گی خاص صورتوں میں نقد کمیشن بھی دیا جا سکتا ہے۔

منیجر رسالہ "جامعہ" و پیام تعلیم۔ قرول باغ۔ دہلی۔

سزائے موت

بادشاہ خود مختار مگر نرم دل تھا۔ انصاف اور عدل کے اصول مستحکم مگر سخت گیر نہ تھے بخت سے سخت شاہی احکام میں رحم کی گنجائش اور لچک باقی رہتی تھی۔

اس ملک میں کبھی کسی نے سزائے موت کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نہ کبھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا تھا، قانونی سزاؤں میں انتہائی سزا جلا وطنی کی تھی۔ وہ بھی کبھی شاذ و نادر، دس بیس برس میں کسی ایک مجرم کو ایک دفعہ۔ لیکن اس انتہائی سزا میں بھی رعایت اور رحم کی لچک باقی رہتی تھی۔ فرض کیجئے کہ بادشاہ نے زید کو ملک بدر کر دیا۔ زید وطن سے دور کیونکر رہ سکتا تھا، وہ کچھ روز وطن کی سرحد کے پاس آوارہ گردی کرتا رہا، پھر کچھ روز بعد کبھی کبھی سرحد کے اندر بھی آنے لگا، دو چار فرلانگ سلطنت کی حدود کے اندر پھرا چلا اور پھر واپس ہوگیا، پولیس کا بھی کچھ خوف تھا، چوکیداروں کا بھی کچھ اندیشہ تھا۔ (فوج اس ملک میں نام کو نہ تھی، ضرورت ہی کیا تھی، چوکیدار اور پولیس کے سپاہی قانون کے محافظ تھے اور بس!) کچھ روز آوارہ گردی کے بعد زید کو کسی نے نہ ٹوکا تو وہ دارالسلطنت کے اندر بھی آنے جانے لگا۔ کبھی کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھتا، کبھی باغ عامہ میں چہل قدمی کرتا، کون جانے کون ہو، مگر ایک دن باغ عامہ کے دروازہ پر پولیس کے افسر نے پہچان لیا۔ راستہ روک کر اس نے کہا:۔

"جناب من! آپ تو شاید ملک بدر کئے جا چکے ہیں؟"

"جی ہاں! مگر میں صبح ہی تو آیا تھا اور شام کو ضرور چلا جاؤں گا۔"

"ہاں! یہ صورت ہے، یہ صورت ہو تو کچھ حرج نہیں۔"

عمر بھر زید یوں ہی پولیس والوں سے صبح کا آنا اور شام کا جانا بیان کرتا رہا، جلا وطنی کا حکم بھی اس کے خلاف قائم اور حکم شاہی کا احترام بھی برقرار رہا مگر زید کی آزادی میں بھی کوئی مداخلت

نہ ہو سکی!

مگر ایک دفعہ بادشاہ کے ملک میں ایک سخت حادثہ پیش آیا، ایک بہت ہی سخت حادثہ جیسا کبھی پہلے پیش نہ آیا تھا۔ یعنی بادشاہ کی رعایا میں سے ایک نے، اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ ایسا واقعہ اس ملک کے باشندوں نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا، عدالت میں ہزار ہا اشخاص کا مجمع تھا، ملزم کے خلاف عام طور پر نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ عدالت کے جج صاحبان سخت غصے اور رنج کی حالت میں مقدمہ کی سماعت کے لئے اپنی کرسیوں پر آکر بیٹھے۔ بادشاہ بھی اس حادثہ کی وجہ سے بہت مغموم تھا۔ ججوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیے، نہ ایسا جرم کبھی کسی نے پہلے سنا تھا نہ ایسی سزا! لوگ حیران بھی تھے، ناراض بھی تھے، مغموم بھی تھے!

پولس نے ملزم کو اپنی حراست میں لے لیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو قتل کس طرح کیا جائے۔ سلطنت کے طول و عرض میں نہ کوئی جلاد تھا نہ کسی کو پھانسی دینا آتی تھی۔ بہت سے طویل مشوروں کے بعد وزرائے شاہی نے ہمسایہ سلطنت کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ پھانسی دینے کا سامان اور ایک پھانسی دینے والا بھیج دیا جائے، بہت سی خط و کتابت کے بعد ہمسایہ سلطنت نے آمادگی ظاہر تو کی مگر اس شرط پر کہ اس خدمت کے معاوضہ میں ایک ہزار سکے دیئے جائیں۔ جب اس کا یہ جواب وصول ہوا تو بادشاہ اور اس کے وزراء کو عرصہ تک اس سوال پر غور کرنا پڑا، لیکن کسی طرح معاوضہ دے کر مجرم کو قتل کرانے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک انسان کی جان جسم سے نکالنے کے لئے ایک ہزار سکوں کو خرچ کر دینا، محض حماقت ہی۔ آخر کار ہمسایہ سلطنت سے امداد لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اور مجرم ۶ ماہ بعد بھی پولیس کی نگرانی میں آزاد اور زندہ تھا!

پھر ایک دفعہ مجلس وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا، اور پھر ایک دفعہ کسی دوسری سلطنت کو لکھا گیا کہ وہ پھانسی دینے کا سامان بھیج دے۔ وہاں سے بھی ہزار تو نہیں مگر سو سکوں کا حساب بن کر

آیا۔ بادشاہ کے کابینہ نے پھر راتوں اور دنوں اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنے دماغوں پر زور ڈالا۔ آخرکار وہی فیصلہ ہوا جو پہلے ہو چکا تھا، "سو روپیہ محض ایک مجرم کا گلا دبا کر اس کی جان نکالنے کے لئے، کیا حماقت ہے، نہیں ہو سکتا!" بادشاہ نے فرمایا، "یہ تو نہیں ہو سکتا"، اور وزراء نے بھی یک زبان ہو کر کہا، "یہ تو نہیں ہو سکتا" جب شہر میں کابینہ کے اس فیصلہ کی خبر پہنچی تو وہاں بھی ہر چھوٹے بڑے نے یہی کہا کہ "یہ تو نہیں ہو سکتا"!

پھر کیا ہوا؟ کم و بیش ایک سال تک مجلس وزراء کے جلسوں میں اس سوال پر بحث ہوتی رہی! اور مجرم ہنوز زندہ رہنے پر مجبور تھا!

دو سال گزر گئے، بادشاہ اور وزراء کا ناخن عقل اس گرہ کو نہ کھول سکا، بالآخر حکم ہوا کہ پولیس کا ایک سپاہی تلوار سے مجرم کی گردن کاٹ دے، بڑی بات یہ تھی کہ اس صورت میں سلطنت بہت سے ناواجب اخراجات سے بچ جائے گی، چنانچہ پولیس کے افسر کو حکم دیا گیا کہ ایک سپاہی کو اس غیر معمولی کام کے لئے نامزد کر دے۔ مگر افسر نے عذر کیا اور اس کے سپاہیوں کو اس طرح تلوار استعمال کرنے کی بالکل عادت نہیں، افسر کا جواب ناقابل جواب تھا!

مگر اب کیا کیا جائے؟ ہفتوں مجلس وزراء کے جلسے صبح شام ہوتے رہے مگر اس سوال کا جواب میسر نہ آتا تھا! اور مجرم ہنوز نہ زندگی کی امیدوں سے دور نہ موت سے قریب تھا!

ایک دن اُن وزراء میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "کیوں نہ ہم سزائے موت کو حبس دوام سے بدل دیں"، تمام اراکین مجلس اس تجویز کی معقولیت کے معترف ہوئے اور بادشاہ نے بھی اس کو مناسب اور بہتر تجویز سمجھ کر منظوری دے دی۔ مگر یہ تجویز بھی دشواریوں سے خالی نہ تھی۔

مجرم حبس دوام کی سزا کو پسند بھی کرے گا یا نہیں؟
جیل خانہ کہاں ہے جس میں وہ عمر بھر رکھا جائے؟
اور جیلر کا کیا انتظام ہوگا؟
اور مجرم کو زندہ رکھنے کے لئے خورد و نوش کا خرچ کون برداشت کرے گا؟

سلطنت کو آج تک جیلخانہ کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ لہٰذا سرکاری جیلخانہ موجود نہ تھا، نہ جیلر تھا، پھر ہفتوں مشورے ہوئے، اور بالآخر ایک مکان کرایہ پر لے کر جیل خانہ بنایا گیا، ایک شخص کو نوکر رکھا گیا کہ وہ جیلر بن کر قیدی کی حفاظت کیا کرے۔ شاہی باورچی خانے سے قیدی کے کھانے کا انتظام منظور ہوا، کہ سن کر قیدی کو بھی راضی کر لیا گیا کہ وہ اپنی سزا کی نوعیت بدل جانے پر ناراضگی کا اظہار نہ کرے، دو تین سال کی کشمکش کے بعد اب قیدی اپنے جیل خانے میں آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے!

چھ مہینے تک یہ دستور رہا کہ قیدی اپنے گھاس کے بستر پر لیٹا رہتا تھا جیلر صبح آتا تھا اور دروازے پر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ شام تک یا تو قیدی سے باتیں کرتا رہتا تھا، یا شطرنج کھیلتا رہتا تھا، دونوں وقت شاہی باورچی خانے کا ایک غلام قیدی اور جیلر کا کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ شام کو جیلر مکان کا دروازہ باہر سے بند کر کے اپنے گھر چلا جاتا تھا، بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب حکام اعلیٰ کو اس قیدی کے متعلق کوئی تردد باقی نہ رہا ہوگا، مگر بادشاہ خود ابھی تک متردد تھا، وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ملک کے بجٹ پر اس مستقل خرچ کا بار کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ قیدی ابھی نوجوان ہے، سالہا سال زندہ رہے گا، پھر یہ مکان کا کرایہ، جیلر کی تنخواہ، قیدی کا کھانا، یہ تو گویا ساری عمر کا خرچ پیچھے لگ گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کا تردد کچھ بیجا نہ تھا، چنانچہ پھر ایک دن مجلس وزراء نے بادشاہ کے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا، مہینوں کے بعد شاہی کونسل بالآخر اس فیصلہ پر پہنچی کہ اگر قیدی کو اپنی حفاظت خود کرنے پر آمادہ کیا جا سکے تو جیلر کو برخاست کر دیا جائے، اس کی تنخواہ کے بقدر اخراجات میں تخفیف ہو جائے گی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ قیدی کوئی ضدی آدمی نہ تھا، اس نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اب وہ تنہا اپنے جیلخانے میں صبح سے شام تک زندگی بسر کرتا تھا۔ دن میں دو دفعہ جب شاہی باورچی اس کا کھانا لے کر آتا تھا تو ایک دو گھنٹے شطرنج کی کوئی بازی قیدی کے ساتھ کھیل جاتا تھا۔ کچھ عرصے تک قیدی کی زندگی کا یہ راستہ بالکل ہموار رہا، لیکن ایک دن شاہی باورچی بھول گیا، یا مصروف زیادہ تھا، یا بیمار ہو گیا، غرض یہ کہ قیدی کا کھانا وقت پر نہ آ سکا

بوک نے شاہی قوانین کی پابندی سے انکار کر دیا۔ اور قیدی خود ہی قید خانے سے نکل کر شاہی باورچی خانے تک پہنچ گیا، جب ایک دفعہ قیدی اپنا کھانا لینے خود جا سکتا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہر دفعہ وہی نہ جایا کرے۔ مجلس وزرا نے بھی مزید کفایت کے اس پہلو کو پسند کیا اور اب یہ دستور ہو گیا کہ قیدی دونوں وقت خود ہی اپنا کھانا لے آتا تھا اور رات کو قید خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہتا تھا۔ کھانا لانے اور شاہی باورچی خانے تک جانے آنے کے سلسلہ میں کبھی باغ عامہ میں دو چار گھنٹے سیر و تفریح، یا کبھی کسی قہوہ خانے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا وقفہ ایک ایسی معمولی بات تھی جس کے متعلق قیدی سے کبھی بازپرس ہو ہی نہ ہو سکتی۔ وہ خود ہی اتنا ایماندار اور قانون سلطنت کا پابند تھا کہ دن بھر باہر رہنے کے بعد بھی شب کو کبھی اپنے جیل خانے سے غیر حاضر نہ ہوتا اس طرح کئی سال گزر گئے، قیدی اپنی سزا بھگت رہا تھا اور حکومت کا ضمیر بھی مطمئن تھا کہ خطاوار کو کافی سزا دے کر قانون کی عزت برقرار رکھی گئی!

لیکن بادشاہ ہر سال اپنے بجٹ میں جیل خانے کے اخراجات کی مد کو دیکھ کر بہت فکرمند ہوتے تھے۔ ان کی رائے میں جیل خانہ کا کرایہ اور قیدی کی خوراک کا خرچ ملک کے بجٹ پر ایک بیجا بار تھا، رفتہ رفتہ ایک دن پھر اخراجات کا یہ سوال مجلس وزرا کے سامنے آ گیا۔ کسی نے یہ تجویز پیش کی قیدی کی سزا کو حبس دوام کے بجائے جلا وطنی کر دیا جائے اور اس طرح جیل خانے کے اخراجات سے ملک کو بچانا چاہئے۔ تجویز معقول تھی، اُس پر مجلس متفق ہو گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ قیدی بھی سزا کی اس ترمیم پر راضی کیا جا سکیگا؟ مجلس کے روبرو قیدی حاضر کیا گیا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی، پہلی دفعہ، اپنی طویل مدت قید میں جب وہ تمام احکام کو اطاعت اور بندگی کے ساتھ قبول کرتا رہا تھا، پہلی دفعہ قیدی نے وزرا کی اس تجویز پر سخت اعتراض کیا اس نے کہا:۔

"جناب آپ نے قتل کا حکم دیا، میں نے عذر نہ کیا، آپ نے حبس دوام کا حکم دیا میں اس پر بھی رضامند ہو گیا، آپ نے میرے جیلر کو موقوف کر دیا میں نے شکایت نہیں کی، آپ نے میری حفاظت کا فرض مجھ ہی پر عاید کر دیا۔ میں نے اسکو بھی

گوارا کر لیا پھر آپ نے مجھ کو مجبور کیا کہ باورچی خانے سے اپنا کھانا لایا کروں، یہ بھی میں نے آپ کی خاطر منظور کیا۔ اب آپ مجھے ملک سے نکالتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کماؤں گا کیا؟ میری وجہ معاش کیا ہو گی، میں آپ کا قیدی ہوں، آپ نے مجھے قید کیا، اور میں نے آپ کے تمام احکام کی تعمیل کی، لہٰذا اب میری پرورش آپ کے ذمے نہیں تو کس کے ذمے ہے؟"

قیدی نے جس قدر عذر پیش کئے سب معقول تھے، شاہی کونسل لاجواب ہو گئی، جلسہ برخاست ہو گیا اور شاہی محل کے بڑے کمرے میں پھر عرصے تک اس سوال پر مشورے ہوتے رہے کہ ہو تو کیا ہو، کریں تو کیا کریں، قیدی جلاوطنی پر رضامند نہیں ہوتا، قتل کیا نہیں جا سکتا، حبس دوام کے اخراجات بہت ہیں، پھر کیا سمجھوتا کیا جائے؟ اس وقت تک قیدی کے اخراجات کا اوسط ایک ہزار روپیہ سال کے قریب تھا۔ اگر یہ رقم نہیں بچائی جا سکتی تو نصف ہی بچالی جائے۔ اس طرح کہ قیدی کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ پانچسو روپیہ سال لے لیا کرے اور اس ملک سے چلا جائے جب اس تجویز میں بادشاہ اور اس کے وزرا متفق ہو گئے تو پھر قیدی کونسل کے سامنے طلب کیا گیا اور اُس سے کہا گیا کہ

"تم کو پانسو روپیہ سال پنشن ملے گی بشرطیکہ تم اس ملک سے چلے جاؤ"

گو کہ قیدی اس تجویز کو انصاف اور قانون کے خلاف سمجھتا تھا لیکن لوگوں کے سمجھانے سے وہ بالآخر اس پر راضی ہو گیا چنانچہ وہ اب سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے باغ میں رہتا ہے۔ ہر تیسرے مہینے بادشاہ کا ہرکارہ اُس کی پنشن اس کو دے جاتا ہے، اس طرح اس کے حبس دوام کی طویل مدت گزر رہی ہے!

جو تکلیفیں اور پریشانیاں اس قیدی کے متعلق وزرائے سلطنت کو ہوئیں اس کا لحاظ کر کے ملک کے قانون میں اب اس قدر ترمیم کر دی گئی ہے کہ آئندہ مجرموں کو سزا کے بعد جیلخانے میں رکھنے کے بجائے پنشن دے کر ملک بدر کر دیا جاتا ہے اور وہ ہمسایہ ممالک میں سرکاری پنشن پر اپنی سزا کا زمانہ بسر کر لیتے ہیں!

زخم آخری کی آرزو

ایک نگاہ لطف تیر بے کماں میرے لئے　　ایک ادائے ناز زخم بے نشاں میرے لئے
زخم دل میرے لئے داغ نہاں میرے لئے　　تھے دیارِ عشق میں کیا کیا نشاں میرے لئے

آج میری ہستی ہنگامہ زا خاموش ہے
آرزوئے مردہ کا تابوت بار دوش ہے

اس بساط عشق پر ہاری ہوئی بازی ہوں میں　　اور فریب حسن کا ایک قصہ ماضی ہوں میں
فیض داغ عشق کا ممنون فیاضی ہوں میں　　مرگ امید وفا پر ہر طرح راضی ہوں میں

دیدۂ بے نور محروم تماشا چاہئے
اے دل بے مدعا آخر تجھے کیا چاہئے!

ہے حیات دنیوی ایک عہد مجبوری کا نام　　دار و گیر زندگی ہے ایک معذوری کا نام
کیف وصل یار ہے فی الواقعہ دوری کا نام　　عیش رکھا انہاک درد مہجوری کا نام!

دیکھنا تو زندگی کی یہ غلط اندیشیاں
اور ناکام فریب عشق کی دل ریشیاں!

جستجوئے علت اجزائے فانی کس لئے　　سوزش جہد بقائے زندگانی کس لئے
ہستیٔ بے ربط عالم کی کہانی کس لئے　　نقطۂ موہوم پر جادو بیانی کس لئے

مدعائے ہستی باطل رہے گا بے نشاں
فہم خود بیں کی مگر اڑتی رہیں گی دھجیاں

قطرۂ شبنم ہے تصویر نظام روزگار　　برگ گل پر ایک ساعت بھی نہیں ممکن قرار
ہر نفس لاتا ہے یک صبح خزاں شام بہار　　موج بوئے گل کا کیا آغاز کیا انجام کار

ہے چمن کی آبرو ممنون یک موجِ نسیم
بلبلِ رنگیں ہے کیوں پابندِ صد امید و بیم؟

"(1) ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے" — اور خود تقدیر بھی ایک خوابِ بے تعبیر ہے
اس کتابِ زندگی کی زخمِ دل تفسیر ہے — ہر نفس نکلا ہوا گویا کماں سے تیر ہے
جب یہ عالم ہے تو یہ ہنگامۂ ہستی ہے کیا
امتیازِ باطل ہشیاری و مستی ہے کیا؟

زندگی کے چہرۂ اصلی پہ ہے ہلکا نقاب — پردۂ غفلت میں ہے پوشیدہ پیری و شباب
اصل کارِ زندگی ہے جلوۂ نقشِ سراب — ایک ہی ہے خندۂ مسرور اور چشمِ پُرآب
اس فریبِ زندگی پر کیوں مٹے جاتے ہیں ہم
عقلِ بے بنیاد کے بوتے پہ اتراتے ہیں ہم!

ہمنوا تیری نظر مصروفِ سیرِ آب ہے — محوِ رقصِ موج ہے اور کس قدر بیتاب ہے
تو نہ سمجھے گا کہ یاں ہر قطرہ ایک گرداب ہے — جنسِ عشرت اس تماشا گاہ میں نایاب ہے
کشتیِ پارینہ لرزاں قلزمِ ہستی پہ ہے
موجِ چشم آگیں آمادہ زبردستی پہ ہے

دل کہ ہے سوزِ جراحت کا مزا پائے ہوئے — ہر قدم پر عمر کے ایک زخم نو کھائے ہوئے
جستجوئے عیشِ بے معنی سے پچھتائے ہوئے — بھول کر سب زندگی کے خواب دکھلائے ہوئے
شیوۂ ناز و نیازِ عشق و شانِ دلبری
مانگتا ہے سب کے بدلے ایک زخمِ آخری!

(ق۔ ع۔ غ)

---

(1) "اقبال"

غزل

از جناب دلؔ شاہجہاں پوری

حسنِ ازل ہے جلوہ گر آئینۂ مجاز میں — عشق نے روح پھونک دی جذبۂ امتیاز میں
عشقِ جنوں نواز نے پردۂ سوز و ساز میں — درد و غضب کا بھر دیا نالۂ دل گداز میں
دل کا نشان اب کہاں بزمِ نیاز و ناز میں — عشق تو جذب ہو گیا حسنِ کرشمہ ساز میں
اہلِ نظر سے تھا نہاں شاہدِ خلوت آشنا — پردہ اُٹھا کے آ گیا انجمنِ مجاز میں
بیٹھے تو گرد کی طرح اُٹھے تو درد کی طرح — عمر یوں ہی گذار دی دشتِ جنوں نواز میں
کج نگہی کی ہر ادا۔ آہ عذابِ جاں ہوئی — فتنۂ حشر تھا نہاں چشمِ فسوں طراز میں
چشمِ وفا نواز سے شانِ نیاز دیکھئے — پست ہے رعبِ غزنوی بارگہِ ایاز میں
عشقِ رسولِ پاک سے ہو یہ اثر پذیر دل — نالہ کریں جو ہند میں گونج اُٹھے حجاز میں
بندۂ عشقِ مبتلا کجا دید کی آرزو کرے — اس نے تو منہ چھپا لیا پردۂ کبر و ناز میں
حاصلِ انتہائے غم پوچھئے اس غریب سے — عرصۂ حشر ہے نہاں جس کی شبِ دراز میں
جوشِ فنا عطا کیا نقشِ دوئی مٹا دیا — شمعِ جمالِ یار نے خلوتِ سوز و ساز میں
سنگِ درِ حبیب کو حس نہ سہی قبول کی — فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نیاز میں

عشقِ وفا پرست کی شان یہ ہے جنابِ دلؔ
ہستیِ دل مٹائیے رہ گذرِ نیاز میں

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

سعید - تربیت - ندیم

سعید | ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی کا نام نامی دنیائے ادب میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے دل بھی پایا ہے اور داغ بھی۔ قلم بھی پایا ہے اور خیال بھی۔ مدت سے اخبار نویسی کرتے ہیں، ہمدرد کے اڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکے ہیں اور رسالہ کامیابی کو ایک مدت تک چلاتے رہے ہیں۔ اب انھوں نے اپنا یہ ذاتی رسالہ نکالا ہے۔ جس کا حجم کراؤن سائز پر چار جزو ماہانہ ہے اور جو نہ صرف مفید اور لطیف مضامین بلکہ تصاویر سے بھی مزین ہے۔ قیمت سالانہ سے ر، اور مقام اشاعت کوچہ چیلان دہلی ہے۔

تربیت | یہ رسالہ مہینے میں دو بار مقام قلعہ بہار شریف ضلع پٹنہ سے مولوی مسعود عالم صاحب کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ بہار جیسے مقام سے اُردو کے لئے جو کوشش ہو وہ قابل احترام ہے یہ رسالہ ابھی نیا نیا عالم وجود میں آیا ہے اس لئے اس کی چھپائی لکھائی اور ترتیب میں جو خامیاں ہیں ان کو ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اس کے مدیر کو مشورہ دیتے ہیں کہ کاغذ اور چھپائی کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھیں ورنہ رسالہ کبھی مقبول عام نہ ہو سکے گا۔

رسالہ کا حجم ۴۸ صفحے ہے۔ اور قیمت سالانہ سے ر

ندیم | یہ ماہانہ رسالہ گیا سے مولانا انجم اور عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی کی ادارت میں کراؤن سائز پر ساڑھے چار جزو کا مصور نکلنا شروع ہوا ہے۔ زیر تنقید رسالہ تیسرا نمبر اگست سنہ ۳۱ء کا ہے۔

مضامین عمدہ ہیں۔ زبان شستہ ہے اور چھپائی لکھائی اچھی ہے۔ ہم کو توقع ہوتی ہے کہ یہ رسالہ صوبہ بہار میں اُردو زبان کی اچھی خدمت کرے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اس کو چلانے والوں کو استقلال نصیب ہو تاکہ اس کو برابر ترقی دیتے ہوئے چلے جائیں۔

اس کی سالانہ قیمت للعہ ہے اور ملنے کا پتہ دفتر ندیم محلہ پنچایتی اکھاڑہ۔ شہر گیا۔

کتب:۔

مرزا جی۔

مرزا جی | از ایم اسلم صاحب، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۲۱۲ صفحے کتابت معمولی، کاغذ نفیس، طباعت عمدہ، قیمت عہ ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو، بازار بارود خانہ، لاہور

مصنف کے ظریفانہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس پر پروفیسر تاثیر صاحب نے ایک مختصر اور پرمغز دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے "گذارشات" کے نام سے اپنی ادبی زندگی کی مختصر تاریخ اور ہر مضمون کی شانِ نزول لکھی ہے جس کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ اصل کتاب میں اکیس مضامین ہیں اور ایک تتمہ جو بقول مصنف کے دو خالی صفحے بھرنے کے لئے لکھا گیا۔ تیرہ مضامین میں "مرزا جی" کو تختۂ مشق بنا کر مختلف قسم کے مضحک کیرکٹروں کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اور آٹھ مضامین متفرق موضوعوں پر ہیں۔

زبان کے متعلق مصنف نے خود عذر کیا ہے اس لئے ہمیں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ مضامین کی عبارت کو جو مجموعی حیثیت سے سلیس و دلنشیں اور شوخ ہے بھونڈی غلطیوں نے داغدار کر دیا ہے۔ یہ عیب تھوڑی سی توجہ سے دور ہو سکتا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھیں گے۔

کتاب کے چار مضمون "مرزا جی ہندو تھے" "مرزا نجریا" "دعوتی رقعہ" اور "مرزا جی"

ستھری ظرافت کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ انھیں پڑھ کر جسے ہنسی نہ آئے اور لطف نہ آئے اُسے "مزاجی" سے کم نہ سمجھنا چاہیئے، خصوصاً "مزاجی بندوقچی" بڑے مزے کی چیز ہے۔ بقیہ مضامین عجلت میں سرسری طور پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں بعض اچھی پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ان میں ادبی ظرافت اور طنز کے اس قانون کی صریحی خلاف ورزی ہے کہ لکھنے والے کو ذاتی بغض و عداوت اور مذہبی اور سیاسی تعصب کے اظہار سے بچنا چاہیئے یا کم سے کم ان جذبات کو لطفِ بیان اور شوخیِ گفتار کا پابند رکھنا چاہیئے۔ جلی کٹی باتوں میں کوئی ظرافت نہیں ہوتی۔ زہرخند پر کسی کو ہنسی نہیں آتی افسوس کی بات ہے کہ مصنف نے اکثر مقامات پر اس بارے میں ذاتی عناد اور عوام کے تعصبات کی رعایت مدِنظر رکھی ہے اور ادبی مقصد کو فراموش کر دیا ہے۔

بہرحال ان چار مضامین کی وجہ سے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور بہت سے گرما گرم اور چٹپٹے فقروں کی خاطر ہر ظرافت پسند شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

شذرات

ہمارے رسالے کے قلمی معاون اور جامعہ کے استاد تاریخ سید نذیر نیازی صاحب بی اے کو پچھلے مہینے حکم قضا سے اپنے عزیز بھائی شبیر احمد کی جواں مرگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم جامعہ کا ہونہار طالب علم تھا اور برادران جامعہ میں ہر دلعزیز تھا۔ خداوند تعالےٰ اسے غریق رحمت فرمائے اور نیازی صاحب انکے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اس نمبر میں ہم ایک مضمون منکرین حدیث کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق چند باتیں قابل گذارش ہیں

چونکہ فاضل مقالہ نگار رسالہ جامعہ کی ادارت کے رکن ہیں اس لئے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ان کے مضامین میں اہل جامعہ کے خیالات کی نمائندگی کی جاتی ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ موصوف جو مضمون لکھتے ہیں ذاتی حیثیت سے لکھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان کے خیالات سے جامعہ کے لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً حدیث کے متعلق انھوں نے جو مضامین دو اشاعتوں میں لکھے ان میں بعض واقعات اور اکثر نتائج جہاں تک ہمیں علم ہے یہاں کوئی بھی قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ چنانچہ فاضل مقالہ نگار کے پچھلے مضمون کی تردید میں جامعہ کے ایک مستعد طالب علم نے مضمون لکھا تھا اور اس مرتبہ پھر لکھیں گے۔ ایک اور بزرگ نے بھی حدیث کی اہمیت پر ایک مدلل مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور جو حضرات اس موضوع پر خامہ فرسائی فرمائیں گے ان کے رشحات قلم کو ہم تشکر کے ساتھ رسالے میں درج کریں گے بہ شرطیکہ ان میں ذاتیات کا رنگ مطلق نہ ہو اور علمی بحث کے آداب کا خیال رکھا جائے۔

ہمارے رسالے کا یہ اصول ہے اور رہے گا کہ ہر سنجیدہ مضمون خواہ اس کے خیالات سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو رسالے میں درج کیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو اس کی تردید بھی شائع کی جائے۔ علوم کی ترقی کے لئے بھی اور مذہبی عقائد کی پختگی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ جو شبہات دلوں میں رہتے ہیں وہ زبان پر آئیں اور مدلل جوابوں کے ذریعے سے رد کئے جائیں۔ تعلیم کا ایک لازمی جزو یہ ہے کہ طالب علم کو مخالف رائے سننے کی اور اس کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑے۔ جامعہ کے جوان اور بوڑھے اور رسالۂ جامعہ کے قارئین سب کے سب خدا کے فضل سے سچے طالب علم ہیں یا ہونا چاہتے ہیں اور اتنا سواد اور اتنی تمیز رکھتے ہیں کہ مختلف اقوال اور دلائل میں سے قول صحیح اور دلیل محکم کو پہچان لیں، اس لئے وہ اختلاف رائے کو صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ اگر اس کا اظہار نیک نیتی اور تہذیب کے ساتھ کیا جائے۔ انھیں کے مذاق کا اتباع رسالۂ جامعہ میں کیا جائے۔

کئی سال سے جامعہ میں مالی مشکلات اور دوسری پریشانیوں کی وجہ سے یوم تاسیس نہیں منایا جا سکا۔ اس سال جناب شیخ الجامعہ صاحب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس رسم کو پھر تازہ کرنا چاہئے تاکہ اہل جامعہ کے دل میں جامعہ کے بانیوں کی یاد قائم رہے اور انھیں سال میں ایک دن اپنے کاموں کے احتساب اور اپنے مقاصد کی تنقید کا موقع ملے۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر کو یوم تاسیس کا جلسہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک اصلاحی تمثیل اور جدید طرز کے مشاعرے کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے جس میں کوئی طرح نہیں ہوگی اور شعر پڑھنے کی عام اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ صرف ہندوستان کے چند باکمال شعرا اپنا منتخب کلام سنائیں گے۔ اس طرح کا مشاعرہ ۱۹۲۶ء میں ہمارے یہاں نہایت کامیابی سے ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ اس بار اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوگا۔ مفصل پیش نامہ ۲۰ اکتوبر کے بعد اخباروں میں شائع ہو جائے گا۔ امید ہے کہ جامعہ کے قدیم طلبہ اور اس کے دوسرے ہمدرد جو آسانی سے دہلی تشریف لا سکتے ہیں شرکت کرکے اہل جامعہ کو زیر بار احسان فرمائیں گے۔

جو حضرات ہمارے رسالے کو اپنے مضامین بغرض اشاعت عنایت فرماتے ہیں اُن سے درخواست ہے کہ مضمون کا مسودہ صاف خط میں ایک سطر چھوڑ کر لکھا کریں اور اُسے بہت غور سے پڑھ لیا کریں تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے خصوصاً اشخاص اور مقامات کے ناموں اور سنین واعداد کے لکھنے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس سے مدیر اور کاتب کے کام میں بہت سہولت ہو جائے گی۔ اور مضامین پوری صحت کے ساتھ چھپ سکیں گے۔

ہم کئی سال سے اس کی پابندی کر رہے ہیں کہ ہر نمبر میں ایک افسانہ ضرور چھپے۔ معقول افسانوں کے فراہم کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے رسالوں کے مدیر اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم ان کا جو معیار اپنے رسالے کے لئے قائم کیا ہے اس کی وجہ سے ان دقتوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ پچھلے دو مہینے کے پرچوں میں ہم کوئی افسانہ شائع نہیں کر سکے۔ ہمارے ملک کے ادیبوں کو ابھی اس صنف سے ذوق نہیں ہوا ہے۔ ہمارے رسالوں میں عموماً یورپی زبانوں کے افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ میں بھی سوائے پروفیسر محمد مجیب صاحب اور حیات اللہ صاحب انصاری کے طبعزاد افسانوں کے، عموماً ترجمے ہی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہم ادبی چیزوں کے ترجموں کی قدر وقیمت کے منکر نہیں مگر ہماری زبان وادب کی ترقی کے لئے اور ہماری معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کی زندگی کے متعلق طبعزاد افسانے بھی لکھے جائیں، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی زبان کے ادیبوں کو اس طرف توجہ دلانے کے لئے کبھی کبھی انھیں عمدہ افسانوں کے انعامی مقابلے میں شرکت کی دعوت دیا کریں۔ چنانچہ ہم اس قسم کا پہلا مقابلہ امتحاناً نومبر میں رکھتے ہیں اور عام اطلاع کی غرض سے ذیل کا اعلان درج کرتے ہیں، اُردو کے اخبارات ورسائل سے درخواست ہے کہ کم سے کم ایک بار اس کی نقل شائع کر دیں۔

رسالہ جامعہ کی طرف سے افسانہ نویسی کا ایک مقابلہ مقرر کیا گیا ہے جس کی شرائط حسب ذیل

ہیں :-

۱- افسانہ طبعزاد ہو اور ہندوستان کی زندگی کے متعلق خواہ تاریخی ہو خواہ خیالی۔

۲- اس کا مضمون کم سے کم رسالہ جامعہ کے ۸ صفحے کے برابر ہو اور زیادہ سے زیادہ ۱۶ صفحے کے برابر۔

۳- عبارت سلیس اور شگفتہ ہو اور خیالات مذہبی اور سیاسی تعصبات سے پاک ہوں۔

۴- ۳۰ر نومبر ۳۱ء تک دفتر رسالہ جامعہ میں پہنچ جائے۔

۵- ایک کمیٹی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی انعامی افسانے کا انتخاب کرے گی۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

(۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب

(۳) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

۶- جن صاحب کا افسانہ بہترین سمجھا جائے گا۔ ان کی خدمت میں ۲۵ روپے نقد یا اگر وہ پسند کریں گے تو اس قیمت کی کتابیں پیش کی جائیں گی۔

۷- انعامی افسانہ اور بقیہ افسانوں میں سے جو مدیر رسالہ جامعہ کے نزدیک قابل اشاعت ہوں گے وہ مختلف اوقات میں رسالہ جامعہ میں شائع کیے جائیں گے۔ جن افسانوں کی اشاعت منظور نہ ہوگی وہ لکھنے والوں کو واپس کر دیے جائیں گے۔

دوران جنگ میں ابن معاویہ کے یمنی لشکر کا اضطراب اور ابن معاویہ سے بدگمانی اس سلسلہ کا ایک اہم واقعہ

غرض دونوں طرف کی فوجیں باقاعدہ تھیں۔ جنگ ہوئی تو خوب اڑیں۔ ابن معاویہ کی فوج نے جب جنگ کی حالت نازک دیکھی تو اہل یمن گھبرا گئے اور ابن معاویہ کی طرف دیکھنے لگے جو اس وقت گھوڑے پر سوار تھے اور آپس میں کہنے لگے "یہ تو ایک کمسن لڑکا ہے اگر اس گھوڑے پر سے گر جائے تو ہم کیا کریں گے آخر کار ہلاک ہوں گے۔" ابن معاویہ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ انھوں نے بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے، ان لوگوں نے اقبال کیا۔ اس پر ابن معاویہ نے ابو الصباح کو بلا کر کہا "کیا ہمارے لشکر میں تمہارے خچر سے اچھا کوئی خچر نہیں ہے اور یہ گھوڑا تو مجھے تکلیف دیتا ہے اور میں اس پر سے تیر نہیں چلا سکتا۔ تم میرا یہ گھوڑا لے لو اور مجھے اپنا خچر دے دو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایسی سواری پر ہوں کہ اگر کہیں گھر جاؤں تو آسانی سے پہچانا جا سکوں۔" ابو الصباح کا خچر سفیدی مائل اشہب رنگ کا تھا ابو الصباح عبدالرحمن ابن معاویہ کی گفتگو سے کچھ شرمندہ سے ہو گئے کیونکہ وہ یمنی تھے اور کہا "کیا امیر اپنے گھوڑے پر قائم نہیں رہ سکتے۔" عبدالرحمن نے نفی میں جواب دے کر ابو الصباح سے خچر لے لیا۔ اور اس پر سوار ہوئے یہ دیکھ کر یمن والے مطمئن ہو گئے اور اپنے گھوڑوں پر سے اتر کر پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

ابن معاویہ کی فتح اور یوسف کی ہزیمت

اب جنگ نے پھر سختی سے رنگ بدلا۔ ابن معاویہ کی فوج میں سے حبیب ابن عبدالملک اپنے سواروں کو لے کر یوسف کی سوار فوج کے میمنہ و قلب پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دی۔ خالد سودی اور اس کے ہمراہی بھاگ گئے۔ عبید ابن علی (سردار فوج یوسف) نے اسے بھاگتے دیکھ کر خود بھی راہ فرار اختیار کی۔ پھر حبیب اور ابن نعیم نے اہل شام کے سواروں کے ساتھ یوسف کے قلب پر حملہ کیا اس حملہ میں یوسف کی فوج سے کنانہ ابن کنانہ، عبداللہ ابن یوسف اور جوش بن صمیل کام آئے۔ یوسف و صمیل کے قدم اکھڑ گئے۔ یوسف کی فوج میسرہ میں عبید اور قیس کی جماعت اپنی فوج کے ساتھ لڑتی رہی یہ جنگ دوپہر تک زور پر رہی پھر یوسف کی میسرہ کو بھی شکست ہوئی اور یہ لوگ نہایت بری طرح مارے گئے۔ عبید بن علی اور قیس کے سردار کام آئے۔ جنید حمولی

لوگوں کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔

یوسف کا خوان نعمت اور ابن معاویہ کی فوج

فتح پا کر ابن معاویہ یوسف کے قصر میں آئے تو اس میں کوئی نہ ملا۔ اس کے بعد ابن معاویہ کا لشکر میدان سے پلٹا تو یوسف کے لشکر گاہ پر پہنچا یہاں ان لوگوں کو یوسف کا تیار کرایا ہوا کھانا اور تمام اشیاء متروکہ ملیں۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ابن معاویہ نے خالد ابن زید کو قید کر کے بنی امیہ کے بوڑھوں کی حراست میں دے دیا تھا اور حکم دے دیا تھا کہ اگر لوگ مزاحم ہوں تو اسے قتل کر دیا جائے (بقول مولف) خالد کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنے لئے اتنی دعا کبھی نہ کی تھی جتنی اس موقع پر کی۔ میں یوسف کی فتح کے لئے دعا مانگا کرتا تھا پھر یہ بھی کہتا تھا کہ وہ کامیاب ہوا تو اور ابن معاویہ کو فتح ہوئی تو میں بہر حال مارا جاؤں گا" غرض خالد صلح ہو جانے تک قید ہی میں رہا۔

یوسف کے اہل و عیال کے ساتھ ابن معاویہ کا حسن سلوک اور اہل یمن کا اشتعال۔

جب ابن معاویہ قصر میں آئے تو انھیں کوئی نہ ملا۔ جلد باز لوگ یوسف کے عیال و مال وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ ابن معاویہ نے انھیں دیکھا تو بھگا دیا اور یوسف کے اہل و عیال میں سے جو لوگ بے لباس ہو رہے تھے انھیں کپڑے پہنائے اور ان کی طرف سے جتنی مدافعت ممکن تھی کی۔ یمن کے لوگ اس بات پر بگڑ گئے کیونکہ یوسف کی اولاد و ناموس کو رسوا کرنے کی نسبت جو ان کا ارادہ تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے ابن معاویہ کو برا بھلا کہنے لگے مگر ابن معاویہ کا یہ سلوک ان میں سے سمجھدار لوگوں کو زیادہ گراں نہیں گزرا دل میں ابن معاویہ کی اس طرفداری سے ناراض ضرور ہوئے مگر ظاہر میں تعریف کرتے رہے۔ مگر بعض ان میں سے ایسے بھی تھے جنھوں نے آپس میں اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا "اب تم اپنے دشمن بنی مضر سے تو فارغ ہو ہی چکے ہو یہ شخص (ابن معاویہ) اور اس کے ساتھی بھی حقیقت میں مضر ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آؤ ایسے میں ان سے بھی فرصت پالیں تاکہ ہمیں ایک دن میں دو فتحیں حاصل ہوں۔"

ثعلبہ ابن عبد . . . کی بروقت خیر اندیشی و امداد

ان میں کے بعض لوگ اس تحریک سے خوش ہوئے بعض ناراض۔ قبیلہ قضاعہ نے بالاتفاق اس تحریک کو ناپسند کیا۔ یہ رنگ دیکھ کر ثعلبہ ابن عبد . . . جذامی جو فلسطین والے قبیلہ جذام کے ممتاز لوگوں میں تھا اگرچہ ان کے سرداروں سے نہ تھا ابن معاویہ

کے پاس آیا اور انھیں ازراہ خیر خواہی اس گفتگو سے مطلع کیا جو ان کی اور ان کی اولاد و وابستگان کے قتل کے متعلق ہوئی تھی اور یہ باور کرایا کہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں اور اس تحریک سے قبیلہ قضاعہ کی بیزاری و نارضگی سے بھی خبردار کیا۔ پھر ابن معاویہ سے کہا کہ آپ ہوشیار رہیں اور اپنی خیر خواہی کو اپنے پاس رکھیں۔ آپ کے قتل کی جس نے صلاح دی تھی وہ سب سے زیادہ سخت آدمی ہے اس سے اس کا اشارہ ابو الصباح کی طرف تھا۔

ابن معاویہ کا مخصوص باڈی گارڈ ثعلبہ کی اس کارروائی کا یہ اثر ہوا کہ عبد الرحمن ابن معاویہ نے اس کا بہت خیال رکھا اور اس کی بہت عزت افزائی کی اور اسی دن عبد الرحمن ابن نعیم کو اپنا محافظ بنایا اور اپنے غلاموں اور جان نثاروں کو بلا کر اپنی حفاظت پر مقرر کیا۔

اب قرطبہ میں بنی امیہ ابن معاویہ کے پاس اکٹھا ہو گئے تھے اس وقت قرطبہ میں بنی امیہ کے بہت سے ذی ثروت خاندان تھے۔

جب ابن معاویہ نے یوسف کا قصد کیا تھا تو یوسف نے اپنے بیٹے عبد الرحمن کو لکھ دیا کہ سرقسطہ سے پانچسو سوارے کر آئے اور ابن معاویہ سے مقابلہ کرے چنانچہ شکست قرطبہ کے دن عبد الرحمن ابن یوسف ہی نے ابن معاویہ سے جنگ کی تھی۔

طلیطلہ میں یوسف کا فوجیں جمع کرنا پھر یوسف طلیطلہ پہنچا اور صمیل اپنے پڑاؤ پر واپس آیا۔ یوسف نے اہل طلیطلہ میں سے جن لوگوں کو جھگڑوں سے خالی اور ایک حد تک مطمئن پایا ان کو اکٹھا کر لیا۔ اس زمانہ میں طلیطلہ کا عامل ہشام بن عروہ فہری تھا۔ اس نے بھی اپنی جمعیت سے یوسف کی مدد کی مگر خود وہیں رہا پھر صمیل آیا تو اس نے مضر کے باقیماندہ لوگوں میں سے جتنے آدمی عروہ اور یوسف کے پاس قابل انتخاب سلے چن لئے تھے۔

عبد الرحمن ابن معاویہ نے جیان کے حاکم حصین ابن دجن کو اور البیرہ کا جابر ابن علاء ابن شہاب کو مقرر کیا تھا۔ جب یوسف اور صمیل جیان کی طرف بڑھے تو حصین ابن دجن تیتنہ کے قلعہ میں میں جا چھپا۔ جب یوسف و صمیل جیان سے البیرہ گئے تو جابر ابن علاء البیرہ چھوڑ کر پہاڑوں میں

چلا گیا

یوسف کے مقابلہ کے لئے البیرہ کی طرف پیشقدمی | جب ابن معاویہ کو یوسف کا البیرہ پہنچنا معلوم ہوا تو وہ بھی لشکر اکٹھا کر کے یوسف کی طرف بڑھے اور قرطبہ میں ابو عثمان کو نائب مقرر کر کے چند یمنیوں اور بنی امیہ کے ساتھ وہیں چھوڑا۔

ابن معاویہ کی لونڈیوں کا معاملہ | کسی موقع پر ابن معاویہ کو دو لونڈیاں ہدیئے میں دی گئی تھیں تیسری لونڈی اور چند غلام انھوں نے خود خریدے تھے اور ان سب کو اپنی ذات کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ البیرہ جانے سے پہلے جب یوسف جیان ہی میں تھا اور اسے ابن معاویہ کے ارادۂ آمد کی اطلاع ہو چکی تھی

قرطبہ پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کی چڑھائی | اس وقت یوسف نے اپنے بیٹے ابو زید عبدالرحمٰن کو حکم دیا تھا کہ تم دوسری طرف سے چڑھائی کر کے قرطبہ پر حملہ کر دو۔ ادھر ابن معاویہ یوسف کے ارادے سے البیرہ روانہ ہو چکے تھے۔ ابو زید عبدالرحمٰن ابن یوسف نے باپ کے حکم کی تعمیل میں دوسری طرف سے قرطبہ پر دھاوا بول دیا۔

لونڈیوں پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کا تصرف | ابو عثمان عبیداللہ جن کو ابن معاویہ نے قرطبہ کا نائب مقرر کیا تھا اسی حملے کے وقت قصر کی جامع مسجد میں محصور ہو گئے ابو زید نے ان کو یہ وعدہ کر کے حصار سے نکالا کہ تمھیں قتل نہ کریں گے اور قید کر کے لے چلا۔ اس سلسلے میں ابو زید عبدالرحمٰن ابن یوسف کو ابن معاویہ کی دو لونڈیاں ہاتھ آئیں، تیسری لونڈی جسے ابن معاویہ نے عرب کے کسی خاندان سے مول لیا تھا بھاگ گئی یا جب اس خاندان والوں کو ضرورت پیش آئی تو وہ اسے اپنے ساتھ بھگا لے گئے۔ اس وقت یہ لونڈی حاملہ تھی اور اس سے جو لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام عائشہ تھا۔

ابو زید عبدالرحمٰن کی حرکت پر اس کے ایک رفیق کا اعتراض۔ | ابو زید ابو عثمان اور ان دونوں لونڈیوں کو لے کر چلا تو اس کے کسی دانشمند ساتھی نے اس سے کہا " تو نے اتنا بڑا کام نہیں کیا جتنا عبدالرحمٰن ابن معاویہ نے کیا۔ عبدالرحمٰن کے بس میں جب تیری مائیں اور بہنیں تھیں تو اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، ان کو پناہ دی اور کپڑے پہنائے مگر تو نے اسکی دو کنیزوں پر قابو پا کر قبضہ کر لیا "

ابوزید نے اس شخص کی نسبت بری رائے قائم کی اور اس سے کینہ رکھنے لگا۔

پھر ابوزید نے قلعہ تدمین میں جو شہر قرطبہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا خیمہ لگانے کا حکم دیا اور اس خیمے میں ان دونوں لونڈیوں کو اتارا اور ان کا مال و متاع اپنے تصرف میں لے کر لونڈیوں کو وہیں چھوڑا اور خود ابوعثمان کو قید کئے ہوئے اپنے باپ کے پاس البیرہ پہنچا۔

فریقین میں صلح کی تکمیل | ابن معاویہ جو البیرہ کے ارادے سے چلے تو انھوں نے کہیں رکے بھی نہ دیکھا یہاں تک کہ صوبہ البیرہ میں آپہنچے اور موضع ارملہ میں قیام کیا۔ یہاں سے فریقین میں پھر مراسلت شروع ہوئی۔ یوسف و صمیل نے ابن معاویہ سے تحریک کی کہ اگر ہماری جانیں اور مال و جائداد محفوظ رہے تو ہم حکومت سے دست بردار ہو جائیں اور سارے ملک و رعایا کو بھی امان حاصل ہو جائے۔

ابن معاویہ نے منظور کر لیا اور سنہ ۱۴۱ھ میں دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اسی سلسلے میں ابن معاویہ نے خالد بن زید کو چھوڑ دیا۔ اور یوسف نے ابوعثمان کو رہائی دی۔ ابن معاویہ نے یوسف سے معاہدہ کر لیا کہ ہم تمھارے بیٹے عبدالرحمن ابوزید اور محمد ابوالاسود کو ضمانت صلح کے طور پر رہن رکھیں گے چنانچہ ان دونوں کو یہ وعدہ کر کے حراست میں لے لیا کہ ہم انھیں ملکی معاملات کے اصلاح پر آنے تک قصر قرطبہ میں نہایت اچھی طرح نظر بند رکھیں گے اور کسی طرح کی سختی نہ کریں گے۔ اور امن پر قابو پانے کے بعد ان دونوں کو واپس کر دیا جائے گا۔

صمیل کے متعلق ابن معاویہ کا حسن خیال | صلح ہو جانے کے بعد جب ابن معاویہ صمیل کا ذکر کرتے تو کہتے یہ حکومت تو صرف اللہ ہی کو زیبا ہے مگر صمیل کی سلیقہ مندی میں کوئی شک نہیں وہ میرے ساتھ البیرہ سے قرطبہ تک گیا۔ اس کے زانو میرے زانو سے نہ ملے نہ اس کے خچر کا سر میرے خچر کے سر کے برابر ہوا۔ وہ اتنا باادب تھا کہ اس نے مجھ سے کسی بات کو نہ پوچھا اور نہ بغیر پوچھے بے ضرورت گفتگو کی۔ لیکن ابن معاویہ یوسف کی نسبت ایسا کوئی ذکر نہ کرتے تھے یہ بات اس لئے تھی کہ جب صلح ہو گئی تو یوسف ابن معاویہ کے دائیں جانب تھے اور صمیل[1] بائیں جانب۔ اسی حالت میں

(۱) صمیل کے متعلق ابن معاویہ نے جو رائے قائم کی تھی وہ اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ تینوں قرطبہ میں داخل ہوگئے۔ ابن معاویہ نے قصر قرطبہ میں قیام کیا اور یوسف اپنے محل بلاط الحر میں اترے جو اس سے پہلے حر بن عبد الرحمٰن ثقفی والی اندلس کا محل تھا۔

قصر بلاط الحر کا قضیہ اور یوسف کے خلاف شکایتیں | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یوسف نے ابن حر پر ظلم کرکے اسے قتل کر ڈالا اور محل پر قبضہ کر لیا تھا اور بعض کہتے ہیں اس سے خرید لیا واللہ اعلم۔ غرض جب یہ لوگ قرطبہ آئے تو لوگ یوسف کے خلاف شکایتیں کرنے لگے اور انھیں یہ توقع ہوئی کہ ابن معاویہ ان کے موافق ہوکر یوسف پر سختی کریں گے اور اس خیال سے یوسف کے بعض اموال و آراضی پر یوسف کا ناجائز قبضہ ظاہر کرتے ہوئے دعوے کیا کہ اس کے اصل مالک ہم ہیں اس پر ہمارا قبضہ ہونا چاہئے۔ آخر یہ جھگڑا قاضی تک پہنچا۔

قاضی یزید یحییٰ | اس زمانے میں یزید ابن یحییٰ قضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ مدعیوں کو قاضی سے بھی یہ امید تھی کہ قاضی اپنے ذاتی کاوش کی وجہ سے یوسف کے خلاف ہماری طرفداری کریں گے کیونکہ یوسف و صمیل نے شقندہ میں یمنیوں کو قتل کرکے ساری قوم سے عداوت مول لے لی تھی۔ یزید ابن یحییٰ دربار خلافت سے باقاعدہ فرمان کے ساتھ قاضی ہوکر آئے تھے۔ یوسف اگرچہ ان سے خوش نہ تھا مگر اہل اندلس کی رضامندی کی وجہ سے اعتراض نہ کر سکا۔ اس موقع پر یوسف و صمیل اور مدعی قاضی کے یہاں پیش ہوئے لیکن مدعیوں کو بڑی مایوسی ہوئی جب قاضی نے یوسف و صمیل کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہ کرکے مدعیوں کو پریشان کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی نے بعض مدعیوں کو دس دس دن تک پریشان رکھا۔ جو زیادہ ثروت والے تھے وہ تین پیشیوں میں تین تین دن سے زیادہ نہ رہ سکے۔ اس مقدمے کے بعد بھی یوسف و صمیل نہایت آزادی و اطمینان کے ساتھ ابن معاویہ کے پاس آتے رہے اور وہ بھی ان دونوں کو وقتاً فوقتاً شریک رائے کرتے رہے۔

عبدالملک بن عمر اور حزی ابن عبدالعزیز کی آمد | راوی کا بیان ہے کہ اس سال عبدالملک (۱) ابن عمر ابن

(۱) عبدالملک عرف مروانی اور حزی ابن عبدالعزیز دونوں عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے دادا ہشام کے چچیرے بھائی

مروان جن کو مروانی بھی کہتے ہیں اور جزی بن عبدالعزیز ابن مروان اپنی اولاد و موالی اور چند بنی امیہ کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے اور تھوڑے دن میں خاصی تعداد بڑھالی۔

موالی بنی ہاشم اور قبائل قریش وغیرہ کی یوسف کے ساتھ سازش اور یوسف کا فرار

قرطبہ میں موالی بنی ہاشم و بنی فہر اور قبائل قریش وغیرہ کے کئی خاندان تھے ان لوگوں نے یوسف کی بدولت بڑے بڑے مرتبے حاصل کئے تھے اب چونکہ ابن معاویہ کے تسلط سے یہ بات باقی نہ تھی اس لئے یہ لوگ یوسف کے پاس آ آکر سازشیں کرتے اور اس کو موجودہ حالت پر شرمندہ کرکے ابن معاویہ کے خلاف اکساتے تھے آخر یوسف نے ان کے کہنے میں آکر لوگوں سے خط و کتابت شروع کی۔ لشکر والوں نے تو یوسف کو جواب دے دیا کہ "ہم صلح کے بعد پھر جنگ پر تیار نہیں ہیں۔ صمیل اور قبیلہ قیس والوں کو بھی یوسف کی یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ جو کچھ ہوگیا ہے ہم اسی پر راضی ہیں اور اب ہم ابن معاویہ سے خلع نہ کریں گے۔ جب یوسف کو ان لوگوں سے مایوسی ہوئی تو اس نے بلدیوں[1] خصوصاً ماردہ اور لقنت والوں کو ہموار کرنا شروع کیا یہ لوگ یوسف کا ساتھ دینے پر بخوشی آمادہ ہوگئے۔ ان میں زیادہ تر یوسف کے خاندان کے لوگ تھے جو جنگ مسارہ کے دن[2] لقنت و طلیطلہ میں آباد ہوگئے تھے جب عبدالرحمن ابن معاویہ سے صلح ہوئی تو ابن معاویہ نے یوسف کے گھرانے کے بعض لوگ یوسف کو لوٹا دئے اور اس کی بعض بیٹیوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ چھوڑا اور کچھ لوگوں کو جو جبال رہتے تھے وہیں رہنے دیا اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ صلح کے کچھ مدت بعد جب یہ موقع آیا تو ان لوگوں کے دعوتی خطوط بھی یوسف کے پاس آئے اور یوسف سنہ ۱۴۱ھ میں بھاگ کر ماردہ پہنچا۔

صمیل اور یوسف کے بیٹوں کی گرفتاری

جب ابن معاویہ کو یوسف کا بھاگنا معلوم ہوا تو ابن معاویہ نے اس کا تعاقب مگر وہ چھپ گیا اُس کے دو بیٹے البتہ گرفتار ہوگئے جنھیں ابن معاویہ نے

تھے اس لئے رشتہ میں عبدالرحمن ابن معاویہ کے دادا ہوئے۔ (مترجم)

(۱) اس کتاب میں بلدیوں یا بلدیین سے وہ عرب مراد ہیں جو بلج کے آنے سے پہلے اندلس میں آباد ہوئے تھے انکی آمد کا زمانہ سنہ ۹۲ھ اور سنہ ۱۲۳ھ کے مابین سمجھنا چاہیے۔

(۲) اس جنگ سے ثعلبہ ابن سلامہ عاملی والی جنگ مراد ہے جس میں بلدی عرب اور بربری اس کے حریف تھے (مترجم)

قتل کر ڈالا صمیل قرطبہ میں پکڑ لیا گیا صمیل نے حجت کی کہ "میرا کوئی گناہ نہیں ہے اگر میں مجرم ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھاگ جاتا"، ابن معاویہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ بغیر تیرے مشورہ کے نہیں بھاگا۔ ہم بھی تیرے خیر خواہ تھے مگر تو نے ہم سے غداری کی، غرض ابن معاویہ نے صمیل کو قید میں رکھا۔

جنگ کے ارادہ سے یوسف کی پیشقدمی اور اشبیلیہ پر حملہ

یوسف ماردہ میں آیا تو اس نے وہاں کے لوگوں میں عربوں اور بربریوں کو جمع کیا، لقنت پہنچا یہاں اس کے اہل بھی مل گئے پھر یوسف اشبیلیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت اشبیلیہ میں عبدالملک ابن عمر مروانی کی حکومت تھی یوسف کے آنے پر اشبیلیہ میں حمص کے کچھ عرب عبدالملک کی طرف ہو گئے اور بلدی سب کے سب سوائے چند آدمیوں کے عبدالملک سے علٰحدہ ہو کر یوسف کے حامی ہو گئے اس لئے اشبیلیہ میں یوسف کا لشکر بہت بڑھ گیا اور بیس ہزار سے زائد اس کی جمعیت ہو گئی۔ اس جمعیت کے ساتھ یوسف نے اشبیلیہ میں عبدالملک ابن عمر مروانی پر حملہ کیا۔ جو عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی طرف سے اشبیلیہ کے حاکم تھے۔

یوسف اشبیلیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر ابن معاویہ کے لئے بڑھا اور عبداللہ ابن مروانی کی اشبیلیہ میں آمد

عبدالرحمٰن ابن معاویہ قرطبہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے لشکروں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ سب جمع ہو جائیں تو آگے بڑھیں راوی کہتا ہے کہ جب یوسف کی فوجیں جمع ہو گئیں تو یوسف مروانی پر چڑھائی کے ارادہ سے بڑھا۔ مروانی کے ساتھ کچھ شامی فوج تھی اور وہ کم تھی۔ اسی فوج کے ساتھ وہ اشبیلیہ کی حفاظت کر رہا تھا جب یوسف نے مروانی کی جمعیت بہت تھوڑی دیکھی تو وہ ان کی طرف سے بے خطر ہو گیا۔ اور اشبیلیہ کو اسی حال میں چھوڑ کر ماردہ کے عربوں، بربریوں اور لقنت والوں اور چند اہل اشبیلیہ کی فوجوں کے ساتھ ابن معاویہ کے مقابلہ کے لئے چلا۔ ادھر ابن معاویہ کے لشکر بھی قرطبہ میں جمع ہو چکے تھے وہ بھی آگے بڑھے اور اس جگہ قیام کیا جسے برج اسامہ کہتے ہیں۔ یوسف اپنی عاقبت سے بے پروا ابن معاویہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مروانی اپنے دارالحکومت اشبیلیہ میں اپنے

بیٹے کا منتظر تھا جب مروانی کا بیٹا عبداللہ عالی ملک مورور آگیا تو اس نے اپنے باپ کو محصور سمجھ کر اپنے محکوموں کو جمع کیا اور اپنے باپ کے پاس اشبیلیہ پہنچا۔ اشبیلیہ میں عبداللہ کے داخل ہونے تک مروانی پر سے محاصرہ اٹھ چکا تھا۔ عبداللہ نے اُسے یوسف کی آمد و واپسی سے باخبر کیا پھر لوگوں کو بلا کر رائے طلب کی۔ ان کے سرداروں نے کہا کہ ہم تمہارے باپ کے تابع فرمان ہیں جب تمہارا جی چاہے یوسف پر حملے کے لئے چلو۔ اس مشورہ پر مروانی اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا عبداللہ اہل اشبیلیہ و مورور وغیرہ کے ساتھ یوسف پر حملے کے قصد سے روانہ ہوئے۔

جب امیر ابن معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ یوسف مروانی کو چھوڑ کر میری طرف حملے کے ارادے سے بڑھ رہا ہے تو وہ بھی آگے بڑھ کر حصن مدوّر میں جا اترے۔ اس وقت یوسف وادی کذا میں تھا۔

یوسف اور مروانی کی فوجوں کا مقابلہ یہاں جب لوگوں نے یوسف کو اطلاع دی کہ مروانی آپہنچا تو یوسف اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو عبدالرحمن ابن معاویہ بھی آجائے اور میں دونوں طرف سے دشمنوں میں گھر جاؤں مروانی کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر مروانی خود اس فکر میں تھا کہ فی الحال جہاں تک ممکن ہو مقابلے کی نوبت نہ آئے اور قلت فوج کے خیال سے جنگ سے بچنا چاہتا تھا مگر یوسف کی سبقت کی وجہ سے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا اور آخر کار ایک مقام پر مروانی اور یوسف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آگئیں۔ یہاں بنی فہر کے موالی میں سے تقنت یا ماردہ کے رہنے والے ایک بربری نے مروانی کے لشکر سے مقابلہ کے لئے مبارزطلبی کی۔ یہ بربری بڑا بہادر اور دلاوری میں بہت مشہور تھا اس لئے مروانی کے لشکر سے کوئی شخص اس کے مقابلے کے لئے نہ نکلا۔ آخر مروانی نے اپنے بیٹے عبداللہ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ شرارت کی ابتدا ہے۔ اور ہماری قلت فوج سے ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہے بیٹا اب تم خدا پر بھروسہ کر کے ہماری مدد کرو" یہ سن کر عبداللہ خود مقابلے کے لئے نکلا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک حبشی غلام بھی چلا جو پہلے آل مروان میں الحکم کا غلام تھا اور ابو نصری اس کی کنیت تھی۔ اس غلام نے عبداللہ سے پوچھا کہ آپ کیوں

نکلے ہیں اور کیا ارادہ ہے۔ عبداللہ نے کہا اس شخص کے مقابلے کے لئے۔ غلام نے کہا اس کے لئے تو میں کافی ہوں اور یہ کہہ کر ابو بصری تنہا بربری کے مقابلے پر آیا۔ اس وقت آسمان سے خفیف سا ترشح ہو رہا تھا دیر تک دونوں میں کشمکش رہی۔ خوب جنگی کرتب دکھائے گئے کیونکہ دونوں دلاور اور قوی و تنومند تھے۔ اتفاق سے بربری کا پیر پھسل گیا اور وہ گر گیا ابو بصری نے فوراً حملہ کرکے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ یہ دیکھتے ہی مروانی کے لشکر والوں نے زور سے تکبیر کہی اور ایک دم حملہ کر دیا۔ دم کے دم میں یوسف کو شکست ہو گئی۔ اس کے اکثر لوگ میدان چھوڑ کر منتشر ہو گئے مگر قتل بہت تھوڑے ہوئے۔ مروانی کی فوج نے اپنی قلت کی وجہ سے دشمن کے تعاقب میں بہت کم حصہ لیا۔ صرف وہ لوگ جو یوسف کے لشکر سے الگ رہ گئے تھے وہی مروانی کی سپاہ کے ہاتھوں میں پڑ کر لوٹے گئے اور قتل ہوئے۔

عبداللہ ابن مروانی کی ابن معاویہ سے ملاقات | اس جنگ کے وقت امیر ابن معاویہ مدور میں موجود تھے عبداللہ ابن عبدالملک مروانی اپنی فوج سے علیحدہ ہو کر یوسف کی شکست کی خبر اور مقتولوں کے سر لے کر امیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر نے اس سے ملاقات کی۔ اس فتح پر خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فوراً ایک قاصد اپنے غلام بدر کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ "مروانی کی مدارات اور دلجوئی کا کافی خیال رکھو اور ہم سے دو چند ان کی جہانداری میں حصہ لو۔" عبداللہ نے اس موقع پر امیر کو جنگ کے تمام حالات سے مطلع کر دیا تھا اور امیر کی نظر میں اپنی عزت و وقار بڑھا کر کافی امتیاز حاصل کر لیا تھا۔

یوسف کا آخری وقت | یوسف اس جنگ سے فرار ہو کر قریش کی طرف گیا اور وہاں سے فحص البلوط کی طرف ہوتا ہوا طلیطلہ کے راستے پر ہو لیا تاکہ ابن عروہ کے پاس جا کر پناہ لے۔ اب طلیطلہ صرف دس میل رہ گیا تھا کہ یوسف کا گزر عبداللہ ابن عمر انصاری کی طرف ہوا جو ضلع طلیطلہ کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ کسی نے عبداللہ ابن عمر کو اطلاع دی کہ یہاں سے یوسف شکست خوردہ گزر رہا ہے عبداللہ نے لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ آؤ آگے چل کے یوسف کو قتل کر ڈالیں تاکہ دنیا کو اس کے

شر سے نجات مل جائے اور وہ بھی دنیا سے نجات پا جائے" چنانچہ یہ لوگ حملے کے لئے تیار ہو کر بیٹھے اتنے میں یوسف آگے نکل چکا تھا جب عبداللہ ابن عمر تعاقب کرتے ہوئے یوسف کے پاس پہنچے ہیں تو طلیطلہ صرف چار میل رہ گیا تھا۔ اور اس وقت یوسف کے ساتھ بنی تمیم کے ایک مولیٰ سابق نامی سوار اور ایک خدمتگار کے سوا کوئی نہ تھا۔ جو لوگ ناواقف ہیں ان کا بیان ہے کہ "صرف یوسف کا غلام تھا اور اس کے باقی لوگ بیچارگی کی حالت میں سرقسطہ میں پڑے تھے یا تھک۔ راہ کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے" غرض یوسف الفہری اور سوار دونوں عبداللہ ابن عمر انصاری کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ غلام فرار ہو کر طلیطلہ پہنچ گیا۔

ابو زید ابن یوسف کا قتل | اب عبداللہ ابن عمر انصاری یوسف کا سر لے کر امیر کی طرف چلا جب امیر کو عبداللہ ابن عمر کے اس شان سے آنے کی خبر ملی تو اس نے عبدالرحمٰن ابن یوسف کو قتل کرا دیا جس کی کنیت ابو زید تھی۔ امیر ابو زید سے ناراض تھا کیونکہ اس نے امیر کی لونڈیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تھی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے عبداللہ ابن عمر کے آنے پر عبدالرحمٰن ابن یوسف کا سر یوسف کے سر کے ساتھ باہر نکالا اور دونوں کو پھنکوا دیا۔

ابو زید کے ساتھ ہی یوسف کا دوسرا بیٹا ابو الاسود بھی امیر کے قبضے میں تھا۔ تعجب ہے کہ امیر نے اس کی طرف التفات نہ کیا اور حقیر جان کر درگزر سے کام لیا۔ صرف قید کرنے پر اکتفا کی اتفاق سے وہ قید سے نکل بھاگا اور پھر قوت پکڑ کے ۲ سال تک امیر پر متواتر حملے کرتا رہا۔ اس کی یہ لڑائیاں حرب قسطلونہ کے نام سے مشہور ہیں جن کا مفصل بیان آگے آئے گا۔

امیر عبدالرحمٰن ابن معاویہ کی لونڈیوں کے ساتھ ابو زید نے جو کچھ بدسلوکی کی تھی اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہ لونڈیاں ابو زید نے چھوڑ دی تھیں۔ مگر امیر کو ان سے نفرت تھی۔ اس نفرت کی وجہ سے ایک کنیز اس نے عبدالحمید ابن غانم اپنے غلام کو دے دی جو عبدالرحمٰن ابن عبدالحمید ابن غانم کی ماں بنی۔ اس کا نام کلثوم تھا اور دوسری ایک اور شخص کو عنایت کر دی۔ یہ واقعہ اس قسم کے حالات میں بسلسلہ ترتیب لکھ دیا گیا ورنہ ایسے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا

احاطہ دشوار ہے۔

صمیل کا انجام | عبدالرحمٰن ابن یوسف کے قتل کے بعد اسی رات کو صمیل بھی قیدخانے میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ صبح کو اس کی لاش قیدخانے سے نکال کر اس کے اعزہ کو دے دی گئی جنھوں نے اسے دفن کر دیا۔ جب صمیل یوسف اور اس کے بیٹے عبدالرحمٰن کا قصہ تمام ہو گیا تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ صرف محمد ابوالاسود کا قضیہ باقی رہ گیا جو قید سے نکل کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔

رزق غسانی و ابن عروہ وغیرہ کی بغاوتیں | یوسف و صمیل کے بعد رزق ابن نعمان غسانی نے سر اٹھایا اور ایک سال چار ماہ تک امیر سے لڑا اس کے قتل کے بعد ہشام ابن عروہ فہری نے لڑائی جاری رکھی۔ حیوہ ابن ولید یحصبی اور عمری بھی جو حضرت ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے اس کے ہمراہ تھے اس جنگ پر امیر خود روانہ ہوئے اور طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک دفعہ عین گرمی جنگ میں جب کہ امیر قلعے تک پہنچنے ہی والے تھے ہشام نے صلح کی درخواست کر دی اور اپنے بیٹے کو بطور یرغمال امیر کے ہمراہ کر دیا۔ امیر اسے لے کر واپس ہو گئے تو ہشام نے پھر سر اٹھایا اور امیر کی بیعت توڑ کر بغاوت پر کمر باندھی۔ امیر نے دوسرے سال پھر طلیطلہ پر چڑھائی کی اور جنگ میں مصروف ہوئے۔ اس مہم پر امیر نے چاہا کہ ہشام پھر اطاعت قبول کرے اور جنگ نہ کرے مگر وہ نہیں مانا۔ امیر نے کچھ دن انتظار کیا کہ شاید اب ہشام کی اصلاح ہو جائے اور وہ صلح کر کے میری بیعت تسلیم کر لے۔ مگر نتیجے میں مایوسی ہوئی آخر کو امیر نے ہشام کے بیٹے کو جو ضمانت صلح میں ان کے پاس یرغمال کے طور پر تھا طلب کر کے قتل کرا دیا اور اس کا سر منجنیق میں رکھ کر شہر میں پھکوا دیا۔ بعد ازاں امیر اسی سال وہاں سے واپس ہو گئے۔

علا ابن مغیث کی بغاوت | امیر کو تھوڑے ہی دن سکون سے گزرے تھے کہ علا ابن مغیث یحصبی نے امیر کے خلاف سر اٹھایا۔ بعض کہتے ہیں کہ علا باجہ کا حضرمی تھا اس نے لوگوں کو ہموار کرنے کے لئے مراسلت کی اور لوگوں کو ابوجعفر منصور کی اطاعت پر توجہ دلائی۔ ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ نے اپنی خلافت کا ایک سیاہ نشان علا کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس موقعہ پر علا نے اس نشان کو نکال کر اسے ایک نیزے میں باندھا اور مصر کے لشکروں میں سے لے کر اسے نکلا۔

اس بغاوت میں علاء کا ساتھ واسطہ بن منیث اور امیہ ابن قطن فہری نے بھی دیا۔ یمانی فرقے بڑھ کر اشبیلیہ پہنچے اور وہاں ان لوگوں نے امیہ بن قطن پر تہمت لگا کر اسے گرفتار کر لیا۔ یہ حالات سن کر امیر نے بھی فوجیں جمع کیں۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بڑھے اور قلعہ رعواق میں پڑاؤ ڈال دیا۔

غیاث ابن علقمہ کی کمک | غیاث ابن علقمہ لخمی شذونہ سے باغیوں کی مدد کے لئے آرہا تھا۔ امیر کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے غلام بدر کو ایک چھوٹا سا لشکر دے کر غیاث سے لڑنے کے لئے بھیجا۔ بدر سفر کرتا ہوا واجہ میں وادی ابرہ اور دریائے اعظم کے درمیان مقیم ہوا۔ ابھی جنگ کا آغاز نہ ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان مراسلت ہوتے ہوتے صلح کی ٹھہر گئی اور غیاث ابن علقمہ لخمی لڑائی سے ہاتھ کھینچ کر اپنے شہر کو واپس ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بدر بھی امیر کے پاس چلا آیا۔

باغیوں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے آپس میں کہا کہ "اب ہمارے لئے صرف قرمونہ ہی رہ گیا ہے" اور یہ سوچ کر رات کو قرمونہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ امیر نے یہ سن کر بدر کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ جلد سے جلد قرمونہ روانہ ہو جاؤ اور قرمونہ کے دروازے پر اپنے ڈیرے لگا دو اور صبح کو ہمارے پہنچنے تک غیر مسلم رعایا کو اپنے پاس جمع کر لو۔

باغیوں کا عبرتناک انجام | بدر کو روانہ کر کے امیر بہت سویرے قرمونہ کی سمت چلا اور ظہر تک وہاں پہنچ گیا باغیوں کو وہاں تک پہنچنے میں دیر ہوئی وہ قرمونہ کے ایک گاؤں شرا تک پہنچے تھے کہ انھیں قرمونہ کے دروازے پر ڈیرے لگے ہوئے نظر آئے جنھیں دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ امیر ہم سے پہلے آپہنچا۔ تاہم باغیوں نے مقابلے میں سبقت کی۔ امیر کی طرف کے سوار بھی بڑھے۔ فریقین میں خوب مقابلہ ہوا مگر آخر میں باغی بری طرح پسپا ہو کر قتل ہوئے۔ امیہ بن قطن بحالت قید امیر کے لشکریوں کے ساتھ آیا۔ امیر نے اس پر احسان رکھ کر اسے آزاد کر دیا۔ نتائج جنگ کا جب اندازہ کیا گیا تو دشمنوں کے سات ہزار سر شمار میں آئے۔ جن میں سے امیر نے ممتاز مقتولوں کے سر اور علاء کا سر علٰحدہ کر لیا۔ علاء کے ایک کان بھی کاٹ لئے۔ پھر ہر مقتول کے نام کا ایک پرچہ لکھوا کر اس مقتول کے کان میں لٹکا دیا۔ پھر ان سروں کو افریقیہ لیجانے والے کے لئے انعام مقرر کیا۔ ایک شخص آمادہ ہو گیا اور اس نے تمام سروں کو خرجیوں میں رکھ کر جہاز کے

ذریعے سے قیروان کی راہ لی وہاں پہنچ کر اس شخص نے رات کے وقت یہ تمام سر بازار میں پھینک دئے۔
صبح کو جب لوگوں نے بازار میں سر ادھر اُدھر پڑے دیکھے اور ان کے ساتھ ایک ایک پرچہ بھی دیکھا تو بڑی ہلچل مچ گئی اور یہ خبر ابو جعفر منصور تک پہنچی۔

ہشام عمری اور حیوہ وغیرہ کا انجام | اس واقعہ کے بعد امیر نے پھر ہشام ابن عروہ کی طرف توجہ کی اور تمام ابن علقمہ اور اپنے غلام بدر کو کچھ فوج کے ساتھ طلیطلہ بھیجا جہاں ان دونوں نے ہشام ابن عروہ کو گھیر لیا۔ بدر و تمام کو روانہ کر کے امیر نے طلیطلہ کی مہم پر اور فوجیں بھیجیں اور ہر چھٹے مہینے ایک تازہ دم فوج امداد کے لئے بھیجتا رہا۔ آخر اہل شہر طول محاصرہ کی تاب نہ لا سکے اور انھوں نے لڑائی کی صعوبت ناقابل برداشت سمجھ کر امیر کی فوج سے سازش کرنا شروع کی۔ تمام و بدر سے معاملات طے ہو گئے اور شہر والوں نے ہشام عمری اور حیوہ سے بیزار ہو کر انھیں امیر کی فوج کے سپرد کر دیا۔

تمام ان لوگوں کو قید کر کے انھیں قرطبہ پہنچانے کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔ بدر شہر میں اپنی جگہ قائم رہا تاکہ امیر کا حکم حاصل کر کے تعمیل کرے۔ تمام ان لوگوں کو لئے ہوئے اوریط تک پہنچا تھا کہ عاصم ابن مسلم ثقفی سے ملا۔ عاصم نے امیر کے حوالے سے اسے حکم دیا کہ تم طلیطلہ کے والی مقرر کئے گئے ہو۔ اب تم وہیں روانہ ہو جاؤ اور بدر کو واپس کر دو۔ تمام نے اس حکم کی تعمیل کی اور طلیطلہ واپس ہو گیا۔
عاصم ثقفی اسیروں کو لئے ہوئے قریہ حلوہ میں جا اترا۔ امیر نے ان کی اطلاع پا کر پولیس کے حاکم اعلیٰ عبدی کو ان اسیروں کی سزا پر مامور کیا۔ عبدی نے ان کے لئے ایک ایک کمبل کا جبہ لیا اور اپنے ساتھ ایک حجام اور چند گدھے لے کر ان کے پاس پہنچا۔ ان کے سر اور داڑھیاں منڈائیں اور جبے پہنا کر بیڑیاں پاؤں میں ڈلوائیں اور گدھوں پر بٹھا کر سب کو اپنے ساتھ لئے ہوئے قرطبہ پہنچا۔ اس عالم میں عمری نے جو بہت ضعیف تھا حیوہ سے کہا کہ مجھے بہت تنگ جبہ پہنایا گیا ہے۔ حیوہ نے طنز کے لہجہ میں جواب دیا۔ جی ہاں تم یونہیں چھوڑ دئے جاتے تو اچھا تھا۔ غرض امیر کے حکم سے اس بُرے حال میں ان سب کو قتل کر کے سولی دے دی گئی۔

سعید یحصبی کی سرکشی | ان کے بعد سعید الیحصبی نے بغاوت کی اور لبلہ پر حملہ کیا۔ یہ سعید مطری کے نام سے

بھی مشہور ہوا۔ اس کے سر اٹھانے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک رات جبکہ وہ نشے میں تھا اس کے سامنے اہل یمن کے قتل کا ذکر ہوا اور علاء کے قتل کا بھی حال کہا گیا یہ سن کر اس نے اسی عالم مخموری میں اپنے نیزے میں نشان باندھ کر نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور اس جوش کی حالت میں گویا جنگ کے لئے آمادگی ظاہر کردی۔ جب نشے سے افاقہ ہوا تو اس نے دریافت کیا کہ نیزہ پر یہ نشان کیسا بندھا ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب میں کہا "کل رات کو آپ ہی نے یہ نشان اپنی قوم کے قتل کا حال سن کر غصے میں باندھا تھا" اس نے حکم دیا قبل اس کے کہ یہ خبر مشہور ہو اس نشان کو کھول ڈالا جائے مگر ساتھ ہی اسے ایک بات سوجھ گئی اور اس نے کہا "میں اپنی رائے سے نہیں پھروں گا"۔ کیونکہ وہ ایک بہادر اور جری شخص تھا۔ پھر اس نے اپنی قوم کو طلب کیا ایک جماعت اس کے ساتھ ہوگئی اور یہ سب قلعہ رعواق کی طرف بڑھے اور قلعے میں داخل ہوگئے

جب امیر کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بھی اسی طرف روانہ ہوکر قلعے کے پاس جا پہنچا۔ اس کی آمد سن کر مطری قلعے سے باہر نکلا اور جنگ شروع ہوگئی۔ مطری کے ہمراہ سالم بن معاویہ کلاعی بھی تھا۔ خوب گھمسان کی جنگ ہوئی مگر اس میں زیادہ طول نہ ہوا کیونکہ مطری کی جماعت نے اپنا جنرل خلیفہ ابن مروان یحصبی کو بنالیا جس نے امیر سے اپنے اور اپنی قوم کے لئے امان مانگی۔ امیر اسے امان دے کر واپس ہوگیا اور یہ لوگ بھی قلعہ خالی کرکے چلے گئے۔

ابوالصباح کی بغاوت اب ابوالصباح نے سر اٹھایا۔ اس کی سرکشی کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے امیر نے ابوالصباح کو اشبیلیہ کا گورنر مقرر کیا تھا مگر کسی بات پر معزول کرکے ابوالصباح کو ناراض کردیا۔ یہ بغاوت اسی ناراضگی کی وجہ سے تھی۔

جب ابوالصباح نے بغاوت کے خیال سے ایک جگہ ٹھہر کر لشکروں سے خط و کتابت کی تو امیر کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ عبداللہ ابن خالد بھی اپنے کسی عہد کی وجہ سے ابوالصباح کی حمایت کے لئے بڑھ رہا ہے تو امیر نے چال سے کام لیا اور مختلف مقامات سے جعلی خطوط ابوالصباح کے پاس بھیجے۔ ان خطوط میں یہ لکھا ہوا تھا:- "اگر تم قرطبہ کی طرف بڑھو گے تو کامیاب ہوگے"، ابوالصباح

اس چال میں آگیا اور امیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے قتل کے بعد عبداللہ ابن خالد خود حکومت کے کاموں سے دستکش ہوگیا اور قنتین میں سکونت اختیار کر کے وہیں مرگیا۔

اس واقعے کے متعلق ایک بیان یہ بھی ہے کہ تمام ابن علقمہ ابوالصباح کو بہلا پھسلا کر کوئی عہد کئے بغیر اپنے ساتھ لئے ہوئے قرطبہ آگیا۔ امیر کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ابوالصباح کو اپنی خدمت میں باریاب کیا اس وقت ابوالصباح کے ساتھ اس کے لشکر کے چار سو آدمی بھی تھے ابوالصباح نے امیر سے کچھ شکایتیں کیں۔ ان کے جواب میں امیر اس سے سختی سے پیش آئے اور اسے دھمکایا مگر بعض امور میں اس سے مشورہ بھی لیا تاکہ وہ فوراً شبہ میں نہ پڑ جائے۔ پھر ایک سیاہ فام مدینہ کی رہنے والی لونڈی کو بلایا جو دوسری لونڈیوں پر دار وغہ تھی اور ان کی معلمہ تھی۔ وہ امیر کے پاس ایک خنجر لے کر حاضر ہوئی یہ دیکھ کر ابوالصباح چونک پڑا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ خنجر لے لے۔ مگر امیر نے فوراً غلام کو اشارہ کیا وہ جھپٹے اور ابوالصباح کی شہرگ پر خنجر چھونے لگے۔ ابوالصباح بے بس ہوگیا اور غلام نے اسے قتل کر ڈالا۔

امیر نے ایک کمبل میں اس کی نعش کو لپٹوا کر وہاں سے علیحدہ کر دیا اور خون کے نشانات اس جگہ سے بالکل زائل کرا دئے۔ پھر اپنے وزرا کو مشورے کے لئے طلب کیا اور ان سے ابوالصباح کے قتل کی نسبت رائے لی۔ وزرا کو اس وقت تک یہی معلوم تھا کہ ابوالصباح امیر کے پاس قید ہے وہ اس کے قتل کے حال سے بے خبر تھے۔ اس جلسے میں کسی نے بھی ابوالصباح کے قتل کی رائے نہ دی اور یہی کہا کہ اس کے چار سو سوار دروازے پر موجود ہیں اور امیر کا لشکر اس وقت تیار نہیں ہے ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں کوئی آفت نہ برپا ہو، صرف مروانی نے البتہ قتل کی تائید کی۔ اور اشارۃً کچھ شعر پڑھے جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

لا یفلتنک فیا تیناباً لعقبۃ   اشدد یدیک بہ تبرأ من السقم

"ایسا نہ ہو کہ وہ تجھ سے نجات پا کر چلا جائے اور پھر کوئی آفت لائے اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوط کر کے اُسے روک اور بے خطر ہو جا"

کمال   (باقی)

(۷)

قدر انسان کی بڑھاتی ہے   اس سے بنتا ہے آدمی انسان
اہل معنیٰ کا قول ہے یہ اثیمؔ   علم ہے جسم شاعری ہے جان

(۸)

سیر ہوتے نہیں حریص سخن   شاعری بھی عجیب نعمت ہے
نہیں ہوتی زبان پر محسوس   اے اثیمؔ اس کی دل میں لذت ہے

(۹)

شاعری کیا ہے؟ برگزیدۂ علم   رنگ و بوئے گل دمیدۂ علم
نافۂ آہوئے رمیدۂ علم   نکہتِ مشک و نورِ دیدۂ علم

(۱۰)

قدر کرتے ہیں اس کی اہل کمال   شاعری جسم علم کی ہے روح
کشف ہوتا ہے اے اثیمؔ اس سے   کاملوں کے لئے ہے وجہ فتوح

(۱۱)

شاعری باغ علم کا ہے وہ پھول   جس کی بو سے دماغ ہے تازہ
کیا حسیں ہے عروس علم اثیمؔ   اس دلہن کے ہے رخ کا یہ غازہ

(۱۲)

کبھی بے علم کو نہیں آتی   شاعری بھی ہے علم سے ممتاز
سرِ حق کرتی ہے عیاں یہ اثیمؔ   کھول دیتی ہے آسمانی راز

(۱۳)

شاعری کرتی ہے عیاں جو اثیمؔ   روح سے ہے تعلق اشیا کا
روح کو اس سے ہوتی ہے تفریح   یہ کھلونا خدا کا ہے گویا

غـــزل

(از حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہ)

یہ اک معمورۂ غم ہے لہو کا ذکر ہی کیا ہے
مرا دل چیر کر دیکھو تمنا ہی تمنا ہے

فروغ حسن آنکھوں میں ہے پھر چھپنے سے کیا حاصل
ذرا سی اوٹ باقی ہے نہ حائل ہے نہ پردا ہے

تڑپتا ہوں شب غم میں جو وہ آئیں تو سمجھا دوں
کوئی یہ کہہ کے لے آئے چلو دیکھیں تماشا ہے

نہ ہوتا کچھ اثر دل پر محبت کا تو بہتر تھا
جسے بیمار سمجھے ہو وہ ہر حالت میں اچھا ہے

کرو شبہہ نہ میری ناتوانی پر بناوٹ کا
اسی صورت پڑا ہوں میں گراں درد اٹھا ہے

چلے آنا وہیں جس جا ہر اک دم خاک اڑتی ہے
تمھیں معلوم کیا ہم بے نشانوں کا نشاں کیا ہے

قفس اور آشیاں کا فرق اے صیاد سن مجھ سے
یہ تیری دستکاری ہے یہ میں نے بنایا ہے

زمانے کی بھری محفل کی آبادی مٹانے کو
بہت کچھ حسن نے اس آفت جاں کو سنوارا ہے

یہ دل کی رازداری ہے کہ زور ناتوانی ہے
دھواں اٹھتا نہیں ہر چند اک مدت سے جلتا ہے

خراب بادۂ الفت ہے مجھ سا کون اے ساقی
سوا ہے کیف مستی اور پینے کا تقاضا ہے

وہی ثاقب جو اب بھولا ہوا ہے یاد تھا کل تک
جسے ہم لوگ سنتے ہیں جسے تم نے بھی دیکھا ہے

انکار حدیث

ستمبر کے جامعہ میں مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کا ایک مضمون "منکرین حدیث" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میں اپنے محترم، پروفیسر سید عابد حسین صاحب مدیر جامعہ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے موقع مرحمت فرمایا کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عرض کر سکوں۔

لیکن قبل اس کے کہ اصل بحث پر گفتگو کا آغاز کیا جائے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں مخاطب محترم مقالہ نگار نہیں ہیں، بلکہ وہ "منکرین حدیث" ہیں، جن کی موصوف نے ترجمانی فرمائی ہے۔
منکرین حدیث کا خیال ہے کہ

"جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی ہے جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی۔"

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط فہمی کی تصحیح کر دی جائے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

لم اسمع احدا نسبه الناس او نسب نفسه الی علم یخالف فی ان فرض اللہ عزوجل اتباع امر رسول اللہ والحکمہ بان اللہ عزوجل لم یجعل لمن بعدہ الا اتباعہ۔ [1]

مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جسے لوگ اہل علم کہتے ہوں یا وہ خود اپنے تئیں اہل علم سمجھتا ہو اور اس کی مخالفت کرے کہ اللہ نے کہا ہے کہ اطاعت کی جائے امر رسول کی اس کے حکم کے سبب کہ اللہ نے اپنے بعد صرف رسول کی اتباع بتائی۔

اس رفع غلط فہمی کے بعد، منکرین حدیث کے خیالات و دلائل اور ان کے جوابات بہ ترتیب پیش کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض منکرین حدیث کا یہ ہے کہ

"سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت، اور کسی

---

[1] کتاب الام صفحہ ۲۵۰۔

حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے' فبای حدیث بعدہ یومنون ٥ اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے ؟ فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ٥ اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے' زیادہ تصریح اس آیت میں ہے' ومن الناس من یشتری لہوالحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذہا ہزوا اولئک لہم عذاب مہین ٥ بعض آدمی وہ ہیں جو خریدار ہوتے ہیں حدیث کے مشغلہ کے تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم کے اور اس کو مذاق بنائیں یہ لوگ ہیں جن کے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے' اس آیت میں " لہوالحدیث " کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے۔ مجھے تعجب ہے پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی۔"

یہ ہے پہلی دلیل کا خلاصہ جسے میں نے بعینہٖ نقل کر دیا ہے' غالباً محترم مقالہ نگار بھی اس باب میں متفق ہوں کہ اس دلیل میں منکرین حدیث نے حد درجہ تدلیس وتلبیس سے کام لیا ہے' پہلے یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن کے علاوہ کسی سنت' اور کسی حدیث کی پیروی کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے' پھر " فبای حدیث بعدہ یومنون " اور اسی قسم کی دوسری آیات میں " حدیث " کا ترجمہ " حدیث " کرنا' اتنی بڑی بددیانتی ہے کہ علمائے جرح وتعدیل' اور ائمہ نقد وبحث نے ایسی تلبیس مبین کے لئے کوئی لفظ نہیں وضع کیا۔

عربی کا ہر ابجد خواں جانتا ہے' اور یقیناً منکرین حدیث کا ہر فرد جانتا ہے کہ حدیث کے معنی بات کے ہیں اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ اگر فن حدیث مراد ہوتا تو اس کے ذکر کا اس جگہ موقع کیا تھا۔ کیا جب حضور سرور کائنات قرآن مجید پیش فرماتے' تو لوگ یہ کہتے تھے کہ حدیث قرآن سے اولیٰ وافضل ہے' آپ قرآن کی دعوت کیوں دیتے ہیں " حدیث " کی دعوت دیجئے' تو ہم قبول کریں ؟

ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہاں مخاطب کفار ومشرکین ہیں کہ خدا کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود' قرآن کے اعجاز' اور رسول کی غیر مشتبہ صداقت کے باوجود' کفر وشرک کے معائب ونقائص معلوم کر لینے کے باوجود ، اگر قرآن پر نہیں تو آخر

فبای حدیث بعدہ یومنون | وہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے۔

اور کہا یہ جارہا ہے کہ اس آیت سے اتباع حدیث کی ممانعت نکلتی ہے، محترم مقالہ نگار نے یقیناً بیچارہ داری سے کام لیا کہ منکرین حدیث کی اس تلبیس کو یونہی درج مضمون فرما دیا، مولٰنا کو فٹ نوٹ میں اس دجل و فریب کا پردہ فاش کر دینا چاہئے تھا۔

"لہوالحدیث" والی آیت کے ترجمہ میں بھی منکرین حدیث نے اسی طرح اپنی "فہم قرآن" کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہے، جودت فہم، اور سخن فہمیٔ عالم بالا کا منکرین اگر یہی ثبوت پیش کرتے رہتے تو "معلوم شد" اور دلیل کتنی معقول دی ہے کہ اگر اس جگہ حسب خیال مفسرین" غنا" مراد تھا تو اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی؟ اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں حدیث و روایت سے دوں بہتر ہے کہ قرآن مجید سے دوں، آیت قرآنی ہے

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین | جب تک تمہیں موت نہ آجائے اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو،

اس جگہ " یقین " کے معنی "موت" کے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے زمانہ سے منکرین حدیث کے موجودہ زمانہ تک سب اس کے معنی یہی سمجھ رہے ہیں، خود منکرین حدیث بھی، یہ کوئی نہیں کہتا کہ

وعبد ربک حتی یاتیک الیقین | جب تک تمہیں یقین نہ آجائے اس وقت تک عبادت کرو

اور اس کے بعد چھوڑ دو، تو اگر اس جگہ یقین کے معنی " موت " کے ہیں، تو آخر خدا کو کیا دشواری تھی کہ "موت" کہہ دیتا؟ " یقین " کہہ کے خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ میں ڈالنے کے کیا معنی؟

جواب بالکل "ظاہر و باہر" ہے "قرآن مجید کا ایک خاص پیرایۂ بیان ہے، ادائگی مفہوم کے لئے حسب موقع جو کنایہ، جو استعارہ، جو تشبیہ سب سے زیادہ بلیغ اور موثر ہوتی ہے وہ لائی جاتی ہے، اس پر اعتراض کرنا کہ اس جگہ یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں، کوئی بہتر طریق معارضہ نہیں۔

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ

"کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان پر کوئی آسمانی مہر ہے؟ یا خود رسول کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح انھیں جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو؟"

جواب اثبات میں ہے، جن حدیثوں کو ہم نے تسلیم کیا ہے، ان پر آسمانی مہر یقیناً ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رسول کے حکم کے مطابق ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔

آسمانی مہر تو ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ | تمہارے لئے رسول ایک اچھا نمونہ ہے،

و ماینطق عن الھوی ان ہو الا وحی یوحی | رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ دیتا بلکہ وہ جو کہتا ہے وہ وحی کیا ہوا ہوتا ہے۔

اور

ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتہوا | رسول جو کچھ دے اس کو لے لو، جس سے منع کرے باز رہو۔

وازیں قبیل اور بہت سی آیتیں ہیں، جن میں حکم رسول کی اطاعت فرض کی گئی ہے، اور ظاہر ہے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں احکام رسول وارد ہیں، سنت رسول موجود ہے تو اسے ترک کیسے کیا جا سکتا ہے، جبکہ خود رسول اللہؐ بھی تاکید فرماتے ہیں کہ میری سنت کو پکڑے رہنا، کتاب اللہ کو پکڑے رہنا کبھی گمراہ نہیں ہوگے، خلفاء راشدین میں جو شخص بھی سریر آرائے خلافت ہوتا ہے، جمہور امت کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ میں کتاب اللہ کو دلیل راہ بناؤں گا، سنت رسول کو چراغ ہدایت سمجھوں گا، اگر اس میں کوتاہی کروں تو مجھ سے مواخذہ کرنا، تو آخر وہ کونسی "سنت" تھی جس کی پیروی کا اعلان ہو رہا ہے، جس کی اتباع کا دم بھرا جا رہا ہے، لامحالہ ماننا پڑیگا کہ وہی سنت، جو سلف سے خلف تک پہونچی ہے، جس کے متعلق ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا کیا، جس کے متعلق خود رسول نے کہا،

علیکم بسنتی | تم پر میری سنت واجب ہے۔

وقت آخر رسول اللہ قلم دوات مانگتے ہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو، حضرت عمر فرماتے ہیں، ہمارے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول کافی ہے، حضور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ قرآن نہیں تھا جس کے متعلق حضور کچھ تحریر فرماتے، اس لئے کہ اس کی تو آپ نے عمر بھر تبلیغ کی تھی، اس کے تو حفاظ موجود تھے، اور یہ پورے طور سے شائع ہو چکا تھا اس لئے اس کے متعلق

کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی، معلوم ہوتا ہے کوئی دوسری چیز بھی تھی جس کے اوپر ہدایت کا انحصار تھا، قرآن سے ہدایت بلاشبہ ہوتی تھی، لیکن اس ہدایت کا تکملہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک حضور کوئی دوسری چیز تحریر نہ فرماتے، لیکن حضرت عمرؓ نے جب فرمایا کہ ہمارے لئے کتاب وسنت کافی ہے تو حضور خاموش رہے، گویا آپ نے اس سے اتفاق فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز آپ تحریر فرمانا چاہتے تھے وہ سنت نبوی ہی تھی۔

اس کے علاوہ اس کا تو ہر شخص کو اعتراف ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے مذہب خود رسول اللہ سے سیکھا تھا، انھوں نے رسول اللہ کی زبان سے سنا تھا، اپنے کانوں سے رسول اللہ کو حلال و حرام کا فتویٰ دیتے، چیزوں کو اچھا برا کہتے سنتے تھے۔ اگر کوئی شبہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہؐ سے پوچھ لیتے تھے اور وہ بتلا دیتے تھے، لہٰذا ان کا مذہب، ان کا فہم، ان کا تفقہ فی القرآن، ان کا اعتصام بالکتاب، اور ان کی رائے ہمارے مقابلے میں ارفع واعلیٰ ہے۔ خلفاء راشدین کا عہد دیکھئے، ان میں بھی حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کو دیکھئے، کہ ان حضرات کا مسلک کیا تھا۔ کیا وہ صرف تمسک بالکتاب کو کافی سمجھتے تھے؟ کیا انھیں ہر چیز قرآن میں مل جاتی تھی؟ حضرت ابوبکرؓ کا یہ واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ایک عورت جدہ کا حق طلب کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی۔ آپ نے کہا میں کتاب اللہ میں تیرا کوئی حق نہیں پاتا، تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ رسالت پناہ نے سدس دلوایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کوئی گواہ بھی ہے؟ محمد بن مسلم نے شہادت دی تو حضرت ابوبکرؓ نے بلا تامل اسے نافذ فرما دیا[۱]۔ اس پر ذہبی نے تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن میں حضرت ابوبکرؓ نے کچھ نہیں پایا تو سنن کی جستجو فرمائی اور جب ثقہ سے خبر مل گئی تو آپ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اس کی تصدیق کی اور نافذ کرایا، خوارج کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے[۲]۔

اسی طرح حضرت عمرؓ بھی قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے، چنانچہ حضرت عباسؓ کی زمین

---

[۱] و [۲] تذکرۃ الحفاظ ذکر ابی بکر۔

والے واقعہ میں شہادت لی، ویسا ہی فیصلہ کیا، جیسا حدیث کے مطابق ہونا چاہئے تھا، اور پھر خود ہی فرما دیا کہ میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں، صرف تاکید مقصود تھی۔[1]

خود رسول اللہ کے زمانے میں بھی حدیث کی "تاریخی" حیثیت نہیں تھی، بلکہ "دینی" حیثیت تھی۔ رسول اللہ نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا ہے تو فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ آیا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو ؟ کہا سنت رسول سے، فرمایا اگر اس میں بھی نہ ہو تب ؟ کہا تب میں اپنی رائے سے کام لوں گا۔[2] اس پر رسول اللہ خوش ہوئے۔ اگر ان کی دینی حیثیت نہیں تھی، تو رسول اللہ کے خوش ہونے کے کیا معنی ؟

حضرت ابن عمر کا یہ واقعہ بھی خاص حیثیت رکھتا ہے۔

حدثنا سلیمٰن بن حرب عن ایوب عن نافع ان ابن عمر کان یکری مزارعہ علی عھد النبیؐ و ابی بکر و عمر و عثمان، و صدرا من امارۃ معاویۃ ثم حدث عن رافع بن خدیج ان النبی نھی عن کراء المزارع فذھب ابن عمر الی رافع و ذھبت معہ فسالہ فقال نھی النبیؐ عن کراء المزارع فقال ابن عمر قد علمت انا کنا نکری مزارعنا علی عھد رسول اللہؐ۔

سلیمان بن حرب ایوب سے، وہ نافع سے بیان کرتے ہیں کہ ابن عمر اپنے کھیت کرایہ پر دیدیا کرتے تھے، رسول اللہؐ کے عہد میں بھی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے عہد میں بھی، اور جناب معاویہ کے عہد میں بھی کچھ عرصے تک، پھر ان سے رافع بن خدیج کی حدیث بیان کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء ارض سے منع فرمایا ہے، تو ابن عمر نے کہا تم جانتے ہو ہم رسول اللہ کے زمانے میں بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔

حدثنا یحیی بن بکیر ثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب قال اخبرنی سالم ان عبد اللہ بن عمر قال کنت اعلم فی عھد رسول اللہؐ ان الارض

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے سالم نے خبر دی کہ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ میں رسول اللہ کے عہد میں یہ جانتا تھا کہ زمین کرایہ پر دی جا سکتی ہے، پھر عبداللہ بن عمر ڈرے کہ مبادا رسول اللہ نے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمر۔

[2] اس حدیث کی مشکوٰۃ نے ترمذی، ابوداؤد اور دارمی کے حوالے سے تخریج کی ہے۔

ثم خشی عبداللہ ان یکون النبی قد احدث فی ذلک شیئاً لم یکن علم فترک کراء الارض۔[1]	کچھ اس باب میں فرمایا ہو اور انھیں علم نہ ہوا اس خیال کے آتے ہی انھوں نے زمین کرایہ پر دینا چھوڑ دی۔

اس میں خاص طور سے غور طلب یہ امر ہے کہ عبداللہ بن عمر خود صحابی ہیں اور جلیل القدر صحابی ہیں، حاضر باش بزم رسول ہیں، ان کے زہد و تقویٰ، اور دیگر محامد و محاسن کی ایک دنیا قائل ہے، خود رسالت مآب خوشنودی مزاج کا اظہار فرما چکے ہیں۔ رسول اللہ کے عہد میں، حضرت ابوبکر کے عہد میں، حضرت عمر کے عہد میں، حضرت عثمان کے عہد میں، اور جناب معاویہ کے عہد امارت میں کچھ عرصے تک وہ ایک کام کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھیں رافع بن خدیج کی حدیث پہونچتی ہے، خود تحقیق حال کے لئے رافع کے ہاں جاتے ہیں، وہ وہی جواب دیتے ہیں، خود صحابی ہیں، رسول کے زمانے سے اس وقت تک ایک کام کرتے آئے، کسی نے ٹوکا نہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ نے فرمایا ہو اور مجھے علم نہ ہو سکا ہو، لہذا اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر احادیث صرف تاریخی درجہ رکھتی تھیں دینی حیثیت کی مالک نہیں تھیں تو عبداللہ ابن عمر باوجود جلیل القدر صحابی ہونے کے کیوں ایک پرمنفعت کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ حدیث کی دینی حیثیت کے قائل نہ ہوتے تو کیا قیامت تک وہ ایسا کر سکتے تھے؟ صرف یہی دینی حیثیت تھی جس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اسے چھوڑ دیں۔

حضرت ابن عمر ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابل تامل ہے،

قال ابن عمر لجابر بن زید انک من فقہاء البصرۃ فلا تفت الا بقرآن ناطق او سنۃ ماضیۃ فانک ان فعلت غیر ذلک ہلکت واہلکت۔[2]	حضرت عبداللہ بن عمر نے جابر بن زید سے کہا کہ بیشک تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو لیکن اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دینا سوا قرآن و سنت کے، اگر اس کے علاوہ تم نے کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے۔

---

[1] بخاری صفحہ ۳۱۵۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی۔

اس کے علاوہ

قال ابو النضر لما قدم ابو سلمة البصرة اتيته انا والحسن فقال للحسن انت الحسن ما كان احد بالبصرة احب الى لقاء منك وذلك انه بلغنى انك تفتى برائك فلا تفت برائك الا ان يكون سنة عن رسول الله او كتاب منزل ؎

ابو النضر کہتے ہیں کہ جب ابو سلمہ بصرہ آئے تو میں حسن کے ساتھ وہاں گیا، انھوں نے حسن سے کہا کہ بصرہ میں تم سے زیادہ ملاقات کا اشتیاق مجھے کسی اور سے نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہ دو یا سنت رسول سے یا کتاب الٰہی سے۔

اگر سنت کی کوئی دینی حیثیت صحابہ کی نظروں میں نہیں تھی عبداللہ بن عمر ابو سلمہ کو کیوں یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دو، بلکہ سنت سے دو، کتاب سے دو۔ اگر دینی حجت صرف کتاب تھی تو صرف کتاب ہی پر زور دینا چاہئے تھا لیکن صحابی ہونے کے باوجود وہ زور دے رہے ہیں بلکہ ڈرا رہے ہیں کہ دیکھو کہ اگر اپنی رائے سے فتویٰ دیا تو ہلاک ہوئے، کتاب الٰہی اور سنت رسول دونوں کو اپنے سامنے رکھو اور فتویٰ دو، صرف "تاریخی" چیز کی اتنی حیثیت تو نہیں ہو جاتی کہ وہ "دینی" چیز کے دوش بدوش، بہ ثبات "عقل وہوش" رکھی جائے؟

علاوہ ازیں

قال الشعبى ما حدثوك من رسول الله فخذ به وما قالوه برائهم فالقه فى الحش ؎۲

شعبی کہتے ہیں کہ اگر لوگ تم سے حدیث بیان کریں تو تم اُسے لے لو لیکن اگر اپنی رائے بیان کرنے لگیں تو اُسے غلاظت میں پھینک دو۔

یہ حدیث بھی قابل تامل ہے، اسے بھی شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک خاص عنوان کے ماتحت ذکر کیا ہے، اور شاہ صاحب کا پایۂ علم حدیث میں جتنا ارفع واعلیٰ ہے اس سے سب واقف ہیں خیر، وہ حدیث یہ ہے،

؎ و ؎۲ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۵۰، بحوالۂ دارمی۔

لا الفین احدکم متکئا علی اریکتہ، یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او رغبت عنہ فیقول لا ادری ماوجدنا فی کتاب اللہ اتبعنا ۔	نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ ٹیک لگائے ہوئے تکیہ پر بیٹھا ہو اس کے پاس میری باتوں میں سے کوئی ایسی بات آئے جس کا میں نے حکم دیا ہو، یا منع کیا ہو اور وہ کہے کہ میں تو اسے نہیں جانتا، قرآن میں تو ہے نہیں کہ میں اس کی پیروی کروں۔

معلوم ہوتا ہے سرکار رسالت نے اپنی چشم بصیرت سے سب کچھ مطالعہ فرمایا تھا ورنہ ایسی بات وہ کیوں فرماتے ؟

شاہ ولی اللہ صاحب، جو اسرار و رموز شریعت کے ماہر خصوصی ہیں ایک اور بات فرماتے ہیں۔ جو ہر منکر حدیث کے لئے سرمایۂ تفکر ہے یعنی رسول اللہؐ سے جو کچھ مروی ہے اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا بعض حصہ

مستند الی الوحی وبعضہا مستند الی الاجتہاد و اجتہادہ بمنزلۃ الوحی لان اللہ تعالیٰ عصمہ من ان تستقر ارایہ علی الخطاء ۔ ؎[1]	وحی سے مستند ہوگا، یا حضور کے اجتہاد سے اور آپ کا اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ و مصئون کر دیا ہے کہ آپ کی رائے گرامی غلط واقع ہو۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انبیا معصوم ہیں، لہٰذا ہمارے رسول بھی غلطی اور غلط روی سے معصوم تھے، محفوظ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص مرتبہ پر سرفراز فرمایا تھا، ان سے کسی غلطی کا صدور نا ممکن تھا۔ پھر اس کے تسلیم کرنے کے بعد فرمودہ رسول ظاہر ہے ریب و شک سے پاک، اور اسی طرح واجب العمل اور واجب التسلیم ہے جس طرح کوئی منصوص امر جس پر نص وارد ہو، غرض اس قبیل کی بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں جن سے حدیث کی دینی حیثیت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، اور ثابت ہو جاتا ہے کہ خود عہد صحابہ میں اس کی دینی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے اور اس عہد سے آج تک امت

؎[1] حجۃ اللہ البالغہ

اسے مانتی چلی آئی ہے۔ پھر اب یہ دعویٰ کہاں تک قابل پذیرائی ہے؟
ایک اور بات کہی گئی ہے:۔

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور یہ ہے' اطیعوا اللہ واطیعوا رسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول' اور اطاعت رسول فرض ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔ اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امرا ہوئے ہیں ان میں سے بھی ہر ایک کا مجموعۂ احادیث ہونا چاہئے' ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی ؟ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا دونوں داخل کئے گئے ہیں۔"

امعان نظر سے اگر اس دلیل کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔ قرآن نے یقیناً خدا' رسول اور امیر کی اطاعت کا حکم دیا ہے' اور ہمیں اطاعت کرنی چاہئے' لیکن کیا رسول اور امیر کا درجہ ایک ہے ؟ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں' اور کتنی معقول بات فرماتے ہیں کہ

اقول انتظام الدین یتوقف علی اتباع السنن النبیؐ و انتظام السیاستہ الکبریٰ یتوقف علی الانقیاد للخلفا فیما یامر و نہم۔ [۱]	میرا خیال یہ ہے کہ انتظام دین سنن نبوی کی پیروی پر منحصر ہے' اور انتظام سیاستہ کبریٰ خلفا اور امرا کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے۔

شاہ صاحب کا یہ قول اتنا مبرہن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا' دین چونکہ ایک اٹل' اور نہ بدلنے والی چیز ہے اس لئے اس میں تو قرآن و سنت نبوی ہی کی پیروی ہوگی اور سیاست ایسی چیز ہے جو مصالح کے لحاظ سے ہر وقت بدلتی رہتی ہے اس لئے امرا اور خلفا کی اطاعت و انقیاد کا حکم ہے اس لئے کہ اسلام کے نزدیک'

الفساد اکبر من القتل	فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۷۵۔

اسلام جماعت انسانی کو ایک نظام اور ضابطہ کے اندر رکھنا چاہتا ہے، اسی لئے اگر کوئی حبشی غلام بھی امیر ہو تو بھی اس کی اطاعت واجب ہے، لیکن اگر وہ کتاب وسنت سے اعراض کرے تو خواہ وہ حبشی نہیں عمر فاروق ہو ایک بدو اسے تکلے کی طرح سیدھا کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے۔ خود قرآن و حدیث میں جا بجا اس کی تفصیل ملے گی کہ امیر کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے جب تک وہ متبع کتاب و سنت ہے اور جب اس سے وہ اعراض کرے تو اس کی پیروی ساقط۔ مسلمان پر پڑوسی کا حق ہے، دوستوں کا حق ہے، والدین کا حق ہے، قرابت داروں کا حق ہے، امیر وقت کا حق ہے لیکن اگر کوئی بات خلاف سنت ہو خلاف کتاب ہو تو یہ تمام حقوق ختم ہو جائیں گے، مسلمان ان تمام بندشوں سے آزاد ہو جائے گا اور وہ صرف خدا کی اطاعت کرے گا، ارشاد رسول کی پیروی کرے گا۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ نظم و انتظام کے قائم رکھنے کے لئے امیر کی اطاعت واجب تو ہے لیکن اسی وقت تک جب تک وہ کتاب وسنت پر چلے۔ میرے اس دعوے کی دلیل قرآن ہی میں اور اسی آیت میں ملتی ہے کہ

وان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول | اگر کوئی تنازعہ فیہ مسئلہ درپیش ہو تو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ

اس جگہ "امیر" کا لفظ "ردوہ" میں اسی لئے نہیں داخل کیا کہ اگر وہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی قرآن و حدیث میں اس کی جستجو کرو۔ لہذا اگر "ردوہ" میں امیر داخل ہوتا تو یقیناً امراء اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت تھی لیکن جب اس میں نہیں ہے صرف "اطیعوا" میں ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے اور جب کوئی بات پیدا ہوگی تو خدا اور رسول کی طرف لوٹائیں گے، اس وقت امیر کو پوچھیں گے بھی نہیں اور اسی کے مطابق عمل کریں گے، اب یقیناً یہ بات ثابت ہو گئی کہ امراء اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت کیوں نہیں ہے، اور رسول اللہ کے مجموعۂ حدیث کی ضرورت کیوں ہے؟

- آگے کہا ہے کہ

"یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اطاعت ہوگی اولو الامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے کہ جو اس کی جانشینی کریں گے۔"

اگر ایسا ہوتا تو "ردوہ" میں امیر کا لانا ضروری تھا، اور اس میں امیر اسی لئے نہیں لایا گیا کہ اس کا ہر وقت امکان ہے کہ کوئی امیر غاصب ہو، شرابی ہو، حکم خدا اور حکم رسول کی پروا نہ کرتا ہو، لہٰذا اگر ایسا ہو تو آخری فیصلہ "اولوالامر" پر نہیں، بلکہ ان کے "اولوالامر" یعنی خدا اور رسول پر رکھا گیا، مثلاً یوں سمجھئے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت نے اگر بقول بعض مسجدیں مقفل کرا دیں، نماز غیر ضروری قرار دی، پارلیمنٹ کا کوئی مذہب نہیں رکھا، قوانین اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا، اور ایک دوسرا دستور حکومت وضع کر لیا، تو کیا انھیں کوئی منکر حدیث "جانشین رسول" مان لے گا، نہیں اور یقیناً نہیں، تو ایسی صورت میں چارہ کار سوا اس کے اور کیا ہے کہ معاملہ خدا اور رسول کے سپرد کیا جائے، اس لئے کہ رسول کے متعلق تو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اتنا "نیشنلسٹ" ہو جائے گا کہ قرآن کو چھوڑ کر یورپ اور اس کی دوسری نو آبادیوں کے اصول پر دستور حکومت وضع کرے، بتلایا جائے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ کیا اس کی اتباع کی جائے؟ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر لامحالہ ہیں رجعت قہقری کر کے اسی طرف لوٹنا ہو گا جس نے "اولوالامر" کی اطاعت واجب کی ہے۔ اب یہ حکمت سمجھ میں آگئی ہو گی کہ "اطیعوا" میں امیر کا ذکر تھا نظم و انتظام کے لئے ہے، اور "ردوہ" میں عمداً اور مصلحتاً نہیں ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو، تو اس کا تدارک کسی ایسے "جانشین رسول" سے نہیں ہو گا بلکہ صرف قرآن و حدیث سے۔

پہلی ہی دلیل کے ضمن میں کہا گیا ہے،

"کہ دراصل حکم کتاب اللہ ہے رسول یا امیر اس سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں، اسی لئے فرمایا "وان اختلفتم فی شیء فحکمہ الی اللہ"۔"

اور اسی لئے فرمایا کہ "وان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول" اگر صرف "اللہ" مقصود تھا تو لفظ "رسول" کے نہ لانے میں یہاں کیا "دشواری" تھی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعد اگر کوئی چیز ماموربہ ہے تو وہ رسول ہے، قرآن کے بعد اگر کوئی چیز واجب العمل ہے، تو وہ حدیث ہے۔

ان کھلی ہوئی آیتوں اور نشانیوں کے بعد آخر منکرین حدیث

"فبای حدیث بعدہ یومنون ۵" | اور کس چیز پر ایمان لائیں گے،

دوسری دلیل ہے کہ

"کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں رسول کے حکم کے بھی اتباع کا تو حکم موجود ہے' قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی' لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا' اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے اتبع ما اوحی الیک من ربک' پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی لہذا رسول بجز وحی کے کسی کا پیرو نہیں تھا اس لئے اس کی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے:"

ثابت ہوا کہ حدیث کی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے' اس لئے کہ احادیث بھی تو آخر امور دین ہی کے متعلق ہیں' اور یہ "تاریخی" طور سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ میری پیروی کرو' صحابہ کی پیروی کرو' اگر ایسا کرو گے تو ہدایت یاب ہوگے' لہذا رسول کی پیروی عین قرآن کی پیروی ہے' لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ سب اس تفصیل سے قرآن میں موجود بھی ہے' اس لئے قرآن نے کہلوایا'

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی | اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (رسول اللہ کی) پیروی کرو۔

اور اس کی پیروی موجب رضامندی خدا ہے' اور اس کی پیروی ہے کیا؟ وہی جس کے متعلق اُس نے حکم دیا' جس کے متعلق اس نے منع کیا' اور چونکہ رسول کی پیروی موجب رضامندی خدا ہے اس لئے یہ بھی کہدیا کہ

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی ؃ | فرمودۂ رسول وحی ہی ہے' اور بس کیا؟

اس لئے کہ خدا نے اسے رسول بنایا' اس کی پیروی اپنی رضامندی کا سبب بتائی' تو پھر ظاہر ہے اس کا قول کوئی معمولی قول نہیں ہو سکتا بلکہ وہ وحی ہے' اور کچھ نہیں۔

آگے پھر کہا گیا ہے کہ

"یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا جس کے ثبوت میں آیت وما ینطق عن الھوی الخ پیش کی جاتی ہے صحیح نہیں کیونکہ کفار کو جو انکار

تھا وہ قرآن کے متعلق تھا' اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے رسول اللہؐ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق نہ انکار تھا نہ بحث قل انما انذرکم بالوحی"

چنانچہ پہلی ہی آیت میں تصریح ہے کہ "نطق رسول" وحی ہے' اور یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ وہی نطق رسول وحی ہے جو امور دین میں ہو' اور وہی حدیثیں واجب العمل ہیں جو امور دین میں ہوں' "ورنہ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اس کے متعلق" نہ اصرار ہے نہ دعویٰ کہ وہ واجب العمل ہیں' یعنی اگر رسول اللہ نے حضرت عائشہؓ سے گھر میں کوئی بات کی' یا حضرت فاطمہؓ سے کچھ فرمایا' تو امتیان محمد میں ہر شوہر یا باپ پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ بھی اپنی لڑکی سے وہی کہے' اور اسی طرح کہے' لیکن اگر رسول نے کہا کہ طواف یوں کرو' سعی یوں کرو' نماز میں یوں کھڑے ہو' یہ اور اسی قبیل کے اقوال و اعمال جو دین سے متعلق ہیں دئے تو وہ ہمارے لئے' بلاشبہ واجب العمل ہیں' ان کی پیروی کی جائے گی' اور جو پیروی کرے گا خدا اس سے خوش ہو گا۔

تیسری دلیل میں احادیث کو ظنی بتلایا گیا ہے اور اس لئے ناقابل عمل' اس پر گفتگو بے کار ہے اس لئے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہیں۔

چوتھی دلیل میں ایک بہت دلچسپ بات یہ کہی گئی ہے کہ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی' اور پھر اس کو محکم یوں کیا گیا ہے کہ

"بعض جگہ حدیثیں بالکل قرآن کے خلاف جاتی ہیں جن کی وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں مثلاً اللہ نے مالدار مسلمانوں پر مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین' مگر حدیث کہتی ہے' "لا وصیۃ لوارث"۔ علما نے اس حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا ہے

منسوخ کر ڈالی"۔

تعجب ہے کہ اس برہان قاطع پر جو منکرین حدیث نے پیش کی ہے کیا کہا جائے؟ اگر یہ منکرین حدیث سے اس قدر بیزار ہیں تو قرآن مجید پر تو پورے طور سے وسعت نظر ہونی چاہئے تھی، نہ یہ کہ ادھر ادھر کی کتابوں میں جو کچھ کسی نے لکھ دیا وہ سچ سمجھ لیا گیا۔ دعویٰ اور دلیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حدیث نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ لوگوں کو حق وصیت سے محروم کر دیا، اب وہ بیچارے کیا کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب تک قرآن مجید میں اعزا و اقربا کے حصص مقرر نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ پورا رکوع نازل ہوا جس میں باقاعدہ ہر شخص کے حصص مقرر کر دئے گئے ہیں تو اس کی ضرورت نہیں رہی اور بحث و اتفاق دیکھئے کہ اس میں بھی رسول کی پیروی فرض کی جا رہی ہے۔

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق اثنتین فلھن ثلث ما ترک، و ان کانت واحدۃ فلھا النصف، ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد، فان لم یکن لہ ولد و ورثہ ابواہ فلامہ الثلث فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین آباؤکم وابناؤکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعا، فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما ۞ ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد، فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیۃ یوصین بہا او دین، ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد، فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون

اللہ تم کو وصیت کرتا ہے کہ تمہاری اولاد میں مرد کے لئے عورت سے دوگنا حصہ ہے اور اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو جو چیز وہ چھوڑ گیا ہے تو دو تہائی اس چیز کا ملے گا، اور ایک ہو تو اس کے لئے نصف ہے، اور ماں باپ میں ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس صورت میں کہ اس کے اولاد ہو، اور اگر نہ ہو تو والدین ہی وارث ہوں گے، اور ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور اگر اس کے بھائی ہوں تو چھٹا ملے گا اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائے، یا قرض کے دینے کے بعد، تمہارے باپ اور تمہاری اولاد اس سے ناواقف ہیں کہ کس میں زیادہ نفع ہے ان میں، یہ تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور تمہاری بی بی جو چھوڑ کر مرے اس میں تمہارا نصف کا حصہ ہے اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اگر ہو تو تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے، وصیت یا قرض کے دینے کے بعد، اور اگر تمہارے اولاد نہ ہو تو تمہاری جائداد میں بی بی کا چوتھائی

بها او دین، وان کان رجل یورث کللۃ او امرأۃ ولہ اخ او اخت فلکل واحد منہما السدس فان کانوا اکثر من ذلک فہم شرکاء فی الثلث من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین، غیر مضار، وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہار خلدین فیہا، وذلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا ولہ عذاب مہین۔

(والمحصنت)

حصہ ہے اور اگر ہو تو پھر آٹھواں حصہ ہے بی بی کے لئے وصیت اور قرض کے بعد اور اگر کوئی ایسا آدمی ہو جس کی میراث کلالے یا ایسی عورت کہ ہے اس کے واسطے بھائی یا بہن تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اس سے بھی زیادہ ہوں تو وہ سب ثلث میں شریک ہونگے وصیت یا قرض کے بعد، اس میں کسی کو ضرر نہیں ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ علیم وحکیم ہے، یہ اللہ کے حدود ہیں، جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ہمیشہ رہے گا اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی، حدود سے گزر گیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں داخل ہوگا اور اس کے واسطے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے۔

اس پورے رکوع میں "عائلی مصالح" کو مدنظر رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کریمہ "واذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین" کا اجمال کافی نہ سمجھ کر یہ پورا رکوع نازل فرمایا، اور اس میں باقاعدہ لڑکا، لڑکی، والدین، شوہر، بی بی، بھائی، بہن سب کے حقوق متعین کر دئے، اب ہر مسلمان ان کی تعمیل پر مجبور رہے، اور ورثا کو بھی حصے از روئے شرع شریف ملیں گے لہذا اس صورت میں وارث کے لئے، وصیت کی ضرورت ہی کیا باقی رہجاتی ہے ؟ وصیت تو اس وقت کی جاتی ہے جب آدمی مر رہا ہو اور اسے یقین ہو کہ میرے مرنے کے بعد یہ کام ایسا نہیں ہوگا تو وہ وصیت کرکے اپنی آرزو محکم کر جاتا ہے اور پھر وہ پوری ہوتی ہے، لیکن جب اس کا اندیشہ ہی نہیں، وارث کو حق بہرحال ملے گا، چاہے وہ دینا چاہے چاہے نہ دینا چاہے تو پھر وارث کے لئے وصیت کی کیا حاجت رہ گئی ؟ لیکن اگر وصیت کرنے والا اپنی جائداد ست کار خیر کے لئے غریبوں اور یتیموں کے لئے کچھ وصیت کرنا چاہتا ہے کہ بطور صدقہ جاریہ کے وہ کام آئے، تو اس کا حق بھی شرع نے باقی رکھا ہے، وہ اپنی جائداد کے ثلث حصے میں جس قسم کی، جس کو چاہے وصیت کر سکتا ہے اور وہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہوگی۔

لیکن ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا، اور اگر وہ کر بھی دے تو قاضی اسے منسوخ کر دے گا اس لئے کہ حقوق اقربا باقی رہ جائیں گے، اور یہ مالی حقوق مقصد خداوندی نہیں۔ وصیت ثلث میں نافذ رہے گی اور یہ جو کچھ ہوگا، قرآن مجید کے اس رکوع کو پیش نظر رکھ کے ہوگا۔

اور حدیث کے اوپر یہ الزام لگانا کہ وہ عائلی مصالح کو تباہ کر رہی ہے' بہت بڑی زیادتی ہے' احادیث وسنن میں اکثر ایسے واقعے ملتے ہیں کہ کوئی صحابی اپنی سب سے زیادہ "عزیز و محبوب" چیز راہ خدا میں وقف کر دینا چاہتے ہیں لیکن رسول خدا انھی " عائلی مصالح " کی بنا پر انھیں باز رکھتے ہیں' اور اسے ان کے اقربا میں بحصہ رسدی تقسیم کرا دیتے ہیں' پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث پر یہ الزام کیسے لگ سکتا ہے ؟

اب یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ جب تک ذوی القربیٰ کے حقوق کی باقاعدہ تعین نہیں ہوئی تھی اس وقت تک کے لئے وہ آیت کافی تھی جس میں والدین وغیرہ کے لئے وصیت کرنے کا حکم ہے لیکن جب حقوق پر پورا ایک رکوع نازل ہو گیا' تو وہ اجمال اس تفصیل میں مدغم ہو گیا' اور اب امت کا اسی پر عمل ہے' اور چونکہ سب کے حقوق خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں' اب ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی ہے۔ لہذا وارث کے لئے وصیت کرنا ایک بے معنی سی بات ہے' البتہ اس ثلث میں جس پر وصیت کرنے والے کو پورا اختیار رہے ہر قسم کی وصیت کر سکتا ہے' اور وہ نافذ ہو گی' لیکن اس کے بعد وصیت کا دروازہ بند ہے' اور گویا حکم قرآن سے بند ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ

"صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا لاتکتبوا عنی غیر القرآن الخ"

یہ "الخ" کیا چیز ہے ؟ محترم مقالہ نگار نے اس جگہ بھی بے جا رواداری سے کام لیکر منکرین حدیث کو انتہائی تلبیس کا موقع دیا۔ پوری حدیث یوں ہے :۔

لاتکتبوا عنی القرآن وحدثوا عنی فلا حرج	مجھ سے سوا قرآن کے کچھ نہ لکھو ہاں حدیث بیان کرو۔

"حدثوا عنی فلا حرج" کو نہ لکھنا صرف "الخ" لکھ کے ٹال دینا بہت بڑی زیادتی ہے' جب

پوری حدیث اس طرح سامنے آجاتی ہے تو اعتراض کی صورت ہی بدل جاتی ہے یعنی رسالت پناہ نے اس اندیشے سے کہ قرآن اور حدیث غلط ملط نہ ہو جائیں کتابت سے تو منع فرمایا اور حدیث بیان کرنے کی اجازت دیدی، اور بعد کو جب یہ اندیشہ رفع ہوگیا تو آپ نے کتابت کی اجازت بھی عبداللہ بن عمرو کو دے دی، جیسا کہ خود حضرت ابوہریرہ نے ایک مقام پر اعتراف فرمایا ہے کہ مجھ سے زیادہ عالم بالحدیث سوا عبداللہ بن عمرو کے کوئی نہیں، اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا[1]۔ کتابت کا یہ فعل ظاہر ہے آنحضرت کے زمانے ہی میں ہوتا تھا، خود طاہر جزائری نے اس کی توجیہ بھی کی ہے کہ جب لبس واختلاط کا اندیشہ رفع ہوگیا تو آپ نے کتابت کی اجازت دیدی[2]، ورنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست زاہد و عابد شخص کتابت حدیث کا حکم اپنے عہد خلافت میں کیسے دے سکتا تھا، اور صحابہ اور تابعین اس کی پیروی کیسے کر سکتے تھے؟

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ

"حضرت ابوبکر نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا، اس لئے کہ اختلاف کا اندیشہ تھا، انھوں نے تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا اُسے بھی جلا دیا۔"

یہ بھی غلط ہے۔ یہ قول تذکرۃ الحفاظ سے لیا گیا ہے، اور خود صاحب تذکرۃ الحفاظ، علامہ ذہبی نے ان دونوں واقعات کو "مراسیل" میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایۂ استناد قطعاً ساقط ہے[3]۔ مراسیل ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتے، نہ ہم ان سے احتجاج کر سکتے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد تعجب ہے کہ منکرین حدیث

---

[1] و [2] توجیہ النظر

[3] تذکرۃ الحفاظ ذکر ابی بکر۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ بعض لوگ مراسیل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں لیکن جمہور محدثین کرام قطعاً اسے ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں، اور کبھی اس سے احتجاج نہیں کرتے، ہمیں جمہور محدثین کا مسلک پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (رئیس احمد جعفری)

اسے کیسے پیش کرتے ہیں؟ یہ واقعہ تو خیر مراسیل میں سے ہے لیکن صاحب تذکرۃ الحفاظ نے بڑے زور شور سے حضرت ابوبکرؓ کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جب آپ نے جدہ کا حق حدیث سے دلوایا ہے، اور اُس کے بعد لکھا ہے کہ دیکھو حضرت ابوبکرؓ کو جب قرآن میں ایک چیز نہیں ملی تو سنن کی جستجو کی، اور جب سنن میں مل گئی تو اسے نافذ کر دیا، اور خوارج کی طرح یہ نہیں کہہ دیا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے[1]۔

خود حضرت عمرؓ کا یہ عالم تھا کہ وہ قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے، اس قلت روایت اور کثرت طرق کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے۔ قلت روایت کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہؐ سے یونہی اندھا دھند روایت نہ کر دی جائے، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر حزم و احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے، اور کثرت طرق کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث متعدد راویوں سے اور متعدد طرق سے روایت کی جائے، تاکہ اس کی صداقت اور حقیقت غیر مشتبہ ہو جائے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے "املاص" کے متعلق قرآن مجید میں کچھ نہیں پایا تو حدیث کی طرف رجوع کیا اور جب حدیث مل گئی تو قبول کیا۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے واقعے میں جس کا ذکر آچکا ہے، جب آپ کو شہادت مل گئی تو آپ نے قبول فرمایا[2]۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ بھی، جب حدیث ملتی تھی تو حلف لے کے اسے قبول فرما لیتے تھے[3]۔ یہ کبھی نہیں فرماتے تھے کہ ان کی تو صرف "تاریخی" حیثیت ہے، دینی حیثیت سے ہم نہیں مانتے، نیز، حضرت علیؓ منکر حدیث کی روایت سے منع فرماتے تھے اور مشہور حدیث کی تحدیث کی ترغیب دیتے تھے[4]۔ ان باتوں کو پیش کرنے کے بعد ایک دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ

> "حضرت ابن عباسؓ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث "الوضوء مما مسته النار" اور حضرت علیؓ کی حدیث "نہی عن المتعہ" اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکرؓ۔

[2] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمرؓ۔

[3] و [4] تذکرۃ الحفاظ، ذکر علیؓ۔

اس سے گویا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس حدیث کے قائل نہیں تھے، حالانکہ یہ کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا' اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس ان تین حدیثوں کو قبول نہیں فرماتے تھے' جو گویا ان کے نزدیک پایۂ تحقیق تک نہیں پہونچتی تھیں اور ان تین حدیثوں میں بھی پہلی حدیث منسوخ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں متعدد روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں رسول اللہؐ نے اسے ترک فرما دیا تھا۔ آپ نے گوشت نوش فرمایا اور بلا وضو کے نماز پڑھی اور خود جابر کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے آخر میں "مماستہ النار" سے وضو ترک کر دیا تھا' اور اسی پر امت کا عمل یا "تواتر" چلا آ رہا ہے' تو اسے حضرت ابن عباس نے بہت اچھا کیا نہیں مانا' اس لئے کہ یہ ماننے کی چیز ہی نہیں تھی' رہی دوسری حدیث "نہی عن المتعہ" سے انکار کی' تو ممکن ہے حضرت علی کی اس حدیث میں انھیں کچھ شبہ ہوا ہو اس لئے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کیا' لیکن ان کے اس انکار کو خود صحابہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کو حضرت ابن عباس کے اس مسلک کا جب علم ہوا تو انھوں نے نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی کہ جس طرح وہ بصارت سے محروم ہیں اسی طرح بصیرت سے بھی' ذرا متعہ کر کے وہ دیکھیں تو پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟ اور تیسری حدیث جس کا حضرت ابن عباس نے انکار فرمایا ہے اسے بیان کرنا چاہئے تھا کہ وہ کیا تھی' یوں تو اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ

"عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہو گیا' اور شہادت' در شہادت' در شہادت' در شہادت' عقلاً' عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں"

حیرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ناممکن کون سی چیز ہو گئی؟ صحابہ سے تابعین روایت کرتے ہیں' تابعین سے تبع تابعین روایت کرتے ہیں' ان سے اور ثقہ لوگ۔ اگر ایک بات ایک سچا آدمی کہے تب تو وہ قابل قبول ہے اور اگر دس سچے آدمی اسی بات کو کہیں تو وہ ناقابل قبول؟ یہ استدلال بدیع تو یقیناً ناقابل فہم ہے۔ ہمارے پاس روایت کرنے والوں کی زندگی کا ایک ایک صفحہ محفوظ ہے' ان کے کردار' ان کی گفتار' ان کے عادات و اطوار سب ہمارے سامنے ہیں' ان کا بیٹھنا اٹھنا' ان کا کھانا پینا' ان کی

بات چیت، ان کے عیوب و فضائل، ان کے محامد و معائب سب ہماری نظر میں ہیں، تو آخر وہ کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر ہم انھیں ساقط الاعتبار سمجھ لیں؟ آخر "شہادت" در شہادت، در شہادت، در شہادت" "عقلاً، وفاً، یا قانوناً کس لحاظ سے قابل سماعت نہیں؟" امام شافعی نے بتایا ہے کہ قبول حدیث کا معیار کیا ہے:

اخبرنا ابو محمد الربیع بن سلیمان المرادی المؤذن صاحب الشافعی رحمۃ اللہ سالت الشافعی بای شئ تثبت معجز عن رسول اللہ ﷺ فقال قد کتبت ھذہ الحجۃ فی کتاب جماع العلم فقلت اعد من ھذا مذھبک ولا تبال ان یکون فیہ فی ھذا الموضع فقال الشافعی اذا حدث الثقۃ عن الثقۃ حتی ینتھی الی رسول اللہ ﷺ فھو ثابت عن رسول اللہ ولا ترک الرسول اللہ حدیثا ابدا الا حدیثا وجد عن رسول اللہ ﷺ حدیث یخالفہ واذا اختلفت الاحادیث عنہ فالاختلاف فیہا وجہان احدہما ان یکون بھا ناسخ ومنسوخ فنعمل بالناسخ ونترک المنسوخ والآخر ان تختلف ولا دلالۃ علی ایہما الناسخ فنذھب الی اثبت الروایتین الخ [1]

ابو محمد کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ سے حدیث ثابت کس طرح ہوتی ہے؟ فرمایا میں اس بحث پر "جامع العلم" میں کافی لکھ چکا ہوں۔ میں نے عرض کیا کچھ یہاں بھی دہرا دیجئے، تو انھوں نے فرمایا کہ جب ثقہ، ثقہ سے روایت کرے رسول اللہ تک پہونچا دے تو وہ حدیث رسول ہے۔ پھر ہم کسی حدیث کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسری حدیث اس کی مخالف ہے، اور مخالفت کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم ناسخ پر عمل کریں گے اور منسوخ کو ترک کر دیں گے، اور اگر احادیث میں اختلاف ہو اور اس پر کوئی دلیل نہ ہو کہ کون ناسخ ہے اور کون منسوخ تو ہم دونوں روایتوں میں سے جو روایت سب کی زیادہ اثبت ہوگی اسے تسلیم کریں گے۔

امام صاحب نے اس موضوع پر اپنے اور خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، لیکن ان کا اس بحث سے زیادہ تعلق نہیں اس لئے انھیں ہم چھوڑتے ہیں، مذکورہ بالا اقوال میں امام صاحب نے قبول حدیث کا معیار روشن کر دیا ہے، اور یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر احادیث میں اختلاف ہو تو ہمیں کیا طریقہ

---

[1] کتاب الام، جزء سابع، صفحہ ۱۷۷۔

کا راختیار کرنا چاہیے۔ غرض کہنا یہی ہے کہ اگرچہ "شہادت درشہادت" چار بار نہیں لاکھ بار ہو لیکن اگر رواۃ ثابت ہوں، ثقہ ہوں، عدول ہوں، تو وہ بلا تامل و بلا تذبذب قبول کی جائیں گی۔ لیکن اگر حقیقۃً منکرین حدیث اس "شہادت، درشہادت، درشہادت" سے گھبراتے ہیں، تو ایک دوسری کتاب بھی ہے جس میں صرف "شہادت، درشہادت" ہے اور بس، یعنی موطا امام مالک۔ امام مالک تبع تابعی ہیں، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں، جو تابعی ہیں، اور وہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں، جو بلا ریب و شک عدول ہیں۔ امام مالک کی ثقاہت میں کسی کو شبہ ہی نہیں، اسی طرح زہری بھی غیر مشکوک ہیں، اور صحابہ پر زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی۔ غرض موطا کے جتنے بھی طرق ہیں وہ تین یا چار سے نہیں بڑھتے، اور وہ سرچشمۂ نبوت کے قطرے ہیں جن کی لطافت و پاکیزگی میں کون ہے جو شک کرے؟ موطا امام مالک کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اصح کتاب، بعد کتاب اللہ، موطا امام مالک ہی کو مانتے ہیں، پھر بخاری کو، پھر مسلم کو۔[۱] لیکن اس کا کیا علاج کہ منکرین موطا کو بھی نہیں مانتے، آخر فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ○" | اللہ اور اس کی ان نشانیوں کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟

چھٹا اعتراض نہایت سنگین اور بہت زبردست ہے۔

> "ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہو سکتی ہے؟ کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں، پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی لہٰذا حدیث کا سارا دارو مدار شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔"

آخر اس کے علاوہ اور میزان ہو کیا سکتی ہے۔ کہ ثقہ کو ثقہ، ثقہ کہے؛ لیکن اس کے اس قول کی بنیاد ظن اور تخمین پر نہیں، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ پر ہوتی ہے، اسے جب یقین ہو جاتا ہے کہ جس کی ثقاہت کی میں تصدیق و توثیق کر رہا ہوں وہ وہ ہے جس نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں کہا، دروغ بیانی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ، باب طبقات الحدیث۔

ے کام نہیں لیا، کذب و دجل اپنا پیشہ نہیں بنایا، اس کی ساری عمر حق پژوہی اور راست گوئی میں گزری
س کی زندگی کا ایک ایک صفحہ اس کی دیانت، راستبازی اور صداقت شعاری کا زبان حال سے ترجمان
ہے تب اس نے شہادت دی کہ ہاں یہ ثقہ ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ ثقہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا تو آخر اور
سیار صداقت ہے کیا؟ رہا یہ سوال کہ اب خود اس توثیق کرنے والے کی ثقاہت معرض بحث میں آتی ہے
تو اس کا جواب بھی وہی ہے تا آنکہ یہ سلسلہ صحابہ تک پہونچ جائے، جو سب کے سب عدول ہیں اور ان
سے رسول تک جس نے ان صحابہ کی توثیق کی، انھیں ستارہ بنایا کہ جو اس کی رہنمائی قبول کرے گا ہدایت
پائے گا، اس طرح یہاں آکر یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

لیکن

" رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں
صحابہ کرام کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف،
اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے، بحث کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس امر پر اپنی حیرت
کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے، حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے
' ومن اہل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمہم نحن نعلمہم ' مسلمان کہلاتے تھے اور رسول اللہ
تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا، نیز واقعہ افک میں جو لوگ شریک تھے، جن پر حد قذف
پڑی جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ' لا تقبلوا شہادۃً ابداً ' وہ بھی مسلمان کہے جاتے
تھے، علاوہ بریں ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا
' لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض ' دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں
میں پڑکر باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا، ان کو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت
کے پلہ میں ہموزن رکھ دیا جاتا ہے۔"

پہلے اس "فتنہ" کے مسئلہ کو صاف ہو جانا چاہیے، پھر عدالت صحابہ پر گفتگو ہوگی، صحابہ کی باہمی لڑائیاں
مثلاً حضرت علی اور حضرت عائشہ کی جنگ، درحقیقت کسی نفسانی جذبہ کے ماتحت نہیں تھیں بلکہ "حسن نیت"

کے ساتھ "غلط فہمی" کا نتیجہ تھیں، اور

الاعمال بالنیات	اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

س لئے ان بزرگان امت کی یہ اجتہادی غلطی نہ فتنہ تھی نہ "ایک دوسرے کا گلا کاٹنے" کے مرادف۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی حضرت عائشہ کا ہمیشہ احترام فرماتے رہے، کبھی آپ نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی، بلکہ ام المومنین، ام المومنین کہتے رہے، ورنہ اگر نفسانیت کی خاطر ہوتی، کسی مقصد نفس کے ماتحت ہوتی، تو دوسرے صحابہ اس میں کیوں آلودہ ہوتے، اور خود حضرت عائشہ جن کی برأت خود قرآن نے کی، اور حضرت علی جن کو رسالت پناہ نے بمنزلہ ہارون کے کہا، کیوں کر ایسی غلطی فرما سکتے تھے؟ کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا جو فتنہ و فساد میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا رسول اللہ اسے بمنزلہ ہارون علیہ السلام کہہ سکتے تھے جو جنگ و جدل کرے؟ نہیں، اور یقیناً نہیں۔ یہ صرف ان بزرگان امت کی اجتہادی غلطی تھی، جس کا بعد میں ہر ایک کو اعتراف بھی تھا، اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عائشہ کو، اور حضرت عائشہ نے حضرت علی کو کبھی برا بھلا نہیں کہا، بلکہ اپنے اپنے ذمے سے درگزر فرمایا۔ اور اگر اسے فتنہ تسلیم کر لیا جائے، تو (معاذاللہ) قرآن نے غلطی کی کہ برأت کی، اور (نعوذ باللہ) رسول اللہ نے بے جا کیا کہ حضرت علی کو بمنزلہ حضرت ہارون سمجھا۔ خدا ہم پر رحم کرے، ہماری لغزشوں کو معاف کرے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، قرآن کو تمام باتوں کا علم تھا، سرکار رسالت کی چشم بصیرت ہر چیز کا مطالعہ کر رہی تھی، قرآن نے جو کچھ کہا، سچ کہا، اور رسول نے جو کچھ فرمایا، صحیح فرمایا، والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ہم المتقون۔

اب صحابہ کی عدالت پر گفتگو آتی ہے، امت کا صحابہ کرام کی عدالت و ثقاہت پر جو اجماع ہے، اور ان کو نقد و بحث، اور جرح و تعدیل سے جو ماوراء تصور کیا جاتا ہے اس کی وجہ محض عقیدت مندی، نہیں ہے، بلکہ کچھ اور ہے۔ علامہ ابن حجر نے اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پیش نظر رہے۔

اتفق اہل السنۃ علی ان الجمیع عدول ولم یخالف فی ذلک الا شذوذ من المبتدعۃ وقد ذکر الخطیب	حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ عدول ہیں، اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ کی ایک مختصر سی ٹولی کے

فی الکفایۃ فصلہ تفصیل فی ذلک فقال عدالۃ الصحابۃ
ثابتۃ معلومۃ بتعدیل اللہ لہم واخبارہ عن طہارتہم واختیارہ
لہم فمن ذلک قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس،
وقولہ وکذالک جعلناکم امۃ وسطا وقولہ لقد رضی
اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم
ما فی قلوبہم وقولہ السابقون الاولون من المہاجرین
والانصار والذین اتبعوہم باحسان رضی اللہ عنہم و
رضوا عنہ وقولہ یا ایہا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک
من المومنین، وقولہ للفقراء والمہاجرین الذین
اخرجوا من دیارہم واموالہم یبتغون فضلا من اللہ
ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ہم
الصادقون الی قولہ انک رؤف الرحیم فی آیات
کثیرۃ یطول ذکرہا واحادیث کثیرۃ یکثر تعدادہا،
وجمیع ذلک یقتضی القطع بتعدیلہم ولا یحتاج احد منہم
مع تعدیل اللہ لہ الی تعدیل احد من الخلق علی انہ
لو لم یرد من اللہ ورسولہ فیہم شیٔ مما ذکرناہ لاوجبت
الحال التی کانوا علیہا من الہجرۃ والجہاد ونصرۃ
الاسلام وبذل المہج والاموال وقتل الآباء والاولاد
والمناصحۃ فی الدین، وقوۃ الایمان والیقین القطع
علی تعدیلہم والاعتقاد ولنزاہتہم وانہم افضل من
جمیع الخالفین بعدہم والمعدلین الذین یجیئون

خطیب نے "کفایہ" میں نہایت نفیس بحث اس موضوع پر کی
ہے وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت و ثقاہت تو خود خدا کی
تعدیل کے بموجب ہم مانتے ہیں مثلاً "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس"
اور "کذلک جعلناکم امۃ وسطا" اور "لقد رضی اللہ عن المومنین
اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبہم" اور "السابقون الاولون
من المہاجرین والانصار والذین اتبعوہم باحسان رضی اللہ عنہم
ورضوا عنہ" اور "یا ایہا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین"
اور "للفقراء والمہاجرین الذین اخرجوا من دیارہم واموالہم یبتغون
فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ہم
الصادقون"۔ غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ صحابہ
عادل ہیں ثقہ ہیں ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی
تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں، اور اگر
خدا اور رسول کی طرف سے یہ کچھ نہ وارد ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے
پھر بھی ان کے گراں قدر خدمت ہجرت، جہاد، اسلام کی مدد
جان کی قربانی، مال کی قربانی، آباء و اولاد کا قتل راہ اسلام
میں، مناصحۃ فی الدین، قوت ایمان، اور عزم و ثبات یہ سب اس
پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل ہیں اور وہ اپنے تمام مخالفین سے
اعلیٰ و افضل ہیں، اور ان معدلین سے بھی جو ان کے بعد ان پر
جرح کرنے پر آمادہ ہیں، یہی تمام علماء کا مسلک ہے۔ ابو زرعہ
رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے کسی
کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے، اور اس پر اپنا ایمان

من بعدهم - هذا مذهب كافة العلماء ومن يعتد بقوله
ثم روى بسنده الى ابي زرعة الرازي قال اذا
رأيت الرجل ينتقص احدا من اصحاب رسول الله
فاعلم انه زنديق وذلك ان الرسول حق والقرآن
حق وما جاء به حق وانما ادى الينا ذلك كله الصحابة
وهولاء يريدون ان يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب و
السنة والجرح بهم اولى وهم زنادقة - والاحاديث
الواردة في تفضيل الصحابة كثيرة من ادلها على المقصود
مارواه الترمذي وابن حبان في صحيحه من حديث
عبد الله بن مغفل قال قال رسول الله ﷺ الله الله
في اصحابي لا تتخذوهم غرضا فمن احبهم فبحبي احبهم
ومن ابغضهم فببغضي ابغضهم ومن اذاهم فقد اذاني
ومن اذاني فقد اذى الله ومن اذى الله فيوشك
ان ياخذه - قال عبد الله بن هاشم الطوسي حدثنا
وكيع قال سمعت سفيان يقول في قوله تعالى قل
الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى قال هم
اصحاب محمد ﷺ والاخبار في هذا كثيرة جدا فلنقتصر على
هذا القدر ففيه مقنع [1]

رکھو کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ وہ لایا برحق ہے اور
یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب و سنت کو
باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے،
وہ سب کے سب زنادقہ ہیں۔ اور صحابہ کی تفضیل میں احادیث
بھی بہت کثرت سے وارد ہیں مثلاً ترمذی اور ابن حبان نے
اپنی "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث ذکر کی ہے کہ میرے
اصحاب کو اپنے خرافات کی آ" نہ بناؤ" جو ان سے محبت کرتا ہے
وہ میری وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے، جو ان سے بغض رکھتا
ہے، وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے،
جس نے ان کو تکلیف پہونچائی اس نے مجھے تکلیف پہونچائی، اور
جس نے مجھے تکلیف پہونچائی اس نے اللہ کو اذیت دی، اور
جس نے اللہ کو اذیت دی تو اس سے بلاشبہ مواخذہ کیا جائیگا۔
عبداللہ ہاشم طوسی کہتے ہیں کہ مجھ سے وکیع نے کہا کہ میں نے
سفیان سے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "اے رسول کہدے کہ
ان بندوں پر سلامتی ہو جو پاک وصاف کئے گئے" تو کہا کہ وہ اصحاب
محمد ہیں، جن کو اللہ نے پاک وصاف کیا، اور اس جگہ وہی مراد
ہیں، اس موضوع پر اور احادیث بھی بہت زیادہ مروی ہیں،
لیکن اس جگہ اتنا کافی ہے۔

ابن حجر کی یہ بات بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ اگر قرآن و حدیث میں یہ کچھ نہ بھی وارد ہوتا تو بھی ان

---

[1] مقدمۃ الاصابہ فی تمییز الصحابہ صفحہ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵۔

کی عدالت وثقاہت غیر مشتبہ اور شک وشبہات سے پاک تھی اس لئے کہ جس جماعت نے ہجرت کے مصائب برداشت کئے ہوں وطن عزیز کو چھوڑا ہو' اعزا واقربا کو چھوڑا ہو' جہاد کیا ہو' اپنی جانیں قربان کی ہوں' اپنے مال راہ خدا میں لٹایا ہو' غرض طرح طرح کے آفات ومصائب کا مقابلہ کیا ہو اور یہ سب محض دین کے لئے کیا ہو تو ان کو اگر عادل نہیں مانئے گا تو کسے مانئے گا؟ بالتشبیہ یوں سمجھئے کہ مہاتما گاندھی جی کے جو حالات "نیشنلسٹ اور کانگرسی" حضرات کے سامنے ہیں ان کی بنا پر کون ہے جو انہیں غیر عادل قرار دے' اور اگر ایسا کرے تو یقیناً وہ نیشنلسٹ نہیں' کانگرسی نہیں۔ اسی طرح بلاتمثیل صحابہ کے حالات وواقعات کی موجودگی میں کون ہے جو ان پر زبان طعن دراز کرے اور اگر کرے تو وہ مسلمان نہیں' بقول ابن حجر کے زندیق ہے' اور پھر قرآن وحدیث کی توثیق مستزاد' نرا ظن نہیں بلکہ "آسمانی مہر" بھی ہے' اور پھر اس پر بھی نظر ڈالئے کہ صحابہ جب روایت کرتے تھے تو اپنی ذمہ داری کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے' اس لئے کہ ان کے سامنے یہ وعید بھی تھی کہ

من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار

مجھ پر جو دیدہ ودانستہ دروغ بیانی کرے اسے چاہیے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر وہ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور جب بیان کرتے تھے تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی غلطی نقل قول میں ہو جائے' وہ لرزنے لگتے تھے' کانپنے لگتے تھے' ان کی گھگھی بندھ جاتی تھی' مثلاً حضرت ابن مسعود صحابی جلیل القدر کا یہ واقعہ خاص طور سے غور طلب ہے کہ

عن ابی العیس عن مسلم البطین عن ابی عمرو الشیبانی قال کنت اجلس الی ابن مسعود فلا یقول' قال رسول اللہ' فاذا قال' قال رسول اللہ ' استقلتہ الرعدۃ وقال' ہکذا' او نحو ذا' او قریب من ذا' او' او [1]

عمرو بن الشیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعودؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا' وہ "قال رسول اللہ" کبھی نہیں کہتے تھے' اور جب "قال رسول اللہ" کہتے تھے تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے "اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریبا ایسا ہی فرمایا" یا ' یا ' یا '

---

[1] تذکرۃ الحفاظ' ذکر ابن مسعود الامام ربانی'

ڈر کا یہ عالم تھا' اپنی ذمہ داری کا یہ احساس تھا' رسول اکرم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی بلیکن کرتے کیا؟ امت تک رسول کا "اسوۂ حسنہ" بھی پیش کرنا ضروری تھا' اس لئے حدیث بیان کرتے تھے لیکن پورے حزم واحتیاط کے ساتھ۔ اب اگر اس کے بعد بھی ان کی عدالت وثقاہت غیر مشتبہ ہے تو مجھے نہیں معلوم دنیا میں ثقاہت اور عدالت کا معیار کیا ہے؟

اس جگہ ایک اور خیال کی تصحیح بھی ازبس ضروری ہے' کہ احادیث کی تدوین واشاعت' اور ضبط وکتابت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا' یہ سلسلہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا' چنانچہ طاہر جزائری کہتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ عصر صحابہ اور اوائل عہد تابعین میں سوائے قرآن کے اور کچھ ضبط کتابت میں نہیں آیا تھا' حالانکہ ثبوت اس کا بھی موجود ہے کہ کتابت کا کام خود عہد نبوی اور عصر صحابہ میں شروع ہو گیا تھا' چنانچہ زید بن ثابت نے "علم الفرائض" میں ایک کتاب تالیف کی تھی' اور بخاری نے اپنی "صحیح" میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابوہریرہ نے عبداللہ بن عمرو کو اپنے سے افضل بالحدیث اسلئے تسلیم کیا کہ وہ لکھ لیتے تھے[۱] ۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کتابت کا جو حکم ابوبکر بن حزم کو دیا تھا' وہ خود جلیل القدر تابعی تھے اور وہ صحابہ میں سے' سائب بن یزید' عباد بن تمیم اور عمر بن سلیم الزرقی اور عمرۃ اور خالدہ بنت انس سے حدیث روایت کرتے تھے' اور اس حکم کے بعد انہوں نے اسے لکھ لیا[۲]۔ اسی طرح زہری بھی جلیل القدر تابعی ہیں' انھوں نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث لکھی اور مدون کی۔ زہری صحابہ میں سے ابن عمر' سہل بن سعد' انس بن مالک' محمود بن الربیع' سعید بن المسیب اور امامۃ ابن سہل سے اور دیگر صحابہ اور کبار تابعین سے روایت کرتے ہیں' ان کے شاگردوں میں بھی بڑے بڑے اساطین علم وفضل نظر آتے ہیں مثلاً معمر' اوزاعی' لیث' مالک اور ابن ابی ذئب وغیرہ[۳]۔ غرض یہ معاملہ تو بالکل صاف ہے کہ حدیث کی اشاعت اور کتابت کا کام عہد نبوی میں کچھ کچھ' اور عہد صحابہ' اور عصر تابعین میں باقاعدہ شروع ہو گیا تھا' آگے چل کر ایک نہایت دردناک منظر پیش کیا ہے'

---

[۱] و [۲] و [۳] توجیہ النظر۔

جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ

"صحابہ کے بعد ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح و تعدیل کے سلخ میں لائے جاتے ہیں اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے، بہت سے خبیث، کذاب اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ محض ظن زری تخمین۔"

اگر منکرین حدیث اس جرح و تعدیل کے نتائج کو جو قانون شہادت کی سخت سے سخت شرائط کو پوری کرتے ہیں، محض ظن زری تخمین قرار دیتے ہیں تو پھر منکرین قرآن کی زبان کیسے بند کریں گے بشک جب بڑھتا ہے تو مرض بن جاتا ہے اور وہم کہلاتا ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔

ساتواں اعتراض اور زیادہ اہم ہے کہ قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے اور حدیث تفریق۔ منکرین حدیث سے گزارش یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو لیکن موجودہ زمانہ میں تو "اہل قرآن" برعکس معاملہ پیش کر رہے ہیں۔ اچھا خاصا سکون تھا، اطمینان تھا، سب لوگ حدیث کو مانتے چلے آرہے تھے اور دفعۃً ان ارشادات عالیہ نے تفریق پیدا کر دی ہے اور یہ بڑھتی جائے گی جب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ، وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ

شام میں آثار قدیمہ کے عجائب خانے

(حضرت علامہ محمد کرد علی وزیر تعلیمات و صدر مجمع علمی عربی شام نے دمشق کے آثار قدیمہ پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ ناظرین جامعہ کی دلچسپی کے لئے اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قدیم اشیاء کی موجودہ تمدن کو کیوں ضرورت ہے، نہایت معمولی چیز اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ کس قدر قیمتی ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں بھی قدیم اشیاء نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ کاش ہم اپنی ان چیزوں کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور ان کو ضائع ہونے سے بچا سکیں۔) (مترجم)

مغرب میں عجائب خانوں کی تنظیم و ترتیب جو آج کل موجود ہے وہ زیادہ تر انیسویں صدی کی پیداوار سمجھی جاتی ہے خصوصاً آثار قدیمہ کی تقسیم و تفریق اس زمانے میں جس اصول پر کی گئی ہے وہ واقعی قابل داد ہے۔ مشرق میں بھی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قدیم الایام سے اس طرف کچھ نہ کچھ توجہ تھی۔ ایتھنز[1] دار الحکومت یونان میں ایک نگار خانہ عرصۂ دراز سے تھا۔ اس میں قدیم چیزیں و تصاویر جمع کی گئی تھیں۔ روم کی بہترین چیزیں وہی ثابت ہوئیں جن کو اس نے یونانیوں سے لے کر اپنے عجائب خانوں میں رکھا تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں اس قسم کے عجائب خانے بنانے اور انہیں چیزیں رکھنے کا یورپ میں مذاق نہ تھا۔ البتہ ایسی نادر روزگار تاریخی چیزیں بادشاہوں کے محلوں، گرجوں میں یا یہود کے عبادت خانوں میں محفوظ تھیں۔ زمانۂ حال میں سب سے پہلے بڑے بڑے اٹلی کے مصوروں کو ایسے مکانات کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا کہ جہاں وہ اپنی تصاویر جو نادر زمانہ ہوں رکھ سکیں۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس طرح

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار بھی قدما کی تقلید میں یونان کا شمار مشرقی ممالک میں کرتے ہیں۔ (مدیر)

سے عجائب خانوں کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہروں میں عجائب خانے لوازم تمدن میں شمار ہونے لگے۔ بادشاہوں اور بڑے بڑے امرانے وہ بیش بہا اشیار جو انھوں نے تحفۃً یا قیمتاً حاصل کی تھیں انھیں دے دیں۔ نادر تصاویر، خطاطی کے بہترین نمونے، اسلحہ جنگ، زیورات و آلات موسیقی وغیرہ سب اس میں شامل تھے۔

عرب کے تہذیب و تمدن کے زمانے میں ہمیں تاریخ سے ایسے عجائب خانوں کا پتہ نہیں چلتا لیکن ان کی تہذیب و تمدن کے آثار ان عجائب خانوں کی جگہ ان کے بادشاہوں کے محلوں، ان کی جامع مسجدوں میں آج تک موجود ہیں خصوصاً جامع مسجد بنی امیہ کی یادگار دمشق میں بیت المقدس کی جامع مسجد اور قاہرہ و بغداد کی جامع مسجدیں ہیں۔

قصر حمرا و قصر زہرہ اندلس میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح خلفائے عباسیہ کے محلات بغداد میں، خلفائے فاطمیین کے قاہرہ میں عثمانیہ کے قسطنطنیہ میں اور شاہان ہند کے دہلی وغیرہ میں ہیں اور وہ اسی زمانہ کی تہذیب و تمدن کی یادگار ہیں۔ جس طرح آج کل امرا اور بادشاہ اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں فخر کرنے کے لئے ایسی عجائبات کا مجموعہ رکھنا پسند کرتے ہیں اسی طرح قدیم مشرقی امرا کو بھی اس کا شوق تھا۔ ان کے محلوں میں ان کی طبیعت کے اختلاف کے لحاظ سے اس قسم کی مختلف اشیار موجود رہتی تھیں چنانچہ ملک شام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس وقت تک یہاں ایسے مکانات موجود ہیں جن میں اس قسم کے رنگا رنگ نوادر جمع ہیں۔ چنانچہ چینی و کاشانی سامان، قدیم زمانے کے جنگی ہتھیار اور اوزار، سونے چاندی کے قدیم زیورات و ظروف باوجود مختلف حادثات کے جو اس ملک پر زمانۂ ماضی میں گذرتے رہے اب بھی موجود ہیں۔ جس طرح نادر کتب کا جمع کرنا قرطبہ کا خاصہ تھا اسی طرح نایاب اشیار ملک شام میں جمع ہوتی رہیں۔ اور اس میں دمشق کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ حلب میں بھی ایسے عجائبات موجود ہیں۔

قرون وسطیٰ میں فاتحوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی چیزیں خصوصاً زیورات وغیرہ لوٹ میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ تیمور لنگ بہت سی نادر چیزیں اور اس زمانے کی عجائب روزگار اشیار دمشق سے

لے گیا۔ سلطان سلیم فاتح مصر عثمانی بھی تیمور سے اس بارے میں کم نہیں رہا۔ بہترین اشیار جو وہ سے جا کا لے گیا۔ اور قسطنطنیہ کے محل ان سے آراستہ کئے گئے۔ بعض مورخین ذکر کرتے ہیں کہ اندلس کے عربی الاصل بادشاہ اپنے محلوں کو نہایت نفیس اور خوبصورت تصاویر اور مجسموں سے مزین کرتے تھے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ تصاویر اور مجسمے انسان کے بھی ہوتے تھے اور جانوروں کے بھی۔ جنگ صلیبی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی یورپی لوگ شامی ممالک کی اشیار اپنے مکانات اور گرجوں میں رکھنا اور اپنے محلات کو ان سے مزین کرنا باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اہل یورپ نے وہ تمام چیزیں جو قدیم لوگوں کی بہترین دستکاری کا اعلیٰ نمونہ اور ان کی تہذیب و تمدن ترقی کی تاریخی شہادت تھیں اپنے ملکوں میں پہنچا دیں اور وہاں کے عجائب خانوں میں داخل کر دیں۔ اس طرح انھوں نے مشرق کو خود اس کے اسلاف کے خزانوں سے محروم کر دیا۔ پتھر کے کتبے، تصاویر، اصنام، نادر علمی کتابیں، عہد حجری کی اشیار جو یمن و شام میں دستیاب ہو سکیں یہ سب آج پیرس و لندن و برلن کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔

ہمارے علمار آثار قدیمہ نے سفر کر کے خود ان مقامات کو دیکھا ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ کیا کیا سامان ہمارے ملک میں موجود تھا جس کو یورپ ہم سے لے گیا اور ہم غفلت میں سوتے رہے۔ ہم نے چپ چاپ یہ نقصان برداشت کر لیا اور احتجاج کی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جب یورپ و امریکہ کے رسالوں نے ان پر مضامین لکھے تب ہم کو معلوم ہوا کہ ہمارے پاس کیا دولت تھی جو ہم نے کھو دی۔ اب ہم باشندگان شام نے ان اشیار کی برآمد تو جہاں تک ہو سکا ہے بند کر دی ہے اور اس کی حفاظت کا خاص انتظام بھی کیا ہے۔ ہماری بے پروائی کی اب وہ حالت تو نہیں رہی جو زمانہ سلطنت عثمانیہ میں تھی کہ یہ یادگار چیزیں یہاں سے جا رہی تھیں اور ہم خوش تھے، یورپ اپنی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھ رہا تھا اور ہمیں ہوش تک نہ تھا کہ یہ کام ہمیں بھی کرنے کا ہے۔ تاہم ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں بھی بہت نقصان ہو چکنے کے بعد آخر میں حکومت کو ادھر توجہ ہو گئی تھی اور اس نے بعض بعض اشیار کی برآمد ممنوع قرار دیدی تھی۔ ترک خود وہ سامان جو صیدا و تدمر کے کھنڈروں وغیرہ سے

برآمد ہوا تھا ے گئے اور انھوں نے قسطنطنیہ کے عجائب خانے کو اس سے مزین کر دیا۔ مسجد اقصیٰ میں صخرہ کے بعض غاروں کو انگریزی علما ر آثار قدیمہ نے عجیب طرح کھودا اور نہیں معلوم کیا کیا نادر اور قیمتی اشیا ر یہاں سے مغرب کو منتقل ہو گئیں۔ علما ر آثار کی بہت جماعتوں نے ہمارے ملک میں کھنڈروں کے کھودنے اور سامان نکال نکال کر یورپ لے جانے کا مدت تک مستقل طور پر کام جاری رکھا۔ حکومت عثمانیہ نے اپنا ذاتی حق بھی ان سے نہیں لیا۔ جو مال خود ہم نے اور ہمارے بھائیوں نے ضائع کیا ہے اس پر کہاں تک رنج و الم کا اظہار کیا جائے۔ یہی غنیمت ہے کہ صلح کانفرنس منعقدہ پیرس میں ان نادر اشیا ر کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا جو جنگ عظیم کی حالت میں برلن و پیرس پہنچ گئی تھیں۔

ہم نے جنگ عمومی سے کچھ مدت قبل حکومت عثمانیہ کو بھی متوجہ کیا تھا کہ وہ دمشق میں ایک چھوٹا سا عجائب خانہ کھول کر نادر اشیا ر و آثار قدیمہ کی حفاظت کرے لیکن ارباب حکومت ترکی ہمیشہ یہی خیال پیش نظر رکھتے تھے کہ ہر طرح کی برتری و فوقیت شہر قسطنطنیہ کو حاصل رہے باقی تمام شہر اور قصبوں کی حالت تو آبادیات سے زائد نہ ہو۔ اس لئے ہماری تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔

جب ملک شام میں عربی نظام حکومت قائم ہوا تو اہل ملک کی رائے پر مدرسۂ عدلیہ میں جو قرون وسطیٰ کے عرب کی بہترین یادگار ہے ایک عجائب خانہ کھول دیا گیا۔ اس طرح ملک شام کا یہ پہلا عربی عجائب خانہ قائم ہوا۔ اس کے قائم کرنے والوں نے اس کا جدید نظام یورپی طرز پر رکھا ہے۔ اگر چند سال اسی حالت گذر گئے تو خدا تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس ملک کی نادر اشیا ر چار ہزار سال سے اس وقت تک کی اس عجائب خانے میں جمع کر دی جائیں گی۔ اور عربوں کی اعانت سے اس عربی عجائب خانے کی زندگی پائدار ہو جائے گی۔ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے تحائف و عجائبات تھے انھوں نے اسی خیال سے ان اشیار کو عجائب خانے میں منتقل کر کے بڑی فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عجائب خانہ اس ملک کی جدید تمدنی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ ہے اور یہ ثابت کر دے گا کہ ہمارے بزرگ اُس زمانے میں تہذیب و تمدن کے کس مرتبے پر پہنچے ہوئے تھے، زمانۂ حاضرہ کو ان سے کیا تعلق ہے، یہ دور کس طرح ان کا شاگرد ہوا اور اس نے اپنے استادوں سے کیا کیا باتیں سیکھیں اور کن کن امور میں کیا کیا

اختراع کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ قدما کے ذہن کو ان امور سے کہاں تک مناسبت تھی۔

یورپی حکومتیں گزشتہ صدی میں مسلسل اپنے وفود ملک شام میں کھدائی کے لئے بھیجتی رہی ہیں تاکہ نادر و قدیم اشیاء برآمد کرکے انھیں اپنے ملک کی زینت بنائیں۔ ان جماعتوں نے بہت سے کھنڈر کھود کھود کر بہت کچھ قدیم اشیاء برآمد کرلیں خصوصاً فرانس نے ۱۸۶۰ء میں جو جماعت اس غرض کے لئے شام میں اور انگلستان نے فلسطین میں بھیجی تھی انھوں نے بہت سامان برآمد کیا اور اپنے اپنے ملکوں کو لے گئیں۔ اس کامیابی کا اثر یورپ میں یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی کوشش اس بارہ میں دگنی چوگنی کردی۔ فرانس نے موسیو رنان، ڈلوک، موسیو دو سلسی، دو فوکوین، کلرمون گانو، دوسو و فانژان وغیرہ کی سرکردگی میں جماعتیں روانہ کیں۔ اس طرح انگلستان سے مسٹر اونیس مادن، سایس، ولیسن، فارین وغیرہ کی جماعتیں آئیں جرمنی نے تونیس کا وفد اور سوئستان والوں نے مارکس وان برشیم کو بھیجا۔ ان جماعتوں نے چوکیداری کا کام کیا۔ اس میں مخصوص مقامات حسب ذیل تھے:۔

تل نعمی، تل زکریا، تل صافی، تل جدیدہ، تل جزر، تل تعناک، تل مسلم، عکہ، یافا، قدس، صیدا، صور، جبیل، عمریت، جزیرہ ارواد اور بعلبک۔

ان کے علاوہ بہت سے مقامات شمالی شام کے بھی کھودے گئے تھے۔

یہ جماعتیں نہایت کوشش و جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف تھیں اور انھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اس وقت حکومت عثمانی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ کیا کچھ اس کی ملکیت سے خارج ہو ہو کر دوسروں کے قبضے میں جا رہا ہے۔ اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ یہ قیمتی تاریخی سامان شام میں رکھا جائے اور اس کے لئے کوئی مناسب جگہ مخصوص کی جائے۔ حکومت عثمانیہ کی نظر میں ان اشیاء کی وہ وقعت ہی نہ تھی جو یورپ کی سلطنتوں کی نظر میں تھی۔ اگر حکومت کو کبھی توجہ دلائی بھی گئی تو اس نے ہمیشہ یہی دلیل پیش کی کہ ایک ہی مرکز ایسا ہونا چاہئے جہاں یہ نوادر سب جمع ہوں تاکہ لوگوں کو اپنی ترقی کے زمانے کا اور ایک دوسرے کی حالت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو، اس لئے بہت سے عجائب خانے کھولنے کی جگہ صرف مرکز میں ایک بڑا عجائب خانہ

ہونا کافی ہے اور اپنی دلیل کو قوی کرنے کے لئے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یورپ کے ممالک کی اور علماء آثار کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن افسوس وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مختلف قومیں مختلف زمانوں میں مختلف قسم کی ترقی و تمدن کی مالک رہی ہیں، وہ آج سلطنت عثمانیہ کے ماتحت زندگی گزار رہی ہیں۔ ان سب کے مختلف زمانوں کے کاموں کو ایک جگہ جمع کرنا اور خود ان کے ملکوں کو اس سے محروم کر دینا کہاں تک مناسب تھا۔

بہرحال سلطنت عثمانیہ نے اس امر میں کچھ کیا بھی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کے لئے کیا۔ اور جب یورپ کے ممالک میں یہ نوادر پہنچیں اور ان کی اشاعت ہوئی تو اور لوگ بھی اس مال غنیمت کے حصول کے لئے دوڑے اور لوگوں نے تجارت کی غرض بھی شامل کر لی۔ یہ تجار اپنے اپنے ملکوں میں بڑے ذی اثر تھے۔ انھوں نے بہت کچھ ان امور میں کامیابی حاصل کی اور اپنے ملکوں کو خصوصاً اور دیگر یورپ کو عموماً ان نوادر سے مالامال کر دیا۔

ایک عیسائی یونیورسٹی امریکہ کی ان سب تجار پر فضیلت لے گئی۔ اس کو بیروت میں قیام اور اپنا کام جاری کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ اس نے اپنے کام کے ساتھ کھدائی کا اور نوادر نکالنے کا کام بھی جاری کر دیا۔ اس کے لائسنس میں اس کو یہ اختیار حکومت کی طرف سے حاصل تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فورڈ نے جبیل اور حلب و دیگر مقامات میں بہت کامیاب کھدائی کی اور بہت سے نوادر اس نے برآمد کئے۔ شامی ان اشیاء کی کوئی قدر و قیمت نہیں جانتے تھے اور اگر کوئی جانتا بھی تھا تو وہ کوئی پروا نہیں کرتا تھا، بلکہ لوگ بہت تھوڑے تھوڑے روپیہ کے عوض اپنی ذاتی و شخصی اشیاء و نوادر کو یورپ و امریکہ کے تجار کے ہاتھ فروخت کر رہے تھے یہاں تک رفتہ رفتہ ملک ان نوادر سے خالی ہو گیا۔

ان کھدائیوں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے آثار ہمارے پڑوسی ممالک کے مقابلہ میں مختلف رہے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ہر طرح یہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ شامی ہر معاملہ میں سادگی کے زیادہ دلدادہ تھے اور ان کی اصلی طبیعت اور ان کے معتقدات کی بناء پر یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ چنانچہ ان کے فلسفے، مذہب اور مصنوعات سے بھی اس کا پتہ ہمیں چلتا رہا ہے لیکن اس سادگی کے ساتھ انھوں نے خوبصورتی کا اضافہ کرکے اپنی صنائع کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

تاہم جو کچھ مل سکا اس سے شامیوں کے ذوقِ سلیم اور ان کی صنعتی سادگی و خوبصورتی کا پتہ چلتا ہے۔ بہ خلاف اہلِ مصر کے شامی اپنے مُردوں کے ساتھ نفیس سامان بہت کم رکھتے تھے جس کا ایک سبب یہ تھا کہ شام کی زمین مرطوب ہوتی ہے اور اس میں جو چیز دفن کی جائے وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تاہم وہ مختلف قسم کی سادہ چیزیں دفن کرتے تھے۔ بادشاہ رشمونزار کی قبر ایک مرتبہ کھل گئی تو اس میں سے صرف ایک کتبہ برآمد ہوا جو ایسے قبور کھودنے والوں ہی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا " قبر کھود کر میری توہین نہ کرو اس میں سونا چاندی کچھ نہیں ہے"۔ اس سے اہلِ شام کے خیالات کا اندازہ کافی ہو جائے گا کہ وہ مردوں کے ساتھ قیمتی زیورات دفن نہیں کرتے تھے۔ جب بادشاہوں کا یہ حال تھا تو رعایا کی قبروں میں تو اس کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت میں ان کی دانشمندی اور مضبوطیٔ عقیدہ کی دلیل ہے جو قدیم سے ان میں پائی جاتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مفکرین دانشمند لوگ قدیم سے بہت سی لغو و بیہودہ باتوں سے پرہیز کرتے تھے اور اپنی قوم و ملک کو لغویت سے بچایا کرتے تھے۔ شامیوں کا عقیدہ مثل دیگر سامی اقوام کے یہ تھا کہ جسم ایک مادی چیز ہے اور مرنے کے بعد اس کی عزت و احترام میں اتنے مبالغے کی ضرورت نہیں جتنا دیگر اقوام نے اپنے اپنے ممالک میں جاری کر رکھا ہے۔ باوجود ان امور کے بھی ہمیں بعض بعض قبروں میں اور بعض مقامات پر کچھ اشیاء ملی ہیں ان کے لئے ہمارے پاس یہی دلیل ہے کہ عموماً شامی اس سے پہلے اکثر تاریخی ادوار میں غیر ممالک کے زیر اثر ہی رہے ہیں، یہ ان کا اثر تھا۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سیاست کا اثر ان کے امور معاشرت میں بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

شامی عرصے سے ان اشیاء نوادر کی جن کو ہر سہ مذاہب یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں نے محفوظ رکھا تھا حفاظت کرتے رہے ہیں کیونکہ یہ ملک ان تینوں مذہبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے آثار شام کی عظمت بمقابلہ دیگر ممالک کے بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ نظام اجتماعی کے ساتھ ان آثار کو گہرا تعلق ہے۔ اسی سبب سے جمعیۃ الاقوام نے ان اشیاء کی حفاظت کے لئے خاص طور سے ایک دفعہ (۱۲۱) منظور کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشیاء کی کامل حفاظت کی جائے گی اور اس سلطنت کو جو شام کی نگران ہو یہ حق نہیں ہوگا کہ کھدائی کے وقت کسی ملک کے یا کسی قوم کے علماء آثار کو ان اشیاء سے محروم کر دے۔ اس

سے کل اقوام و مذاہب کے لئے اثری تحقیقات کا دروازہ کھل گیا۔

اس بنا پر ان اشیاء کی حفاظت کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس نے ایک جلسے میں یہ تجویز منظور کرلی کہ جملہ اشیاء کی حفاظت کی جائے۔ جو اشیاء نوادر سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اتحادی لے گئے تھے وہ واپس ہوئیں۔ افسران لشکر نے آثار شام پر خصوصیت سے توجہ مبذول کی یہاں تک کہ اپنے لشکروں میں جو آثار قدیمہ کے ماہر تھے ان پر شام کے آثار کی معلومات حاصل کرنا لازمی قرار دیا اور جو لوگ ان قدیم اشیاء کو خراب کرتے تھے ان کے خلاف سخت ہدایات نافذ کیں جن سے ان اشیاء کی کافی حفاظت ہوگئی۔ اسی سلسلہ میں بمقام مارسیلز اہل فرانس کی ایک انجمن ملک شام کے عام آثار پر بحث کرنے کے لئے منعقد ہوئی جس کی قراردادوں میں سے سب سے اہم یہ مطالبہ ہے کہ حکومت فرانس آثار قدیمہ کا ایک دفتر شام میں کھولے اور حکومت عثمانیہ نے جو اشیاء حاصل کرلی ہیں شام کے لئے ان کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ حکومت فرانس نے شام میں دفتر قائم کرایا اور انگلستان نے بھی فلسطین و شرق اردن میں آثار قدیمہ کا محکمہ کھول کر اس کی تقلید کی۔ امیر فیصل کے مختصر دور میں بھی اہل شام اس طرف متوجہ رہے اور انھوں نے امیر فیصل سے ان آثار کی حفاظت کے لئے عرض کیا۔ اس معروضہ کو ایک وفد نے جس کے صدر حفظ شام کے مؤلف تھے پیش کیا اور درخواست کی کہ دمشق میں ان اشیاء کی حفاظت کے لئے ایک عجائب خانہ کھولا جائے۔ یہ درخواست نہایت خوشی سے قبول فرمائی گئی اور صدر وفد ہی کو حکم ہوا کہ وہ ترتیب و تنظیم عجائب خانہ کا کام کریں چنانچہ فرانس کے زیر اثر شامی حکومت نے ایک عجائب خانہ حلب میں بھی کھول دیا۔ اس کے بعد حکومت لبنان، جبل دروز، علویوں کی حکومتوں نے بیروت سویدا اور طرطوس میں یکے بعد دیگرے عجائب خانے کھول دئے۔

حکومت فلسطین و شرق اردن نے بھی بیت المقدس میں اور عمان میں عجائب خانے بنوائے بہت تھوڑی مدت میں یہ عجائب خانے درست ہوگئے۔ کچھ سامان تو کھدائی کے ذریعے سے، کچھ ہدیوں کے طور پر اور کچھ لوگوں کے خریدنے اور کچھ حکومت کی امداد سے آیا۔ غرض اس طرح یہ کام مکمل ہوگیا۔

اب فرانس نے حسب ذیل مقامات پر کھدائی کا کام جاری کرنے کو چند مستقل جماعتیں بھیج دی ہیں

جنہوں نے صیدا وام العوامید، کفر الجرہ، بیروت، جبل القریہ، لبیا (حکومت لبنانیہ) اور سویدا، قنوات، شہبا، رجیل دروز، طرسوس (حکومت علوئین) تل النبی (قدش قدیمہ) مشرفہ (قطنا قدیمہ) نیرب، ارسلان طاش، وقصر احمر (ملک شام) میں کھدائی کا کام جاری کر رکھا ہے۔ دو جماعتیں مشترکہ طور پر کام کر رہی ہیں، انھوں نے قلعہ صالحیہ و تدمر کے اطراف میں دوراسا، اوبوس میں کھدائی شروع کی ہے۔ یہ مقام دریائے فرات کے کنارے پر ہے جہاں گیوسلوفیا نے بھی ایک وفد کھدائی کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے آثار شیخ سعد و تل ارفاد میں کام شروع کیا ہے۔ جرمنی نے راس العین میں حکومت سوریہ کے ماتحت شمالی شام کے علاقے میں اپنی ایک جماعت کے ذریعے کھدائی شروع کی ہے۔ انگریز و امریکہ اپنا دائرہ عمل صرف فلسطین شرق عربی تک ہی محدود کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تل متسلم (مجدو قدیمہ) بیسان و سبسطہ (سمرہ قدیمہ) سیشم و بیت جبرین و قدس شریف اور اس کے اطراف میں تالبہ و جرش میں کھدائی جاری کر رکھی ہے۔

دمشق کا عجائب خانہ آثار قدیمہ جو مختلف اشیاء کو مذکورہ بالا ذرائع سے حاصل کرکے ترتیب دیا گیا ہے اس میں مختلف تاریخی زمانوں کے مختلف نوادر جمع ہو چکے ہیں خصوصاً عہد اسلامی کے نوادر خاص طور سے جمع کئے گئے ہیں۔ دمشق ہی وہ شہر ہے جو امرائے حکومت کا دارالسلطنت رہا ہے اور اسلامی عرب کے تمدن کا گہوارہ تھا۔ دمشق ہی کو دیکھ کر ہم کو اسلامی عرب کی ابتدائی شان و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہاں اس عجائب خانے کا ہونا اور ایسی جگہ تمام نادرات کا جمع کرنا ضروری تھا۔ دمشق میں جو آثار قدیمہ جمع ہیں وہ دوسرے شامی عجائب خانوں سے مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دمشق پر بہ مقابلہ دوسرے بلاد شام کے اسلامی عہد میں حکومت کی توجہ زیادہ رہی ہے۔

اس عجائب خانے میں علاوہ قیمتی اشیائے قدیمہ کے مختلف اسلامی عہد کے سکہ جات بھی ہیں، اور مٹی اور چینی کے ٹوٹے ہوئے یا سالم برتن بھی موجود ہیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات مختلف خطوط میں جو دستیاب ہو سکیں اور بعض مخصوص کلام مجید بھی ہیں جن پر سونے اور چاندی کا کام ہے۔ بعض بعض تختیاں ہیں جن پر اس زمانے کی خطاطی کا بہترین نمونہ دکھایا گیا ہے۔ رومی زمانے کی تختیاں بھی

ہیں۔ ان رومی تختیوں پر بھی مسلمانوں نے اپنے زمانے میں عربی خطوط میں اپنے کمال ذوق و عقیدت سے آیات قرآنی لکھی ہیں۔ اس سے ان کی کمال خطاطی کا پتہ چلتا ہے۔ بعض بعض تختیاں صرف نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کس کس قسم کے نقش و نگار مروج تھے اور ان کے بنانے والے اپنے اس سامان سے جو ان کو اس وقت میسر تھا کیا کیا کمالات دکھایا کرتے تھے۔ خط کوفی جو اسی زمانے کی ایجاد ہے اس کے مخطوطے جو اپنے عہد بہ عہد کی ترقی و تغیر کی داستان ناظرین کو بتاتے ہیں نہایت خوشنما خط کوفی میں لکھے ہوئے ہیں۔ پرانے کتبے بھی ہیں۔ تابوت بھی ہیں جن پر نہایت نفیس نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔

ان تمام تختیوں اور مخطوطوں میں دو پتھر کی لوحیں ہیں جو سلجوقی اور ایوبی زمانے کی یادگار ہیں۔ ان پر جامع امویہ دمشق میں جو ترمیم ہوئی اس کا حال درج ہے۔ ایک پر ۵۷۵ھ کی اور دوسری میں ایوبی زمانے کی ترمیم و مرمت کا حال ہے جو ۵۸۵ھ میں ہوئی۔

ایسے کتبے جو زیادہ تر امرائے شام و علمار کی قبروں پر نصب تھے اور اب کھدائی کے سلسلے میں برآمد ہوئے بہت ہیں۔ یہ عموماً ساتویں اور آٹھویں صدی کے لوگوں کی قبروں کے سنگ مرمر کے تعویذ ہیں۔ ان کے آخر میں تاریخ ضرور ہوتی ہے۔ عربی خط کی ترقی اور ہر ہر عہد کے تغیرات کا ان سے کافی پتہ چلتا ہے۔

دوسرے درجے کی اشیا میں عربی آثار ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کے ہیں اور بعض مٹکے بھی ہیں جو پکائی ہوئی مٹی کے بنائے گئے ہیں اور ان پر انسان و حیوان و طیور وغیرہ کی تصاویر ہیں۔ ایسے ہی پتھر کے مٹکے بھی ہیں۔ یہ تیرھویں صدی عیسوی میں عراق میں تیار ہوتے تھے اور ان کی مثال کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی۔

اسلام سے پہلے کے آثار میں قابل ذکر اشیا زیادہ تر کانچ کے سامان پر مشتمل ہیں۔ اس زمانے کی دنیا کے سب ملکوں کی کانچ کی چیزیں اگر دیکھی جائیں تو شام کی مصنوعات ان سے بڑھی چڑھی نظر آتی ہیں خصوصاً جو سامان تدمیر کے کھنڈروں سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس وقت اپنا جواب

نہ رکھتا تھا۔ ایک کانچ کے بت کا صرف سر دستیاب ہو سکا ہے۔ وہ بت شام کے کسی بڑے آدمی کا سمجھا گیا ہے جس کا زمانہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل مسیح تھا۔ فرعونِ اول کے زمانے کے بت بھی ہیں۔ ان میں ان جنگوں کی تصویریں ہیں جن میں اس نے اہل شام سے انتقام لیا تھا۔ رومی اور یونانی زمانے کی بت تراشی و سنگ تراشی کے نمونے بھی ہیں۔

بیروت میں بھی ایک عجائب خانہ قدیم اشیا کا تیار ہو گیا ہے۔ اس میں زیادہ تر فنیقی قوم کے تمدن و تہذیب کے آثار ہیں جن میں بڑا حصہ برتنوں اور زیوروں کا ہے جو جبیل کی قبروں سے اور بعض ان کے معبدوں کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض اشیاء تو دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کی ہیں اور بعض اٹھارہ سو سال قبل مسیح کی ہیں۔ ایک لوح پر احیرام کے بادشاہ کی تصویر ہے جس کا سنہ ۱۳۰۰ قبل مسیح میں انتقال ہوا۔ اس کے دونوں طرف ان بادشاہوں کی تصویریں ہیں جو اس کے ماتحت تھے۔ وہ اپنے دینی رسوم ادا کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ خود یہ بادشاہ حبشیوں کے کندھوں پر کھڑا ہے۔ اس وقت تک جس قدر لوحیں دستیاب ہوئی ہیں ان سب سے زیادہ قدیم اور صاف یہی لوح ہے جس سے فنیقی اقوام کی قدیم ترین کتابت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مٹی کا برتن بھی ملا ہے جس پر فرعون آمنحعت ثالث کا نام لکھا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۰۵۰ یا ۱۰۰۰ قبل مسیح تھا۔ دو مٹی کے برتن اور ہیں ان پر آمنحعت رابع کا نام ہے۔ ایک پتھر کا برتن بھی مع سرپوش ہے جو نہایت خوبصورت اور کمال صنعت کا نمونہ ہے۔ اس پر (خدام معبود ابن شمس آمنحعت ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے) ہیروغلافی خط میں لکھا ہوا ہے۔ ایک چھوٹا سا سیاہ پتھر کا صندوق ہے جو زیورات رکھنے کے لیے مستعمل تھا۔ اس پر سونے کا کام ہے جو بہترین دستکاری کا نمونہ ہے۔

یہاں بہت سے مٹی کے برتن بھی جمع کئے گئے ہیں۔ کفر جرہ سے جو برتن نکالے گئے ہیں وہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہ دو ہزار سال قبل مسیح کے بنے ہوئے ہیں۔ جبیل سے جو سامان برآمد ہوا ہے وہ تاریخی یادگار کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم ہے۔

عجائب خانہ سویدا | سویدا جبل دروز کا دار السلطنت ہے۔ جبل دروز میں زیادہ تر پتھر کا بہت نفیس

سامان تھا۔ یہ سامان زیادہ تر یونانی و رومی زمانے کا تھا لیکن افسوس شامی ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔
طرسوس علاؤین کے دار السلطنت میں جو جدید عجائب خانہ ہے اس میں کوئی قابل ذکر نادر چیز نہیں ہے۔
حلب کے عجائب خانے میں بھی کوئی خاص چیز قابل ذکر نہیں ہے البتہ ارسلان طاش، تل الاحمر وتل ارفاد و نیرب سے جو سامان نکل رہا ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے۔

قدس شریف میں جو عجائب خانہ ہے اس میں زیادہ تر مٹی کے برتن اور بعض بعض معدنی اشیا ہیں۔ ان سے عہد بہ عہد کی ترقی اور ترمیم ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک پر جو تاریخی زمانے گزرے ہیں انھوں نے اپنے اپنے وقت میں کیا کیا اثر ڈالا ہے۔ ایک لوح یونانی رومی عہد کی یہاں بھی عجیب وغریب ہے جس میں یونانیوں اور جنگجو خواتین کا مقابلہ دکھایا گیا ہے۔ کچھ کوہ آتش فشاں کے پتھروں کی یادگاریں فرعون اول ورعمسیس ثالث کے زمانے کی بھی ہیں جو بیان میں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک انسانی کھوپری کا ٹکڑا بھی تابغہ میں ملا ہے جو زمانۂ تاریخ سے قبل کا قیاس کیا جاتا ہے۔
عمان کے عجائب خانے میں بھی کوئی چیز قابل ذکر نہیں ہے کچھ ہیں تو یونانی اور بیزنطی زمانے کی یادگار ہیں اور بس۔

اجنبی ممالک کے وفود نے جو سامان کھود کر برآمد کیا اور اس میں سے جو حصہ ہمیں دیا اس کا ہمیں اعتراف ہے اور جو خود کھود کر لے گئے اور ہمیں کچھ نہیں دیا اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ یہ اشیا زیادہ تر عہد اسلامی سے اول کی ہیں۔ عہد اسلامی کی اشیا زیادہ تر مدارس و مقابر میں محفوظ ہیں جو ہمارے محکمۂ اوقاف کے زیر نگرانی ہیں اور حکومت نگراں بھی ان پر دست تصرف دراز نہیں کر سکتی۔ عام مسلمان ابھی تک ان قدیم اشیا کی قیمت واہمیت نہیں جانتے ہیں اور ان کی وجہ سے بھی ہمیں نقصان پہنچتا رہا ہے۔ معمولی چیز سمجھ کر وہ ان نادرات تاریخی کو فروخت کر دیتے ہیں اور جب وہ ہمارے ملک سے جا کر دوسری جگہ بڑی قیمت حاصل کرتے ہیں اور اخبارات سے ہم کو معلوم ہوتا ہے تو ہمیں اس نقصان کا اندازہ اور افسوس ہوا کرتا ہے۔ ان کی آگاہی کے لئے ہمیں یہ اطلاع دینا ہے کہ وہ ان اشیا کی قیمت کو سمجھیں۔ اگر نا واقفی کا یہی حال رہا اور یہ نادرات اسی طرح نکلتی رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ ہمارا ملک ان اشیا سے خالی ہو جائے گا اور اغیار اپنے

خزانے ہمارے ہی نوادر سے پر کرلیں گے۔ ہمیں اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ جس طرح ملک مصر نے اپنی اشیاء نوادر کی حفاظت کی ہیں ہمیں بھی ان کی تقلید کرنا چاہیئے۔

جمہوریۂ فرانس نے ایک فرانسیسی کالج کھولا ہے جس میں آثار قدیمہ پر لکچر دئے جاتے ہیں خصوصاً اسلامی عہد کے آثار پر۔ قاہرہ کے فرانسیسی کالج کی طرح بیت المقدس میں بھی ایک کالج قائم ہوا ہے۔ یہ سب غیر ملکوں کے زیر اثر ہیں خصوصاً انگریزوں اور امریکیوں کے۔ بیت المقدس میں بھی حفاظتی تدابیر پر عمل ہو رہا ہے اور انگریز و امریکی دفود نوادر برآمد کرکے انھیں محفوظ رکھتے ہیں۔ انگلستان اور فرانس اپنے اپنے حلقۂ اثر میں کوشش کر رہے ہیں کہ قدیم نوادر فراہم کرکے محفوظ رکھیں اور اگر اجنبی ممالک کے قبضے میں ایسے نوادر پہنچ گئے ہوں تو واپس لئے جائیں۔ چنانچہ ان اغراض و مقاصد کے تحت میں اپریل ۱۹۲۶ء کو جمعیت الاقوام کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور اس جلسے کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ ان آثار کی بدولت اب ہم دیکھتے ہیں کہ سیاحوں کی زیادہ تعداد اس ملک میں آتی ہے اور ہم ان کے خیالات و آرا سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو عنقریب شام اپنا صحیح مرتبہ اقوام عالم میں حاصل کرلے گا اور وہی وقت ہماری حقیقی کامیابی کا ہوگا۔

دنیا کی رفتار

ادارت جامعہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر مہینہ ممالک عالم کے اہم واقعات پر ایک مختصر سا تبصرہ ان صفحات میں شائع کیا جائے۔ دو حصوں میں عالم اسلامی اور ہندوستان پر جدا جدا تبصرہ ہوا کرے گا اور ایک حصے میں بقیہ ممالک پر۔ افسوس ہے کہ اس بار ہندوستان کے متعلق حصہ شائع نہیں ہو سکا۔ آیندہ مہینے انشاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔

(الف) ممالک غیر

(۱)

اس سلسلے کے پہلے مضمون میں ملک وار تبصرے کی جگہ ہم اس بنیادی چیز کا تبصرہ ضروری سمجھتے ہیں جس کا اثر ساری دنیا کی سیاست پر پڑ رہا ہے یعنی اس معاشی تباہی کا جس میں دنیا مبتلا ہے اور جس کے اثرات کبھی ہندوستان کے کسانوں کی بے چینی اور یہاں کے تاجروں اور انتہا پسند ارباب سیاست کے اتحاد کی شکل میں رونما ہوتے ہیں کبھی جرمنی میں انقلاب کی سی شکل پیدا کر دیتے ہیں، ادھر امریکہ کو اپنے اس قصد مصمم سے ہٹاتے ہیں کہ وہ یورپ کے معاملات میں کوئی حصہ نہ لے گا، تو ادھر انگلستان میں تبدیل حکومت اور جدید انتخاب کی وجہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جولائی سنہ ۳۱ء سے دنیا میں جو معاشی انتشار رونما ہوا ہے وہ اپنے جماعتی اور سیاسی نتائج و عواقب کے اعتبار سے یقیناً اس انتشار سیاسی سے کم اہم نہیں جس میں دنیا جولائی سنہ ۱۴ء میں مبتلا ہوئی تھی۔

آخر اس معاشی انتشار کی وجہ کیا ہے؟ جواب ملتا ہے کہ تمام اجناس خام اور مصنوعات کی قیمتوں کا بہت زیادہ گر جانا۔ اس کی وجہ؟ اس کا تفصیلی جواب نہایت دشوار ہے لیکن اہم وجوہ تین ہیں: (۱) ضرورت سے زیادہ پیداوار اور اس کے باعث رسد کا طلب سے بڑھ جانا (۲) بین الاقوامی

تجارت میں سیاسی وجوہ سے رکاوٹیں پیدا ہونا اور اس لئے اضافۂ رسد کا تجارت میں اور بھی نہ کھپ سکنا۔

(۳) اسباب متعلق بہ زر۔ یعنی سونے کی غلط تقسیم کے سبب سے اکثر ممالک عالم میں زر اور اعتبار کی کمی اور اس کی وجہ سے زر کی قدر کا بڑھنا یعنی اجناس کی قیمتوں کا گھٹنا۔ ان تینوں اسباب کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)

جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے تقریباً ۱۹۲۵ء میں دنیا کے اکثر ممالک جنگ عظیم کے مضر اثرات سے پنپ چکے تھے۔ اور اس کے بعد سے برابر مقدار پیداوار میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف مغربی ممالک میں صنعتی پیداوار میں رفتہ رفتہ کتنا اضافہ ہوگیا تھا۔

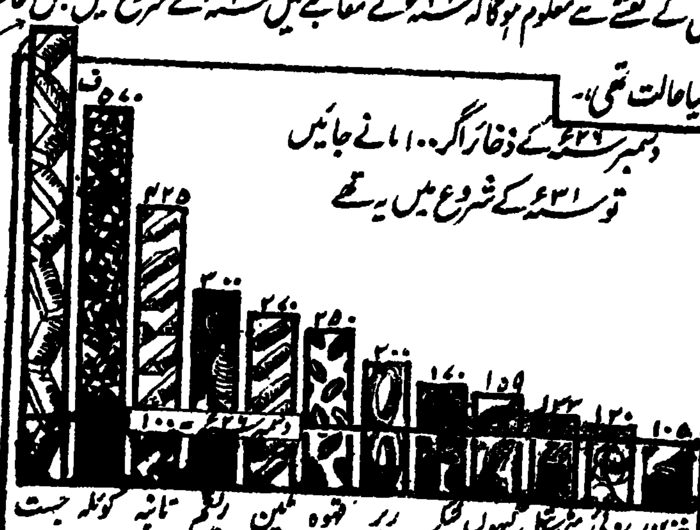
سال	برطانیہ (اگر ۱۹۲۴ء کی پیداوار کو ۱۰۰ تسلیم کیا جائے)	کنیڈا (اگر ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء کا اوسط ۱۰۰ مانا جائے)	ریاستہائے متحدہ امریکہ (اگر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک کا اوسط ۱۰۰ مانا جائے)	جرمنی (اگر ۱۹۲۸ء کی پیداوار ۱۰۰ مانی جائے)	فرانس (اگر ۱۹۱۳ء کی پیداوار ۱۰۰ مانی جائے)
۱۹۲۴ء	۱۰۰	۱۱۶	۹۵	۶۹	۱۰۸
۱۹۲۹ء	۱۱۲	۱۹۳	۱۱۸	۱۰۲	۱۳۹

اُدھر زراعت میں بھی کلوں کے استعمال اور نئے نئے ترقی یافتہ طریقوں کے رواج نے گیہوں، شکر، قہوہ وغیرہ کی پیداوار کو بازار کی مانگ سے کہیں بڑھا دیا تھا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک کے تین سال ہی میں کھانے کی چیزوں اور اجناس خام کی پیداوار میں ۸ فی صدی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک گیہوں ہی پر نظر کیجئے جس سے ہندوستان کے کسانوں کو بھی بڑا تعلق ہے۔ اگر خاص خاص گیہوں پیدا کرنے والے ممالک کے زرعی اعداد کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک گیہوں کی سالانہ پیداوار کی جو مقدار تھی اس کے مقابلے میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک کی اوسط سالانہ مقدار کوئی پچاس فی صدی زیادہ تھی۔ اور اس زمانے میں آبادی ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ اس کے علاوہ تبدیل مذاق کی وجہ سے برطانیہ اور امریکہ میں گیہوں بطور غذا کے بھی نسبتاً کم استعمال کیا جانے لگا تھا۔

اسی طرح مصنوعی ریشم کے عام رواج نے سوتی کپڑے کی مانگ میں معتدبہ کمی کردی تھی لیکن

روئی کی پیداوار بڑھ رہی تھی۔ یہی حال قہوہ، شکر، ربر، تانبہ، کوئلہ وغیرہ کا تھا۔ اس اضافہ رسد کے مقابلے میں طلب میں نہ تو یوں اضافہ ہوا کہ آبادی اسی تناسب سے بڑھی ہوتی اور نہ موجودہ آبادی کی قوت خرید ہی بڑھی۔ زراعت میں کلوں کے روز افزوں رواج نے آدمیوں کو زراعت سے ہٹا کر صنعت کی طرف بھیجا۔ لیکن ایسے وقت کہ صنعت میں خود کلوں کے ترقی پانے سے آدمیوں کی ضرورت کم ہوتی جاتی تھی۔ یعنی موجودہ آبادی کے لئے کمائی کے مواقع کچھ کم ہی ہوئے اور اس طرح ان کی قوت خرید میں کچھ تخفیف ہی ہوئی۔

غرض جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں اور اجناس خام کا تعلق ہے سنہ ۲۹ء ہی میں رسد و طلب میں اچھا خاصہ عدم توازن پیدا ہو چکا تھا۔ قیمتیں اسی وقت خوب گرتیں لیکن انھیں گرنے سے روکا گیا۔ ساری پیداوار کو منڈی بھیجنے کے بجائے باثر جماعتوں نے ان کے ذخیرے بڑھائے اور اس امید پر کہ آئندہ کوئی بہتر صورت حال پیدا ہو سکے گی رسد کو روک کر قیمتوں کو گرنے سے باز رکھا۔ لیکن یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ربر کے لئے اسٹی ونسن اسکیم (Stevenson Scheme) ناکام ہوئی۔ گیہوں کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے فیڈرل فارم بورڈ کی اسکیم (Federal Farm Board Scheme) اور بعد کی کئی کانفرنسیں ناکام رہیں۔ اور جب پتہ چلا کہ یہ تدابیر کارگر نہیں ہوتیں تو وہ تمام ذخائر جو اس زمانے میں برابر بڑھائے جا رہے تھے بازار میں لا ڈالے گئے اور قیمتیں یکایک نہایت تیزی سے گریں۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۲۶ء کے مقابلے میں سنہ ۳۱ء کے شروع میں بعض خام اجناس کے ذخائر کی کیا حالت تھی۔



(۲)

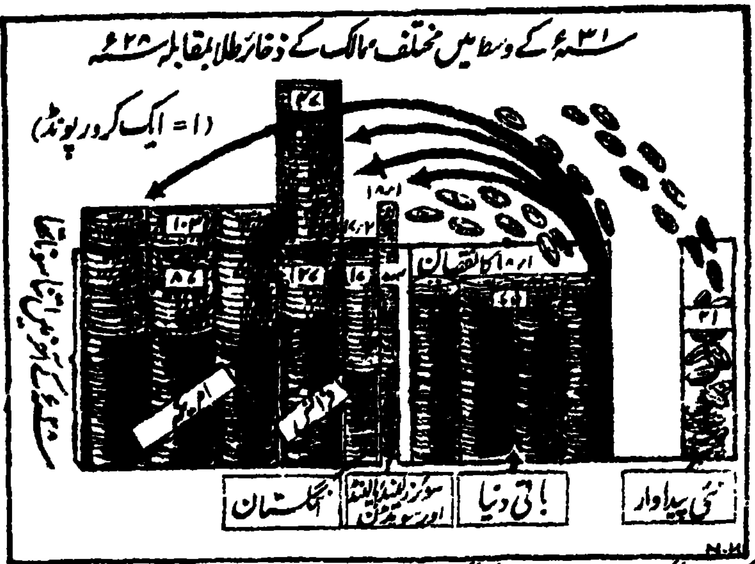
جنگ عظیم میں میکانکی ذرائع کے بکثرت استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی چیزیں جنگ کے بعد بھی امن کے اغراض کے لیے برابر مستعمل رہیں اور انھوں نے معاشی روابط میں سہولت کے نئے نئے وسائل پیدا کر دیے۔ لاسلکی، ہوائی جہاز، دور گو، ترقی یافتہ طباعت ان سب نے دنیا کو سمیٹ کر بہت چھوٹا بنا دیا اور کاروبار معاشی میں سرعت کے امکانات پیدا کر دیے۔ دنیا صحیح معنوں میں ایک جسم ہو گئی۔ کہیں ذرا سا توازن بگڑا اور کل جسم مبتلا ہو گیا۔

لیکن سیاست نے اس معاشی رجحان کا ساتھ نہ دیا۔ قوم پرستی کے جائز و ناجائز جوش نے سیکڑوں سیاسی دیواریں کھڑی کر دیں اور روابط معاشی کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ یورپ میں جنگ کے بعد جو متعدد نئی ریاستیں وجود میں آئی ہیں انھوں نے اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے دوسرے ممالک کے مال پر محصول بڑھائے اور ایسی صنعتوں تک کو محفوظ کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کی جو ویسے کبھی نہ پنپ سکتیں۔ کینیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا نے بھی یہی کیا۔ تاکہ اپنی مصنوعات کی منڈی تو خود اپنے لئے محفوظ کر لیں اور اپنی اجناس خام اسی طرح دنیا میں بھیجتے رہیں۔ یہی حال ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ہے۔ جنگ سے پہلے تو یہ ریاستیں یورپ کی مقروض تھیں اور قرض کا سود ادا کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ ان کے ملک کی برآمد ان کی درآمد سے زیادہ ہو۔ مگر جنگ کے بعد یہ قرض خواہ قوم ہو گئیں، لیکن پھر بھی ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک درآمد کے مقابلے میں ان کی برآمد اتنی ہی زیادہ تھی جتنی جنگ سے پہلے ۱۹۱۳ء میں۔ اور اس تفاوت میں ان قرضوں کے سود کی وصولیابی سے اور اضافہ ہی ہو رہا ہے جو امریکہ نے دوسرے ملکوں کو دے رکھے ہیں۔ خود برطانوی سلطنت کی برادری میں مختلف "بھائیوں" نے اپنی زراعت یا صنعت کو بڑھانے کے لئے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں تامینی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کینیڈا نے نیوزیلستان کے مکھن پر محصول لگایا تو نیوزیلستان نے کینیڈا کی موٹروں پر محصول لگا کر بدلہ لیا اور اب نہ نیوزیلستان کا ایک تولہ مکھن کینیڈا جاتا ہے نہ کینیڈا کی ایک موٹر نیوزیلستان پہنچتی ہے! فرانس اور جرمنی نے اپنے کسانوں کی خاطر زرعی پیداوار کی درآمد پر محصول

لگر اس ترقی یافتہ بازاروں کے زمانے میں یہ تماشا دکھایا کہ اپریل سنہ ۳۱ء میں جب دنیا کے کسان اپنے گیہوں تقریباً کسی دام نہیں بیچ سکتے تھے اور شکاگو میں گیہوں کے سو کیلو تین ڈالر میں ملتے تھے تو برلن کے لوگوں کو اسی مقدار کے لئے سات ڈالر اور پیرس میں ۴½ ڈالر دینے پڑ رہے تھے: اور لندن کے مقابلے میں برلن میں روٹی کی قیمت کوئی تگنی تھی! اور اس طرح باوجود دنیا میں گیہوں کی کثرت کے جرمنی اور فرانس میں ان زمینوں پر بھی گیہوں پیدا کئے جاتے رہے جو مصارف پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے معمولاً ہرگز اس قابل نہ سمجھی جاتیں۔ غرض ان رکاوٹوں نے کثرت پیداوار کے اثرات اور بھی بڑھا دئے۔ صنعتی برآمد والے ممالک کو پہنچنے سے روکا، غلہ اور اجناس خام پیدا کرنے والی قوموں کے مال کی مانگ کم کر دی، بین الاقوامی ادائگیوں کو مشکل بنا دیا اور اس طرح دنیا میں سرمایہ کی بدنظمی کو بڑھایا۔ اور اس بدنظمی نے قیمتوں کے گرانے میں بڑی مدد دی۔ اسکی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۳)

دنیا میں کاروبار کے فروغ کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب ملکوں کے پاس کام چلانے کے لئے یا تو خود اپنا روپیہ موجود ہو یا دوسروں سے قرض پر مل سکے۔ قوموں کو خود اپنے اندرونی کاروبار کے لئے نیز باہر والوں کو اعتبار پر کچھ دینے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ سونا ہو۔ جنگ کے بعد سے دنیا میں سونے کی تقسیم میں معتدبہ تغیرات پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۳ء میں دنیا کے تمام سونے کا ۶۳ فی صدی یورپ میں تھا۔ اور سنہ ۲۵ء میں ۳۵ فی صدی رہ گیا تھا! پہلے شمالی امریکہ میں ۲۴ فیصدی تھا اور بعد کو ۴۵ فی صدی۔ سنہ ۳۰ء میں دنیا کا ۷۰ فی صدی سونا صرف تین ملکوں کے قبضہ میں تھا یعنی برطانیہ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ان میں برطانیہ کے پاس کم تھا باقی دو کے پاس زیادہ۔ اُدھر امریکہ میں قیمتوں کے بڑھنے سے زر کا بازار چڑھا، سود کا نرخ بڑھا اور یورپ سے نفع کمانے کے لئے سونا امریکہ کو ڈھلنے لگا۔ اِدھر تاوان جنگ کی وصولی نے فرانس میں بھی سونے کے ذخائر کو برابر بڑھایا۔ اور اس طرح ان دو ملکوں میں دنیا کے سونے کا بڑا حصہ جمع ہو گیا۔



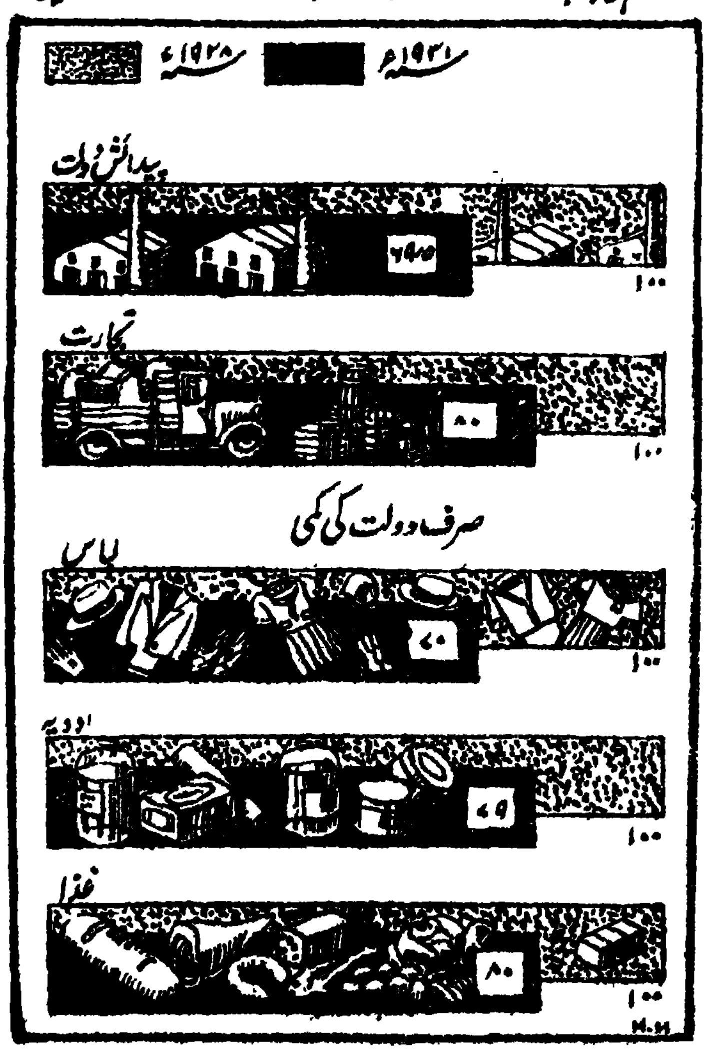
گہرے رنگ میں یہ مقدار ظاہر کی گئی ہے جو زر رائج کے سہارے کے لئے ضروری ہے۔ ہلکے رنگ میں وہ مقدار جو زائد از ضرورت ہے

سونے کی کمی کے باعث دوسرے ممالک اپنے زر اور اعتبار میں اضافہ نہ کر سکے۔ قاعدہ ہے کہ اگر زر کی مقدار کم ہو اور وہ ضروریات تجارت کی مناسبت سے نہ بڑھے تو اس کی قدر بڑھتی ہے یعنی اگر روپیہ کمیاب ہو جائے تو اس کے بدلے اجناس زیادہ ملنے لگتی ہیں یعنی قیمتیں گرتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر یہی صورت حال پیدا ہوئی۔

امریکہ اور جرمنی اگر اپنے عدیم المثال ذخائر طلا کی بنا پر دوسرے ضرورت مند ملکوں کو قرض دیتے رہتے تو کام چلتا۔ لیکن فرانس کو اپنے اس تمام سرمایہ کے ضائع ہونے کے بعد جو جنگ سے پہلے اس نے روس میں لگایا تھا باہر روپیہ لگانے کا زیادہ حوصلہ نہ تھا۔ امریکہ نے پہلے یورپ کو خوب قرض دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک یورپ نے امریکہ سے کوئی ایک ارب پونڈ قرض لئے۔ مگر خود ملک میں روپیہ کی مانگ بڑھنے سے امریکہ نے بھی باہر قرض دینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو جن ملکوں کی معاشی زندگی امریکہ کے قرض پر چل رہی تھی وہ سخت مشکل میں پڑ گئے۔ انھیں میں ایک جرمنی تھا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک جرمنی سالانہ کوئی ۸۰ کروڑ پاؤنڈ قرض لیتا تھا اور اس میں سے زیادہ تر امریکہ سے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں جرمنی کو اس کا چھٹا حصہ بھی قرض نہ مل سکا۔ جسم معاشی میں زرد

اعتبار بمنزلہ خون ہے، اس کی کمی ہوئی تو معاشی زندگی میں مرض کی کیفیت پیدا ہوئی، بیکاری بڑھنے لگی، مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ مارک کی تباہی کی سرگزشت لوگوں کو بھولی نہ تھی، لوگ گھبرا اُٹھے، بے اعتباری عام ہوگئی۔ جرمنوں نے کثرت سے اپنا روپیہ پردیس کے بنکوں میں بھیجدیا اور امریکہ و برطانیہ نے تھوڑے ہونے کے لیے جو رقمیں جرمنی میں لگا رکھی تھیں انھیں واپس لینا شروع کیا۔ اس سب پر مستزاد قیمتوں کی کمی، اس نے تو گویا جرمنی کا کام ہی تمام سا کر دیا۔ اس لئے کہ قیمتوں کے گرنے کے معنی ہیں زر کی قیمت کا بڑھنا۔ جس غریب گویا کو ۱۴ کروڑ پاؤنڈ سالانہ اپنے قرض کا سود ہی ادا کرنا پڑتا ہو اور کوئی ۸½ کروڑ پاؤنڈ تاوان جنگ اس کے لئے قیمتوں کا ذرا سا اتار قرض کے بوجھ کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے بالمقابل ۱۹۳۱ء میں جرمنی کی معاشی زندگی کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے



عام کساد بازاری میں جرمنی کے دیوالیہ ہونے کے اندیشے نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور اگر جمہوریہ امریکہ کے صدر ہوور نے اپنا وہ تاریخی اعلان نہ کر دیا ہوتا کہ ایک سال تک تمام سرکاری بین الاقوامی ادائگیاں ملتوی کر دی جائیں تو جرمنی کے دیوالہ کے ساتھ ساتھ دنیا کی معاشی زندگی کو ناقابل بیان صدمہ پہنچ جاتا۔

اس اعلان کی وجہ سے صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ سال رواں میں مندرجہ ذیل ممالک کو یافتنی رقمیں نہ ملیں گی:۔

١۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	٥ کروڑ پونڈ	٢۔ فرانس	ایک کروڑ ٦٠ لاکھ پونڈ
٣۔ برطانیہ	١ کروڑ پونڈ	٤۔ بلجیم	٣٠ لاکھ پونڈ
٥۔ اٹلی	٢٠ لاکھ پونڈ	٦۔ دیگر ممالک	٥٠ لاکھ پونڈ

کل ٨ کروڑ ٦٠ لاکھ پونڈ

اور مندرجہ ذیل ممالک کو دادنی رقمیں نہ ادا کرنی پڑیں گی:۔

١۔ جرمنی	٨ کروڑ پونڈ	٢۔ دوسرے تاوان ادا کرنیوالے ممالک	٢٠ لاکھ پونڈ
٣۔ برطانوی نوآبادیات	٤٠ لاکھ پونڈ		

کل ٨ کروڑ ٦٠ لاکھ پونڈ

... ...

پریسیڈنٹ ہوور کی اس تجویز سے جرمنی کو کم سے کم دم لینے کی مہلت ملی، اگرچہ کوئی ٣٥ لاکھ بیکاروں کی فوج اور سیاست میں انتہا پسند جماعتوں کی قوت میں ترقی مستقبل سے مطمئن ہونے کی امید نہیں دلاتی۔ اسی زمانے میں انگلستان میں نہایت اہم معاشی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں جن سے وہ اب تک دوچار ہے۔ ایک طرف جرمنی کی ناقابل اطمینان معاشی حالت نے دنیا میں جو بے اعتباری پیدا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ممالک کے لوگوں کا جو روپیہ لندن میں تھا وہ انھوں نے واپس منگانا شروع کیا اور ١٤ دن کے اندر اندر انگلستان سے کوئی تین کروڑ پونڈ کا سونا باہر چلا گیا۔ اور سونے کی

برآمد کو روکنے کے لئے انگلستان کو فرانس اور امریکہ سے ۵ کروڑ پونڈ کا قرضہ پیرس میں لینا پڑا اور مرکزی بنک کو مزید نوٹ چھاپنے کی اجازت لینی پڑی۔ جرمن انتشار کا یہ اثر انگلستان پر اس وجہ سے اور بھی پڑا کہ انگلستان کی مالی حالت بین الاقوامی حلقوں میں پہلے جیسے اعتماد کے ساتھ نہ دیکھی جاتی تھی۔

انگلستان کے اس سال کے میزانیہ میں کوئی پانچ کروڑ کا خسارہ تھا اور تخمینہ ہے کہ ۱۹۳۲ء کے میزانیہ میں کوئی بارہ کروڑ پونڈ کا خسارہ ہوگا۔ ملک میں بے کاری بڑھ رہی ہے اور کوئی پچیس لاکھ آدمی جو کام کرنا چاہتے ہیں بیکار ہیں جن میں سے ۱۰ لاکھ تقریباً دس سال سے بے کار ہیں! ان بے کاروں کی امداد میں حکومت کو تقریباً ۱۰ کروڑ پونڈ سالانہ صرف کرنا پڑتے ہیں۔ تجارت میں فروغ کی امید بہت کم ہے، اس لئے اجرتیں اور تنخواہیں تمام یوروپین ممالک سے زیادہ ہیں، ٹریڈ یونین اوقات کار میں اضافہ ہونے نہیں دیتے، بے کاروں کے لئے اچھے اچھے معاوضے مقرر ہیں، اُدھر قیمتیں جوں جوں گرتی ہیں، کارخانہ داروں پر سود ٹیکس وغیرہ کا دباؤ مفصلہ بالا اصول کی بنا پر بڑھتا ہے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک تھوک فروشی کی قیمتیں کوئی ۲۰ فی صدی اور خردہ فروشی میں ۱۲ فی صدی کم ہوئی ہیں لیکن اجرتوں میں مشکل سے دو فی صدی کی کمی ہوئی ہے، جس کا اثر صنعت پر برا پڑ رہا ہے۔ انگلستان کے مصارف پیدائش دولت دوسرے ملکوں سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ دنیا کی تجارت میں انگلستان کا حصہ گھٹ رہا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں دنیا کی تمام تجارت کا ۱۲٫۹۴ انگلستان کے ہاتھ میں تھا، ۱۹۲۹ء میں ۱۰٫۸۶۔ ۱۹۱۳ء میں انگلستان کے پاس دوسرے ممالک میں لگانے کے لئے ۱۸۱ ملین پونڈ فاضل تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ۱۲۸ ملین اور ۱۹۳۰ء میں صرف ۳۹ ملین۔

غرض دنیا میں انگلستان کی ساکھ پہلی سی نہیں رہی۔ صنعت کو فروغ دینے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ سیاسی وجوہ نے چین اور ہندوستان کی منڈیوں کو بگاڑ دیا ہے۔ مصارف پیداوار کی زیادتی کے باعث دوسرے حریفوں کا مقابلہ مشکل ہوگیا ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے انگلستان کے ارباب سیاست و معیشت ہر تدبیر کر رہے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے نیز اپنے سونے کو روکنے کے لئے انگلستان نے وہ کیا جو

صرف دوران جنگ میں کیا تھا یعنی اپنے زر رائج کو معیار طلا پر مبنی نہ رکھا یعنی حکومت اور سرکاری بنک پر یہ ذمہ داری نہیں رہی کہ وہ سونے اور زر رائج میں کوئی نسبت قائم رکھے، اپنے زر رائج کے اعتبار سے سونے کو ایک مقررہ و متعین قیمت پر بیچے۔ انگلستان نے اگر یہ فیصلہ اپنے میزانیہ کو درست کرنے سے پہلے کر دیا ہوتا تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوتا کہ انگریزی سکہ کی قیمت بہت گر تی۔ لیکن انھوں نے پہلے ایک متحدہ قومی حکومت بنا کر اور اس کے ہاتھوں اپنا میزانیہ درست کرا کر اپنی ساکھ کو درست کیا اور اس کے بعد یہ اعلان کیا۔ اس سے خراب نتائج رونما نہیں ہوئے۔ لیکن آئندہ سال اور اس کے بعد مالی حالت کو درست رکھنے کا مسئلہ اب بھی سخت تشویش کا باعث ہے اور اس کی اصلاح کی تدابیر پر سیاسی جماعتوں میں سخت اختلاف ہے جس کا حال آئندہ پرچے میں برطانوی انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا جائے گا۔

(ب) عالم اسلامی

کابل میں تبلیغ عیسائیت وسط ایشیا میں غالباً افغانستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کسی زمانے میں بھی تبلیغ عیسائیت کی اجازت نہیں دی گئی۔ ۸۰-۱۸۷۸ء میں جب لارڈ رابرٹس اور سر ڈونلڈ اسٹیورٹ نے قندھار پر حملہ کیا ہے تو بے شک آرک بشپ آلین اور فادر راٹگران کے ساتھ تھے لیکن ان لوگوں کا تعلق محض انگریزی فوج سے تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی پادری کا گزر اس سرزمین میں ہوا ہو۔ موجودہ زمانے میں یہ فخر صرف ایک امریکن پادری ریورنڈ جارج بے بلاٹر کو حاصل ہوا ہے جو ایک پیر ہفتاد سالہ ہیں مگر باوجود اس کے تبلیغ عیسائیت کا شوق اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ پادری صاحب جب اتنے بڑے سفر کا عزم کر چکے تو انھیں پاسپورٹ لینے کا خیال آیا لیکن اس کے لئے انھیں مسلسل اٹھارہ مہینے دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ بالآخر ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو شکاگو کا یہ پرجوش مبلغ جس نے سفیر افغانستان متعینہ روما کے سامنے اپنے آپ کو ایک دینی راہنما کی بجائے دو چار کتابوں کا مصنف ظاہر کیا تھا کابل پہنچا، مگر آتے ہی بیمار ہو گیا اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو با دل ناخواستہ اسے واپس جانا پڑا۔

تھوڑے دنوں کے بعد جب پادری صاحب کی صحت بحال ہو گئی تو انھوں نے اعلیٰحضرت شہریار غازی اور وزیر خارجہ حکومت افغانستان کے نام ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ انھیں دوبارہ کابل آنے کی اجازت دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جو کیتھولک عیسائی کسی نہ کسی وجہ سے افغانستان میں مقیم ہیں ان کی روحانی ذمہ داریوں کے لئے ان کا وجود بے حد ضروری ہے۔ اپنے خط میں انھوں نے حکومت کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ عیسائیت کی حمایت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالیں گے نہ کسی معاملے میں دخل دیں گے خواہ اس کا تعلق سیاست داخلی سے ہو یا خارجی سے بلکہ ایک اچھے اور نیک شہری کی طرح قانون کا پورا پورا احترام کریں گے۔ بایں ہمہ انھیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور "کیتھولک لیڈر" کو جو اس خبر کا راوی ہے حکومت افغانستان کی بے رخی سے شکوہ ہے کہ اس نے پادری صاحب موصوف کی معروضات پر غور کرنا تو درکنار ان کے مراسلے کی رسید تک نہ بھیجی۔ یہ امر کہ مسیحی مبلغین ہمیشہ مغربی شہنشاہیت کا آلہ کار بنے ہیں صحیح نہ ہو تب بھی محض ان پیچیدگیوں کو دیکھتے ہوئے جو گزشتہ دو ڈیڑھ صدی میں ان بزرگوں کے طفیل شرقی سیاسیات میں رونما ہوتی رہی ہیں حکومت افغانستان کا یہ فیصلہ نہایت مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ ایک فتنے کو چھیڑنے کی بجائے اس سے پہلو بچانا ہی بہتر ہے۔

مسلمانان ہند چینی میں مسیحی ریشہ دوانیاں | مسلمانان ہند کے لئے ڈاکٹر زویمر کا وجود محتاج تعارف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کس طرح حکومت مصر کے زیر سایہ اپنے تبلیغی پرچے کے ذریعے عالم اسلام پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی عنایت فرماتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں "مسلم ورلڈ" نے اپنی عنان توجہ اسلامیان ہند چینی کی طرف موڑی ہے جہاں "شام" نامی ایک قبیلہ ملک کے اس حصے میں جس پر فرانس کی حکومت ہے آباد ہے۔ ہند چینی میں اس قبیلے کے علاوہ اور بھی مسلمان ہیں۔ "مسلم ورلڈ" کے نزدیک ان لوگوں کو اسلام سے منحرف کر دینا کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں۔ اول تو قبیلۂ شام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی وہ لوگ جو انام میں بستے ہیں اور وہ جو کمبودیا میں آباد ہیں۔ پھر بتایا گیا ہے کہ کمبودیا کے شام اہل ملایا سے ربط و ضبط کی وجہ سے اگرچہ کسی قدر پکے مسلمان ہیں لیکن ان

کے مقابلے میں ان کے اثنا عشری بھائی بند مذہب میں بالکل کچے ہیں۔ "یہ لوگ شعائر اسلامی کے بالکل پابند نہیں۔ ان کے رسم و رواج مشرکانہ ہیں۔ انھیں اسلامی تعلیمات کا مطلق علم نہیں۔ چند مولوی ہیں جو خود بھی دین سے بے بہرہ کاہنوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں البتہ گاہے گاہے اگر کسی حاجی کا ادھر گزر ہو جائے تو اس سے ایک مذہبی روح پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس حصۂ ملک کے شام جاہل، غیر متمدن اور پست ہیں، رہنے کے لئے مکان تک نہیں بناتے لہذا لوگوں کے حج کو آنے جانے کے امکانات شاذ ہیں۔ حج ہی وہ سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے اسلام میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ اس کا امکان نہیں اس لئے یہیں سے تبلیغ عیسائیت کی ابتدا ہونی چاہئے تاکہ سب سے پہلے ان کچے مسلمانوں کو دین سے منحرف کر دیا جائے۔" کچے اور پکے مسلمانوں کا محافظ تو خیر اللہ میاں کے سوا اور کون ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے عیسائی مبلغین ان غیر متمدن لوگوں کی بجائے اپنے متمدن بھائیوں کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ اول تو کلیسا نے ایک خود ساختہ تاریخ، غلط منطق، بے معنی روایات، خیالی حکمت اور من گھڑت نفسیات کی بنا پر ایک ایسی دینیات تیار کی جس نے انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ لوگ عیسائیت کو مغربی تمدن اور مغربی ڈپلومیسی کا ایک ناگزیر جز سمجھ کر تبلیغ و دعوت کے لئے وہ ذرائع اختیار کر رہے ہیں جن سے تبدیل مذہب تو ممکن نہیں البتہ الحاد و بے دینی ضرور پھیل سکتی ہے۔ معلوم نہیں اس فریب نفس کا ان حضرات کو خود بھی علم ہے یا نہیں۔

ایران و روس کے نوسالہ تجارتی تعلقات اس سال فروری کے آخر میں مجلس نے ایک قانون کے ذریعے ایران کی کل خارجی تجارت کو حکومت کا اجارہ قرار دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل ایران شورایۂ روس کی تجارتی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ یہ صورت حالات کیوں پیش آئی اس کی اجمالی تاریخ یہ ہے۔

شمالی ایران کی تجارت تمامتر روس کے زیر اثر ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شمالی ایران کا سامان تجارت صرف روس ہی کے راستے باہر جا سکتا ہے۔ ایران کی شمالی سرحد کا طول تقریباً ۱۵۰۰

میل ہے جس کا ایک حصہ تو گویا وسطی سطح مرتفع کا وہ شمالی خطہ ہے جس کی بلندی تین ہزار سے پانچ ہزار فٹ تک ہے اور جہاں زراعت کے مواقع نہایت کم ہیں۔ اس علاقے کے سامان برآمد میں زیادہ تر قالین، کمبل، کپاس اور خشک پھل شامل ہیں۔ البتہ شمالی سرحد کا دوسرا حصہ جو گیلان اور مازندران کے صوبوں پر مشتمل ہے اور جس کی جغرافی حیثیت ایک تنگ مگر نہایت سرسبز اور شاداب ساحلی میدان کی سی ہے جو کوہستان البرز اور بحیرۂ خزر کے درمیان واقع ہے تجارتی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ یہاں سے چاول، مچھلی، تازہ اور خشک پھل اور ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی مصنوعات باہر بھیجی جاتی ہیں۔ ہونے کو تو یہاں لکڑی بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ دامن کوہسار ہر جگہ نباتات سے مالامال ہے لیکن چونکہ روس کو اس کی ضرورت نہیں اس لئے ایران ابھی تک اپنے جنگلات کے قیمتی ذخیرے سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ غالباً صرف اس ایک بات سے یہ امر بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ کس طرح روس کی جغرافی حیثیت ایران کی تجارت میں حائل ہو رہی ہے۔

ایرانی مصنوعات کا زائد حصہ صرف روس کے بازاروں میں بک سکتا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وسائل نقل وحمل کی قلت کی وجہ سے دوسرے ممالک کو چیزیں بھیجنے میں مصارف کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس سے ایرانی تجارت کو بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ ۲۹-۱۹۲۸ء کے درمیان ایران کے سامان برآمد کی قیمت ننانوے لاکھ پونڈ سے زیادہ تھی جس میں سے چونتیس لاکھ پونڈ سے زیادہ کا سامان صرف روس نے خریدا حالانکہ اس میں تیل کی وہ مقدار بھی شامل ہے جسے اینگلو پرشین آئل کمپنی نے باہر بھیجا تھا۔ مزید برآں بحر خزر کی دخانی کشتیوں کا انتظام بھی روس ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لہذا ایران کے لئے شمالی تجارت کا مسئلہ نہایت اہم ہو گیا ہے۔ ایران کے نقرئی سکے کی قیمت گر چکی ہے اور حکومت اس فکر میں ہے کہ ملک میں طلائی معیار قائم ہو جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایران کی تجارت برآمد میں اضافہ نہ ہو جائے کیونکہ اس سے مبادلے کو تقویت پہنچے گی۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں اس ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی جسے "ماورائے ایران" کے نام سے

موسوم کیا گیا ہے اور جو بحر خزر کے جنوب مشرقی گوشے سے شروع ہو کر خلیج فارس کے دہانے پر کہیں ختم ہو جائیگی۔ اس ریلوے کی تعمیر سے بھی حکومت کا مقصد یہی تھا کہ تجارت برآمد کے لئے روس کے علاوہ دوسرے بازاروں کی طرف توجہ کی جائے لیکن چونکہ یہ ریلوے لائن اس آمدنی سے تعمیر ہو گی جو حکومت ایران کو ہر سال مالگذاری سے حاصل ہوتی ہے لہذا ابھی اس کی تعمیر کو ایک مدت چاہیئے۔

ایران اور روس کے سیاسی اور تجارتی تعلقات کا باقاعدہ آغاز ۲۶ فروری ۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے جب عہد نامۂ ماسکو کی رو سے اعلان کیا گیا تھا کہ حکومت روس ان تمام قرضوں سے دست بردار ہوتی ہے جو زار کی طرف سے حکومت ایران کو دئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ چند اور مراعات کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا اور اہل ایران کا خیال تھا کہ دونوں ہمسایہ حکومتیں تجارت و ترقی کی راہ میں ایک دوسرے کی معین و مددگار ثابت ہوں گی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے شمالی سرحد کے محصول چنگی کا شاخسانہ پیدا ہوا جس کے متعلق حکومت روس کا اصرار تھا کہ اس کی شرح نہایت کم رہنی چاہیئے۔ پھر یہ قضیہ پیش آیا کہ بحر خزر کی شکارگاہوں کا جہاں سے مچھلیاں بہم پہنچتی ہیں انتظام کون کرے۔ ہنوز یہ معاملہ طے نہ ہوا تھا کہ ۱۹۲۵ء میں ایران میں غیر معمولی قحط پڑا اور حکومت مجبور ہو گئی کہ جہاں کہیں سے ممکن ہو سکے غلہ خریدے۔ اس سے شمالی تجارت کے لئے جو ناگوار نتائج مترتب ہوئے ان کے جواب میں روس نے پٹرول کی قیمت بڑھا دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی تیل کی پیداوار میں اضافہ کر دے۔

اسی زمانے میں شورائیہ روس کو اس امر کا اندازہ ہوا کہ ایشیائی سرحدوں کی تجارت میں اسے ½ ۵ لاکھ روبل کا نقصان ہوا ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے حکومت روس نے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایرانی روسی بینک نے ایرانی تجار کا روپیہ دینے سے انکار کر دیا اور یکم فروری ۱۹۲۶ء کو کپاس کے سوا تمام ایرانی درآمد پر بحری محصول عائد کر دیا جس سے ایرانی تجار کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

چونکہ ان واقعات کا اثر ایران کی اقتصادی حالت پر اچھا نہیں پڑ رہا تھا لہذا ۲۷ جولائی

جولائی ۱۹۲۶ء کو حکومت ایران نے ہز ہائینس مرزا ابوالحسن خاں تیمورتاش کو ماسکو میں سفیر خاص بنا کر بھیجا اور دونوں سلطنتوں کے درمیان مصالحت کی گفت و شنید شروع ہوگئی۔

ان مصالحانہ کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بحر خزر کی شکار گاہوں کو طہران کی ایک مشترکہ مجلس کے زیر انتظام کر دیا گیا جس کے تین رکن ایرانی تھے اور تین روسی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت روس نے اس مجلس کے احکام کی ہمیشہ خلاف ورزی کی ہے۔ ثانیاً دونوں حکومتوں نے طے کیا کہ وہ دو سال کے لئے ایک عارضی تجارتی معاہدہ قائم کریں جسے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مجلس نے منظور کیا۔ اس معاہدے کی رو سے قرار پایا کہ مملکت روس میں ایرانی درآمد کی مقدار ۵۰ ملین روبل سے زیادہ نہ ہو جس میں سے ۲۰ ملین روبل سامان خوراک اور باقی تیس ملین دوسری مصنوعات پر صرف کیا جائے۔ ایرانی تجار کو اجازت دی گئی کہ وہ اس مقدار سے نصف مال بہم پہنچائیں۔ باقی مال کی خرید روسی کارندوں کے سپرد ہوئی۔ یہ بھی طے پایا کہ ایرانی مصنوعات کے مبادلے میں حکومت روس ایرانی تجار کو ۹۰ فی صدی قیمت کے روسی مصنوعات اور ۱۰ فی صدی زر نقد ادا کرے گی جس کی شرح ایرانی روسی بینک مقرر کرے گا۔ علاوہ ازیں تمام مصنوعات کی (سوائے تیل اور دوا ایک چیزوں کے) قیمت حکومت روس ہی نے متعین کی۔ اسی اثناء میں تمام قوموں نے ایران کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ اسے محصولات تجارت کے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن چونکہ محصولات کی شرح نہایت کم رکھی گئی تھی لہذا اس کا فائدہ بھی زیادہ تر روس ہی کو پہنچا۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ بات آشکارا ہوگئی کہ یہ عارضی تجارتی معاہدہ ایران کے حق میں نہایت نقصان رساں ثابت ہوگا۔ کچھ اس وجہ سے کہ روس کا تمام سرمایہ حکومت کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اس لئے کہ شرح مبادلہ کا تعین سوویٹ بینک کے ہاتھ میں تھا لہذا روسی تجارتی کمپنیوں نے تمام ملک میں روسی مصنوعات کو پھیلا دیا یہاں تک کہ ان چیزوں کی تجارت بھی جو بآسانی ایران میں بک سکتی ہیں (مثلاً شکر، سوتی کپڑا وغیرہ) روسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور روسی حکومت نے ایرانی بازاروں کو اپنا فاضل اور ردی مال نکالنے کا ذریعہ بنا لیا۔ گویا بجائے اس کے کہ اس معاہدے کی رو سے دونوں قوموں کی تجارت مساوی درجہ اختیار کرتی مملکت روس نے صرف ۱۹۲۹ء میں ایران کی نسبت ۲۵ لاکھ پونڈ زیادہ کا مال بھیجا۔

اس کے ساتھ ہی سوویٹ حکومت نے ایران کے شاہی بینک سے اسٹرلنگ خریدنا شروع کر دیا لیکن چونکہ قران کی قیمت گر رہی تھی لہذا مجلس نے ۲۵ فروری ۱۹۳۰ء کو یہ طے کیا کہ آئندہ تمام مبادلہ حکومت کے ہاتھ میں رہے گا۔

اب صاف ظاہر تھا کہ ایران و روس کے تجارتی تعلقات کوئی خوشگوار صورت اختیار نہیں کر سکتے۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں عارضی معاہدے کی میعاد ختم ہو گئی جس پر تمام ایرانی تجار روس سے خارج البلد کر دئے گئے۔ اس کے جواب میں ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو ایرانی مجلس نے ایک نیا قانون منظور کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ایران تمام قوموں سے ساویانہ تجارتی تعلقات قائم کرے۔ ایرانی حکام چاہتے تھے کہ اس قانون کی آڑ میں تمام روسی تجار کو دولت ایران سے خارج کر دیا جائے لیکن حکومت روس نے یہ غدر پیش کیا کہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی رو سے ایران کو اس کا حق نہیں پہنچتا لہذا حکومت کو خاموشی کے ساتھ معاہدے کی یہ تعبیر تسلیم کرنا پڑی۔ بالآخر ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء کو اور پھر ۱۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو ایک ضمنی قانون کے ذریعے مجلس نے یہ طے کیا کہ آئندہ تمام خارجی تجارت کو حکومت کا اجارہ قرار دیا جائے۔ اب تمام درآمد و برآمد حکومت کے قبضے میں ہے جس کی مقدار اور شرح قیمت کا تعین حکومت ہی کی مرضی سے ہوگا۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا دولت ایران اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتی ہے کہ وہ روس کے معاشی تفوق سے آزاد ہو جائے۔ معلوم نہیں آگے چل کر واقعات کیا شکل اختیار کرتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ حکومت کی اجارہ داری کی وجہ سے بیرونی تجار کو کافی دقتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔

مسلمانان چین | جاؤسن صاحب ایڈیٹر یوا ایہ ہوا میگزین مسجد جامع تنگ ترنے پائی لاؤ، پییانگ چین سے مدیر رسالہ اسلامک ریویو کو لکھتے ہیں:۔

"چین اسلام کا بہت بڑا مرکز ہے۔ آپ کو ہر جگہ مسلمان اور مسجدیں نظر آئیں گی۔ اسلام کا تعلق چین سے بہت پرانا ہے۔"

"تقریباً سبھی چینی مسلمان مرفہ الحال ہیں۔ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو مدارس میں تعلیم دلواتے ہیں، کثرت سے اسلامی ابتدائی مکاتب قائم کئے گئے ہیں۔ ماہوار جرائد کی تعداد

میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے ۔ گزشتہ تیس برس سے مسلمانان چین خاص طور سے اس بات کے آرزومند ہیں کہ ان کے ملک میں اسلام کو فروغ ہو۔ اس غرض سے ایک انجمن بھی قائم کر دی گئی ہے جس کا نام "چنگ تا اسلامک نارمل اسکول" ہے۔ یہی مسلمانان چین شمالی کی مرکزی جمعیۃ ہے ۔ اس انجمن کے صدر مانگ تنگ صاحب ہیں جن کی عمر ابھی صرف تیس برس کی ہے مگر وہ اپنا بیشتر وقت اور روپیہ تبلیغ اسلام ہی میں صرف کرتے ہیں۔ ہمارے میگزین کو بھی ان سے کافی امداد مل رہی ہے۔ شنگھائی اور وان سین میں بھی اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں۔"

ہنگری میں شعائر اسلامی کا احیا | "۲۵۰ برس کے سکوت کے بعد بوداا دارالسلطنت ہنگری میں جو ۱۵۰ برس تک اسلام کا مرکز حکومت رہا ہے مؤذن کی صدائیں پھر بلند ہونگی۔ ۱۹۱۶ء کے ایک قانون کے مطابق جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی کا پورا پورا حق دیا گیا تھا گور بابا میں شعائر اسلامی ادا کئے گئے۔ جس پہاڑی پر یہ مزار بنا ہے وہ ابھی تک "کوہ گل" کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سال بھر گلاب کی بہار رہتی ہے جس کی بیلیں ایک چار دیواری کے اندر جس کے کناروں پر ترکی طرز تعمیر کے چار مینار قائم ہیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس موقع پر حجاز، عراق، قفقاز، مصر اور البانیہ کے مندوب بھی موجود تھے۔"

یہ الفاظ ہیں جن میں ہندوستان کے انگریزی اخباروں نے ہنگری میں شعائر اسلامی کے از سرنو احیا کی خبر دی ہے ۔ گور بابا کا اشارہ جناب گل بابا کے مزار کی طرف ہے جو ۱۵۴۱ء میں حصار بودا کے دوران میں سلیمان ثانی کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے (۲۹ ربیع الثانی ۹۴۸ھ ہجریہ مقدسہ)۔ گل بابا کا تعلق سلسلہ بکتاشیہ سے تھا اور جیسا کہ اوپر تذکرہ آچکا ہے ان کا مزار اب تک بوداپسٹ میں موجود ہے۔ یہ ایک ہشت پہلو عمارت ہے جس کے گنبد میں چوبی سفالے اور سیسے کے پترے استعمال کئے گئے ہیں۔ گنبد کی چوٹی پر ایک لالٹین لگا دی گئی ہے اور مزار کی دیواروں پر ہر طرف بیلیں چڑھی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

کتب:-

کلیات عزیز | مجموعہ کلام خواجہ عزیز مرحوم لکھنوی معہ مقدمہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ و تبصرہ ڈاکٹر سر محمد اقبال پی۔ایچ۔ڈی تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۵۱۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت فی نسخہ مجلد ؎، غیر مجلد ؎۔ ملنے کا پتہ منیجر صاحب نامی پریس لکھنؤ۔

خواجہ عزیز متوفی ۱۹۱۵ء فارسی شاعری کے آخری استاد تھے جن کے اوپر ہندوستان میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس ملک سے فارسی زبان اٹھ گئی ورنہ یہاں کے اہل سخن بیشتر اسی زبان میں اپنے کمال اور جوہر کو دکھاتے تھے۔ اب نہ کہنے والے رہے اور نہ سمجھنے والے الاماشاءاللہ۔

خواجہ صاحب کا مجموعہ کلام ان کے فرزند اور خلف الصدق خواجہ وصی الدین ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے کوشش کے ساتھ فراہم کرکے ترتیب دیا اور شائع کیا۔ درحقیقت انھوں نے نہ صرف اپنے مرحوم باپ کا بلکہ دنیائے ادب کا حق ادا کیا جس پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

خواجہ صاحب مرحوم کی استادی مسلم ہے۔ ان کا کلام اساتذۂ قدیم کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے بلکہ اس کا رنگ بھی وہی ہے۔ زبان میں کامل پختگی اور صفائی ہے۔ بیان کا انداز سنجیدہ اور ہموار ہے کہیں اپنے درجہ سے گرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور قصیدے بھی مثنویاں بھی ہیں اور قطعے بھی اور ہر صنف سخن میں ان کی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ ان کی ایک نعتیہ غزل کا یہ شعر نہایت مقبول ہوا

دہد حق عشق احمدؐ بندگان چیدۂ خود را بخاصاں شاہی بخشد مئے نوشیدۂ خود را

شیخ علی حزیں کا ایک مشہور مقطع ہے

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سر شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید ایں جا

اس پر خواجہ صاحب کی بھی غزل ہے اور اس کا مقطع بھی خوب ہے

جہاں شہریست مالامال از ہر جنس و ہر کالا — عزیزا ری توانی یوسفے باید خرید ایں جا

ایک شعر میں خواب زندگی کی تمثیل بیان کرتے ہیں

شبستانیست گیتی کاندرو خوابیدہ گویا — ہمہ شب تا سحر خواب پریشاں دیدہ گویا

انسانی فطرت کی واماندگی پر روتے ہیں

زیں چہ خیزد کہ نقاب از رخ او بردارند — چشم من مست خود آں پردہ کہ نتواں برخاست

دہن و میان کی بود بے نمود کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں

در حسن او دہان و میاں ایں دو چیز نیست — ویں حسن دیگر است کہ ہم ہست و نیز نیست

غالب اور نظیری کی اس بحر اور قافیہ میں غزلیں دیکھیے۔ خواجہ صاحب کا یہ شعر انکے کسی شعر سے فروتر نہ ہوگا

شب تار عاشقاں را نبود بشمع حاجت — کہ کنند خانہ روشن بہ جگر گداز کردن

کہیں کہیں لفظی رعایت بھی ہے مگر دلکش انداز میں

غیر از الم نخواند عزیز آیتے بعشق — زیں مصحف انتخاب الم ساخت

ہست نازم نہ نیاز یکہ زہند و صنماں — ہر کہ میکرد رم از سایہ من۔ رام افتاد

زحال عاشقانت چشم پوشی خوش نمی آید — وگرنہ چشم بد دور انچہ پوشی خوشنما باشد

قصائد بڑے بڑے ہیں اور استادوں کے قصیدوں کے دوش بدوش۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیہ بھوپال کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں بھوپال شہر کی تعریف میں لکھتے ہیں

بھوپال تال جامع ہر ناز و نعمت است — بھوپال جنت است اگر۔ تال کوثر است

ایک قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے جو قاآنی کے قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ شعرا کی مذہبی نوک جھونک بھی دلچسپ ہوتی ہے۔ قاآنی نے اپنا قصیدہ ان اشعار سے شروع کیا ہے

رسم عاشق نیست با یکدل دو دلبر داشتن — یا ز جاناں یا ز جاں بایست دل برداشتن

یا اسیر حکم جاناں باش یا در بند جاں — زشت باشد نو عروسے را دو شوہر داشتن

ان شعروں میں جو کنایہ ہے اسکی تصریح کر کے میں اسکی لطافت کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ خواجہ صاحب اسکے جواب میں لکھتے ہیں

نوعروساں را بیک آئینہ باشد کار و بس　　　مرد را زیباست چار آئینہ در برداشتن

خواجہ صاحب کے اس قصیدے کا مطلع بھی خوب ہے

کار ہر کس نیست بار عالمے برداشتن　　　درد سر بسیار دارد بر سر افسر داشتن

مثنویاں چار ہیں۔ ان میں سے بڑی مثنوی داستان روم و روس غازی عثمان پاشا شیر پلونا کی لڑائی کے متعلق بطرز سکندر نامہ لکھی ہے اور بہت کچھ اس کا انداز نباہا ہے۔

نظامی نے سکندر نامہ میں بادشاہ وقت کی مدح اس طرح شروع کی ہے

عَلَم بر کش اے آفتاب بلند　　　خراماں شو اے ابر مشکیں پرند

بنال اے دلِ رعد چوں کوس شاہ　　　بخند اے لب برق چوں صبح گاہ

ببار اے ہوا قطرۂ ناب را　　　بگیر اے صدف دُر کن ایں آب را

بیا اے در از قعر دریائے خویش　　　بتاجِ سر شاہ کن جائے خویش

شاعر کی نگاہ میں زمین و آسمان کی تمام حرکت اپنے ممدوح کے لئے نظر آتی ہے۔ اسلئے اسکے مداح ہونے کی حیثیت سے تحکمانہ لہجے میں خطاب کرتا ہے کہ اے آفتاب اپنی کرن ڈال، اے ابر چل، اے رعد گرج، اے بجلی چمک، اے ہوا پانی برسا، اے سیپ قطرہ کو موتی بنا، اے موتی سمندر سے باہر نکل اور تاج شاہی میں آکر جگہ لے۔

خواجہ صاحب اسی نہج پر ملکہ وکٹوریہ کی مدح شروع کرتے ہیں

بیا اے فلک تازہ کن خاک را　　　بر آر اے زمیں بر فلک تاک را

بدہ اے نوشاخ را توشۂ　　　سرا اے خوشہ بر کش ز ہر گوشۂ

بگیر اے کدیور ازاں خوشہ آب　　　بتاب آفتاب آب را کن شراب

بر آ اے شراب از تہ خم بجام　　　کہ باشد بکام شہنشہ مدام

حقیقت یہ ہے کہ وہ اس دور آخر میں اساتذۂ سلف کی یادگار تھے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

عزیزؔ ہرچہ بگوید بگوش ہوش شنو　　　کہ یادگار سخن پروران اسلافست

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ ہم حسب وعدہ اس مہینے میں ۹۶ صفحے کا پرچہ ٹھیک وقت پر شائع کر رہے ہیں انشاءاللہ آیندہ بھی یہ پابندی جاری رہے گی۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس نمبر میں "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے عالم اسلامی اور دوسرے بیرونی ممالک کے اہم واقعات پر مختصر تبصرے بھی دئے گئے ہیں۔ اگلے نمبر سے ان کے علاوہ ہندوستان کے متعلق بھی اسی قسم کا تبصرہ شائع ہوا کرے گا۔ یہ مضامین ایسے حضرات سے لکھوائے جاتے ہیں جو سیاسیات اور عمرانیات سے ذوق صحیح رکھتے ہیں اور ہندوستان و بیرون ہند کے بہترین روزناموں اور مجلّوں کا وقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم شذرات کے صفحوں میں اب صرف جامعہ ملیہ اور دوسرے علمی، تعلیمی اور اصلاحی اداروں اور تحریکوں پر نظر رکھیں گے۔ امید ہے کہ اس تقسیم عمل سے ہمیں اپنے اس مقصد میں زیادہ کامیابی ہوگی کہ قارئین کرام کے سامنے مفید علمی اور ادبی، تاریخی اور اصلاحی مضامین پیش کرنے کے علاوہ انھیں دنیا کے اہم واقعات کو غور و تنقید کی نظر سے دیکھنے کی دعوت بھی دیں۔ نظم اور افسانے کے حصے میں بھی ہم زیادہ لطف اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تنقید کتب کے متعلق یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر فن کی کتابوں پر ان حضرات سے تبصرہ کرایا جائے جو اس کے ماہر یا مبصر ہیں۔ اس غرض سے کچھ کتابیں دہلی کے باہر بھیجنی پڑتی ہیں اور خط و کتابت میں دیر لگتی ہے مگر "دیر آید درست آید" کی امید پر ہم اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ جو حضرات ہمیں ریویو کے لئے کتابیں بھیجتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ اگر ریویو شائع ہونے میں تعویق ہو تو ہمیں معذور سمجھیں۔

رسالے کے لئے بلند پایہ علمی مضامین حاصل ہونے کی ایک نئی صورت نکلی ہے۔ اردو اکادمی یہ انتظام کر رہی ہے کہ ہندوستان کے ان ارباب علم سے جو اردو لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں ہر سال سات آٹھ خطبے اپنے ماہوار جلسوں میں پڑھوائے۔ اُمید ہے کہ آیندہ مہینے سے یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جلسوں میں پڑھے جانے کے بعد یہ خطبے دو تین قسطوں میں رسالہ جامعہ میں شائع ہوا کریں گے۔ اس طرح ہر نمبر کے لئے دو ایک محققانہ مضامین ہمیشہ مہیا رہا کریں گے۔

ان اصلاحوں کے بعد انشاء اللہ رسالے کی قدر اہل نظر کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی لیکن رسالے کا اس حالت پر قائم رہنا اور مزید ترقی کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس کی اشاعت بڑھے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم اردو اکادمی کے ایک رکن انتظامی کو مختلف مقامات پر دورہ کرنے کے لئے روانہ کرنے والے ہیں کہ رسالے کے نئے خریدار اور اکادمی کے نئے ممبر بنائیں۔ رسالے کے پرانے خریداروں سے خصوصاً اکادمی کے پرانے ممبروں سے درخواست ہے کہ ہمارے نمائندے کو اس کام میں جتنی مدد دے سکتے ہوں اس میں دریغ نہ کریں۔ اس نوازش سے نہ صرف اردو اکادمی بلکہ جامعہ ملیہ بھی زیر بار احسان ہوگی۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں افسانہ نویسی کے مقابلے کا جو اعلان کیا تھا اس کی طرف ہم اہل قلم کو پھر توجہ دلاتے ہیں۔ انعام خصوصاً اتنی کم رقم کا انعام کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لئے عمدہ لکھنے والے زحمت تحریر گوارا کریں۔ لیکن ان کی قلمی امداد سے اردو ادب کی جو خدمت ہوگی وہ خود بڑا بیش بہا انعام ہے۔

اردو اکادمی کی طرف سے جو مشاعرہ یوم تاسیس کے موقع پر منعقد ہونے والا ہے اس کا وقت ۲۹ اکتوبر ۹ بجے تا ۱۲ بجے شب مقرر کیا گیا ہے۔ لاہور سے حضرت حفیظ جالندھری، کانپور سے حضرت حسرت، الہ آباد سے حضرت اصغر گونڈوی، لکھنؤ سے حضرت صفی، حضرت ثاقب اور حضرت ظریف تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت فانی اور حضرت مانی کو بھی دعوت دی گئی ہے اور امید ہے کہ وہ قبول فرمائیں گے۔ دہلی کے چند کہنہ مشق شعرا بھی مدعو کئے گئے ہیں۔

انشاء اللہ ہم آیندہ نمبر میں یوم تاسیس کی خصوصاً مشاعرے کی مفصل روداد شائع کریں گے۔

امیر نے یہ سب سن کر وزراء سے کہا کہ میں تو اس کو قتل کر چکا۔ پھر اس کے حکم سے ابو الصباح کا سر نکالا گیا اور منادی نے چلا کر اس کے لشکر والوں سے کہا کہ "ابو الصباح قتل کر دیا گیا۔ جو جانا چاہے امن و آزادی کے ساتھ اپنے شہر میں چلا جائے" یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے اور کوئی فساد نہ ہوا۔

فاطمی کی بغاوت | اس کے بعد فاطمی نے سرکشی کی اور چار سال تک مسلسل امیر سے لڑتا رہا۔ فاطمی کا نام شقین بن عبدالواحد المکناسی ہے اور اس کی ماں کا نام فاطمہ۔ فاطمی بجدانی قبیلے کا تھا جو کتابت یعنی خوشنویسی میں مشہور ہے۔ اس نے اپنے فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے سالم ابو زغنل عامل ماردہ پر ایک رات حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا اور تورریہ کے اطراف پر غلبہ کر کے چاروں طرف لوٹ مار مچا دی اور اس پر امیر خود روانہ ہوا۔ اُسے غزوات الدور کہتے ہیں فاطمی امیر کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور جنگلوں کی طرف بھاگ گیا۔ امیر نے شہر میں داخل ہو کر باغیوں کا تمام سامان تباہ و برباد کر ڈالا اور جن لوگوں پر کچھ نہ کچھ جرم ثابت تھا ان میں کسی کو بغیر سزا دئے نہ چھوڑا۔ امیر نے یہ سب کارروائی لوگوں کو عبرت دلانے کیلئے کی۔

حیوہ ابن ملاس کا فتنہ | اس اثنا میں امیر کے پاس بدر کا خط قرطبہ سے آیا، جہاں وہ امیر کا قائم مقام تھا، اس خط میں لکھا تھا کہ "حیوہ ابن ملاس نے اشبیلیہ میں حمص والوں کے ساتھ مل کر سر اٹھایا ہے۔ یہ حیوہ حضرمی قبیلہ کا ہے اور اس کی اعانت میں اس کے ساتھ عبدالغافر یحصبی بھی ہے۔"

جس وقت امیر کو یہ خط ملا، امیر کے ساتھ اشبیلیہ کے لشکر میں طلب کلبی ابن خشخاش اور اس کا بیٹا بھی تھے۔ یہ خط پڑھ کر امیر مسارہ میں جا اترے اور اشبیلیہ کے لوگوں میں سے تیس شخص گرفتار رکئے، (ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں) اور ان کو قید رکھنے کا حکم دیا۔ یہ سب قرطبہ بھیج دئے گئے۔ پھر امیر دشمنوں کی طرف بڑھے اور وہ بھی پیشقدمی کرتے ہوئے میسر تک آپہنچے۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لئے خندق کھود لئے تھے۔ جب امیر ان کے مقابل پہنچے تو جنگ چھڑ گئی اور ایک مدت تک جاری رہی۔ ان لوگوں کے ساتھ مغربی بربری بھی تھے۔ امیر نے ان بربریوں سے خط و کتابت کرنے کے لئے بنی میمون کو ہدایت کی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ بربریوں کو امیر کی نیک خیالی کا یقین دلا دیں۔ اس کے بعد امیر نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنے غلاموں اور جدید اسیران جنگ

کو بیچنا شروع کر دیا۔

یہ تدبیر کامیاب رہی، لوگ خوف زدہ ہو کر امیر کی طرف متوجہ ہونے لگے اور ان کے دیوان خانے میں ایک جماعت اظہار اطاعت کے لئے حاضر ہوگئی۔ اس جماعت کے سامنے ہی امیر نے اپنی فوج کو احکام جنگ سنائے۔

جن بربریوں سے بنی میمون خط و کتابت کر رہے تھے انھوں نے وعدہ کیا کہ جب خندق اور حصار بے کار ہو جائیں گے اور جنگ نہایت زور پر ہوگی اس وقت ہم اپنے گروہ کے ساتھ شکست کھا جائینگے مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز عین گرمی جنگ میں بربریوں نے اپنے وعدہ کا ایفا کیا اور امیر کے مخالفوں کو شکست فاش ہوئی۔ فوج غنیم کا کوئی بربری قتل سے باقی بچا نہ کوئی عرب، سب بری طرح مارے گئے۔ علاء کے ہمراہیوں میں جتنے قتل ہوئے تھے اس سے زیادہ حبشی اس جنگ میں قتل ہوئے۔ یحوة بھی قتل ہوگیا، عبدالغافر سکندر کے راستے سے فرار ہو کر مشرق جا پہونچا۔ اس کے بعد امیر نے بدر کو لکھا کہ "جو تیس آدمی تمہارے پاس قید ہیں انھیں قتل کر دیا جائے" اس حکم کی تعمیل ہوئی۔

اسی زمانے میں امیر نے بزیع الحارث ابن بزیع القاتل کو خریدا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ جب امیر نے اس کی شجاعت کے بعض واقعات خود ملاحظہ کئے تو اس سے دریافت کیا "تم غلام ہو یا آزاد؟" اور اس نے جواب میں اپنے آپ کو غلام بیان کیا تو امیر نے اسے خرید کر حبشیوں کا چودھری بنا دیا۔ لیکن اس زمانے کی چودھرات کو اس زمانے[1] کی چودھرات پر قیاس نہ کرنا چاہئے بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ حبشیوں کی ایک علیحدہ فوج مقرر کر کے بزیع کو اس کا افسر بنا دیا تھا۔ ایسی ہی چودھرات امیر الحکم نے بھی جاری کر رکھی تھی۔ پہلے صرف دو گروہ ہوا کرتے تھے سوار یا پیدل اور شتر سوار عبدالحمید ابن غانم کے ماتحت تھے جو پیدل فوج کا افسر تھا۔ پیدل اور سوار کی کوئی امتیازی وردی نہ تھی جیسی اب ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانے ہی میں چودھرات کا مفہوم تبدیل ہو چکا تھا۔

اسی سال امیر بربر فاطمی کے تعاقب میں چلا مگر فاطمی جنگلوں میں بہت دور بھاگ کر قصر ابعض سے آگے بڑھ چکا تھا اس لئے اسے واپس آنا پڑا۔

یحییٰ ابن یزید و عبید اللہ ابن ابان کی بغاوت

پھر یحییٰ ابن یزید ابن ہشام جس کو الیزیدی بھی کہتے ہیں اور عبید اللہ ابن ابان ابن معاویہ بن ہشام ابن عبد الملک باغی ہو گئے اور ابن دیوان الحیشانی و ابن یزید ابن یحییٰ التجیبی اور ابن ابی عزیب نے ان کی اعانت کی۔ جب یہ لوگ متفق ہو کر امیر کے خلاف کھڑے ہوئے تو عبید اللہ کا ایک غلام رات کو فصیل سے لٹک کر شہر میں اتر آیا۔ یہ غلام مسلمان تھا تھا اور بدر سے ملنے کے لئے قصر کے ارادہ سے نکلا تھا۔ جب بدر سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس بغاوت کا حال کہدیا۔ اس وقت امیر وادی شوش میں تفریح و شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ امیر کو وہیں یہ حالات معلوم ہوئے اور بدر نے بھی ڈاک کے ذریعے سے اطلاع دی۔ اس بنا پر امیر نے فوراً سماعہ کو بلایا جو سوار ول کا افسر تھا اور اسے حکم دیا کہ تم جتنے آدمی میسر آسکیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور عبید اللہ ابن ابان کو گرفتار کرو۔ عبد الحمید بن غانم پیدل فوج کے افسر کو بلا کر یحییٰ ابن یزید کی گرفتاری کا حکم دیا۔ ان دونوں افسروں نے اپنی اپنی جگہ پہنچ کر حکم کے مطابق ان لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اس اثناء میں امیر رصافہ پہنچ گئے اور عبد اللہ و یحییٰ وغیرہ کو قید رکھنے کا حکم دے کر باقی لوگوں کے لئے فوج روانہ کی۔ جب سب گرفتار ہو گئے تو امیر کے حکم سے سب قتل کر دئے گئے اور ان کی لاشیں رصافہ سے قلعہ قرطبہ تک گھسیٹی گئیں۔

عبد الرحمٰن ابن حبیب کی یورش اور انجام

پھر عبد الرحمٰن بن حبیب فہری جو سقلابی کے نام سے بھی مشہور ہے امیر سے تدمیر میں ایک سال تک لڑتا رہا۔ سقلابی نے سلیمان اعرابی کلبی سے جو ان دنوں برشلونہ میں تھا اعانت کے لئے مراسلت کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ سقلابی نے خفا ہو کر خود سلیمان سے لڑائی چھیڑ دی مگر سلیمان نے اس کو شکست دے دی اور سقلابی تدمیر کو واپس ہو گیا۔ یہ موقع دیکھ کر امیر سقلابی کی طرف بڑھا اور تدمیر کو تباہ و برباد کر دیا۔

ابھی اس مہم کا مختتم فیصلہ نہ ہوا تھا کہ برانس کا ایک شخص مشکان[1] نامی اریط والوں میں سے سقلابی کے

---

[1] مشکان۔ یہ نام اصل کتاب میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔

پاس آیا اور اس کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ اس نے اتنی خیر خواہی ظاہر کی کہ سقلابی کو اس پر پورا اعتماد ہوگیا اور سقلابی کے دل میں اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ ایک دن محان نے دھوکا دے کر اس کو قتل کر ڈالا اور سقلابی کے سواروں کو اپنے ساتھ لے کر امیر کے پاس جا پہونچا۔

فاطمی کا خاتمہ | اس کے بعد امیر نے تمام اور ابو عثمان کو ایک لشکر دیکر فاطمی کی مہم پر بھیجا جو ان دنوں ایک قلعے میں تھا۔ ان دونوں نے وجیہہ غسانی کو سفیر بنا کر فاطمی کے پاس بھیجا۔ وجیہہ ابو عثمان کا بھانجا تھا۔ فاطمی نے وجیہہ کو بہکا کر اپنی طرف کرنا چاہا۔ وجیہہ اس کے کہنے میں آکر وہیں ٹھہر گیا اور پھر تمام اور ابو عثمان اپنے لشکر کے ساتھ فاطمی کی طرف بڑھے۔ فاطمی بھی میدان میں اترا اور دونوں لشکروں میں خوب جنگ ہوئی۔ مگر فتح فاطمی کو ہوئی۔ امیر کا لشکر پسپا ہوا اور فاطمی شنتبریہ کی طرف بڑھا اور ایک موضع میں جس کو قریۃ العیون کہتے ہیں جا اترا۔ یہاں ابو حسن داؤد ابن ہلال اور کنانہ بن سعید الاسود نے دھوکا دے کر فاطمی کو قتل کر ڈالا۔ وجیہہ غسانی بھاگ کر ساحل البیرہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اس کے لئے امیر نے شہید و عبدوس ابن ابی عثمان کو مقرر کیا جو عین عید کے دن اس کے پاس پہونچے اور فریب دے کر یہ ظاہر کیا کہ ہم دونوں تمہارے پاس پناہ لینے آئے ہیں اور ایک موقع پر دھوکے میں حملہ کرکے وجیہہ کو قتل کر ڈالا۔

جس وقت امیر نے شہید و عبدوس کو وجیہہ کی طرف روانہ کیا تھا اسی وقت بدر کو ابراہیم ابن شجرہ بربری مروانی کی طرف بھیجا تھا اور جس دن شہید و عبدوس نے وجیہہ کو پہونچ کر قتل کیا عین اسی دن بدر بھی ابراہیم کے پاس پہونچا۔ چونکہ ابراہیم ایک بہادر شخص تھا اس لئے مقابلہ کے وقت دونوں میں سخت جنگ ہوئی اور بڑی دشواری کے بعد بدر اسے قتل کر سکا۔

سلمی کی بغاوت | اس کے بعد سلمی نے امیر پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ امیر کے یہاں سلمی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ایک رات کو سلمی نشے میں بیہوش ہو کر شہر کی طرف چلا۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ اس نے چاہا کہ باب القنطرہ یعنی پل والے دروازے کو کھولے مگر چوکیدار مانع آئے۔ یہ دیکھ کر اس نے چوکیداروں پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ اس کی خبر العبدی کو ہوگئی۔ العبدی نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ رات امن و سکون سے گزر جانے دی۔ جب سلمی کا نشہ اترا اور اس نے اپنی حرکت پر غور کیا تو امیر

کے خوف سے مشرق کی طرف بھاگا اور ایک قلعے میں حفاظت کی غرض سے پناہ لی۔ امیر نے اُس کے پیچھے حبیب بن عبدالملک قرشی کو روانہ کیا۔ حبیب نے اسے مقابلے کے لئے بلایا۔ سلمی نے نکل کر سرمیدان مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ شخصی تھا اور اس میں سلمی کا حریف مغیث کا ایک غلام تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر پوری قوت سے حملہ کیا اور دونوں ایک دوسرے کے حملے سے ختم ہو گئے۔

رماحس والی الجزیرہ کی سرکشی | اس کے بعد رماحس بن عبدالعزیز کنانی والی الجزیرہ نے بغاوت کی۔ اس نے دوشنبہ کے روز لشکر تیار کیا اور جمعہ کے دن امیر کو خبر ملی۔ شنبے کے روز امیر اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ رماحس کو خبر تک نہ ہوئی اور نسخ بیعت سے دس روز کے اندر اندر یعنی بدھ کے دن امیر کا لشکر آ گیا۔ اس وقت رماحس حمام میں ہڑتال لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دفعتہً اطلاع ہوئی تو ہڑتال پونچھ کر اپنے اہل وعیال کے ہمراہ جہاز میں سوار ہو کر فرار ہوا اور ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ کے پاس پہونچا۔

سلیمان اعرابی کی بغاوت | اب سلیمان اعرابی نے سرقسطہ پر حملہ کیا۔ اس حملے میں اس کے ساتھ حسین ابن یحیٰی انصاری بھی تھے جو حضرت سعد بن عبادہ صحابی کی اولاد سے ہیں۔ امیر نے ثعلبہ ابن عبد کو مع لشکر سلیمان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ ثعلبہ اہل شہر سے مقابلہ کرتا رہا جو سلیمان کے طرفدار ہو گئے تھے۔ چند روز کی جنگ کے بعد سلیمان نے لشکر سے آرام کی مہلت مانگی۔ لوگوں نے اس سے یہ خیال کیا کہ لڑائی بند ہو گئی اور شہر کے دروازے بند کر کے آرام سے بیٹھ رہے۔ اب سلیمان اعرابی نے خفیہ طور پر اپنا سوار لشکر تیار کر کے ثعلبہ ابن عبد پر ایک دم حملہ کر دیا اور ثعلبہ کو اس کے ڈیرے ہی میں جا لیا اور گرفتار کر کے قید کر دیا۔ ثعلبہ کے لشکر کو شکست ہوئی اور سلیمان نے ثعلبہ کو شاہ قارلہ کے پاس بھیجدیا۔

شاہ قارلہ کا حملہ | ثعلبہ جب بحالت قید شاہ قارلہ کے یہاں پہونچا تو قارلہ نے اپنے خیال میں اس بغاوت کے واقعے کو امیر کے ضعف پر محمول کیا اور اپنے دل میں فتح سرقسطہ کی امید باندھ کر حملے کی نیت سے سرقسطہ کی سمت بڑھا اور وہاں پہنچ کر جنگ شروع کر دی۔ لیکن اہل شہر نے اس کے خلاف سختی سے مدافعت کی اور اسے اتنا عاجز کر دیا کہ وہ سرقسطہ چھوڑ کر اپنی جگہ واپس آنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد امیر خود سرقسطہ کی جانب جنگ کے ارادے سے روانہ ہوا۔ جب وہ فج ابی طویل

سے آگے بڑھا تو اثنائے راہ میں حفص بن میمون اور غالب ابن تمام کے درمیان مفاخرت پر جھگڑا ہو گیا۔ حفص نے جان بوجھ کر اہل عرب پر اپنی فضیلت کا ادعا کیا جسے غالب ابن تمام برداشت نہ کر سکا اور اُس نے حفص کو تلوار سے قتل کر دیا۔ امیر نے ان کے جھگڑے پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی اور سفر جاری رکھا۔ جب شتنبہ پر پہنچے تو امیر نے چھتیس آدمی گرفتار کئے۔ ان میں ایک ہلال بلی تھا جس کا لڑکا داؤد جو فاطمی کے قتل میں شریک تھا مر چکا تھا۔ یہ سب قیدی قرطبہ بھیج دیئے گئے اور وہاں کسی گھر میں قید کر دیئے گئے۔ اس وقت سے وہ گھر قید خانے کے نام سے مشہور رہے۔ پھر امیر آگے بڑھے۔ امیر کے سرقسطہ پہنچنے سے پہلے حسین بن یحییٰ انصاری، سلیمان اعرابی کو جمعے کے دن کہ مسجد جامع میں قتل کرا چکا تھا۔ اب جو امیر سرقسطہ پہنچے تو ان کا مقابل صرف حسین ہی تھا۔

سلمان اعرابی کا بیٹا عیسوں اربونہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جب اسے امیر کے سرقسطہ آنے کی خبر ملی تو وہ بھی سرقسطہ کی طرف بڑھا اور دریا کے اس پار ٹھہر گیا۔ ایک دن عیسوں نے دیکھا کہ جس شخص نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا وہ شہر سے نکل کر وادی کے کنارے کنارے جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے فوراً اپنا گھوڑا مہمیز کیا اور پاس پہنچ کر اپنے باپ کے قاتل کو مار ڈالا اور اپنے گروہ میں آکر شامل ہو گیا۔ اس جگہ کو اب تک مخاضۃ العیسوں کہتے ہیں۔ امیر نے یہ واقعہ سن کر خواہش کی کہ عیسوں ہمارے لشکر میں شامل ہو جائے چنانچہ عیسوں نے امیر کی خواہش کا احترام کیا اور سرقسطہ میں امیر کی طرف سے ان کے دشمنوں سے لڑتا رہا۔ جب اہل شہر محاصرے سے تنگ آگئے تو حسین نے مجبور ہو کر امیر سے صلح کی خواہش کی اور اپنے بیٹے کو بطور یرغمال پیش کیا جس کا نام سعید تھا اور وہ بڑا دلاور جوان تھا۔ امیر نے اس کی استدعا قبول کی اور واپس ہو گیا۔ لیکن سعید امیر کے لشکر میں ایک روز سے زیادہ نہیں رہا اور حیلہ کر کے شہر بلیارش میں اپنے دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔

یہاں سے آگے بڑھ کر امیر پنبلونہ اور قلہرہ پہنچے اور بشکنش کی طرف واپس ہو کر ملک شرناطیس میں داخل ہوئے وہاں سے ابن بلنسکوط کے پاس آئے اور اس کے لڑکے کو بطور یرغمال لیا اور ان کو جزیہ دینے پر مجبور کر کے صلح کر لی۔ ہنوز امیر کو عیسوں کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لئے امیر نے

اسے قید کرادیا۔

حفص کے بھائی کا واقعہ | حفص ابن میمون کے بھائی وھب اللہ نے اپنے بھائی کے واقعہ قتل پر کہا تھا کہ اگر قریش اس حادثے پر ہماری مدد کے لیۓ جوش میں نہ آئے تو قسم ہے خدا کی ستر ہزار تلواریں ہماری امداد کے لیۓ اُٹھیں گی۔ یہ بات امیر کو کھٹک رہی تھی۔ ایک موقعہ پر امیر نے وھب اللہ کو بھی قید کر دیا۔ جب امیر قرطبہ واپس ہوئے تو ایک دن رصافہ میں بالاخانے پر بیٹھے بیٹھے وھب اللہ کو بلا کر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد عیسوں کو بلوایا۔ عیسوں نے لوگوں سے کہا کہ میں امیر کے مفید مطلب ایک مشورہ پیش کرنا چاہتا ہوں اس لئے مجھے امیر کے حضور میں لے چلو۔ جواب ملا کہ امیر کے پاس کوئی نہیں پہنچ سکتا تمیں جو کچھ کہنا ہو یہیں کہہ لو۔ تب اس نے اپنے پاس کی ایک چھری سے جو اس نے امیر کے قتل کے لیۓ چھپا رکھی تھی اس آدمی پر حملہ کر دیا جس سے یہ گفتگو ہو رہی تھی اور زخمی کر ڈالا۔ وہ آدمی زخمی ہو کر وہیں گیا۔ اس جسارت سے عیسوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور اُسے کچھ مددگاروں کے ملنے کی بھی امید بندھ گئی۔ وہ اسی دھیان میں تھا کہ یوسف داروغہ حمام خانہ جس کے پاس جلانے کی لکڑی تھی آپہنچا اور اُس نے وہی لکڑی عیسوں کے سر پر مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد امیر کے حکم سے رصافہ سے قرطبہ تک عیسوں اور وھب کی لاشیں گھسیٹی گئیں اور پھر ان لاشوں کو قصرِ شاہی کے نیچے سولیوں پر چڑھا دیا گیا۔

سعید ابن حسین جو پہلے امیر کے ساتھ تھا اس سے علیحدہ ہونے کے بعد پھر لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس لیۓ امیر کو جنگ کے لیۓ پھر سرقسطہ جانا پڑا۔ وہاں پہنچ کر امیر نے شہر کے چاروں طرف چھتیس منجنیقیں نصب کر دیں۔ اہل شہر اس محاصرے سے سخت تنگ ہوئے اور انھوں نے حسین کو پکڑ کر امیر کے حوالے کر دیا۔ امیر نے حسین اور پیراس کے ایک باشندے رزق کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا۔ رزق کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیۓ۔ اسی میں اس کی جان گئی۔

مغیرہ ابن ولید کی شورش | بعد ازاں امیر پھر قرطبہ واپس ہوا اور رصافہ میں مقیم ہوا۔ اب امیر کے بھانجے مغیرہ ابن ولید نے امیر پر حملے کا ارادہ کیا اور ہذیل ابن صمیل ابن حاتم نے اس کی اعانت کی۔ علا ابن عبدالحمید القشیری نے امیر کو اس کی خبر دی۔ امیر نے فوراً مغیرہ اور ہذیل کے پاس اپنے آدمی بھیج کر حالات کی

تحقیق کی۔ ان لوگوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور امیر نے انہیں قتل کرا دیا۔

ابوالاسود محمد ابن یوسف کی بغاوت اور امیر کی وفات ابوالاسود محمد ابن یوسف نے اہل شرق کی امداد سے امیر کے خلاف بغاوت کی اور شہر قسطلونہ پر جا پہنچا۔ امیر بھی اس کے مقابلے کے لئے بڑھے۔ یہ جنگ چند روز تک ہوتی رہی نتیجے میں محمد ابن یوسف کو شکست فاش ہوئی اور اس کی جماعت پراگندہ ہوگئی۔ محمد ابن یوسف کے چار ہزار آدمی اس جنگ میں کام آئے۔ محمد قوریہ کی طرف چلا گیا۔ امیر نے اسی سال اس کا تعاقب کیا مگر وہ نہیں ملا اور جنگلوں میں روپوش ہوگیا۔ آخر امیر اس کے اہل و عیال اور بہت سے آدمیوں کو قتل و اسیر کر کے شہروں کو تباہ کرتے ہوئے قرطبہ واپس آئے۔ یہ ان کی آخری جنگ تھی۔ اس کے بعد امیر نے تینتیس سال تین ماہ حکومت کر کے انتقال کیا۔ خدا ان پر رحم فرمائے۔

امیر کے بعض اور حالات ایک مرتبہ قریش نے امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جس نے اپنے عریضے میں ان وظائف کے اضافے کی درخواست کی تھی جو قریش کو ملا کرتے تھے اور ارکان وفد کے نزدیک کم تھے۔ وفد نے امیر کے ساتھ اپنی قرابت بطور حجت پیش کی تھی۔ اس کے جواب میں امیر نے حسب ذیل اشعار لکھے۔

شتان من قام ذا امتعاض (۱) منتضی الشفرتین نصلا

فجاب قفراً و شق بحراً (۲) مسامیاً لجۃ و محلا

فبنز ملکا و شاد عزاً (۳) و منبراً للخطاب فصلا

و جند الجند حین اودی (۴) و مقرا لمصرین اخلا

ترجمہ:۔

(۱) اور لوگوں میں اس شخص میں فرق ہے، جو جوش و غضب کے عالم میں دو دھاری تلوار کھینچ کر کھڑا ہوگیا۔

(۲) میدانوں اور پانی کی گہرائیوں کا مقابلہ کر کے ریگستان طے کئے اور سمندروں کو عبور کیا۔

(۳) ملک کی آبرو بڑھائی اور اس کی حفاظت کی اور فصل خطاب کے لئے منبر پر چڑھا۔

(۴) اس نے ایسے وقت لشکر جمع کئے جب وہ تباہ ہو چکا تھا اور گرتے ہوئے شہروں کو اس وقت بنایا جبکہ وہ ان سے دلکش ہوگیا تھا۔

ثم دعا اہلہ جمیعاً (۱) حیث أتوا ان ہلم اھلا
فجار ہذا طرید جوع (۲) شرید سیف ابید قتلا
فنال امنا ونال شبعاً (۳) ونال مالاً ونال اھلا
الم یکن حق ذا علی ذا (۴) اعظم من منعم ومولا

ایک دفعہ امیر سرحد کے قریب کسی لڑائی میں مصروف تھے۔ اس کے لشکر کے اطراف میں کچھ کلنگ اور قازیں آگئیں۔ ایک شخص نے جو امیر کے شوق شکار سے واقف تھا خبر دی اور امیر کو شکار کے لئے آمادہ کرنا چاہا۔ امیر نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر یہ شعر پڑھے:-

دعنی صید وقع الغرانق (۵) فان ہمی فی اصطیاد المارق
فی نفق او کان فی حالق (۶) اذا التقلت ہواجر الطرائق
کان لغاعی ظل ہند خافق (۷) غنیت عن روض وقصر شاہق
فقل لمن نام علی النمارق (۸) ان العلا شدت بہم طارق

ترجمہ:-
(۱) پھر اس نے اپنے تمام خاندان کو مختلف مقامات سے بلایا -
(۲) اس حالت میں یہ بھوک کا مارا ہوا، تلوار اور قتل سے ڈرا ہوا شخص یہاں آیا -
(۳) اور اس نے سیر ہو کر امن اور دولت وخاندان سب کو پالیا -
(۴) کیا ایسے شخص کا حق خاندان پر ایک منعم و آقا سے زیادہ نہ ہوگا -
(۵) مجھے جانے دو، اور قازوں کا ذکر چھوڑو کیونکہ میری ہمت سرکشوں کے شکار میں مصروف ہے -
(۶) یہ شکار کہیں گھاٹیوں میں ہو یا سرنگوں اور بلند پہاڑوں میں۔ جس وقت راستوں اور میدانوں کے سراب موجزن ہوں -
(۷) لہراتے ہوئے جھنڈے کا سایہ میری چادر ہوتا ہے۔ میں باغوں اور بلند محلوں سے بے پروا ہو گیا اور مجھے ریگستانوں کے ہوتے ہوئے سراپردوں میں رہنے کی ضرورت نہ رہی -
(۸) قالینوں پر سونے والوں سے کہدے کہ عزت و سربلندی تو بڑی مصیبتوں اور بلند ارادوں سے وابستہ ہے -

فارکب الیہا نہج المضائق (۱) اولا فانت ارذل الخلائق

ایک روز خلیفہ عباسی ابوجعفر منصور نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا کہ قریش کا شہباز کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ "امیرالمؤمنین" یعنی آپ ہیں کہ تمام ملک پر آپ نے قبضہ کر لیا، فسادات کا سدباب ہو گیا اور اب ملک میں امن وامان ہے۔ کہا کہ "نہیں، تم نے کچھ ٹھیک جواب نہیں دیا"۔ پھر لوگوں نے کہا کہ "معاویہ"۔ کہا "نہیں"۔ لوگوں نے کہا "عبدالملک ابن مروان"۔ کہا "نہیں"۔ آخر لوگوں نے خود ابوجعفر سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے، تو ابوجعفر نے کہا کہ وہ عبدالرحمٰن ابن معاویہ ہے جو اپنی چالاکی سے بھالوں اور تلواروں سے نجات پاکر تنہا جنگل اور سمندر عبور کرتا ہوا ایک اجنبی ملک میں پہنچا، شہر آباد کئے، لشکر جمع کئے اور سلطنت جو کہ اس کے خاندان سے بالکل جاتی رہی تھی پھر قائم کر لی۔ معاویہ ابن ابی سفیان اپنی حسن تدبیر اور ارادہ کی مضبوطی سے اس گھوڑے پر سوار ہوا جسے عمر و عثمان نے تیار کیا تھا اور معاویہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچا دی تھیں۔ عبدالملک ابن مروان اپنی سابقہ بیعت کی وجہ سے کامیاب ہوا اور میں اپنے قبیلہ اور اپنے طرفداروں کی بدولت فائز المرام ہوا۔ عبدالرحمٰن ابن معاویہ تنہا تھا صرف اس کی رائے اس کی مؤید اور اُس کا ارادہ اس کا ساتھی تھا۔

جب امیر نے سرقسطہ پر حملہ کیا تو ابن اعرابی مدافعت کے لئے نکلا اور دونوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں آخر کار امیر غالب ہوئے۔ اس موقع پر امیر اپنے لشکروں کی دیکھ بھال خود کرتے اور چھوٹی بڑی بات کی خبر رکھتے تھے۔

ایک روز امیر نے ایک سوار کو اپنے گھوڑے سے اترتے دیکھا جو بظاہر اپنے کام سے فارغ معلوم ہوتا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

لم یطیقوا ان ینزلوا ونزلنا　　　　واخوا الحرب من اطاق النزولا

(ہم میدان میں اتر آئے مگر ان میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ جنگجو تو وہی ہے جو میدان میں آسکتا ہو)

---

(۱) اس تنگیوں اور دشواریوں کا بے خطر مقابلہ کر، ورنہ تو ذلیل ترین خلائق میں شمار ہوگا۔

امیر نے اپنے خادم سے کہا کہ جاؤ اور اس شخص کا حال معلوم کرو۔ اگر شرفا سے ہو تو ایک ہزار دینار اور معمولی آدمی ہو تو پانسو دینار اس کو دیدو۔ جب خادم اس کے پاس پہنچا تو وہ قعقع ابن زنیم رمیہ کا عرب تھا۔ خادم نے ایک ہزار اشرفیاں اس کو دے دیں۔ پھر امیر نے اس شخص کو اردن کے لشکر کا قاضی بنا دیا جب اس کی مالی حالت درست ہو گئی تو اس نے امیر سے بغاوت کی لیکن امیر نے اس پر غالب ہو کر معاف کر دیا تاکہ پہلا احسان ضائع نہ ہو اور اسے پھر قاضی مقرر کر دیا۔

امیر ہشام ابن عبدالرحمٰن الداخل

ہشام ابن عبدالرحمٰن نہایت فاضل، فیاض اور کریم النفس امیر تھا۔ رعیت کے ساتھ اس کا سلوک اچھا تھا۔ ملک کی حدود اس کی بدولت نہایت مضبوط تھیں۔ اس کے عہد کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ کفار میں سے کسی شخص نے وصیت کی تھی کہ مسلمانوں کے ملک میں جو چند غلام ہیں ان کو خواہ مال کے ذریعے سے یا کسی اور طریقے سے رہائی دلائی جائے۔ بے حد کوشش کی گئی کہ یہ وصیت پوری ہو جائے مگر سرحدوں کے سخت انتظام و نگرانی اور مسلمانوں کی قوت اور مشرکین کے ضعف کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔

ہشام کا دستور تھا کہ جب اس کے لشکر کا کوئی سپاہی چھاؤنی یا سرحد پر جاتا تو وہ اس سپاہی کی جگہ اس کے بیٹے کا نام دفتر حساب میں درج کرا دیتا اور وہی تنخواہ اس کے بیٹے کو ملنے لگتی تھی ہشام کی یہ تعریف حضرت مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ کو مدینے میں معلوم ہوئی تو انھوں نے آرزو کی کہ "اللہ تعالیٰ اس کو حج کی توفیق دے"۔

یہ روایت فقیہہ ابن ابی ہند کی ہے جو حضرت مالک سے ملے تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ انھوں نے حضرت مالک سے حدیث کی سند لی تھی اور ان سے روایت کرتے تھے۔

ہشام کی سخاوت وایثار ہشام کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حواریوں میں سے ایک شخص نے اس سے ایک مالدار آدمی کے مرنے کا ذکر کر کے کہا کہ وہ بہت مقروض تھا۔ اور اس کی جائداد غیر منقولہ نہایت اچھی

اور زرخیز ہے۔ ایسی باتیں کرکے امیر کو اس جائداد کی خریداری پر بہت راغب کیا اور کہا کہ وہ جائداد عنقریب اس قرضے کے بارے میں فروخت ہو جائے گی۔ امیر نے کہا کہ "میں یہ تو چاہتا ہوں کہ اگر میں خرید سکوں تو اس کی جائداد خرید لوں لیکن یہ مجھے زیادہ پسند ہے کہ اس جائداد کو اپنے قبضے میں رکھنے کے بجائے بار قرض سے سبکدوش کرکے اس کے ورثار کو دیدوں۔" چنانچہ امیر نے اس جائداد کو خرید کر زرِ ثمن سے قرضہ ادا کرایا اور جائداد اس کے ورثار کے پاس رہنے دی۔

مخفی فیاضیاں اور تعمیر مساجد کی کوشش ہشام کا معمول تھا کہ وہ اشرفیوں کے توڑے بار کرا کے اکثر تاریک اور برساتی راتوں میں مساجد میں بھیجا کرتا تھا تاکہ وہاں تقسیم کر دی جائیں۔ اس طرز عمل سے اس کا مدعا یہ تھا کہ مسجدیں آباد رہیں۔

استبداد حکام کا انسداد، مظلوموں کی دادرسی ہشام نہایت سخت گیر بادشاہ تھا۔ وہ اپنے عُمّال کی استبدادیت کا دل سے دشمن تھا اور ان کی خدمات کی کوتاہی پر سخت گرفت کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہشام کہیں جا رہا تھا کہ اس کے جلوس میں ایک شخص آگیا جس پر اس کے کسی والی نے ظلم کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہشام تک پہنچ کر والی کی شکایت کرے۔ مگر جلوس میں اس والی کا ایک دوست بھی تھا اُس نے اس مظلوم شخص کو اپنی عبا میں چھپا لیا اور تسلی دیکر اس کا جو کچھ نقصان ہوا تھا اس کی تلافی اپنے پاس سے کر دی، ہشام تک شکایت نہ پہنچنے دی اور والی کو لکھ دیا کہ "اس شخص کو دل جوئی و نرمی سے راضی کر لو۔" مگر یہ بات چھپ نہ سکی اور ہشام کو اطلاع ہوگئی۔ ہشام کو یہ امر بہت گراں گزرا کہ وہ مظلوم مجھ تک نہ پہنچنے پایا۔ پھر جب اس سے یہ کہا گیا کہ اس کے نقصان کی تلافی کر دی گئی ہے تو اس نے یہ جواب دیا کہ "مظلوم کا انصاف اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے۔" پھر مظلوم کو تلاش کرا کے بلایا اور کہا کہ "حدود اللہ کے سوا جو کچھ تجھے نقصان پہنچا ہے اس کو حلف سے بیان کر۔" وہ شخص قسمیہ بیان کرتا جاتا تھا اور امیر کی طرف سے اس کا معاوضہ ہوتا جاتا تھا۔

حکومت سے پہلے کا ایک واقعہ ہشام کی اس سختی کا یہ اثر ہوا کہ عمال کوڑے اور تلوار سے زیادہ

ہشام سے ڈرنے لگے ۔ اس طرح ایک قصہ اس کے فرمانروا ہونے سے پہلے کا یہ ہے کہ وہ ایک دن دوپہر کے وقت اپنے بالاخانے میں بیٹھا ہوا کھڑکی سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے بنی کنانہ کے ایک شخص کو آتے ہوئے دیکھا جو جیان کے لوگوں سے تھا اور ہشام ہی کا پروردہ تھا۔ اس شخص کا بھائی ابوایوب ضلع جیان کا والی تھا۔ ہشام نے اُسے گرمی کے زمانے میں دھوپ میں آتے ہوئے دیکھا تو اپنے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا کہ حاجب سے کہدو کہ "جب یہ شخص آئے تو فوراً میرے پاس حاضر ہو، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ابوایوب نے تکلیف دی ہے جو ایسے وقت میرے پاس آرہا ہے۔" کنانی جب آیا تو فوراً ہشام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت ہشام کے پاس اس کی ایک لونڈی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کنانی آیا تو لونڈی کو پردے میں کر دیا گیا اور ہشام نے کنانی سے پوچھا "کیا حال ہے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی اہم خبر ہے جس سے پریشان ہو کر یہاں آیا ہے۔" کنانی نے کہا "جی ہاں۔ ایک کنانی نے کسی شخص کو غلطی سے قتل کر دیا۔ مقتول کی دیت تمام کنبے پر عائد کی گئی لیکن مجھ پر یہ ظلم ہوا کہ جس قدر عائد ہونا چاہئے تھی اس سے زائد میرے ذمے لگائی گئی ہے۔ چونکہ ابوایوب جانتا ہے کہ مجھے آپ کے حضور میں کتنی خصوصیت ہے اس لئے وہ میری فکر میں ہے۔ مجبور ہو کر آپ کے پاس پناہ لینے آیا ہوں۔ ہشام نے کہا کہ مطمئن رہ۔ ہشام تیری اور تیری ساری قوم کی طرف سے دیت ادا کر دے گا۔ پھر پردے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنی کنیز کا ایک زیور اتار کر اس کنانی کو دیدیا جس کی قیمت تین ہزار دینار تھی اور اس سے کہا کہ اس کو فروخت کر کے رقم دیت ادا کر۔ اگر کچھ باقی بچ جائے تو اپنے کام میں لا۔ کنانی نے کہا کہ "میں حصول مال کے لئے نہیں آیا ہوں، نہ مجھے اس کی حاجت ہوئی ہے۔ میں تو اس ظلم کے خلاف صرف آپ سے مدد مانگنے آیا ہوں جو مجھ پر روا رکھا گیا ہے اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے میں میرے ساتھ عنایت و توجہ سے پیش آئیں۔" ہشام نے کہا اس کی کیا صورت ہوگی۔ اس نے کہا صرف یہ کہ آپ امیرے ابوایوب والی کو لکھوا دیں کہ اس معاملے میں فلاں کنانی سے جتنی دیت ناواجب وصول کی جارہی ہے، نہ وصول کی جائے بلکہ جتنی تمام قبیلے والوں سے لی گئی ہے اتنی ہی از روئے انصاف اس سے بھی

بھی لی جائے۔" ہشام نے کہا اچھا تو اس زیور کو اپنے ہی پاس رہنے دے۔ میں ابھی انتظام کئے دیتا ہوں اور اسی وقت سوار ہو کر اپنے باپ امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں گیا جو اس وقت رصافہ میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا کوئی ایسی ہی غیر معمولی بات ہوئی ہے جو اس وقت آیا ہے۔ پھر ہشام کو بلایا تو وہ سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ عبدالرحمٰن نے کہا بیٹھو۔ ہشام نے جواب دیا کہ "اللہ امیر کے اقبال میں برکت دے۔ جو رنج و اذیت مجھے پہنچی ہے اس کے ہوتے ہوئے کیسے بیٹھوں۔ پھر امیر سے سب قصہ بیان کر کے استدعا کی کہ میری آرزو پوری کی جائے۔ امیر نے کہا "بیٹھو، تمہاری آرزو پوری کی جائے گی اور جو مانگتے ہو ملے گا۔" پھر ہشام سے پوچھا کہ ابوایوب کے بارے میں کیا چاہتے ہو۔ کہا یہی کہ اس کو لکھ دیا جائے کہ اپنے بھائی سے ہاتھ روک لے اور اس سے ناواجب مطالبہ نہ وصول کرے۔ امیر نے کہا اگر کوئی صورت اس سے بہتر ہو تو کیسا ہے۔ جب تمہاری عنایت اس کنانی پر اتنی ہے تو بیت المال سے کیوں نہ دیت ادا کرا دی جائے، اور تمام بنی کنان سے اس کا بار اٹھا لیا جائے۔ ہشام نے اسے منظور کر لیا اور امیر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ امیر نے بیت المال سے ادائے دیت کا حکم دے کر ابوایوب کو لکھ دیا کہ اب کنانی اور اس کے خاندان سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اس انتظام کے بعد جب وہ کنانی ہشام سے رخصت ہونے آیا تو ہشام سے کہا کہ "میرے آقا! مجھے اپنی آرزو سے زیادہ کامیابی ہوئی اور میرے خیال سے زیادہ حضور نے مجھے مدد دی۔ اب اللہ نے مجھے اس زیور کی طرف سے بھی مستغنی کر دیا ہے، یہ حاضر ہے کیونکہ میں اس چیز کو لے کر بنی کنانہ کے لئے بابرکت نہیں ہو سکتا جو ایک جاریہ سے چھینی گئی ہو اور اس طرح اس کے حق میں نحس ثابت ہو۔ ہشام نے جواب دیا کہ اے کنانی جو چیز میں دے چکا ہوں واپس نہیں لے سکتا اسے تو ہی لے لے۔ اللہ تعالیٰ جاریہ کو اس سے بہتر دے گا۔

امیر الحکم بن ہشام رحمۃ اللہ

اخلاق و عادات | امیر الحکم بن ہشام بڑا بہادر و محتاط اور فہمند بادشاہ تھا۔ اس نے تمام فتنوں کو فرو کر کے

ثمر نفاق کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا اور آس پاس کے کفار کو ذلیل کیا۔ اس میں یہ وصف بہت نمایاں تھا کہ اپنی اس شجاعت و عزت نفس کے باوجود نہایت درجہ متواضع تھا مگر اس کی یہ تواضع بھی نااہلوں کے لیے نہ تھی بلکہ جن لوگوں کو اہل سمجھتا تھا ان کے ساتھ مخصوص تھی۔ وہ ہمیشہ انصاف کے آگے گردن جھکا دیا کرتا تھا خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس خصوص میں وہ اتنا سخت تھا کہ وہ اپنی اولاد اور متوسلین کی ناانصافی کو بھی ذرا نہ پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے حکام میں پاک بازی اور نیک سیرتی کے اوصاف دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ عدل و انصاف کے موافق ہوا کرتے تھے! اس کے عہد میں جو بزرگ قضا کے عہدے پر مامور تھے انھوں نے اپنے زہد و ورع اور کمال قابلیت سے الحکم کو رعایا کی طرف سے معاملات و قضایا میں بہت مطمئن کر رکھا تھا۔ ذیل میں وہ واقعہ درج کیا جاتا ہے جس سے الحکم کے دل پر ان قاضی صاحب کی دیانت و قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔

قاضی کا بے لوث انصاف، الحکم کی حق پسندی

ضلع جیان کے رہنے والے ایک شخص کی ایک کنیز کسی حاکم نے غصب کر لی تھی۔ جب وہ حاکم معزول ہوا تو اس نے یہ تدبیر کی کہ اس کنیز کو الحکم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ادھر مستغیث نے قاضی صاحب کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ قاضی صاحب نے گواہ طلب کیے اور شناخت کے لیے اس کنیز کو بھی امیر سے طلب کیا اور امیر کے پاس صاف لفظوں میں کہلا بھیجا کہ انصاف و قانون کی نظر میں عام و خاص، امیر و غریب، راعی و رعایا سب برابر ہیں۔ اگر امیر کو کنیز بھیجنا منظور نہیں ہے تو قاضی اپنے عہدے سے مستعفی ہوگا۔ امیر کو چاہیے کہ ان دونوں صورتوں میں سے ایک کو پسند کر لیں۔ امیر الحکم نے کہا کہ اس کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مستغیث جس قدر قیمت طلب کرے اسے ادا کر دی جائے۔ قاضی نے کہا ایک تو گواہوں کو جو اس قدر دور دراز ملک سے شہادت دینے آئے ہیں تکلیف ہوگی دوسری قباحت یہ ہے کہ جب تک مستغیث کنیز پر قبضہ نہ پالے بیع کامل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا امیر کو اس باب میں ان دو باتوں کے سوا کوئی اختیار نہیں ہے کہ قاضی کا استعفیٰ منظور کرے یا لونڈی کو عدالت میں بھیجے۔

امیر نے جب اس معاملے میں قاضی صاحب کو بہت مستقل پایا تو کنیز کو عدالت میں بھیجنا گوارا کر لیا۔

اگرچہ یہ اسے بہت ہی شاق گزرا کیونکہ وہ اس کنیز پر فریفتہ تھا۔ غرض گواہوں نے بعد شناخت گواہی دی کہ یہ کنیز مستغیث ہی کی ہے۔ قاضی نے مستغیث کے حق میں فیصلہ صادر کیا اور ہدایت کی کہ مستغیث لونڈی کو اگر فروخت کرنا چاہے تو اپنے شہر میں لے جاکر فروخت کرے تاکہ رعایا کو حقوق طلبی میں کافی قوت حاصل ہو اور وہ بے خوف و خطر امیر و غریب کے مقابلے میں انصاف کی طالب ہو سکے۔

جب ان قاضی صاحب کا انتقال ہوا تو الحکم کو سخت ملال ہوا اور وہ بہت پریشان ہو گیا۔ الحکم کی ایک کنیز نے اس موقع کی ایک عجیب حکایت بیان کی جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

قاضی کے انتخاب کے لئے الحکم کا اضطراب

جس رات الحکم کو قاضی صاحب کے انتقال کا علم ہوا اس رات کو یہی کنیز جو اس واقعے کی راوی ہے امیر کے پاس سو رہی تھی۔ درمیان شب میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے الحکم کو اس کے بستر پر نہیں پایا۔ تلاش کیا تو قصر کے ایک حصے میں الحکم نماز میں مصروف نظر آیا۔ یہ انتظار میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہنوز وہ سجدے ہی میں تھا کہ یہ وہیں پڑ کے سو گئی پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو الحکم کو بدستور سجدے میں پایا۔ کچھ دیر انتظار کر کے پھر سو گئی۔ صبح کے وقت الحکم نے خود اسے اٹھایا تو اس کنیز نے پوچھا کہ "اس قلق و اضطراب کی کیا وجہ تھی جو آپ رات بستر سے علیحدہ رہے۔" الحکم نے کہا مجھ پر سخت مصیبت پڑی ہے۔ قاضی صاحب جن کو میں نے رعایا کے معاملات و انصاف پر مقرر کیا تھا انتقال کر گئے ہیں۔ مجھے ان کی قابلیت، دیانتداری اور زہد پر پورا بھروسہ تھا اور انھوں نے مجھے رعایا کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن کر رکھا تھا۔ اب مجھے خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے ان کا سا جانشین نہ ملے اس لئے خدائے تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے قاضی صاحب مرحوم کے سے جامع اوصاف قاضی کے مقرر کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ میری طرف سے قاضی ہو کر مجھے مطمئن کر سکے اور منصفانہ فیصلے کرتا رہے۔

عہدۂ قضا پر محمد ابن بشیر کا تقرر

جب صبح ہوئی تو الحکم نے وزرا کو طلب کیا اور انتخاب قاضی کے لئے مشورہ کیا۔ مالک ابن عبداللہ قرشی نے محمد ابن بشیر کی رائے دی جو باجہ میں مالک کے کاتب رہ چکے تھے اور کہا کہ مجھے ان کی قابلیت اور زہد پر پورا اعتماد ہے۔ امیر کے دل میں بھی یہ بات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۷	بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا)

تفسیر کا دورِ اول

اس سے قبل ہم بیان کر آئے ہیں کہ صدر اسلام میں نشر و اشاعت اور وسعت عمل کے لحاظ[1] سے مذہبی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں اور اس عہد میں زیادہ تر علمائے دین ہی کا دور دورہ رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں پر مذہب کا نفوذ حد کمال تک پہنچ گیا تھا اور مذہب ہی اُن کو امت کا شیرازہ بند اور قومی عظمت و رفعت کا سرچشمہ دکھائی دیتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کا وجود مسعود عرب میں جلوہ گر نہ ہوتا تو اہل عرب بدستور قبیلوں اور گروہوں میں بٹے رہتے اور ہر ایک قبیلہ دوسرے کے خلاف نبرد آزمائی کرتا ہوتا اور نیز حدود ملک سے باہر نکلنے کی بجائے اہل عرب اپنے خیموں میں مگن رہتے اور کشور کشائی اور جہانگیری کہیں خواب میں بھی نظر نہ آتی طبعی امر تھا کہ اہل عرب اسلام کو اپنی دنیا کی بہبودی اور آخرت کی سعادت سمجھتے، اُن کے علاوہ اور قوموں نے بھی اس دعوت حق کو لبیک کہا اور نہایت اخلاص کے ساتھ جوق در جوق اس میں داخل ہوئے۔ ان کے دلوں میں بھی عربوں کی طرح اسلام کی صداقت اور حقانیت جاگزیں تھی اور عقیدت اور شوق میں یہ نو مسلم سابقین اولین سے کسی طرح پیچھے نہ تھے، چنانچہ ان فاتحین اور مفتوحین نے جو ایک ہی دین کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے قرآن کی طرف توجہ کی اور رسول اللہ صلعم کے اقوال کو سننے اور جمع کرنے لگے، اس طرح سے قرآن و حدیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ آگے چل کر جب دولت اسلامیہ وسیع ہوئی اور نئے نئے حوادث سے مسلمانوں کا سابقہ ہوا تو قرآن و حدیث سے استنباط مسائل کی طرح پڑی۔ اس عہد میں دنیوی علوم اور فلسفہ کا بازار بالعموم

---

(۱) رسالہ جامعہ بابت ماہ جولائی و اگست "پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی مراکز"

سدود رہا۔ اوران دونوں میں سے اگرکسی شق کوکچھ فروغ حاصل بھی ہوا تو دینی رنگ میں رنگنے اور مذہب کی آڑ لینے کے بعد۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز طب کی ایک کتاب کی اشاعت کے لئے کئی دن تک استخارہ کرتے رہے اور اسی طرح غزوات، اسلامی فتوحات، باہمی خانہ جنگیوں اور معرکہ ہائے قتال کی روایتیں حدیث کی شکل میں معرض وجود میں آئیں۔ اس سے قبل مذہبی تحریکات "علمی مراکز" کے تحت میں مجملاً بیان کر دی گئی ہیں۔ آئندہ صفحات میں اُن کی تفصیل کی کوشش کی جائیگی۔

اس دور میں مذہبی تحریکات کا دار ومدار ان تین اہم امور پر تھا۔ قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث اور اس کی تالیف و ترتیب اور نئے حوادث کی بنا پر مسائل کا استنباط جسے ہم شریعہ کے نام سے بیان کریں گے۔

قرآن اور اُس کی ترتیب | قرآن مجید تقریباً بیس سال کے عرصے میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوا۔ اس تمام مدت میں حوادث اور احوال کے مطابق آیات کا نزول ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے انتقال فرمایا اور اُس وقت تک قرآن ایک مصحف میں جمع نہ ہوا تھا۔ وہ محفوظ تو تھا لیکن کاتبین وحی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے متفرق کتبوں اور حفاظ کے سینوں میں۔ حضرت ابوبکر کے عہد میں پہلی دفعہ قرآن کو جمع کیا گیا لیکن ایک مصحف میں نہیں بلکہ متفرق کتبوں کو یکجا کر دیا گیا اور جو کچھ حفاظ کو یاد تھا وہ سپرد رقم کر لیا۔ یہ ذخیرہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھا گیا۔ قرآن کی کتابت و تدوین حضرت زید بن ثابت کی زیر نگرانی سرانجام ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو یہ صحیفے ملے۔ اور اُن سے ام المومنین حضرت حفصہؓ کی طرف منتقل ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں مذکورہ صحائف کو حضرت حفصہؓ سے لے کر حضرت زیدؓ بن ثابت عبداللہؓ بن زبیر سعید بن عاص کے سپرد کیا تاکہ اُن کو ایک مصحف میں جمع کر دیا جائے۔ پھر اس جمع شدہ مصحف کے متعدد نسخے نقل کرا کر مختلف شہروں میں بھیجے اور اس رسمی مصحف کے خلاف جو کچھ ہاتھ لگا وہ نذر آتش کر دیا گیا۔ اس بیان کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم نے صرف ضروری واقعات بیان کر دیئے ہیں۔

قرآن اہل عرب کی زبان اور اُن کے اسلوب کلام اور محاورہ کے مطابق نازل ہوا۔ اس

کے الفاظ عربی ہیں۔ سوائے قلیل التعداد الفاظ کے جو معرب ہیں اور دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں، لیکن اہل عرب نے ان اجنبی الفاظ کو اپنا لیا تھا اور اُس پر اپنے قواعد اور لسانی قوانین جاری کر لئے تھے۔ قرآن کا اسلوب بیان اہل عرب کے اسلوب کے مطابق ہے۔ اُس کی طرح اس میں بھی مجاز کنایہ اور حقیقت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور چاہئے بھی یہ تھا کیونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے۔ اس لئے اُن کی زبان میں ہونا لازمی امر تھا۔ "ومارسلنا من رسل الا بلسان قومہ لیبین لہم"

اس کے باوجود تمام کے تمام صحابہ قرآن کا ہر ایک حصہ سننے کے ساتھ ہی اس کے تمام مطالب سے بہرہ ور نہیں ہو جاتے تھے اور ہمیں ابن خلدون کے اس قول کا آخری حصہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ "قرآن اہل عرب کی زبان اور اُن کے اسلوب بیان کے مطابق نازل ہوا۔ اور وہ تمام کے تمام اس کو سمجھتے اور اسکے مفردات اور ترکیبوں کے معانی کو جانتے تھے"، ہمارے خیال میں قرآن کے عربی زبان کے نازل ہونے سے یہ شرط لازم نہیں آتی کہ تمام اہل عرب اس کے مفردات اور ترکیبوں پر حاوی ہوئے۔ اس کی دلیل خود ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ کسی زبان میں ایک کتاب کا ہونا اس امر کا مترادف نہیں ہوتا کہ تمام اہل زبان اس کو سمجھتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں کتنی کتابیں ہیں جو خود انگریز اور فرانسیسی نہیں سمجھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک کتاب کے سمجھنے کے لئے صرف زبان کی ضرورت نہیں بلکہ کتاب کے معیار کے مطابق استعداد عقلی ہونا ضروری ہے۔ یہی حال قرآن کے بارے میں اہل عرب کا تھا، وہ تمام کے تمام پوری کتاب سمجھنے پر قادر نہ تھے۔ ہر ایک اپنی استعداد اور ذہانت کے مطابق اس علم لدنی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بلکہ ہماری رائے میں اہل عرب کا ہر ایک فرد قرآن کے تمام الفاظ کے معانی سے بھی سے بھی آگاہ نہ تھا جیسا کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قوم کا ہر ایک فرد اُس قوم کی زبان کے تمام الفاظ پر عبور رکھتا ہے۔ مزید ثبوت کے لئے حضرت انس بن مالک کی روایت ملاحظہ ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے "وفاکہۃ وابا" میں "ابّا" کے معنی پوچھے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے تکلف اور تعمق سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ

ایک اور روایت ہے کہ آپ نے منبر سے یہ آیت پڑھی " او یاخذہم علی تخوف " اور تخوف کے معنی دریافت فرمائے۔ بنی ہذیل میں سے ایک شخص نے کہا کہ تخوف ہمارے ہاں تنقص کو کہتے ہیں پھر یہ شعر پڑھا۔

تخوف الرحل منہا تامکا قردا — کما تخوف عود النبعۃ السفن

حضرت عمر کی علم دین میں منزلت دیکھئے اور پھر اس روایت کو ملاحظہ کیجئے۔ جب ان کا یہ حال ہو تو دوسرے صحابہ کا کیا ذکر۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد آیات کے صرف اجمالی معنوں پر اکتفا کرتی تھی، مثلاً اللہ تعالیٰ کے اس قول " وفاکہۃ وابا " میں وہ اس کی عنایتوں کا شمار مراد لیتے تھے۔ اور الفاظ کی تحقیق اور معانی کی تفصیل اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن کو سمجھنے کے لئے زبان اور اس کے اسالیب کا جاننا کافی نہیں مثلاً (والعادیات ضبحا) (والذاریات ذروا) اور (والفجر ولیال عشر) میں دس راتوں سے کیا مراد ہے۔ نیز قرآن مجید میں تورات اور انجیل کے واقعات کے متعلق بکثرت اشارات پائے جاتے ہیں، جن کے سمجھنے کے لئے صرف زبان کی معرفت کسی طرح کافی نہیں۔

خدائے تعالیٰ فرماتا ہے

" وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری۔ جس میں سے بعض آیتیں صاف وصریح ہیں وہی اصل کتاب ہیں۔ اور دوسری مبہم، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی ان مبہم آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی اصل حقیقت کسی کو معلوم نہیں الخ . . . (سورۂ آل عمران)

حقیقت الامر یہ ہے کہ فہم قرآن اور معرفت معانی قرآن میں تمام صحابہ کرام کے ایک سے نہ تھے، بلکہ استعداد کے اعتبار سے ان کے مختلف مدارج تھے۔

---

(۱) یہ دونوں روایتیں کتاب الموافقات جزو ۲ صفحہ ۸۵ و ۸۸ مطبوعہ مصر میں ہیں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں تمام قرآن حفظ کرنے کا رواج جیسا کہ بعد میں عام ہوا نہیں تھا۔ صحابہ ایک سورۃ یا چند آیتیں حفظ کرتے اور اُس کے مطالب سمجھتے، جب اُس میں کما حقہ درک حاصل ہو جاتا تو آگے بڑھتے۔ اس طرح سے جملہ صحابہ پر حفظ قرآن تقسیم ہو جاتا تھا۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی کا بیان ہے کہ عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود وغیرہم ایسے قرآن پڑھنے والے بزرگوں نے ہم سے ذکر کیا کہ وہ آنحضرت سے دس آیات پڑھتے اور جب تک علم وعمل کے لحاظ سے اُن پر عبور نہ کر لیتے کبھی آگے نہ بڑھتے، انس[1] کہتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا۔ اُس کی قدر ومنزلت ہماری نظروں میں بہت بڑھ جاتی۔ عبداللہ[2] بن عمرؓ نے سورۃ بقرہ کے حفظ کرنے پر آٹھ سال لگائے۔ ایک آیت یاد کرتے اور اُس کے معانی اور مطالب سمجھتے پھر کہیں آگے بڑھتے۔

تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی | قرآن میں کثیر التعداد آیتیں صاف وصریح ہیں۔ جن کا مطلب واضح ہے۔ ان میں دین کے اصول اور اُس کے احکام بیان کئے گئے ہیں، خاص طور پر مکی سورتوں میں سورہ انعام ملاحظہ کیجئے۔ اس قسم کی سورتوں کا سمجھنا عوام الناس اہل عرب کے لئے چنداں دشوار نہیں تھا۔ ان کے علاوہ قرآن میں مبہم آیتیں بھی ہیں، جن کا سمجھنا مشکل ہو اور صرف مخصوص اہل علم ہی اُن کے کنہہ تک پہنچ سکتے۔

صحابہ کرام بالعموم قرآن کے سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے کیونکہ وہ اُن کی زبان میں اترا۔ اور نیز وہ اُن حوادث اور احوال کے عینی شاہد تھے جن کے بارے میں آیات اُترتی تھیں۔

اس کے باوجود بھی فہم قرآن کے متعلق اُن میں اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے مختلف مدارج تھے۔ مزید تفصیل یہ ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد۔ } (۲) الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲۰۸

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام صحابہ کی زبان عربی تھی لیکن زباندانی میں ایک دوسرے میں تفاوت ضرور تھا، اُن میں سے بعض ادب جاہلی سے زیادہ بہرہ ور تھے اور غیر مانوس اور مشکل الفاظ سمجھتے تھے اور اس سے وہ فہم قرآن میں مدد لیتے۔ اور بعض اس میدان میں اُن سے پیچھے تھے۔

۲۔ بعض صحابہ کو آنحضرت سے زیادہ شرف صحبت ملا اور وہ آپ کی حضوری اور رفاقت میں اوروں سے زیادہ عرصے تک رہے اور اس سے وہ آیات کے شان نزول سے زیادہ واقف ہوئے اور دوسرے ان نعمتوں سے محروم رہے۔ آیات کے مطالب سمجھنے کے لئے شان نزول سے غیر معمولی مدد ملتی ہے اور اس کے نہ جاننے سے لغزشوں کا احتمال رہتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو بحرین کا عامل مقرر کیا، بعدازیں جارودؓ نے شکایت کی کہ قدامہ نے شراب پی اور انھیں شبہ بھی ہوا، آپ نے اس پر گواہ طلب کیا۔ جارود نے ابوہریرہؓ کا نام لیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ قدامہ: میں تمھیں کوڑے لگاؤں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر میں نے شراب پی ہی ہے جیسا کہ یہ لوگ بیان کرتے ہیں تو تمھیں کوڑے لگانے کا کوئی حق نہیں، حضرت عمرؓ کے سوال کرنے پر قدامہ نے یہ آیت پڑھی۔

"اُن لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے جو کچھ انھوں نے کھایا اس پر کوئی گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کئے اور بار دیگر وہ ڈرے اور ایمان لائے اور پھر ڈرے اور اچھے کام کئے" اور میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور نیز میں آنحضرت کے ساتھ بدر۔ احد۔ خندق اور دوسرے معرکوں میں شریک رہا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تم میں سے کوئی اس کا جواب دیتا ہے؟ اس پر ابن عباس نے فرمایا کہ یہ آیات گذشتہ را صلوٰۃ اور آئندہ را احتیاط کا حکم رکھتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ شراب جوئے اور دوسرے منکرات کو حرام قرار دے دیا ہے۔ حضرت عمر نے اس کی تصدیق کی۔ ایک اور روایت ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا جو قرآن کی تفسیر اپنی

رائے سے کر رہا تھا۔ وہ اس آیت کریمہ کے متعلق کہتا ہے " یوم تاتی السماء بدخان مبین " کہ قیامت کے دن آدمیوں پر دھواں چھا جائے گا اور اُن کے دم گھٹنے لگیں گے اور اُن کو زکام سا لاحق ہو جائے گا " یہ سن کر ابن مسعودؓ نے کہا کہ جو جانتا ہو وہ کہے، اور جو نہ جانے۔ وہ اللہ پر چھوڑ دے۔ مذکورہ آیت کا یہ مطلب ہے کہ قریش نے آنحضرتؐ کی نافرمانی کی آپ نے بددعا کی چنانچہ اُن پر حضرت یوسفؑ کا سا قحط نازل ہوا اور اُن کو اتنا دبایا کہ وہ ہڈیاں تک کھا گئے۔ اُن کی مصیبت کے مارے یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب اُن میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں[1] پاتا۔

۳۔ اہل عرب کے اقوال و افعال کے مختلف طریقوں سے بہرہ ور ہونے میں بھی صحابہ میں درجے تھے۔ بعض جو ایام جاہلیت کی رسوات حج سے واقف تھے حج کی آیات کو دوسروں سے جو ان سے ناواقف تھے زیادہ سمجھتے۔ علیٰ ہذا القیاس اُن آیات کو جن میں عربوں کے معبودان باطل اور ان کے طریقۂ عبادت کی مذمت کی گئی ہے، پورے طور پر سمجھنے کے لئے جاہلی رسوات کا علم ضروری تھا۔

۴۔ اسی طرح جزیرۂ عرب میں بسنے والے یہود و نصاریٰ کے افعال و حرکات جو وہ نزول قرآن کے زمانے میں کرتے تھے، جاننے اور نہ جاننے کا اثر فہم قرآن پر پڑتا تھا۔ قرآن میں ان کی طرف اشارات کئے گئے ہیں اور نیز اُن کی مذمت اور تردید کی گئی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فہم قرآن کے متعلق صحابہ کے مختلف مراتب تھے اور بعد کی نسل یعنی تابعین میں اُن سے زیادہ اختلاف مراتب وجود میں آیا۔

تفسیر کے ماخذ | تفسیر کی ایک شق تفسیر بالمنقول ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ آیات کی تفسیر یا تشریح جو آنحضرتؐ نے فرمائی۔ مثلاً الصلوٰۃ الوسطیٰ سے صلوٰۃ عصر

---

(۱) الموافقات جزو ۳

مراد لی۔ اسی طرح حضرت علیؓ سے روایت ہو کہ آپ نے رسول اللہ سے یوم الحج الاکبر کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ قربانی کا دن، اسی قسم کی بیشتر روایتیں آپ سے مروی ہیں۔ حدیث کی چھ صحیح کتابوں کے علاوہ قصہ گوؤں نے اس قبیل کی تفسیر اور بہت کر ڈالی علما، حدیث نے ان روایات کی کافی چھان بین کی اور صحیح وضعیف کو پرکھا۔ غضب تو یہ ہو کہ بیک وقت ایک آیت کی دو تفسیریں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں، آنحضرت سے مروی ہیں۔ اس قسم کی کثیر التعداد مثالیں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں بیان نہیں کرتے بعض علما نے تفسیر کے اس باب کا بالکل انکار کر دیا ہے۔ یعنی وہ اس قبیل کی روایتوں کی صحت تسلیم نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ تین چیزیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، تفسیر، جنگوں اور غزوں کی روایتیں۔ اس تفسیر کی عدم صحت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مفسرین نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ اگر ان کے نزدیک یہ تفسیر قابل اعتماد ہوتی تو وہ کبھی اس سے بے التفاتی نہ برتتے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس منقول تفسیر کا ذخیرہ بڑھتا چلا گیا۔ آنحضرت کے بعد صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی اسی زمرہ میں داخل ہو گئے چنانچہ عہد اول کی تفسیریں تمام کی تمام انھیں اقوال پر مشتمل ہیں۔

۲۔ تفسیر کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ اجتہاد ہے، یا اسے دوسرے لفظوں میں رائے کہہ لیجئے۔ مفسر عربی زبان اس کے اسالیب بیان۔ ادب جاہلی وغیرہ سے معرفت تامہ رکھنے کے علاوہ شان نزول سے بھی واقف ہو۔ ان سب لوازم کے بعد وہ آیات پر غور کرتا اور اپنی رائے سے ان کی تفسیر کرتا ہے۔ صحابہ کا ایک گروہ اس قسم کی تفسیر کرتا تھا چنانچہ ابن عباس اور ابن مسعود سے اس

---

(۱) الاتقان جزو ۲۔ امام موصوف کے شاگردوں کا خیال ہے کہ اس قول سے مراد یہ ہے کہ اس قبیل کی روایتوں کا غالب حصہ صحت اسناد سے خالی ہے۔

قبیل کی بہت سی روایتیں مروی ہیں۔

تفسیر کے سلسلے میں صحابہ اور تابعین کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے دینے سے مطلقاً گریز کرتی۔ سعید بن المسیب سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا تو آپ فرماتے کہ قرآن میں میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ ابن سیرین نے عبیدہ سے اس قسم کی ایک اور روایت کی ہے۔ دوسری جماعت اجتہاد کو جائز رکھتی اور اس کے عدم اظہار کو علمی بخل سے تعبیر کرتی۔ اس جماعت میں ابن عباس۔ ابن مسعود اور عکرمہ خاص طور پر معروف ہیں۔ یہ لوگ پوری استعداد اور قابلیت بہم پہنچائے بغیر تفسیر کی کوشش کرنے والے کو برا سمجھتے اور اس طرح اپنے اعتقاد اور رائے کے مطابق آیات کو توڑنے موڑنے کو ناجائز ٹھیراتے۔ اُن کے نزدیک عقیدہ قرآن کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ قرآن عقیدے کے تابع ہو۔

اسی اجتہاد کا نتیجہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور آیات کے متعلق صحابہ اور تابعین میں اختلاف رونما ہوا۔ ابن جریر طبری کی تفسیر ان اختلافات کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

۳۔ مذکورہ ماخذوں کے علاوہ تفسیر کا ایک اور ماخذ ہے جس سے مفسرین نے کافی سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ طبعی بات ہے کہ بعض افراد کا رجحان تفصیل کی طرف ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت سن کر اس کے متعلقات کے متعلق سوالات پیدا کر دیے۔ اصحاب کہف کے کتے کا قصہ سن کر اس کا رنگ دریافت کیا اور جب یہ پڑھا "فقلنا اضربوہ ببعضہا"، تو بعض کا مفہوم پوچھنے لگے۔ حضرت نوحؑ کا بیان سنا تو اُن کی کشتی کے قد و قامت وجسامت کے سوالات جڑ دیے۔ حضرت یوسفؑ کی خواب کے سلسلے میں ستاروں کے نام پوچھے۔ الغرض ہر واقعے کی ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اُن کی اس خواہش کی کمی تورات اور اس کے حواشی سے پوری ہوتی تھی، اور نیز یہود میں سے بہت سے افراد زمرۂ اسلام میں داخل ہوگئے تھے، اُن کے ذریعے سے اس قسم کی روایتیں بہ کثرت تفسیر قرآن میں جمع ہوگئیں۔

ان سے آیات کی تشریح کی جاتی تھی۔ جلیل القدر صحابہ مثلاً ابن عباس وغیرہ نے ان روایات کے لینے کو ناپسند فرمایا، خود آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "اہل کتاب کی باتوں کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ انھیں جھٹلاؤ" لیکن جمہور اسلام نے اس کے خلاف کیا، انھوں نے یہودی روایات کو سچا سمجھا اور اپنی کتابوں میں نقل کیا۔ اگر اس کی مزید تصدیق درکار ہے تو تفسیر طبری ملاحظہ کیجئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن عباس کعب الاحبار کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور اس سے روایات لیتے تھے۔ اس بارے میں ابن خلدون کی رائے قابل توجہ ہے وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتا ہے کہ "اہل عرب قبل از بعثت، علم و ادب سے کورے تھے اور وحشت و جہل کا اُن پر تسلط تھا۔ جب تقاضائے بشریت نے اُن کے دلوں میں ابتدائے آفرینش کے اسرار اور زمین و آسمان اور موجودات کی تخلیق کے اسباب معلوم کرنے کا شوق پیدا کیا تو وہ طبعاً اہل کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ لوگ زیادہ تر یہودی تھے اور باقی نصاری اور یہ یہود عربوں ہی کی طرح بادیہ نشین تھے ان کی علمی حیثیت عامۃ الناس اہل کتاب سے زیادہ نہ تھی اور ان کی اکثریت بنی حمیر پر مشتمل تھی، جب اسلام لائے تو وہ چیزیں جو احکام شرعیہ کے مخالف نہ تھیں ان کے ہاں محفوظ رہیں۔ اور یہ زیادہ تر ابتدائے آفرینش تاریخ اور جنگوں کی روایتیں اور یہودی داستانیں تھیں۔ چنانچہ یہودی ادب کا یہ سرمایہ کعب الاحبار۔ وہب بن منبہ اور عبد اللہ بن سلام وغیرہ کی وساطت سے تفسیر میں داخل ہوگیا۔ چونکہ ان روایتوں کا اسلام کے اصولوں اور احکام دینی سے کچھ تعلق نہ تھا اس لئے مفسرین نے ان کے متعلق تساہل برتا اور کتابوں میں نقل کرتے گئے۔[1]

دورِ صحابہ | صحابہ کرام کی ایک قلیل التعداد جماعت تفسیر بالرائے میں مشہور ہوئی۔ ان میں سے روایت کی کثرت کے اعتبار سے حضرت علیؓ۔ ابن عباس۔ عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب اول درجے پر ہیں۔ ان کے بعد زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر آتے ہیں۔

---

(۱) المقدمہ صفحہ ۳۶۷

اس جگہ ہم صرف اول الذکر چار بزرگوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف بلاد اسلامیہ میں تفسیر کی نشو و نما میں ان ہی پر زیادہ انحصار رہا۔ تفسیر میں ان کا تبحر اور مرتبہ کمال نتیجہ تھا۔ ان کی زباندانی، آنحضرت سے طویل صحبت اور معارف اور آداب عرب سے آگاہی کا۔ یہ لوگ قرآن کی تفسیر میں اجتہاد اور رائے کو مکروہ نہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے ابن عباس کو آنحضرت کی طویل صحبت نصیب نہ ہوئی لیکن خلفاء راشدین اور معزز صحابہ کی رفاقت اور ہم نشینی نے اس کمی کی تلافی کر دی۔ یہ زیادہ تر صحابہ سے روایات بیان کرتے تھے۔ روایت کی کثرت کے اعتبار سے ابن عباسؓ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد ابن مسعودؓ۔ علیؓ اور ابیؓ ہیں۔ یہ ترتیب کثرت روایت کے اعتبار سے ہے نہ کہ صحت کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور ابن مسعود سے اوروں سے کہیں زیادہ موضوع روایتیں منسوب کی گئیں۔ اس کے کئی ایک سبب ہیں۔ اہم ترین سبب یہ ہے کہ یہ ہر دو بزرگ خاندان نبوت میں سے تھے۔ ان کی طرف موضوع روایات کو منسوب کرنے سے اوروں سے زیادہ ساکھ اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت علی کے علمی فضل و کمال کو اپنے زعم میں اور بلند کرنے کے لئے آپ سے موضوع روایات منسوب کر دیں۔ اسی طرح خلفائے عباسیہ سے تقرب چاہنے والوں نے اُن کے مورث اعلیٰ یعنی ابن عباس سے بکثرت روایتیں بیان کرنی شروع کیں ہم حضرت علی کے تبحر کے متعلق ابن ابی حمزہ کا بیان پیش کئے دیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو ام القرآن (سورہ فاتحہ) کی تفسیر سے ستر اونٹ لادوں۔ ابوالطفیل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی کو خطبہ دیتے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے سوال کرو۔ خدا کی قسم کچھ بھی پوچھو۔ میں اُس کا جواب دوں گا۔ کتاب اللہ کے متعلق سوال کرو۔ خدا کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں کہ میں نہ جانوں وہ رات میں اتری یا دن میں۔ میدان میں یا پہاڑ میں۔ ان دو روایتوں سے ان لوگوں کے رویے کا اندازہ ہو جائے گا۔

اب ابن عباسؓ کو لیجئے۔ ان سے اس کثرت سے روایتیں مروی ہیں کہ شمار نہیں

قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جس میں اُن کے ایک یا ایک سے زیادہ اقوال نہ ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اُن سے روایت کرنے والوں کا بھی کوئی حساب نہیں۔ بعد میں ارباب نقد و تحقیق نے روایات کے ان سلسلوں کی چھان بین کی بعض کو انھوں نے معتبر مانا اور دوسروں کو تسلیم نہیں کیا۔ ان میں سے معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کا سلسلہ روایت سب سے معتبر ہے اور امام بخاری نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور سلسلے ہیں جو صحت کے درجے سے گرے ہوئے ہیں۔ اُن کو بغرض اختصار حذف کئے دیتے ہیں۔

ابن عبد الحکیم کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو کہتے سنا کہ تفسیر میں ابن عباس سے سو سے زیادہ روایتیں ثابت نہیں۔ اگر اس قول کو صحیح تسلیم کریں تو پھر ان موضوع روایتوں کی قلعی کھل جاتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ روایات گھڑنے والوں نے کس جرأت سے کام لیا۔ اس قسم کی روایتوں کی مزید تحقیق کے لئے ابن جریر کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ بعض دفعہ ایک آیت کی تفسیر دو طریقوں سے ابن عباس سے مروی ہے۔ اور ہر ایک دوسرے سے متضاد۔ مثال کے طور پر (محذ اربعۃ من الطیر) لیجئے۔ دو روایتیں ہیں اور دونوں ایک دوسری کی مخالف۔ اور کوئی وجہ تطبیق ممکن نظر نہیں آتی۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ موضوع تفسیر علمی فائدے سے خالی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت صرف تک بندی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر اوقات یہ غور و فکر اور علمی اجتہاد کا نتیجہ ہوا کرتی تھی۔ ہاں حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت بیکار محض ہے۔

گذشتہ بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے بزرگوں سے متعلق جو کچھ مروی ہے اُس کے تین ماخذ ہیں۔

۱۔ آنحضرت سے منقول روایتیں اور نیز وہ واقعات جو صحابہ کے سامنے پیش آئے

---

(۱) الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲۲۵

اور اُن کے متعلق آیات نازل ہوئیں ۔
۲۔ صحابہ کا اجتہاد جو ادب جاہلی، اہل عرب کے عادات اور رسوم اور زبادانی پر مبنی تھا۔
۳۔ اسرائیلیات یعنی یہود کا ادبی اور تاریخی ذخیرہ ۔

دور تابعین | صحابہ کرام کے بعد تابعین کا دور آیا۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے اُن صحابہ مفسرین سے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے روایات لیں۔ چنانچہ ابن عباس رضؓ سے سب سے زیادہ مجاہد، عطا ابن ابی رباح، عکرمہ مولی ابن عباس اور سعید بن جبیر نے روایت کی ہے۔ یہ چاروں حضرات مکہ میں ان سے مستفید ہوئے۔ اور نیز چاروں کے چاروں موالی تھے۔ روایت کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ان کے مختلف درجے ہیں۔ اسی طرح انکی ثقاہت کے بھی علماء نے مراتب قائم کئے ہیں ۔ اول الذکر نے اپنے استاد سے سب سے زیادہ کم روایت کی ہے لیکن اعتماد اور ثقاہت میں سب بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے امام شافعیؒ، امام بخاریؒ اور دوسرے اہل علم نے ان کی تفسیر کو معتبر تسلیم کیا ہے۔ البتہ بعض علماء نے پھر بھی ان سے اعراض برتا ہے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ "اعمش سے پوچھا گیا کہ مجاہد کی تفسیر سے کیوں پہلو تہی کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے" لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے کسی نے بھی مجاہد کے عدم ثقہ ہونے پر طعن نہیں کیا، یہی حال عطاؔ اور سعیدؔ کا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا بھی پایہ روایت معتبر اور مسلم ہے۔ البتہ عکرمہؒ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے بعض ان کو ثقہ مانتے ہیں اور بعض نے ان کی روایتیں قبول نہیں کیں۔ امام بخاری ان کے ثقہ ہونے کے قائل تھے اور ان سے روایت بھی کی ہے۔ یہ ابن عباسؓ کے مولی تھے اور اصلی وطن مغرب یعنی بلاد مراکش تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں علم میں بڑی جرأت ہے اور اُن کا خیال ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز سے واقف ہیں۔ سعید بن المسیب سے ایک شخص نے ایک آیت کے معنی دریافت کئے آپ نے کہا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ جاؤ اُس سے پوچھو جس کو زعم ہے کہ قرآن کی کوئی چیز

اس سے مخفی نہیں یعنی عکرمہ[1]۔

عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے عراق میں مسروق بن اجداع مشہور ہوئے یہ عربی النسل تھے اور بڑے پرہیزگار، خدا پرست اور ثقہ تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی مشکل اور عمیق مسائل میں قاضی شریح ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بصرہ میں قتادہ ابن دعامہ مشہور تھے۔ نابینا تھے، عربی، تاریخ جاہلیت اور عربوں کے عادات و رسومات میں کمال مہارت کی وجہ سے تفسیر میں ان کو بڑی مدد ملی۔ ان کا ثقہ ہونا مسلم ہے۔ البتہ قضا و قدر کے مسائل میں زیادہ الجھنے کی وجہ سے بعض علماء نے ان کی روایتوں سے اعراض برتا۔

اسرائیلیات | اس عہد یعنی عہد تابعین میں اسرائیلیات اور نصرانیات سے تفسیر کی ضخامت بہت بڑھ گئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ بکثرت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور دوسرے ان ہر دو قوموں کے متعلق قرآن میں جو واقعات بیان کئے گئے تھے اُن کی مزید تفصیل معلوم کرنے کا شوق عام ہو گیا۔ اس صنف روایت کا بطل (ہیرو) وہب بن منبہ ہے۔ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ یہود یمن میں سے تھا۔ بعد میں اسلام لایا۔ یہودی روایات اور قصوں کو جانچے پرکھے بغیر نقل کر دیتا تھا اور اُن کو علمی سانچے میں ڈھالنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں نے اس کی روایات نقل کرنے میں ضروری احتیاط نہ برتی اور بقول ابن خلدون، چونکہ ان اسرائیلیات کو احکام دین اور اصول اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے مفسرین نے ان روایات کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا مثال کے طور پر طبری لیجئے، آپ نے ابن جریج سے بہت سی روایتیں لی ہیں۔ اور پھر اس کے متعلق علمائے اسلام کے بیانات ملاحظہ فرمائیے۔ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اس کو رومی النسل بتاتے ہیں اور اسلام لانے سے قبل وہ نصرانی تھا۔ علماء کے بیان کے بموجب وہ موضوع حدیثیں گھڑتا تھا اور تقریباً نوے عورتوں سے بطریق متعہ نکاح کیا اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسلام میں اس نے کتاب تالیف کی[2] تقریباً ۸۰ ہجری میں پیدا ہوا اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر جزو اول (۲) ابن خلکان

صحابہ اور تابعین کے بعد علماء نے فن تفسیر میں کتابیں تالیف کرنی شروع کیں۔ ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ رائج تھا اور وہ یہ کہ آیت کے بعد اس کے متعلق صحابہ اور تابعین کے اقوال سند کے ساتھ نقل کر دیتے۔ ان میں سے سفیان بن عیینہ۔ وکیع بن الجراح اور عبدالرزاق وغیرہ مشہور ہوئے لیکن ان کی تالیفات ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ البتہ ان کے بعد آنے والے طبقے میں سے ابن جریر طبری سب سے زیادہ معروف ہیں۔

تفسیر کی تاریخی حیثیت واقعہ یہ ہے کہ ہر عہد کی تفسیر اس عہد کی علمی سرگرمیوں سے متاثر ہوتی رہی اور (ابن عباس سے لے کر شیخ عبدہ تک) ہر عہد کے افکار و آرار، علمی نظریوں اور مذہبی خیالات کا رد تو اس میں نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی عہد کی لکھی ہوئی تمام تفاسیر کو سامنے رکھیں تو اس عہد کی علمی سرگرمیوں، اور خیالات اور آرار کی رد کا پتہ چل جاتا ہے۔

صحابہ اور تابعین اولین کے ہاں تفسیر کرتے وقت الفاظ کی تشریح پر اکتفا کیا جاتا تھا اور اس لغوی تشریح میں بھی اختصار مد نظر رکھا جاتا۔ مثلاً غَیرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ، غیر متعرض لمعصیۃ۔ اور اگر کہیں رسوم جاہلیت کا ذکر ہوتا تو اس کا بیان کر دیتے۔ اور اگر زیادہ دور گئے تو شان نزول بیان کر دی ان کے بعد آنے والوں نے اسرائیلیات اور نصرانیات کی بھرمار کرنی شروع کر دی۔ اس عہد کی تفسیروں میں تو نہ کہیں فقہی مسائل کے استنباط کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ کسی خاص مذہبی نقطۂ نظر کی مدافعت مقصود رکھی گئی۔ اس کے بعد قضا و قدر کی ہوا چلی، چنانچہ اس عہد کی تفاسیر ان خیالات سے پُر ہیں، اور ہر ایک مفسر تفسیر کرتے وقت جبر و اختیار کی بحثیں ضرور چھیڑتا ہے۔ پھر فقہی سرگرمیوں کا زمانہ آیا اور علمار تفسیر نے آیات سے مسائل استنباط کرنا شروع کئے۔ اس کے بعد علم نحو اور علم معانی و بیان نے زور پکڑا اور آخر میں علم اخلاق نے اس کی جگہ لی۔

مصر کا مشہور ترین ادیب

جرجی زیدان

الہلال (مصر) کی تیس سالہ مدت حیات میں جرجی زیدان نے انشا پردازی کی ہر صنف میں خامہ فرسائی کی ہے۔ یعنی ادبی و سیاسی، تاریخی و معاشی مقالات سپرد قلم کئے ہیں جن کو اس کی وفات کے بعد ایک مجموعہ کی صورت میں طبع کرا دیا گیا ہے۔ ابتدا میں جرجی زیدان کی مختصر تاریخ حیات بھی زینت مجموعہ ہے جس کا اکثر حصہ صاحب مجموعہ کے روزنامچہ سے لیا گیا ہے۔

میں قارئین جامعہ کے سامنے اس کا ترجمہ صرف اس مقصد سے پیش کر رہا ہوں کہ علم کا شغف رکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ علم کو ظاہری ثروت و وجاہت سے عام طور پر کس قدر بعد رہا ہے۔ لیکن صدہا تکالیف و مصائب کے باوجود علمی کاوشیں برابر جاری رہیں۔ ظاہری موانعات جسم سے گزر کر قلب پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ یہ کشمکش عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو علمی ذوق رکھنے کے باوجود کشمکش حیات سے خائف ہو کر اپنے مقصد عزیز سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

جرجی زیدان کی زندگی بھی مجموعہ ہے عجیب و غریب حالات کا کہ اس بیچارے نے نکبت و افلاس اور ہر قسم کے موانعات کے باوجود علم و ادب کی کس قدر عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

خاندانی حالات | جرجی زیدان نے اپنے روزنامچہ میں اپنے خاندانی حالات کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے، جس قدر کہ اپنے باپ سے سنا۔ اس کے باپ نے ان حالات کو اس طور پر بیان کیا، کہ

"میرے باپ کا نام زیدان مطر یا زیدان یوسف مطر تھا۔ امیر مصطفیٰ ارسلان کی والدہ کے پاس بطور خدمتگار کے رہتا تھا۔ امیر کی والدہ جبوس گزشتہ صدی کے اوائل میں عین عنوب (مصر کے قریب ایک جگہ) اور اس کے ملحقات پر وکیل کی حیثیت سے حکومت کرتی تھی۔

جس وقت ابراہیم پاشا نے سوریا پر حملہ کیا اور عکّہ کو فتح کر لیا تو اس کا ارادہ ہوا کہ پہاڑی علاقوں پر بھی دھاوا بولا جائے۔ جبوس منجملہ ان لوگوں کے تھی جو ابراہیم پاشا کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اس نے زیدان سے ہمراہ چلنے کی خواہش کی مگر اس نے انکار کیا۔ اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ آخر کار ابراہیم کو فتح حاصل ہو گی پھر اپنے اہل و عیال کو بے یار و مددگار کس طرح چھوڑ سکتا تھا اور بھگدڑ میں ساتھ لیجانا بھی مشکل تھا۔ جبوس نے حد سے زیادہ مجبور کیا، مگر وہ اپنی انہیں مجبوریوں کی بنا پر ساتھ نہ دے سکا۔ وہ اپنے دل میں اس کی طرف سے کسی قدر خلش لئے ہوئے روانہ ہو گئی۔

۱۸۳۲ء میں ابراہیم پاشا نے امیر بشیر کی امداد سے علاقہ (جبل) پر قبضہ کیا۔ جبوس اس وقت تک روپوش رہی، جبتک کہ ابراہیم پاشا کی حکومت پر زوال نہ آیا۔ عین عنوب پہنچتے ہی اس نے زیدان سے اپنے سابقہ بغض کا بدلہ اس طور پر لیا کہ اس کی ساری جائداد ضبط کر لی۔ اس کو طرح طرح سے ذلیل کیا۔ یہ بدسلوکی زیدان کے لئے بڑی مصیبت تھی جس نے اس کی صحت پر نمایاں اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ اس غم نے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

زیدان نے اپنے پیچھے ایک بیوی، دو لڑکیاں اور دو لڑکے چھوڑے جن میں سب سے بڑا یہی (جرجی زیدان کا باپ) تھا۔ اس کی عمر اس وقت دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ گویا تمام خانگی ذمہ داریوں کا بار اسی کے سر پر تھا۔

چونکہ اب اس کی ماں عین عنوب میں کسی طرح نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے بچوں سمیت بیروت چلی گئی۔ گو کہ گھر کے تمام لوگوں کی توقعات اس کے ساتھ وابستہ تھیں مگر بیروت کی یہ حالت تھی کہ آبادی بہت معمولی۔ روزگار بالکل ندارد۔ صرف چند کام تھے۔ تجارت اور حکومت

فوجی اور دیوانی ملازمتیں۔

اس کے خاندان کے مورث اعلیٰ کی صحیح تاریخ غیر محفوظ ہے۔ اس کی وجہ خود جرجی زیدان نے یہ بیان کی ہے کہ "میرے باپ نے اپنے آبائی گھر کو بہت ہی کشمکش کی حالت میں چھوڑا۔ نیز یہ کہ اس میں اس وقت اتنی سمجھ نہیں تھی اور بیروت میں بھی اس نے ایک ان پڑھ غریب کی طرح تربیت پائی۔ اسی کے ساتھ گھر کی فکریں۔ خاندان کے متعلق تحقیق ہوتی تو کہاں سے؟

"جب میں جوان ہوا اور مجھے اپنے خاندان کے متعلق تفتیش کا خیال پیدا ہوا تو میں نے عین عنوب کے ایک شخص کو جو خاندان مطرا اور اس کی اصلیت سے واقف تھا دریافت حال کے لئے لکھا تو وہاں سے ایک شخص کی زبانی مجھ تک یہ جواب پہنچا کہ آل مطر کے چند افراد یہاں غربت و پریشانی کے عالم میں آئے۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتہ نہیں۔ البتہ ان میں سے ایک شخص نے جس کا نام زیدان تھا۔ جبوس کے خدام میں داخل ہونے کے لئے پیش قدمی کی۔"

"ایک دوسرے شخص نے بھی مجھے بتایا کہ تمہارا خاندان چند پشتوں سے عین عنوب میں آکر رہا تھا غرضیکہ میرے خاندانی حالات کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کا اصلی وطن حوران ہے، لیکن جس طرح کہ فرقہ ارثوذ کسیہ کے خاندانوں میں سے کسی نے فقر و فاقہ سے تنگ آکر شوف میں سکونت اختیار کی۔ کسی نے جنوبی لبنان روم میں، اسی طرح ہمارے بڑوں نے عین عنوب میں۔"

جرجی زیدان کی پیدائش و تربیت | ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بیروت میں پیدا۔ ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں پائی۔ ناسازگار حالات کی وجہ سے بچپن ہی میں اسکول کو خیرباد کہدینا پڑا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی محنت و مزدوری کرنے لگا۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر پورے بارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی مگر چونکہ علم و ادب کی طرف اس کا طبعی میلان تھا، اس لئے جب کبھی ایسا موقع ملتا کہ کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی یا کسی اہل علم سے ملاقات ہو جاتی تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا۔ اسے فوٹوگرافی اور مصوری سے بھی دلچسپی تھی، اسی لئے اس کی پڑھی ہوئی تمام کتابوں میں کوئی نہ کوئی تصویر

بنی ہوئی ملتی ہے۔ غرضکہ فرصت کے اوقات کو اسی قسم کے کاموں پر صرف کرتا تھا تاکہ عمر بے کار نہ ضائع ہو۔

مدرسہ شبینہ میں اس نے انگریزی زبان صرف پانچ ماہ میں حاصل کی، حالانکہ دن بھر اور شب کے ابتدائی حصہ میں بھی پیٹ کے دھندے میں لگا رہتا تھا۔ اس کی تعلیم اکثر رات کے آخری حصوں ہی میں ہوئی۔ تھکنے کے نام سے واقف نہ تھا۔ کام سے بالکل نہ گھبراتا۔ بلکہ بعض وقت مسلسل چوبیس گھنٹے کام ہی کرتا رہتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک ادبی جماعت کا جس کا نام شمس البر تھا رکن ہوگیا۔ اس جماعت کے اکثر ارکان امریکن کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ شمولیت اس کے رجحانات کی ترقی کا باعث ہوئی، ارکان جماعت اس کی صحبت سے خوش تھے، اس کی گفتگو سے دلچسپی لیتے تھے۔ اسی لئے اکثر کالج کے جلسوں میں بھی مدعو کرتے تھے تاکہ دلچسپ تقریروں اور مباحث سے لطف اندوز ہوں، لیکن جب کبھی وہ جلسے میں آیا تو تقریروں کو سن کر غمگین واپس ہوا۔ اعلیٰ تعلیم سے محرومی کے باعث غیرت و شرم کا ایک دریا اس کے سینے میں موجزن ہوتا تھا۔

۱۸۸۲ء میں اس نے یہ بالکل طے کرلیا کہ سب کام چھوڑ کر طلب علم میں مصروف ہوجائے اسے معلوم ہوا کہ طب بہترین علم ہے، کیونکہ اس سے انسان میں علمیت بھی پیدا ہوجاتی ہے اور کسب معاش کا ایک ذریعہ بھی ہاتھ آجاتا ہے۔ اپنے بعض احباب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اس دشوار گزار راستے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ اس میں بڑا وقت صرف ہوتا تھا۔ کم سے کم دو سال سائنس پر صرف کرنا پڑتے، اس کے بعد چار سال طب پر۔ لیکن یہ بات اس کے ارادے کو پست نہ کرسکی۔ اس نے سائنس اپنے ایک دوست سے تقریباً ڈھائی مہینے میں پڑھ ڈالی۔ چونکہ اسکول کھلنے کا وقت آچکا تھا۔ امتحان داخلے میں بیٹھا اور پاس ہوگیا، پہلے ہی سال سے انتہائی محنت و کوشش تعلیم پر صرف کی سالانہ امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کئے اگرچہ اب بھی فکر معاش سے اسے چھٹکارا نہیں تھا، کچھ نہ کچھ کام اپنے اخراجات کے لئے کرنا

ہی پڑتا تھا۔ غرض کہ اس کی اس امتیازی کامیابی پر اس کے تمام ساتھی اس سے کسی قسم کا کینہ رکھنے کی بجائے بے انتہا خوش تھے۔ اس کو کوشش اور ذہانت کے معاملے میں مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔ صرف اس لئے کہ وہ، لوگ اس کی خوش اخلاقی، نرم مزاجی اور اس کے اخلاص سے متأثر تھے۔

دوسرے سال پھر مدرسے میں آیا۔ ابھی تعلیم کو شروع ہوئے دو ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ جامعہ نے اندرونی معاملات کی وجہ سے ایک زبردست شورش برپا ہوئی جس کے نتیجے میں اچھے اچھے طلبہ کو نکلنا پڑا۔ جرجی زیدان بھی انھیں نکلنے والوں میں تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اطبا شام کی ایک مشہور جماعت کے پاس علوم صیدلیہ (جڑی بوٹی) کو عملی طور پر حاصل کرنے کے لئے پہنچا۔ ان اطبا میں کورنیل مراد بک، حکیمباشی العسکر، ڈاکٹر فانڈیک وغیرہ تھے یہاں رہ کر مندرجہ ذیل علوم میں سند حاصل کی۔

لاطینی زبان، طبیعیات، تشریح حیوانات، نباتات، طبقات الارض، کیمیا عضوی و معدنی، تحلیل کیمیائی، مواد طبی، اور قرابادین علمی و عملی۔

سفر مصر، شام، انگلینڈ اس کے بعد حوادثات عربیہ کے ختم ہونے پر مصر مدرسہ قصر عینی میں تکملۂ طب کے لئے روانہ ہو گیا لیکن چونکہ طب کی سند حاصل کرنے کے لئے ایک مدت درکار تھی اس لئے اپنی توجہ کو اس نے دوسرے علوں پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں جریدہ "الزمان" کی ادارت اس کے سپرد ہوئی۔ قاہرہ میں اس وقت یہی ایک روزنامہ تھا۔ ایک سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ زمانہ ادارت کو گزرا تھا کہ غردون پاشا کی رہائی کے لئے سوڈان پر حملہ کیا گیا تو یہ بھی الزمان کی ادارت کو چھوڑ کر جنگی وقائع نگار کی حیثیت سے ساتھ ہو لیا۔ صرف اس لئے کہ اس ملک کے حالات کا علم حاصل کر سکے۔ تقریباً دس ماہ سوڈان میں گزارے۔ اس اثنا میں بڑے بڑے ہولناک واقعات اس کی نظروں کے سامنے گزر گئے۔ اس سفر میں جو کچھ تکلیف اسے اٹھانا پڑی اس کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنی آنکھوں سے موقع جنگ کو دیکھا کہ توپیں اور بندوقیں دھڑا دھڑ وغ

رہی ہیں۔ سیکڑوں اور ہزار لعل بے حس و حرکت دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دس ماہ بعد لشکر کے ساتھ وہ بھی واپس ہوا۔ حسن خدمت کے صلے میں اسے تمغے دئے گئے۔

اس کا شوق علم مرور ایام کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ میدان جنگ سے واپسی پر بہت دنوں مصر میں قیام نہ کیا۔ بلکہ ۱۸۸۵ء میں بیروت پہنچا۔ یہاں آئے ہوئے اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مجلس علوم مشرقیہ نے اسے اس لئے مدعو کیا کہ وہ اس کی مجلس عاملہ کا رکن بن جائے۔ بیروت میں تقریباً دس ماہ اس کا قیام رہا۔ اس قلیل مدت میں وہ مشرقی لغات کا مطالعہ کرتا رہا۔ عبرانی سریانی اور بہت سی زبانیں سیکھ لیں۔ اس کے بعد ہی اپنی کتاب الفاظ العربیہ و الفلسفۃ اللغویہ تصنیف کی۔

اسی زمانے میں اس کے ایک دوست نے "البطلین" کے نام سے ایک ناول لکھا جس میں ایک بطل جرجی زیدان کو اور دوسرا جنرل غردون پاشا کو قرار دیا۔ واقعات کے سلسلے میں مؤلف روایت نے آداب زندگی کی حفاظت اور کوشش کے نتائج کو سراہا تھا جو پورے طور پر جرجی زیدان میں پائے جاتے تھے۔

۱۸۸۶ء میں موسم گرما میں لندن پہنچا۔ زمانۂ قیام میں علمی مجلسوں اور آثار قدیمہ کی سیر میں مصروف رہا۔ برٹش میوزیم کی تو اس نے خاص طور پر سیر کی۔ جاڑوں میں مصر لوٹ آیا۔ یہاں پہنچتے ہی رسالہ "المقتطف" کے سارے کاموں کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی گئی۔ ۱۸۸۸ء تک تو یہاں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد علٰحدگی اختیار کرکے تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگیا۔ اسی زمانے میں "تاریخ مصر الحدیث" دو ضخیم جلدوں میں لکھی۔ اس کی ترتیب میں اسے بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۸۹ء میں فرقہ فریمیشن کے متعلق سب سے پہلی تصنیف اسی نے کی۔ عربی میں اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب تھی۔ اس کے بعد ممالک ایشیا اور قدیم و جدید افریقہ کی مختصر تاریخ مرتب کی۔

۱۸۸۹ء کے آخر میں منتظمین مدرسہ جدیدیہ نے اس کو فرقہ ارثوذکس کی ایک رومی جماعت

کی خاطر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تاکہ عربی کا درس دے۔ دو سال تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ اس زمانے میں اس نے "المملوک الشارد" مشہور ناول لکھا یہ اس کا سب سے پہلا ناول ہے۔ اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی کئی ایڈیشن اس کے شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں اس نے آہستہ آہستہ کچھ پریس کا سامان مہیا کر لیا۔ لہٰذا تدریس سے علٰحدگی اختیار کر کے تحریری کاموں میں مصروفیت پیدا کر لی ۱۸۹۲ء کے آخر میں "الہلال" نکالا۔ ابتدا میں تمام کاموں کو مثلاً مقالۂ افتتاحیہ مضامین۔ مراسلت اور دوسری اخبار سے متعلق چیزوں کو خود ہی انجام دیتا تھا۔ اگرچہ یہ کام کئی آدمیوں کا تھا۔ لیکن وہ بلا کسی کسل و کبیدگی کے مسلسل کام کئے جاتا تھا، صرف اس لئے کہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرے۔ جب "الہلال" کی اشاعت قابل اطمینان ہوگئی تو ادارت کی ذمہ داریاں اپنے جانی کے سپرد کر دیں۔ دوسرے کاموں کے لئے دو اور ملازم رکھ لئے اور خود ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔ الہلال کے اجرا کے بعد اس نے متعدد تصانیف کیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

موسم گرما کی تعطیلات کے زمانے میں اس نے متعدد سفر کئے ہیں، جن میں سے اہم صرف تین سفر ہیں۔ ایک آستانے کا جب کہ وہاں دستوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دوسرا یورپ کا ۱۹۱۲ء میں تیسرا فلسطین کا ۱۹۱۳ء میں۔

۲۱؍ اگست ۱۹۱۴ء کو سہ شنبہ کے دن ناگہانی طور پر اسے موت آگئی حالانکہ اسے نہ کسی قسم کی شکایت تھی نہ کسی مرض میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر ضرور ہوا کہ کسی وجہ سے وہ بہت زور سے چیخا جس سے اس کے گھر والے گھبرا گئے۔ پھر آن کی آن میں اس کی روح دار فنا کو چھوڑ کر دار بقا کو سدھار گئی۔ زندگی کی آخری ساعت تک بالکل صحیح و سالم رہا۔ مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو کرتا رہا۔

جرجی زیدان اور اس کے اخلاقیات | چوڑا چکلا بھرا ہوا بدن، گندمی رنگ، چمکدار آنکھیں جو اس کی صحت اور بشاشت کا اظہار کریں۔ اپنے تمام کاموں میں ثابت قدم، فراخ دل۔ شیریں کلام۔

اپنے سے کم مرتبہ شخص سے گفتگو میں عار نہ کرنے والا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی ملنے والا، اس کا نمایاں وصف پاس ضمیر دخود داری تھا۔ مطران نے اس کے متعلق بہت ہی دلچسپ جملہ کہا ہے کہ
"میں نے کسی شخص کو سوائے جرجی زیدان کے اجتماع ضدین کا مصداق نہیں دیکھا یعنی کبر اور فروتنی۔"

ہر کام میں تساہل کا خوگر تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کو تو خیال میں بھی نہ لاتا تھا۔ اپنی مخالفتوں کی طرف کبھی توجہ ہی نہ کرتا تھا۔ بعض وقت اس کی تصنیفات پر سخت سے سخت تنقیدیں کی گئیں لیکن اس کے کوئی جواب نہ دیا۔ اور اگر کبھی دیا بھی تو بہت اختصار کے ساتھ جس سے نفس مسئلہ کی تصحیح مقصود ہوتی۔ الہلال کی بیسویں جلد کے صفحہ ۵۶۲ پر ایک سائل کے جواب میں جس نے لکھا تھا کہ بعض رسائل میں آپ کی تصنیفات پر تنقید کا باعث کیا ہے، لکھا تھا۔
"بغض و تشنیع کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، کیونکہ جس کام کے لئے میں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے، استقلال کے ساتھ اس کو انجام دئے جاؤں گا۔ جس وقت سے میں علمی طور پر دنیا میں داخل ہوا ہوں یہی چیز میرے اطمینان قلب کا باعث ہے۔ مجھے عوام کی خدمت کا سودا ہے میرے دل میں اپنے زمانے کے ادبا اور علمار کی رضاجوئی کے جذبات ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ یہ چیز مجھے حاصل ہے۔"

اسی طرح الہلال کی انیسویں جلد کے صفحہ ۱۱۰ پر "نحن والجامعة المصریہ" کے عنوان سے اس خاص ہنگامے کے متعلق تصریحات کی ہیں، جو اس کے جامعہ مصریہ میں استاذ تاریخ اسلام مقرر کرنے پر برپا ہوا تھا۔ اور پھر اسے اس منصب سے علٰحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اس موقع پر اس نے بہت اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر لکھا کہ کس طرح منتظمین جامعہ نے مجھے بلایا اور میں نے کس غرض سے بخوشی اس خدمت کو قبول کیا تھا۔

اغراض سے بالاتر ہو کر بہت خلوص کے ساتھ کاموں کو انجام دیتا تھا۔ اسے ہر وقت حقیقت کی جستجو رہتی تھی اس کا مشہور مقولہ ہے "لا یصح الا الصحیح ولا یبقی الا انسب" درست ہی صحیح ثابت ہوتا ہے

اور بقا سب ہی کو ملتی ہے) اخلاص اس کے ہر عمل اور ہر لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

عربی۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ سریانی اور عبرانی زبانیں پورے طور پر جانتا تھا۔ ان کے علاوہ مشرق وغیر مشرق کی بہت سی زبانوں میں اسے شد بد تھی۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا اپنی ذاتی کوشش اور راسخ عزم کی وجہ سے۔ اس کی عادت تھی کہ جب کسی علم یا زبان کے حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی تو پھر وہ اسے ہی حاصل کر کے چھوڑتا۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے اسے خیال پیدا ہوا کہ جرمنوں نے آثار و آداب عرب کے متعلق کیا لکھا ہے یہ معلوم کرنے کے لئے اپنے طور پر اس نے جرمنی زبان پڑھنا شروع کر دی اور چند مہینوں میں اسے یہ زبان اچھی خاصی آ گئی۔

مستشرقین یورپ اسے بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بعضوں سے تو وہ مل بھی چکا تھا لیکن خط و کتابت تو تقریباً سب ہی سے تھی۔ مشرق میں بھی اس کی کافی وقعت تھی ہزاروں کی تعداد میں اس کے معتقد ہیں۔ عربی زبان کے جاننے والے عام طور پر اس کی تحریروں کے شائق رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "الہلال" اور اس کے ناولوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اُن مواقع سے ہمیشہ کتراتا جن میں اس کی مدح و ستائش کی صورتیں ہوتیں۔ ۱۹۱۳ء میں جب اس نے فلسطین کا سفر کیا تو جہاں جہاں جاتا لوگوں کی خواہش ہوتی کہ اس کی آمد پر جلسہ کیا جائے مگر وہ منظور نہ کرتا۔ البتہ قدس اور نابلس کے لوگوں نے بغیر اس کی اطلاع کے تمام سامان کر لیا اور پھر مجبوراً اسے بھی شریک جلسہ ہونا پڑا۔

بہت سی علمی جماعتوں کا رکن تھا جن میں سے قابل ذکر اٹلی، انگلینڈ اور فرانس کی علمی مجلسیں ہیں۔ جنگ سوڈان کے سلسلہ میں جو امتیازی نشانات اسے ملے تھے ان کے علاوہ اور بھی اعزازی تمغے اس کے پاس تھے۔ مثلاً انگریزی تمغہ۔ مصری ستارہ، واقعہ ابی طلیح کے سلسلے میں ایک نفیس چھڑی۔ عربی ادب میں اس کو ایک زبردست ماہر تسلیم کر کے مصری حکومت نے اسے بڑا اعزاز دے رکھا تھا۔ شام کے امریکن کالج نے وفات سے چند دنوں پہلے ایک علمی ڈگری بھی اسے اعزازی طور پر دی تھی۔

اس کی خصوصیات | ایک مرتبہ ایک مستشرق اس سے ملنے آیا۔ جب اسے دیکھا تو دریافت کیا، کیا آپ ہی جرجی زیدان ہیں؟ اس نے کہا "ہاں" تو اس مستشرق نے کہا کہ آپ کی گوشت و پوست سے بنی ہوئی شکل آپ کی حقیقی شخصیت سے کس قدر مختلف ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ میں ایک ایسے شخص سے ملوں گا جو عمر کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہوگا کیونکہ آپ کی تصانیف کو دیکھ کر میں نے آپ کی عمر کا اندازہ تقریباً اسی سال کیا تھا۔ حقیقتہً یہ اس کی علمی کاوشوں کی ایک پیرائے میں تعریف تھی۔

الہلال | الہلال اس کے مخفی جذبات کے اظہار کی ایک مشین تھی۔ لیکن ابھی پورے بائیس سال نہ ہوئے تھے کہ صاحب الہلال چل بسا۔ اطراف عالم میں جہاں بھی عربی پڑھنے والوں کا وجود تھا وہاں الہلال بھی ضرور پہنچا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مضامین ہر طبقے کے مذاق کے مطابق ہوتے تھے۔ حتی الامکان عبارت آسان ہوتی تھی، کوشش کی جاتی تھی کہ اس طور پر اخبار کو مرتب کیا جائے کہ تفہیم و تفہم میں دقت نہ ہو۔

تصنیفات | مشرق و مغرب میں عام طور پر لوگ اسے ایک زبردست مورخ اور عربی کے ایک ماہر کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، گو اس نے ان دو کے علاوہ اور بہت سے عنوانوں پر معرکۃ الآرا مقالات چھوڑے ہیں۔ غرض کہ محدود مواقع کے لحاظ سے اس نے بہت اہم تصنیفات کی ہیں جن کی عربی زبان کو سخت ضرورت تھی، تاریخ اور لغت میں اس کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں۔

شمار	نام	کیفیت	اجزا	تعداد طبع
(۱)	تاریخ مصر الحدیث	(جدید مصر کے متعلق	۲	۲
(۲)	تاریخ التمدن الاسلامی	(تمدن اسلام)	۵	۲
(۳)	تاریخ العرب قبل الاسلام	(عرب قبل اسلام کے حالات)		
(۴)	تراجم مشاہیر الشرق	(انیسویں صدی کے مشہور مشرقی)		۲

(۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ (عربی زبان کے جزئیات)

(۶) الفلسفۃ اللغویہ والالفاظ العربیہ (فلسفہ لغت)

(۷) تاریخ الماسونیۃ العام (فرقہ فریمیشن کے متعلق)

(۸) تاریخ اللغۃ العربی (عربی زبان کی تاریخ)

(۹) انساب العرب القدماء (عرب قدیم کا نسب نامہ)

(۱۰) علم الفراسۃ الحدیث

(۱۱) طبقات الامم (قوموں کے حالات)

(۱۲) عجائب الخلق

تاریخ التمدن الاسلامی کا ترجمہ پانچ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو۔ ترکی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور فارسی۔ الفلسفۃ اللغویہ کا ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے۔

ناول | اس کی خواہش تھی کہ عوام کے دلوں میں تاریخ اور شہرقیت کے جذبات کسی طرح پیدا کئے جائیں۔ آخر اس کی سمجھ میں یہ صورت آئی کہ تاریخی واقعات کو مسخ کئے بغیر ناول کی شکل دیدی جائے۔ اس طریقے میں اسے بڑی کامیابی ہوئی یہ ناول کئی کئی مرتبہ چھپے بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ان کے تراجم ہوئے۔

اس نے تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ لکھا ہی جو ظہور اسلام سے شروع ہوتا ہے۔ ہر حصہ میں ایک تاریخی دور کو لے لیا ہے۔ پھر اس زمانے کے آدمیوں، انکے خصائل اور حادثات کو بیان کیا ہے۔ حتی الامکان اصلیت (یہ غالبًا محض دعویٰ ہے) کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں نے بھی تاریخی ناولوں کا سلسلہ لکھا ہے۔ لیکن دونوں میں کافی فرق ہے۔ جرجی زیدان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بخلاف دوسروں کے وہ تاریخی واقعات کو ناول کی دلچسپی کے لئے درج کرتے تھے۔

تاریخ اسلام کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اٹھارہ ناول اس کے قلم سے نکلے ہیں۔

۱۔ فتاۃ غسان	۲ جز تین مرتبہ چھپا	۱۰۔ ارمانوسۃ المصریہ	تین مرتبہ
۲۔ غادہ کربلا	"	۱۱۔ عذراء قریش	"
۳۔ الحجاج بن یوسف	دو مرتبہ چھپا	۱۲۔ فتح الاندلس	دو مرتبہ
۴۔ شارل وعبدالرحمٰن	"	۱۳۔ ابو مسلم الخراسانی	"
۵۔ رمضان	"	۱۴۔ العباسہ اخت الرشید	"
۶۔ الامین والمامون	"	۱۵۔ عروس فرغانہ	"
۷۔ احمد بن طولون	"	۱۶۔ عبدالرحمٰن الناصر	"
۸۔ فتاۃ القیروان		۱۷۔ صلاح الدین ومکائد الحشاشین	
۹۔ شجرۃ الدر		۱۸۔ الانقلاب العثمانی	

ان ناولوں کا مشرق کی بعض مشہور زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور یورپین زبانوں میں بھی۔ جن جن زبانوں میں تراجم ہوچکے ہیں ان کی اجمالی فہرست یہ ہے۔ اردو۔ فارسی۔ روسی آذربائیجانی۔ ترکی۔ فرنچ۔ انگریزی۔ روسی اور پرتگیزی۔

چین کا موجودہ نظام تعلیم

قومی تعلیم کے ماتحت چین کے محکمہ تعلیم میں متعدد تبدیلیاں ہوئیں جس وقت قومی حکومت کا پایۂ تخت شہر کنٹن میں تھا تو تعلیمی انتظامات کے لئے ایک کمیٹی یکم مارچ ۱۹۲۱ء میں مرتب ہوئی۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب کہ قومی حکومت کا مرکز نانکینگ میں منتقل ہوا تو ڈاکٹر تسائی یوان پائی کی زیر اہتمام، ایک واہیو یوان (محکمہ تعلیم اور تحقیقات) قائم کیا گیا، اس واہیو یوان نے یکم جولائی ۱۹۲۷ء سے کمیٹی مذکور کی جگہ لے لی۔ پھر جب حکومت نانکینگ کی مجلس عاملہ نے تیسری قانون پاس کرا کے اعلان کیا، تو واہیو یوان نے ۸ دسمبر ۱۹۲۸ء میں موجودہ محکمہ تعلیم کی شکل اختیار کی، تحقیقی کام کے لئے ایک علحدہ ادارہ جو نیشنل سنٹرل اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے، قائم کیا گیا ہے۔

محکمہ تعلیم کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں:

(۱) شعبہ تعلیم اعلیٰ (۲) شعبہ تعلیم ابتدائی و ثانوی (۳) شعبہ تعلیم معاشرتی (۴) شعبہ تعلیم منگولیا و تبت (۵) تعلیمی مجلس انتظامیہ۔

شعبہ تعلیم اعلیٰ کے فرائض میں سے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے انتظام کرنے کے، ان طلبہ کو جو کہ امتحان میں کامیاب ہوں، خاص ڈگریاں دینا بھی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے شعبے میں ان بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی داخل ہے جو کہ بیرون چین میں مقیم ہیں۔ شعبہ تعلیم معاشرتی کا کام عوام الناس، بالغوں اور شہریوں کو مناسب تعلیم دینا ہے۔ ان کی تعلیم میں "اصول ثلثہ" اور دستور کومنگ تانگ کو ایک اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ انھیں مدارس، کتب خانوں، عجائب خانوں کے ذریعے تربیت دینا، میدان، پارک، اور عوام مقامات میں ان کے لئے مناسب اور معصوم تفریح کا سامان مہیا کرنا، معاشرتی حالات کی اصلاح کرنا، رسوم و عادات کی درستی کرنا، تعلیمی مراکز قائم

کرنا، عام ادب کی اشاعت کرنا، عوام الناس کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا یہ سب فرائض اسی شعبے کے ذمے ہیں۔

منگولیا اور تبت کی تعلیم کے شعبے کا یہ فرض ہے کہ ان ملکوں کے تعلیمی حالات کی تحقیق کرے ان کی معاشی اور مالی حالات کی درستی کرے، ان کے باشندوں کی تعلیم کے لئے خاص مدرسین تیار کرے، خاص مدارس کھلوائے، اور ان کی تعلیم کو ہر طرح ترقی دے۔

تعلیمی مجلس کا یہ کام ہے کہ تعلیمی کتابیں لکھوائے اور ترجمہ کرائے، نصاب تیار کرے، درسی کتابوں کا انتخاب کرے۔ لغات وغیرہ مرتب کرائے، علمی اصطلاحوں کا معیار قائم کرے تعلیمی سامان اور اس کے لوازمات مہیا کرے، درسی کتابوں اور نصاب پر نظر ثانی کرے، ان کو چھپوائے، مختلف تعلیمی نمائشوں کے لئے اشیائے نمائش کے اچھے نمونے جمع کرے۔ یہ تو محکمہ تعلیم کے نظام کا خاکہ ہو گیا۔ اب ہم مختصر طور پر اس کام کا ذکر کرتے ہیں جو اس محکمے کے تحت اب تک ہو چکا ہے۔

۱۔ اعلیٰ تعلیم

سابق واہیویوان نے ۱۹۲۸ء کی تعلیمی رپورٹ شائع کی تھی، جس میں قومی یونیورسٹیوں کے جامع حالات درج کئے گئے تھے۔ موجودہ شعبہ تعلیم نے بھی اسی قسم کی ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ واہیویوان نے جو دستورالعمل غیر سرکاری کالجوں، یونیورسٹیوں، ان کی تعلیمی کمیٹیوں اور ٹرسٹیوں کے رجسٹری کرنے کے واسطے شائع کیا تھا اس پر نہایت پابندی اور زور کے ساتھ عمل کیا گیا۔ اس سلسلے میں کئی کالجوں کو تعلیمی ضروریات اور لوازمات مہیا نہ کر سکنے اور مالی حالت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دینا پڑا۔ جہاں تک غیر سرکاری یونیورسٹیوں کی رجسٹری کا تعلق ہے صرف ان کی رجسٹری کی جائے گی جو کہ سابقہ محکمہ تعلیم کی منظوری اور پسندیدگی حاصل کر چکی ہوں اور جن کے قیام کی موجودہ محکمہ تعلیم کو اطلاع دی گئی ہو۔ مالی حیثیت، تعلیم کے ضروری اخراجات، اور تعلیمی ضروریات اور لوازمات کا بھی سوال اٹھا تھا ہنگامی یونیورسٹیوں

کو روکنے اور اچھے اور محنتی طلبہ کو اُن کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے محکمہ تعلیم نے یونیورسٹیوں کے نظم و نسق کے متعلق جو دستور او قاعدہ بنایا ہے اس میں یہ شرط لگا دی ہے کہ یونیورسٹی کا درجہ اسی تعلیم گاہ کو دیا جائے گا جس کے ماتحت کم سے کم تین ملحقہ کالج ہوں تین کالجوں میں سے ایک خالص یا مخلوط سائنس کالج ہو، کیونکہ موجودہ محکمہ تعلیم یہ نہیں چاہتا کہ چین میں ناقص اور بے مایہ یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھے۔ اس کی خواہش صرف یہ ہے کہ جو یونیورسٹیاں موجود ہیں ان کی حالت درست، اصلاح اور ترقی یافتہ ہو جائے سرکاری صوبجاتی اور غیر سرکاری یونیورسٹیاں جنھیں محکمہ تعلیم نے باضابطہ تسلیم کرلیا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سرکاری یا قومی یونیورسٹیاں

نام یونیورسٹی	مقام
۱۔ نیشنل سنٹرل یونیورسٹی	نانکینگ
۲۔ پیکن نیشنل یونیورسٹی	پیپنگ دپیکن
۳۔ نیشنل پیپنگ یونیورسٹی	"
۴۔ نیشنل پیپنگ نارمل یونیورسٹی	"
۵۔ نیشنل شینگ ہوا یونیورسٹی	"
۶۔ نیشنل چیو ٹونگ یونیورسٹی	شنگھائی
۷۔ نیشنل چینان یونیورسٹی	"
۸۔ نیشنل کسپی یونیورسٹی	"
۹۔ ٹونگ جی یونیورسٹی	"
۱۰۔ سن یت سین یونیورسٹی	کنٹن
۱۱۔ پیان انجینرنگ یونیورسٹی	ٹیان تسین
۱۲۔ نیشنل چیکا ئینگ یونیورسٹی	ہانگ چیو

۱۳۔ نیشنل وو ہان یونیورسٹی — وو چانگ، ہوپے
۱۴۔ نیشنل ٹسینگ ٹؤ یونیورسٹی — ٹسینگ ٹؤ اور سی تان

۲۔ صوبجاتی یونیورسٹیاں

۱۔ ہوپے لا اور کامرس یونیورسٹی	ٹیان تسین
۲۔ شمالی شرقی یونیورسٹی	شین یانگ (مکدن)
۳۔ ہاپے یونیورسٹی	پاؤ ٹینگ (ہاپے)
۴۔ چینگ دو یونیورسٹی	چینگ دو (سیوچوان)
۵۔ سیوچوان یونیورسٹی	" "
۶۔ جینگ تا رمال یونیورسٹی	" "
۷۔ ہونان یونیورسٹی	" "
۸۔ شانسی یونیورسٹی	تائی یوان (شانسی)
۹۔ شی آن یونیورسٹی	شی آن (شنسی)
۱۰۔ ہان یونیورسٹی	کائی فانگ (ہانان)
۱۱۔ کوانگ سی یونیورسٹی	کوی لیں (کوانگ سی)
۱۲۔ کوی چیو یونیورسٹی	کوی یان (کوئی چیو)
۱۳۔ آن ہوی یونیورسٹی	آن کینگ (آن ہوی)
۱۴۔ کیرن یونیورسٹی	کیرن (کیرن)
۱۵۔ لان چیو یونیورسٹی	لان چیو (کانسو)

۳۔ غیر سرکاری یونیورسٹیاں جن کی محکمہ تعلیم سے رجسٹری اور منظوری کرائی گئی۔

۱۔ آموی یونیورسٹی	آموی (فوچیانگ)	۲۸ مارچ ۱۹۲۸ء

۲- نانکنگ یونیورسٹی	نانکنگ	۲۰ ستمبر ۱۹۲۸ء
۳- یوتاپیہ یونیورسٹی	خانگھائی	
۴- فو دان یونیورسٹی	"	۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء
۵- شانگھائی یونیورسٹی	"	۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء
۶- کوانگ ہوا یونیورسٹی	"	۱۰ مئی "
۷- گریٹ چائی نا یونیورسٹی	"	۲۰ " "
۸- یان چینگ یونیورسٹی	پیپنگ	۵ جون "
۹- نانکائی یونیورسٹی	تیان تسین	" "
۱۰- سوچیو یونیورسٹی	سوچیو (کیانگ سو)	۲۸ جولائی "
۱۱- چونگ ہوا یونیورسٹی	ووچانگ	۱۰ دسمبر "
۱۲- یونین میڈیکل کالج	پیپنگ	۲۴ مئی ۱۹۳۰ء
۱۳- شانگھائی لا کالج	شانگھائی	۶ جون ۱۹۳۱ء

۲- فنی تعلیم

وا سیوان کے نقش قدم پر، موجودہ محکمہ تعلیم نے بھی، سارے ملک میں فنی تعلیم کے حالات کی تحقیق کرائی، بڑے غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ وسیع پیمانے پر فنی تعلیم کا انتظام کیا جائے نئے مدارس کھلوا کر جدید علوم سکھلائے جائیں، اور خاص ماہرین کی تربیت کی جائے، چنانچہ اعلیٰ فنی مدارس کے ادارات کو چلانے کے لئے خاص قانون بنایا گیا۔ وہ معیار جس سے اعلیٰ فنی تعلیم کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک قانونی اور طبی پیشوں کا تعلق ہے۔ ان کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اجازت دی گئی کہ وہ قانونی اور طبی ادارے قائم کرسکتی ہیں۔ وہ قانونی اور طبی مدارس جو اب تک جاری ہیں خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری ان کو

حکم دیا گیا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے تعلیمی سال کے شروع سے نیا طالب علم داخل نہ کریں۔ اُن میں جو طلبہ موجود ہیں، کورس ختم ہونے پر ان کو رخصت کر دیا جائے اور مدارس بند کر دئے جائیں، ان مدارس کے مکانات، ملکیت اور آمدنی کے ذرائع اور وسائل خاص تعلیمی اداروں قائم کرنے کے واسطے وقف کر دئے جائیں گے۔ تدریجاً خاص تعلیمی ادارات قائم کرنے کے واسطے، حکومت کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا گیا جس میں ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ مختلف مقامات میں مختلف فنون کے مدارس قائم کئے جائیں گے۔ مثلاً کان کنی، جنگل کی کاشت، کاغذ سازی، جہاز سازی، پارچہ بافی، زمین کی اصلاح، پالتو جانوروں کی افزائش نسل، ہوائی جہاز بنانا۔ دھاتوں کو صاف کرنا وغیرہ، مقام اور موقع کے لحاظ سے ان سب کاموں کے لئے خاص مدرسے قائم کئے جائیں گے۔

چونکہ اب تک چین میں مختلف کام کے ضروری ماہرین اور خاص فنون کے معلمین کے لئے تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، اس لئے محکمہ تعلیم نے ہر صوبہ کو یہ ہدایت کی ہے کہ طلبہ کی ایک خاص تعداد منتخب کر کے، جاپان، یورپ اور امریکہ بھیجا کرے اور اسی پر زور دیا گیا کہ ادبی طلبہ کی بہ نسبت زیادہ تر سائنس اور انجنیری کے طلبہ کو ترجیح دے۔ سنہ ۱۹۲۸ اور سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان جو طلبہ غیر ممالک میں گئے ہیں ۲۳۵۰ سے کچھ اوپر ہیں، اسی کثیر تعداد میں سے صرف ۱۲۲ طلبہ حکومت کے خرچ سے گئے ہیں اور باقی سب اپنے ذاتی اخراجات سے۔ قرب کی وجہ سے جاپان میں ۸۰۰ ا چینی طلبہ ہیں مگر یورپ اور امریکہ میں صرف ۱۲۶ اور ۱۵۸ طلبہ ہیں۔

مئی سنہ ۱۹۲۷ء میں تحقیق کا مرکزی ادارہ قائم کرنے کی غرض سے حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی، چھ مہینے کے بعد سابق دا ہیو یوان کے ماتحت یہ ادارہ قائم ہوا، جو کہ چین میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ سمجھا جاتا ہے، مگر موجودہ محکمہ تعلیم کے قائم ہوتے ہی یہ ادارہ اس سے علیٰحدہ کر دیا گیا جو کہ اکادمی سینیکا کے نام سے موسوم ہے۔ چونکہ یہ مضمون موجودہ تعلیمی نظام کے متعلق ہے، اسی لئے اکادمی سینیکا کے متعلق کچھ لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے

لئے جداگانہ مضمون درکار ہے۔

اکادمی سینیکا کے علاوہ چین میں ٹسینگ ہوا یونیورسٹی کا صیغہ تحقیق ہے، جامعہ پیکن کا صیغہ تحقیق ہے، سن یت سین یونیورسٹی (کنٹن) میں ارضیات، حیوانیات، طبیعات، نفسیات تعلیمات کے شعبے متحدہ اور سادہ زبان بنانے کی کمیٹی، مدرسوں کی تربیت کی کمیٹی، طبی تعلیم کی کمیٹی (یہ صرف تین سال سے قائم ہوئی ہے) موجود ہیں۔ اور ملک میں بہت سے ادارات ہیں جو رفاہ عام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ سائنس کی تحقیق اور مطالعہ میں حصہ لینے کی غرض سے بہت سے غیر سرکاری ادارات قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سے تقریباً بیس مقامی تعلیمی کونسلوں سے رجسٹری کرا کر مرکزی محکمہ تعلیم سے منظوری حاصل کر چکے ہیں۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

برطانیہ کی مالی مشکلات کا اثر ہندوستان پر

ایک عرصے سے بنک انگلستان کے خزانے سے سونا برابر نکل کر امریکہ اور فرانس منتقل ہو رہا تھا اور گزشتہ ستمبر کی ۲۰ تاریخ کو ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ اگر باقی ماندہ ذخیرہ طلا کو محفوظ رکھنے کے لئے فوری تدابیر نہ اختیار کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ انگلستان کے ساہوکاری کے اعتبار کو سخت نقصان پہنچے گا، چنانچہ وزارت انگلستان نے پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد ۲۰ ستمبر کی شام کو ایک سرکاری اعلان شائع کر دیا کہ بنک انگلستان آئندہ سے مقررہ نرخ پر سونا فروخت کرنے پر قانوناً مجبور نہیں ہے۔ اس اعلان کے بعد پونڈ اسٹرلنگ یعنی انگلستان کے کاغذی زر کی قیمت میں جو طلائی پونڈ کے برابر تھی ۱۳ فیصدی کا بٹہ لگ گیا۔

برطانوی وزارت کے اس اعلان کی اطلاع غالباً اسی روز رات کو کسی وقت وزیر مالیات ہند کو ہوئی ہو گی، چنانچہ صبح کو وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر ایک "آرڈیننس" نافذ کیا کہ حکومت ہند جو کرنسی ایکٹ بابت ۱۹۲۷ء کے مطابق روپیہ کے تبادلے میں ایک شلنگ ۶ پنس طلائی ادا کرنے پر قانوناً مجبور تھی اس آرڈیننس کے بعد وہ اس ذمہ داری سے دست بردار ہوتی ہے۔

وائسرائے کا یہ آرڈیننس ادھر ہندوستان میں شائع ہوا، ادھر انگلستان میں وزیر ہند نے یہ اعلان کر دیا کہ روپیہ کا تبادلہ بجائے ایک شلنگ ۶ پنس طلائی کے ایک شلنگ ۶ پنس سٹرلنگ کے ساتھ قانوناً قائم رکھا جائے گا حکومت ہند اور وزیر ہند کے ان متضاد اعلانات نے ایک

عجیب صورت حال پیدا کر دی، چنانچہ حکومت ہند کی ہدایت کے مطابق ہندوستان کے تمام ساہوکارو
یں تین دن کی تعطیل کر دی گئی تاکہ اس دوران میں حکومت ہند وزیر ہند سے مشورہ کر کے
اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کرے اور سٹہ کرنے والے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

حکومت ہند نے ۲۱ ستمبر کو جو قدم اٹھایا تھا اس پر ہندوستان کے تمام کاروباری نیز دوسرے حلقوں کی طرف سے اظہار اطمینان کیا گیا تھا۔ البتہ یہ شکایت ضرور تھی کہ ایک ایسے اہم فیصلے کے متعلق حکومت نے اسمبلی سے کوئی مشورہ نہیں کیا حالانکہ اسمبلی کا اجلاس اسی زمانے میں ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی یہ کارروائی تمام آئین اور دستور کے خلاف تھی۔ پھر بھی جو تجویز حکومت ہند نے کی تھی اس سے عام طور پر اتفاق رائے کیا گیا تھا۔ لیکن جب وزیر ہند نے حکومت کے فیصلے کے خلاف لندن میں یہ اعلان کیا کہ روپیہ کا مبادلہ شرح سابق پر پونڈ اسٹرلنگ کے ساتھ قائم رکھا جائے گا تو اس پر لندن میں گاندھی جی اور دیگر مندوبین گول میز کانفرنس نے سخت اعتراض کیا اور ہندوستان میں بھی تمام ایوان ہائے تجارت کی طرف سے احتجاج کیا گیا۔

تین دن کی گفت و شنید کے بعد جب حکومت ہند نے وزیر ہند کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا اور وائسرائے کو پہلا آرڈیننس منسوخ کر کے دوسرا آرڈیننس نافذ کرنا پڑا تو اسمبلی نے بجا طور پر حکومت کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کیا جو محض انگلستان کے مفاد کی خاطر اختیار کی گئی تھی۔ مسٹر شانکم چیٹی کی وہ قرارداد جس میں انھوں نے حکومت کی اس پالیسی پر اعتراض کیا تھا، کثرت رائے سے منظور ہوئی اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ تمام منتخب اراکین نے متفقہ طور پر مسٹر چیٹی کی تائید میں رائے دی۔ کسی جمہوری نظام حکومت میں اس قسم کی قرارداد منظور ہونے کے معنی یہ ہوتے کہ حکومت یا تو مستعفی ہو جاتی یا پبلک کے نمائندوں کے فیصلے کے مطابق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتی۔ مگر اس کے جواب میں وزیر ہند نے دارالعوام میں یہ اعلان کر دیا کہ "فیصلہ ہو چکا ہے اور اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے انتظام کا اثر مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی تجارت اور مالیات پر کیا پڑے گا؟ جہاں تک ہندوستان اور انگلستان کی تجارت اور لین دین کا تعلق ہو جس حساب سے "مطالبات وطن" پہلے ادا کئے جاتے تھے اسی حالت سے اب بھی ادا کئے جائیں گے۔ البتہ تجارتی مال و اسباب دیگر ممالک کے مقابلے میں انگلستان سے ارزاں دستیاب ہوگا اس لئے کہ طلائی شرح سے پونڈ اسٹرلنگ کی قیمت گھٹ گئی ہے اور چونکہ پونڈ اسٹرلنگ کے حساب سے روپیہ کی قیمت مقرر ہوتی ہے اس لئے روپیہ کی قیمت بھی بہت گھٹ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ یا جاپان سے جو سامان منگایا جائے گا اس کی قیمت سونے کے سکے میں حسب سابق ہندوستان کو ادا کرنی ہوگی لیکن روپیہ کی شرح مبادلہ چونکہ بحساب ڈالر اور ین (جاپانی طلائی سکہ) گھٹ گئی ہے اس لئے جس چیز کے لئے پہلے ایک روپیہ یعنی ایک شلنگ ۶ پنس طلائی ادا کرنے پڑتے تھے اس چیز کی قیمت اب تقریباً ایک شلنگ ۶ پنس یا ایک روپیہ سے کچھ زائد ادا کرنا پڑے گی قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو اس کی بکری بھی کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے امریکہ جاپان اور دوسرے ممالک کی تجارت برآمد کو جہاں تک ہندوستان، انگلستان اور دیگر نوآبادیات (جہاں اسٹرلنگ رائج ہے) کا تعلق ہے بہت نقصان پہنچے گا اور ہندوستان کی تجارت درآمد میں چونکہ امریکہ جاپان اور انگلستان سبھی شریک ہیں اس لئے اس نئے انتظام کی وجہ سے خود بخود انگریزی مال کو دیگر ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کی منڈیوں میں ترجیح اور فروغ حاصل ہوجائے گا۔

ادھر ہندوستان کی تجارت برآمد کو روپیہ کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے فائدہ پہنچے گا اور ہماری خام پیداوار امریکہ جاپان اور دوسری منڈیوں میں مقابلۃً سستی پڑے گی اس لئے اس کی مانگ بھی بڑھ جائے گی جس کی وجہ سے ملک کے اندر غلے وغیرہ کی قیمت میں اضافہ ہوگا اور غریب کسان جو ارزانی کی وجہ سے تباہ ہوئے جارہے تھے ان کی حالت کچھ سنبھل جائیگی۔

لیکن اگر روپیہ کی شرح مبادلہ اسٹرلنگ کے حساب سے نہ مقرر کی جاتی اور اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ سب فائدے بھی ملک کو حاصل ہوتے اور اسی کے ساتھ یہ اطمینان بھی ہوتا

کہ روپیہ کی قیمت اتنی زیادہ نہ گھٹے گی کہ جس سے ملک کے اعتبار کو نقصان پہنچے۔ اس کا اندیشہ قدرتاً اس وقت پیدا ہو رہا ہے جب کہ روپیہ کا مبادلہ ایک ایسے زر کے ساتھ مقرر کر دیا گیا ہے جس کی قیمت کے متعلق بہت کچھ شبہات کاروباری حلقے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ آج سے ۱۸ سال قبل رائل کرنسی کمیشن کے سامنے جب بعض حلقوں کی طرف سے یہ سفارش کی گئی تھی کہ روپیہ کا تبادلہ قانوناً طلائی زر کی بجائے اسٹرلنگ کے ساتھ مقرر کیا جائے تو اس نے اس کی سخت مخالفت کی تھی اور اپنی رپورٹ کے پیراگراف نمبر ۲۰ تا ۵۲ میں صاف و صریح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ "بلاشک وشبہ یہ ہندوستان کے لئے نقصان رساں ثابت ہوگا اگر اس کے زر کو کسی ایک ملک کے زر کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، خواہ وہ زر کتنا ہی مضبوط اور مستحکم طور پر ہونے کے ساتھ وابستہ کیوں نہ ہو"۔ پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ رائل کمیشن کے ان الفاظ کو کیوں بلا کسی معقول سبب کے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

حکومت ہند کا ضمنی میزانیہ

حکومت ہند کا ضمنی میزانیہ ہر سال اسمبلی کے شملہ سشن میں پیش ہوا کرتا ہے، اس سال غیر معمولی مالی دشواریوں کی وجہ سے بہت بڑے خسارہ کا پہلے سے اندیشہ تھا، حکومت ہند نے تخفیف مصارف کے متعلق تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کی مکمل رپورٹ سال رواں کے ختم تک شائع ہونے والی ہے چنانچہ اسمبلی کے غیر سرکاری اراکین نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے سفارش کی کہ ضمنی میزانیہ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے تک ملتوی کر دیا جائے تاکہ جہاں تک ہو سکے تخفیف مصارف کے ذریعے سے میزانیہ کا لیکھا جوکھا برابر کیا جائے اور اس زمانے میں جب مالی دشواریاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، مزید محصولات کا ناقابل برداشت بوجھ ملک پر نہ ڈالا جائے مگر حکومت ہند نے ۲۹ ستمبر کو ضمنی میزانیہ اسمبلی کے سامنے

پیش کر ہی دیا، البتہ اسمبلی کی منظور شدہ قرار داد کا کچھ لحاظ رکھتے ہوئے مشیر مال صاحب نے یہ اعلان فرما دیا کہ میزانیہ پیش تو کر دیا گیا لیکن اس پر غور کرنے کے لئے ایک مخصوص اجلاس ۱۴ نومبر سے دہلی میں منعقد ہو گا تاکہ یکم دسمبر سے اس میزانیہ پر عملدرآمد ہو سکے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ میزانیہ پیش کرنے اور اس پر غور کرنے میں زیادہ فرق یہاں نہیں ہے۔ اب تک تو ہمیشہ میزانیئے جس صورت میں پیش ہوئے اسی صورت میں ان پر عملدرآمد بھی ہوا خواہ اسمبلی نے اس کو منظور کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

میزانیہ پر نظر ڈالنے سے مطلع ہوتا ہے کہ سال رواں میں بجائے ایک لاکھ روپیہ کی بچت کے جیسا کہ گزشتہ سال دکھایا گیا تھا ۱۹ کروڑ پچپن لاکھ روپیہ کا خسارہ ہے اور مشیر مال صاحب کا اندازہ ہے کہ تقریباً ۱۰½ کروڑ روپیہ کا خسارہ آئندہ سال بھی میزانیہ میں ہو گا، گویا آئندہ اٹھارہ مہینے کے اندر ۲۹ کروڑ پانچ لاکھ کا خسارہ حکومت ہند کے میزانئے میں ہو گا جس کو کسی نہ کسی طرح سے پورا کر کے دکھلانا چاہئے ورنہ ہندوستان کے نظام زر کو جو دھکا معیار طلائی کے منسوخ ہو جانے سے لگا ہے وہ اور بھی زیادہ مضرت رساں ثابت ہو گا۔

اس خسارہ کو مشیر مال نے تین طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے اول تنخواہوں میں تخفیف، دوسرے فوجی مصارف میں کمی، تیسرے محصولات میں اضافہ۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) تنخواہوں میں تخفیف۔

۱۔ وائسرائے	۲۰ فیصدی
۲۔ مرکزی اگزیکٹو کونسل کے ارکان	۱۵ ″
۳۔ تمام دیگر ملازمین جن کی تنخواہیں چالیس روپئے سے زیادہ ہوں	۱۰ ″

تنخواہوں میں تخفیف سے کل بچت ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوئی۔

ب) فوجی مصارف میں کمی	۴¼ کرور
ج) محصولات میں اضافہ	
۱۔ محصول نمک انکم ٹکس، سپر ٹکس	۲۵ فیصدی
۲۔ سال رواں میں انکم ٹکس	۱۲½ ″
۳۔ ایک ہزار اور دو ہزار روپیہ کے درمیان آمدنی پر جدید ٹکس	۴ پائی فی روپیہ
۴۔ مال درآمد مصنوعی ریشم، بجلی کے بلب، کافور	۴۰ فیصدی
۵۔ مصنوعی ریشم کا دھاگہ اور تار	۱۵ ″
۶۔ مشینیں اور رنگ	۱۰ ″
۷۔ خام روئی	½ آنہ فی پونڈ
۸۔ بوٹ جوتے	۲۰ فیصدی
۹۔ لفافہ	تین پائی فی لفافہ
۱۰۔ کارڈ	″ ″ فی کارڈ

اس تخفیف مصارف اور اضافہ محصولات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے اختتام پر دس کرور ۱۲ لاکھ روپیہ کا نقصان ہوگا لیکن چونکہ یہ تجاویز اٹھارہ مہینے کے لئے پیش کی گئی ہیں، اس لئے ۳۳-۱۹۳۲ء کے اختتام پر ۵ کرور ۲۲ لاکھ روپے کی بچت کی توقع کی جاتی ہے۔

۴ر نومبر سے اسمبلی کا مخصوص اجلاس میزانیہ پر غور کرنے اور اس کو منظور کرنے کے لئے دہلی میں شروع ہوا ہے، پہلی مرتبہ غور اور بحث ہو چکی - دوسری بار بحث ہو رہی ہے۔ اس کے بعد تیسری بار منظوری کے لئے رائے لی جائے گی اور امید ہے کہ حسب معمول کثرت رائے سے منظور ہو جائے گا اور اگر غیر سرکاری اراکین نے اسی یکجہتی اور اتحاد سے کام کیا جس کی بدولت حکومت کو شملہ میں شکست ہوئی تھی تو پھر وائسرائے کو مجبوراً منظوری دینا پڑے گی، لیکن اس کی نوبت

شاید نہ آئے، پبلک سروس کمیشن کی ممبری اور بعض دیگر اعلیٰ ملازمتیں خالی ہونے والی ہیں اور ہر معاملے پر رائے دیتے وقت اکثر اراکین کو ان امور کا بھی خیال رکھنا ہی پڑتا ہے!

جو تدابیر میزانیہ کو متوازن کرنے کے لئے اختیار کی گئی ہیں ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جہاں تک تنخواہوں میں تخفیف کا تعلق ہے ہر چند کہ وائسرائے، ان کے وزرا، اور دیگر ملازمین کا ایثار قابل ستائش ہے لیکن ہندوستان کی رائے عامہ نے چونکہ تنخواہوں کے معاملے میں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک معیار قائم کر لیا ہے اس لئے اس تخفیف سے کوئی شخص بھی کسی طرح مطمئن نہیں ہو سکتا۔ توقع تھی کہ لی کمیشن کی مراعات جو قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے جنگ کے بعد کی گئی تھیں ان کو اب ختم کر دیا جائے گا مگر مشیر مال صاحب اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اس حد تک زیادتی کرنا انتہائی ناانصافی سمجھتے ہیں، اس لئے ان کو بجنسہٖ قائم رکھا گیا ہے۔

اعلیٰ اور ادنیٰ ملازمتوں کی تنخواہوں میں یکساں طور پر دس فیصدی کی تخفیف سے جو ناانصافی صریحاً ادنیٰ ملازمتوں کے ساتھ کی گئی ہے اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہیں ہے جو شخص ہزار روپیہ ماہوار پاتا ہے اس کی تنخواہ میں سو روپیہ کی کمی کوئی بات نہیں لیکن جو غریب پچاس ہی روپیہ پاتا ہے اس کی تنخواہ میں سے پانچ روپیہ کاٹ لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اور اس کے بال بچوں کا پیٹ کاٹ لیا گیا۔

مشیر مال نے نہایت شاندار الفاظ میں کمانڈر انچیف اور ان کے اسٹاف کی خدمات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے فوجی مصارف ۴½ کرور روپیہ کی تخفیف منظور کر لی ہے لیکن فوجی مصارف کا معاملہ بھی آج سے نہیں بلکہ کئی سال سے زیر بحث ہے اور قومی نمائندوں کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے اگر قومی مصارف میں فوراً بقدر نصف تخفیف نہیں ہو سکتی تو جنگ عظیم سے قبل جو مصارف تھے اس سے کسی طرح زیادہ نہ ہونا چاہئے، یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا جاتا ہے کہ

ہندوستان کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی فوج کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور موجودہ فوجی مصارف کا بار زیادہ تر برطانیہ عظمیٰ کی سامراجی پالیسی کو تقویت دینے کے لئے ہندوستان کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی لئے اسمبلی کے تقریباً ہر مقرر نے اس پر زور دیا ہے کہ فوجی مصارف میں ابھی اور زیادہ تخفیف کی جائے اور صرف مصارف میں تخفیف کر کے میزانیہ میں توازن قائم کیا جائے سر عبدالرحیم نے جو تخفیف مصارف کی کمیٹی کے صدر ہیں ، رنومبر کو میزانیہ پر تقریر کرتے ہوئے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ صرف تخفیف مصارف سے میزانیہ کو خسارے سے بچایا جا سکتا ہے۔

جدید محصولات کی مد میں جو چیز بدیہی طور پر پبلک کے لئے بے چینی کا باعث ہوگی وہ نمک پر ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہے ،،،نمک قانون توڑ دیا،، کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں اور اگر اس سے پھر سیاسی فائدہ اٹھایا گیا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

تجارت کی اس کساد بازاری میں انکم ٹکس اور سپر ٹکس میں اضافہ اور خصوصاً ایک ہزار سے دو ہزار تک کی آمدنی پر ۴ پائی فی روپیہ کا جدید محصول جو لگایا گیا ہے کہ سونے کا انڈا حاصل کرنے کے لئے بطخ کا پیٹ چاک کر دیا جائے ، اشیاء درآمد پر جو ٹکس لگایا گیا ہے اس سے ملک کی درآمد پر اثر پڑے گا اور چونکہ بین الاقوامی تجارت میں درآمد کی قیمت برآمد کی اشیاء سے ادا کی جاتی ہیں اس لئے ملک کی تجارت برآمد پر بھی اس کا مضر اثر پڑے گا۔ لفافہ اور کارڈ کی قیمت میں جو اضافہ کیا گیا ہے وہ اس لئے اور زیادہ قابل اعتراض ہے کہ اس مد سے کوئی معتدبہ رقم حکومت کو حاصل نہ ہوگی اور بہت آسانی کے ساتھ اس کی بجائے کسی دوسرے ذریعے سے اسی قدر رقم حاصل کی جا سکتی تھی مسٹر چیٹی اور بی داس نے پٹرولیم ٹکس لگانے کی تجویز کی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں اس پر توجہ نہیں کی گئی۔

بہر حال مجموعی حیثیت سے میزانیہ قابل اطمینان نہیں ہے اور اس بل کو ۱۸ مہینے کے لئے نافذ کرنا بھی قرین مصلحت نہیں ہوتا۔ اگر حکومت واقعی تخفیف مصارف کی کمیٹی کی سفارشات پر

ایماندار ی سے غور کرنا چاہتی ہے تو اس بل کا نفاذ صرف ۴ ماہ کے لئے ہونا چاہیے تھا اور اپریل کے بعد اپریل میں حسب معمول پھر تمام صورت حال پر غور کیا جائے، اور کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں آئندہ سال کا میزانیہ مرتب کیا جائے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو آئندہ کے سیاسی حالات پر اطمینان نہیں ہے اور اس لئے وہ پیش بندی کے طور پر پہلے سے یہ انتظام کر رہی ہے۔

ہندوستان کی جدید مردم شماری

۱۹ ار ستمبر کے گزٹ آف انڈیا میں ہندوستان کی گزشتہ مردم شماری کے اعداد و شمار نظر ثانی کے بعد شائع ہوئے ہیں: حکومت ہند کے ایک رزولیوشن میں واضح کیا گیا ہے کہ مذاہب کی روسے جو اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں وہ تقریباً صحیح ہیں گو وہ احاطہ بمبئی اور برما کے چند حصوں کے متعلق مکمل نہیں ہیں، بعض صوبجات میں خاص خاص مذاہب کے اعداد و شمار درج کئے گئے ہیں جن صوبجات میں جس مذہب کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے ان کو چھوٹے مذاہب کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ، ۲۹ لاکھ ۸۶ ہزار ۸ سو ۷، ہے، جس میں سے ۱۸ کروڑ ۱۵ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۴۷، مرد ہیں اور ۱۷ کرور دس لاکھ ۷۴ ہزار عورتیں، بمقابلہ ۱۹۲۱ء اس مردم شماری میں ۱۰٫۶ فیصدی کا ہوا ہے، مختلف مذاہب کے اعتبار سے آبادی کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

ہندو	۲۳ کرور ۸ لاکھ ۳۰ ہزار ۹ سو ۱۲
مسلمان	۷ کرور ۷۷ لاکھ ۴۳ ہزار ۵ سو ۷۸
سکھ	۴۳ لاکھ ۶ ہزار ۴ سو ۴۲
عیسائی	۵۹ لاکھ ۱۹ ہزار ۷ سو ۹۴

برطانوی ہند کی آبادی

کل آبادی	۲۷ کروڑ ۱۲ لاکھ ۳۷ ہزار ایک سو ۷
ہندو	۱۷ کروڑ ۷۹ ،، ۲۴ ،، ۴ ،، ۳۵
مسلمان	۶ ،، ۷۰ ،، ۸۵ ،، ۵ ،، ۱۰۰

صوبہ وار آبادی

صوبہ	کل آبادی	ہندو	مسلمان
۱۔ اجمیر مارواڑ	۵ لاکھ ۶۰ ہزار ۲ سو ۹	۴ لاکھ ۲۳ ہزار ۵ سو ۹	۹۷ ہزار ایک سو ۳۲
۲۔ آسام	۸۶ لاکھ ۲۲ ہزار ۲ سو ۵۱	۴۹ لاکھ ۳۱ ہزار ۷۶۰	۲۷ لاکھ ۵۵ ہزار ۹۱۴
۳۔ بلوچستان	۴ لاکھ ۶۳ ہزار ۵۰۸	۴۱ ہزار ۴۳۲	۴ لاکھ ۵ ہزار ۳۰۹
۴۔ بنگال	۵ کروڑ ۲۲ ہزار ۵۵۰	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ۳۷ ہزار ۹۲۱	۲ کروڑ ۷۵ لاکھ ۳ ہزار ۳۲
۵۔ بہار اڑیسہ	۳ کروڑ ۷ لاکھ ۶۷ ہزار ۵۷۶	۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ۱۰ ہزار ۴۶۰	۴۲ لاکھ ۶۴ ہزار ۷۷۶
۶۔ بمبئی	۲ کروڑ ۱۸ لاکھ ۵۴ ہزار ۸۴۱	۱ کروڑ ۶۴ لاکھ ۱۵ ہزار ۸۴۶	۴۴ لاکھ ۷۵ ہزار ۱۲۳
۷۔ برما	۱ کروڑ ۴۶ لاکھ ۶۵ ہزار ۹۷۹	۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۹۵۳	۶ لاکھ ۶ ہزار ۸۴۱
۸۔ صوبہ متوسط و برار	۱ کروڑ ۵۵ لاکھ ۷ ہزار ۷۲۳	۱ کروڑ ۲۴ لاکھ ۶۰ ہزار ۱۰۹	۶ لاکھ ۸۲ ہزار ۸۵۴
۹۔ کورگ	۱ لاکھ ۶۳ ہزار ۳۲۷	۱ لاکھ ۴۴ ہزار ۷	۱۳ ہزار ۷۷۷
۱۰۔ دہلی	۶ لاکھ ۳۶ ہزار ۲۴۶	۳ لاکھ ۹۹ ہزار ۸۶۳	۲ لاکھ ۶ ہزار ۹۶۰
۱۱۔ مدراس	۴ کروڑ ۶۷ لاکھ ۴۰ ہزار ۱۰۷	۴ کروڑ ۲ لاکھ ۹۹ ہزار ۹۰۰	۳۳ لاکھ ۱۴ ہزار ۸۳
۱۲۔ صوبہ سرحد	۲۴ لاکھ ۲۵ ہزار ۷۶	۱ لاکھ ۴۲ ہزار ۹۷۷	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار ۳۰۳
۱۳۔ پنجاب	۲ کروڑ ۳۵ لاکھ ۸۰ ہزار ۸۵۲	۶۳ لاکھ ۲۸ ہزار ۵۸۸	۱ کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار ۴۶۰

۱۴- صوبہ متحدہ ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ۸ ہزار ۶۳ ۴ کروڑ ۹ لاکھ ۸ ہزار ۳۳ ۲ ۵ ۱۰ لاکھ ۱۸ ہزار ۹۳۷

جدید مردم شماری کے اعداد کو دیکھنے اور حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ آبادی کے مقابلے میں اس دس سال کے عرصے میں ہندوؤں کی تعداد میں ۱۰ فیصدی کا، مسلمانوں کی تعداد میں ۱۳٫۱ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے سکھوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے ۳۳ فیصدی چینی صرف ۲ فیصدی بڑھے ہیں، بدھ مذہب والوں میں ۸ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور پارسیوں میں ۵ فیصدی کا، عیسائی بھی بہت بڑھے ہیں یعنی ۲٫۲ ۳ فیصدی، یہودی اور پہاڑی قبائل میں ۹ افیصدی کمی ہوئی ہے۔

عالم اسلامی

افغانستان کی رفتار ترقی

اعلیٰحضرت نادر شاہ غازی اور ان کے رفقائے کار افغانستان کی ترقی کے لئے جو سعی بلیغ کر رہے ہیں اس کا اندازہ بآسانی ان اطلاعات سے کیا جاسکتا ہے جو گزشتہ چھ مہینوں میں کابل سے موصول ہوئی ہیں۔

افغانستان کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہاں وسائل نقل و حمل تقریباً نادر ہیں، سوائے اس سڑک کے جو پشاور سے کابل گئی ہے۔ ملک کی اور کوئی سڑک اچھی حالت میں نہیں۔ آمد و رفت کی مشکلات کا اثر سفر و سیاحت سے کہیں بڑھ کر انتظامات حکومت، ملک کی معاشی حالت اور اندرونی امن و امان پر پڑا ہے۔ یہی دقتیں ہیں جن کو محسوس کرتے ہوئے اعلیٰحضرت شاہ غازی کی حکومت نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ افغانستان کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان ریل کا سلسلہ قائم کر دیا جائے۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ریلوے کی تعمیر کس طرح عمل میں آئے گی اور اس کا ٹھیکہ کسی خارجی حکومت کو دیا جائے گا یا کمپنی کو مگر قرارداد یہ ہے کہ اول کابل کو قندھار اور پھر قندھار

کوہات سے ملحق کر دیا جائے، البتہ جہاں کہیں ریلوے کی تعمیر دشوار یا ناممکن ہو وہاں پکی سڑکیں بنوا دی جائیں گی۔ بعض حصص میں ان سڑکوں کی تعمیر شروع بھی ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک دوسری چیز انتظامی ضروریات کے لئے پرواز کا بندوبست کرنا ہے۔ اس وقت تک ترمذ اور کابل کے درمیان سلسلہ پرواز قائم ہے۔ لیکن غالباً اس کا انتظام روس کے ہاتھ میں ہے، حکومت چاہتی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سلسلۂ پرواز کو اپنے زیر نگرانی زیادہ وسعت دے سکے۔ سلسلہ اطلاع رسانی کو مکمل بنانے کے لئے تمام صوبوں کے مراکز کو تار اور ٹیلیفون سے ملا دیا گیا ہے اور حکومت نے علاوہ بہت سے طلبہ کے دو افغان نوجوانوں کو اسٹاک ہولم بھیجا ہے تاکہ وہاں رہ کر وہ خاص طور سے ٹیلیفون انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کریں۔

گزشتہ انقلاب کے تکلیف دہ واقعات سے سبق اٹھا کر حکومت نے متعدد جنگی اصلاحات بھی جاری کر دی ہیں۔ قدیم نظام کے خلاف اب ہر علاقے اور ہر قبیلے پر یہ ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے کہ وہ ملکی سپاہ کے لئے آدمیوں کی ایک خاص تعداد بہم پہنچائے۔ ان کی قواعد و تربیت کے لئے مغربی اصول اور مغربی وردیاں اختیار کر لی گئی ہیں البتہ ٹوپیاں ایک خاص وضع کی ہیں جو جرمنی، فرانسیسی اور روسی فوج کے کاسک سپاہیوں کی ٹوپیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اس خیال سے کہ افواج کے نظم و نسق میں کوئی نقص پیدا نہ ہو اور شورش پسند قبائل کی سرکشی کا انسداد فوراً ہو جائے ملک کے اہم حصوں میں متعدد چھاؤنیاں تعمیر کی جا رہی ہیں جن کے درمیان تار، ٹیلیفون، ریلوں اور سڑکوں کا سلسلہ قائم کر دیا جائے گا۔

تعلیمی امور میں بھی حکومت کا قدم پیچھے نہیں رہا۔ مدرسہ حربیہ کے علاوہ ملک میں چار کالج اور متعدد مدارس موجود ہیں۔ تعلیم ہر جگہ مفت ہے، اور کوہ دامن میں خصوصیت کے ساتھ نئے مدارس قائم کئے جا رہے ہیں کیونکہ کوہ دامن کے باشندے ابھی تک تعلیم و تربیت میں بہت پیچھے ہیں۔

نظام آب رسانی کو بھی دن بدن وسعت دی جا رہی ہے، کوشش یہ ہے کہ بہت سی غیر مزروعہ زمینوں کو کاشت کے قابل بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں پھلوں کی پیداوار پر خصوصیت کے ساتھ

زور دیا جا رہا ہے۔ کابل میں ایک انجمن تجار بھی قائم کر دی گئی ہے۔ یہ انجمن تجارتی مسائل سے متعلق اپنے اہل ملک کو قیمتی مشورے دیتی رہتی ہے۔ گزشتہ انقلاب کی وجہ سے جو چکیاں اور کارخانے بند ہو گئے تھے اب انھوں نے از سر نو کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ ملک کی درآمد و برآمد بھی اب پہلی حالت پر آگئی ہے اور حکومت کا ارادہ ہے کہ یورپ کے ہر ملک میں افغانستان کا کوئی نہ کوئی ایجنٹ موجود رہے۔

اس کے علاوہ اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی اصلاحات نافذ ہو رہی ہیں۔ محکمہ پولیس کا افغان افسر اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ ہے۔ اسکاؤٹنگ کی تحریک بھی ترقی پر ہے۔ شورائے ملی یعنی مرکزی مجلس وضع قوانین کا اثر اور وقار دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اس مجلس کے اراکین صرف وہی لوگ ہیں جو حکومت اور رعایا دونوں میں یکساں اثر اور رسوخ رکھتے۔ جہاں تک ملک کی معاشی اور اقتصادی ترقی کا تعلق ہے یہ خبر مسرت واطمینان کے ساتھ سنی جائے گی کہ علاقہ کوہ دامن میں معدنیات کا ایک گرانبہا ذخیرہ دریافت ہوا ہے اور حکومت غور کر رہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے کیا ذرائع اختیار کرے۔

حوادث ترکیہ

جب سے جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا ہے ترکی اور جرمنی کے تجارتی تعلقات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ترکی کی درآمد میں ⅓ حصہ صرف جرمنی کا ہے اور اگر برآمد کو ایک فرض کر لیا جائے تو اس کا ساتواں حصہ جرمنی کو بھیجا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق قریبہ میں انگریزی تجارت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ ترکی میں جرمن مصنوعات کے مستقل اضافے کی بڑی وجہ سڑکوں، ریلوں اور پلوں کی تعمیر کا سلسلہ ہے جس میں حکومت انگورہ کو خاص طور سے انہماک ہے، البتہ ترکوں کا سب سے بڑا خطرہ روس کی طرف سے ہے۔ روسی ایجنٹ نہایت سرعت کے ساتھ روسی مصنوعات کو ملک میں پھیلا رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ڈر ہے کہ تمام قوم روبہ سیلاب

کے تجارتی شکنجے میں گرفتار نہ ہو جائے۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی بدولت بہت سے پیشے مفقود ہو گئے ہیں۔ اب ترکی میں کہیں بھی مسخروں اور خواجہ سراؤں کی جماعتیں نظر نہیں آتیں جن کا وجود کسی زمانے میں امراء کے لئے اگزیر تھا۔ تھوڑے سے مسخرے اور خواجہ سرا جو اب باقی ہیں نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن اس معاشرتی انقلاب کا سب سے اہم نتیجہ وہ تغیرات ہیں جو ترکوں کے جذبات و عقائد میں واقع ہوئے ہیں۔ غازی پاشا نے حکم دیا ہے کہ تمام ابتدائی مدارس میں تاریخ کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جائے اور اس کو محض واقعات کی تشریح پر محدود نہ رکھا جائے بلکہ طالب علموں کو یہ بتایا جائے کہ ترکی قوم کی حیثیت دنیا میں کیا ہے۔ اسی جذبات کے ماتحت مصطفیٰ کمال پاشا نے حکم دیا ہے کہ ترکی قوم کی "پہلی صحیح" تاریخ مرتب کی جائے۔ اگر انگریزی اخبارات کی اطلاعات ، قعی صحیح ہیں اور ان کا مقصد محض پروپگنڈا نہیں تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غازی پاشا نے تاریخ کے متعلق جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ تاریخ عالم کا اندازہ قرآن پاک کی روشنی میں کرتے۔ بہرحال غازی موصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ترکی قوم ہی تھی جو ہمیشہ انڈو یورپین (ہندی یورپی) تہذیب کے پس پشت کام کرتی رہی ہے۔ بحر روم کے اردگرد اور مشرق میں وقتاً فوقتاً جن تہذیبوں کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ یہ دراصل اسی تمدنی تحریک کے اثرات تھے جو سب سے پہلے ترکوں میں رونما ہوئی۔

اب ترکوں کی "جدید تاریخ ملی" اس غلط فہمی کا ازالہ کرے گی کہ ترک ایک تورانی النسل قبیلہ ہیں جنھوں نے ازمنہ متوسطہ میں ایشیائے کوچک میں آکر سیاسی قوت حاصل کی اور مشرقی یورپ کو اپنی خوفناک دستبرد سے پامال کر دیا۔ یہ خیال کہ ترک صرف لوٹ مار کرنا جانتے ہیں دراصل اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے جو عربوں نے پھیلائی تھی۔

کمال پاشا کا عقیدہ ہے کہ ترکی قوم کو تاریخ عالم پر ایک نہایت اہم درجہ حاصل ہے تاریخ عالم کے ہر صفحہ پر ترکی قوم کا نقش موجود ہے۔ ترکی قوم کو تمام اقوام کی سیادت کا شرف حاصل ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن کی ابتدا ترکوں ہی سے ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کو بعض ایسے زمانوں سے بھی گزرنا پڑا ہے جو کچھ بہت زیادہ قابل ستائش نہیں ہیں لیکن یہ بہرحال ترکی قوم کی زندگی میں چند ناگوار لمحے تھے، جن کو ختم ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ اب انقلاب انگورہ کے ساتھ جس عہد کا آغاز ہوتا ہے اس کی تابانی اور درخشانی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ کمال پاشا کو یقین ہے کہ ترکی تاریخ کے اثری، لسانی اور عمرانیاتی مطالعے سے ان کے دعووں کی تصدیق ہو جائے گی۔ گویا ماضی کے متعلق اس جدید نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے سے اب ترکوں کو بحیثیت ترک اپنے مستقبل کے متعلق کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔

رہا یہ سوال کہ مغربی علما غازی پاشا کے ان خیالات کو کہاں تک تسلیم کر لینے کے لئے تیار ہیں۔ اس کا جواب دینا بہت کچھ پیش از وقت ہے۔ ترکوں کا دعویٰ بہرکیف یہ ہے کہ ان کے قائم کردہ نظریے ناقابل تردید ہیں اور باعتبار تمدن ان کا مرتبہ یقیناً یونان سے بلند تر ہے۔ یونانیوں نے صرف اس کام کی تکمیل کی جس کی ابتدا ترکوں نے کی تھی۔

ابراہیم بیگ کی گرفتاری

ہندوستان کا اخبار بین طبقہ ابراہیم بیگ کے نام سے بےخبر نہ ہوگا۔ البتہ بیگ موصوف کی اصل حیثیت سے شاید بہت کم لوگ واقف تھے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی اخبارات اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق ابراہیم کو ڈاکو، رہزن، مجاہد اور سپہ سالار کے لقب سے یاد کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم بیگ ترکستان کی اس ملی تحریک کا ایک زبردست رہنما تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ جنگ عظیم کے دوران میں جب زار کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو وسط ایشیا نے ایک خودمختار سلطنت کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن اس لئے کہ جب تک انور پاشا مرحوم ترکستان نہیں آئے ہیں بخارا کی سیاست، اشتراکیت اور سرمایہ داری کی سازشوں کا مرکز

بن رہی تھی۔ افسوس ہے کہ ۱۹۲۲ء میں انور پاشا غازی شہید ہو گئے اور ترکستان کی اسلامی حکومت کا تصور حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

اس حادثے کے بعد امیر بخارا نے بھاگ کر افغانستان میں پناہ لی اور روسی لشکر تمام علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امیر بخارا نے ابراہیم بیگ کو عساکر اسلامیہ کا سپہ سالار مقرر کیا اور بیگ موصوف نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ ترکستان کی تحریک ملی میں کچھ جان پیدا ہو جائے، مگر اب تمام اہم مقامات، راستے اور گزرگاہیں روسیوں کے قبضے میں تھیں اور انھیں جہاں کہیں اس تحریک کے آثار نظر آئے وہیں انتہائی سفاکی سے کام لے کر بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالیں۔ مجبوراً ابراہیم بیگ کو تاجیکستان کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی اور دریائے آمو (جیحوں) کے دونوں کنارے (اگرچہ جنوبی کنارہ افغانستان کی حدود میں شامل ہے) اس کی ترکتاز کا آماجگاہ بن گئے۔ ابراہیم بیگ کی قوت ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک زوروں پر تھی، لیکن ۱۹۳۱ء کے موسم گرما سے اس کی طاقت دن بدن کم ہونا شروع ہوئی۔ ۲۲ جون کو روسی سرحد پر عساکر ابراہیمی نے شکست کھائی اور اس کے رفقائے کار علی مردان اور اسحٰق خاں گرفتار ہو گئے۔ ۲۳ جون کو خود ابراہیم بیگ کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور روسی حکام نے اسے تاشقند بھیج دیا۔

بولشویک اخبارات اور بولشویک حکام کا خیال ہے کہ ترکستان کی تحریک ملی ان سرمایہ دارانہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو مغرب میں روس کے خلاف جاری ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ ترکستان کی عام آبادی دل و جان سے اشتراکیت کی حامی ہے۔ مغرب کی سرمایہ دار حکومتوں کے لئے یہ کبھی ممکن نہیں کہ وہ اس سرزمین پر آئندہ اپنے خیالات کی اشاعت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی اخبارات میں ترکستان کی تحریک ملی کو "باسمچی" تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یعنی محض لوٹ مار کا سلسلہ جو مغربی سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں یا قدیم ترکستانی مفسدوں کی طرف سے جاری تھا۔

برعکس اس کے مغربی سیاسیات میں ابراہیم بیگ کو ترکستان کے جہاد آزادی کا آخری علمبردار تصور کیا جاتا ہے۔ فرانس کے ایک اخبار نے بیگ موصوف کی گرفتاری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس بطل عظیم کا نام صفحات تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا" سیاسئین مغرب کا عقیدہ ہے کہ ترکستان کی تحریک ملی کے سامنے ہمیشہ ایک بلند نصب العین رہا ہے جس پر روسیوں نے برابر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مسلمانان ترکستان کو انھوں نے جس طرح جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور ابراہیم بیگ اور اس کے رفقا کو بدنام کرنے میں انھوں نے جن ناپاک ارادوں کا اظہار کیا ہے ان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جسے جریدۂ اصلاح (کابل) نے تاس نیوز ایجنسی سے نقل کیا ہے۔ ابراہیم بیگ کی گرفتاری کی خبر اس روسی ایجنسی نے اس طرح شائع کی ہے کہ

"ازبکستان اور تاجیکستان پر جو باغی جماعتیں افغانستان سے حملہ آور ہو رہی تھیں ان کا قلع قمع ہو گیا ہے"۔

ممالک غیر

برطانوی انتخابات | برطانیہ کے جدید انتخابات ہو گئے۔ کنزرویٹو پارٹی کو توقع سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور لیبر اور لبرل جماعتوں کے ایسے نمائندوں کی تعداد بہت کم منتخب ہوئی جو مسٹر میکڈانلڈ کی قیادت میں ایک متحدہ قومی حکومت کے حامی نہ تھے۔ اس انتخاب میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ برطانوی سیاسی جماعتوں میں خود علحدہ علحدہ وہ یکجہتی نہ تھی جو پہلے ان کی خصوصیت رہی ہے۔

کنزرویٹو جماعت کا ایک حصہ تو اپنے باضابطہ قائد مسٹر بالڈون کا ہمنوا ہے جو سب جماعتوں سے سمجھوتے کے قائل اور موجودہ مالی اور سیاسی مشکلات کے زمانے میں سب سے مل جل کر ایک متحدہ قومی حکومت قائم رکھنے کے حامی ہیں لیکن دوسرا حصہ جس میں نیول چیمبرلین، امری اور چرچل کا اثر کارفرما ہے جلد سے جلد خالص کنزرویٹو وزارت کو برسر اقتدار لانے کا خواہاں ہے۔

لبرل جماعت جو پہلے ہی سے بہت کمزور تھی اس مرتبہ کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ سب سے آگے آگے تو سر جان سائمن کا گروہ تھا جس نے "قومی حکومت" کی حمایت کو اپنا اصول بنایا، اس لئے قومی حکومت کی حامی کنزرویٹو جماعت کی مدد انھیں حاصل تھی۔ دوسرا گروہ سر ہربرٹ سیموئل کا تھا جو اس وقت انتخاب کے مخالف تھے لیکن جب عام انتخاب کا فیصلہ ہو ہی گیا تو یہ اپنی وزارت سے دست کش نہ ہوئے۔ کنزرویٹو جماعت ان کی اس لئے سخت مخالف ہے کہ یہ زراعت و صنعت کے لئے تامینی محصول کے حامی نہیں ہیں۔ اُدھر لبرل جماعت کے سربرآوردہ رہنما مسٹر لائڈ جارج اس لئے ان سے خفا ہیں کہ انھوں نے بالآخر جدید انتخاب پر رضامندی کیوں ظاہر کی اور لبرل پارٹی کا جو فنڈ لائڈ جارج کے شخصی قبضے میں ہے اس سے اس جماعت کو کوئی مدد نہیں دی گئی۔ تیسرے گروہ میں لبرل پارٹی کا اکثر و بیشتر حصہ تھا جو قومی حکومت کی مخالفت اور تامین کے مقابلے میں آزاد تجارت کے اصول کی حمایت کر رہا تھا۔ لیکن لائڈ جارج کے پارٹی فنڈ سے یہ بھی محروم رکھا گیا۔ چوتھی جماعت خود لائڈ جارج کے معتقدین خاص کی ہے جو اپنے پرانے مخالفوں یعنی لیبر پارٹی والوں کی طرف مفاہمت و تعاون کا قدم اٹھا رہی ہے۔

لیبر پارٹی میں بڑی جماعت تو ہنڈرسن کے ساتھ تھی۔ اس پر ایک طرف تو قدامت پرستوں کی جانب سے خالص اشتراکی جماعت ہونے کا الزام تھا، دوسری طرف سے خود اس کے انتہا پسند ساتھی اسے سرمایہ داری کا بیجا حامی بتا رہے تھے۔ اس اس انتہا پسند جماعت نے (جو آزاد لیبر پارٹی کے نام سے مشہور ہے) اکثر جگہ خود لیبر کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کئے اور اس طرح لیبر کی کامیابی کے امکانات کو جو میکڈانلڈ اسنوڈن وغیرہ جیسے بااثر لوگوں کے نکل جانے سے پہلے ہی سے کم تھے اور بھی کم کر دیا۔ لیبر کا ایک مختصر سا گروہ میکڈانلڈ کے ساتھ تھا۔ انھوں نے اپنے لئے نیشنل لیبر کا نام تجویز کیا۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس الزام سے بریت ان کے لئے مشکل رہی کہ ان کا سارا کام اپنے پرانے دشمنوں یعنی کنزرویٹو جماعت کی مالی مدد سے چل رہا ہے۔

لیبر پارٹی میں تفریق اور اشتراک کے امکانات | برطانیہ کی لیبر پارٹی میں پچھلے چند مہینوں میں جو اختلافات رونما ہوئے ان کا سمجھنا انگریزی سیاست کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ لیبر

پارٹی کے قائد اور انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ کو اس زمانے میں اپنی جماعت سے علٰحدگی اختیار کرنی پڑی، ان کا ساتھ وزیر مال مسٹر اسنوڈن اور مسٹر ٹامس نے دیا جو لیبر پارٹی کے بہت بااثر قائد تھے لیکن ان تین تجربہ کار اور ہر دلعزیز قائدوں کا اثر بھی اپنی طرف لیبر پارٹی کے بہت کم حصہ کو کھینچ سکا اور پارٹی تقریباً متفقہ طور پر مسٹر ہنڈرسن کے ساتھ رہی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کی مالی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے جو تدابیر نکالی گئی ہیں وہ یہ کہ اجرتیں کم کی جائیں، سرکاری ملازمتوں میں تنخواہیں گھٹائی جائیں، بے کار مزدوروں کو ریاست کی طرف سے جو بھتہ دیا جاتا ہے اس میں تخفیف ہو، تعمیرات عامہ اور سڑکوں پر جو خرچ ہوتا ہے اس میں ہاتھ روکا جائے، توازن تجارتی کو درست کرنے کے لئے یعنی درآمد کو جو نسبتاً بہت بڑھ گئی ہے کم کرنے کے لئے تامینی محصول لگائے جائیں۔ مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھی ان تجاویز کے حامی اور مسٹر ہنڈرسن اور ان کے ہمنوا اس کے مخالف تھے اور لیبر پارٹی نے مسٹر ہنڈرسن کا ساتھ دیا۔

انگلستان کی لیبر پارٹی تقریباً تمام تر وہاں کے ٹریڈ یونین کے ممبروں پر مشتمل ہے۔ کہیں ۱۹۱۸ء میں جاکر مسٹر ہنڈرسن کی کوشش سے اس میں کسی ٹریڈ یونین سے غیر متعلق آدمی کی شرکت کے امکانات بڑھے، اسی وجہ سے اس پارٹی میں دماغی کام کرنے والوں کی تعداد دوسری جماعتوں سے بہت کم ہے۔ ٹریڈ یونین کے ممبروں کے لئے کفایت کی یہ تجویز جس پر ان کے سابقہ قائدین میکڈانلڈ، اسنوڈن اور ٹامس راضی ہو گئے ہیں، ظاہر ہے کہ قابل پذیرائی نہیں ہو سکتی مزدور یہ کیسے چاہے کہ اس کی اجرت کم ہو، کس طرح مان لے کہ مدتوں کی کوشش سے بیکاری کے بھتے کی جو صورت پیدا ہوئی ہے اسے ختم کر دیا جائے اور اجتماعی مصارف کی تخفیف کے باعث کام کے مواقع میں کمی ہو جانے کا خطرہ اور بھی اپنے سر لیا جائے۔ لیکن مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھیوں نے اس کی حمایت کیوں کی؟ اس لئے کہ ان کی رائے میں اس مرغی کو مار نہ ڈالنا چاہئے جو سونے کا انڈا دیتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نظام سرمایہ داری تب ہی قائم رہ سکتا ہے کہ کارخانوں کے مالکوں کو کافی منافع ملتا رہے۔ اُدھر مسٹر ہنڈرسن کے ساتھی یعنی ٹریڈ یونین کے منظم مزدور صرف یہ دیکھتے ہیں کہ

اس لازمی عمل سے ان کو فوری نقصان ہوگا اور آئندہ کی امیدیں موجودہ نقصان کے مقابلے میں قابل اعتبار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ابھی تک افراد قوم میں آمدنیاں بہت غیر مساوی ہیں اور جب تک امیر و غریب کا یہ بین فرق موجود ہے اجتماعی ضروریات کا بار مالداروں پر ڈالنا اور اس سے غریبوں کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسٹر ہنڈرسن اور ان کے ساتھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ اگر مالکان کارخانہ پر بار برابر بڑھتا گیا تو صنعت کے فوائد ختم ہو جائیں گے اور نظام سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان میں بعض یہی چاہتے ہیں کہ اس نظام کا خاتمہ ہو اور جلد ہو۔ بعض جو ذرا محتاط ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ صنعتی کارخانوں کے مالکوں ہی پر بار بڑھایا جائے۔ بے گنتی مالدار لوگ ہیں جن کے پاس سرمایہ جمع ہے اور وہ اس کے سود سے چین کرتے ہیں، جب روپیہ کی قیمت بڑھے یعنی چیزیں سستی ہو جائیں اور شرح سود وہی رہے تو گویا ان سود کھانے والوں کی آمدنی بیٹھے بیٹھے بڑھ جاتی ہے۔ ان پر خاص ٹیکس لگانا چاہیے۔

وہ گروہ جو سرمایہ داری کا خاتمہ چاہتا ہے۔ مسٹر میکسٹن کے زیر قیادت ہے۔ ان کے ساتھ بہت سے قابل لوگ ہیں لیکن ان کا اثر ابھی بہت کم ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب نظام سرمایہ داری میں اس کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ مالکوں کو منافع بھی ہوتا رہے اور مزدوروں کی اجرتیں بھی بڑھتی رہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھیوں کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ایک اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کو ختم کر دینا چاہیے، اور دوسرا یہ کہ نظام سرمایہ داری پر سے بوجھ ہلکا کر کے اسے چلائے جانا چاہیے۔ لیبر پارٹی کی اکثریت نہ اُن کے پاس ہے نہ اِن کے۔ وہ ابھی نہ انقلاب کی ہمت رکھتی ہے، نہ بوجھ ہلکا کرنے، اجرتیں گھٹانے پر آمادہ ہے۔ لیکن بہر صورت اس اکثریت کو مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کوئی زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ ٹریڈ یونین کے اراکین اپنی اجرتیں نہیں گھٹنے دیں گے اور اگر معاشی حالات نے جلد سنبھالا نہ لیا جس کی فی الوقت کوئی توقع نہیں ہے تو غالباً چند ہی سال میں یہ اکثریت سرمایہ داری سے اصولاً اختلاف ہو کر بالکل اشتراکی پروگرام اختیار کرے گی۔ اس لحاظ سے بہت ممکن ہے کہ مستقبل کا مورخ اس انتخاب کو

انگلستان میں انقلابی اشتراکیت کی ابتدا سے تعبیر کرے۔

منچوریا پچھلے مہینے کے اہم واقعات میں وہ جنگ بھی ہے جو چین اور جاپان کے درمیان منچوریا میں شروع ہوگئی ہے۔ انجمن اقوام اس جھگڑے کو ختم کرنے کی جو کوشش کر رہی ہے اس میں کبھی کامیابی کی امید ہو جاتی ہے، کبھی مایوسی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ آخری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ منچوریا میں ایک جمہوریت کے قیام کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ جاپان نے انجمن اقوام کا ایک تحقیقاتی کمیشن قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ لیکن بظاہر اگر یہ جنگی کارروائی ختم بھی ہوگئی تو وہ اسباب آسانی سے نہیں مٹ سکتے جن کا صرف ایک پہلو اس تنازع سے ظاہر ہوتا ہے۔

جاپان منچوریا میں اپنا اقتدار چاہتا ہے اور مختلف معاہدوں کے ذریعے وہاں ایسے حقوق حاصل کر چکا ہے کہ ایک مدت تک کے لئے قانوناً وہاں قدم جمائے رکھنے کا سامان موجود ہے۔ روس بھی بحر الکاہل پر اپنا اثر رکھنے کے لئے اور وہاں کے سب سے قریب کے راستے پر قابض رہنے کے لئے متفکر ہے۔ لیکن جاپان کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ جاپان خود بھی اس سے چھیڑ کرنا نہیں چاہتا اور بھونے سے اسے خاموش رکھنا چاہتا ہے۔ امریکہ جس کے لئے چین بڑی منڈی ہے، چاہتا ہے کہ چین کا تسلط قائم رہے اور جاپان کو غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہونے پائے۔ اُدھر چین دیکھتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک عضو ہمیشہ کے لئے جدا کیا جاتا ہے مگر کمزور اور بے بس ہے۔ معاہدوں کا واسطہ دیتا ہے انجمن اقوام سے التجائیں کرتا ہے لیکن کمزور کی التجائیں سیاست میں کب کام دیتی ہیں، البتہ امریکہ، روس وغیرہ کے اغراض اس کے آڑے آئیں تو آئیں، یا پھر خود اس کی طرف سے جاپانی مال کا بائیکاٹ۔ ۳۱ء میں جاپان کی برآمد کا ۲۵ فیصد سے زیادہ چین جاتا تھا ۳۲ء میں یہ گھٹ کر ۱۴ فیصدی رہ گیا تھا۔ اگر اب بائیکاٹ نے سخت صورت اختیار کر لی تو جاپان پر خاصا اثر پڑ سکتا ہے جس کی مالیات کی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے اور گزشتہ موسم گرما میں میزانیہ حکومت کی ترتیب میں اچھی خاصی دشواری کا سامنا کیا جا چکا ہے۔

منچوریا میں معیشت و سیاست کی ایسی گتھیاں ہیں کہ انکا تفصیل سے بیان کرنا معاملات کی اہمیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر ہو سکا تو کسی آئندہ اشاعت میں اس پر جداگانہ مضمون ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

تلافی!

منصور، ایک سرمست شباب نوجوان تھا، رگوں میں جوانی کا خون موجزن، سر میں عشق و ہوس کا سودا۔ اور دل میں کسی کے چاہنے کی آرزو، طرہ یہ کہ عہدہ قضا پر مامور، نہ فکر امروز، نہ غم فردا، مزید اتفاق یہ کہ مکان ہی کے پاس ایک خاندان نے اقامت اختیار کی جس کا ہر فرد "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش"، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پیکر رعنائی سے آنکھ لڑی جس نے پیام و سلام کی صورت اختیار کی، پیام و سلام، اختلاط و ارتباط میں بدلا۔ اور اختلاط و ارتباط نے اپنے "نتائج" ظاہر کئے، اور بالآخر عشق و محبت کا یہ المیہ بھی اسی طرح ختم ہو گیا جس طرح آدم و حوا کے فرزند، ہوا و ہوس کے اسٹیج پر اپنے کمالات فن کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔

نوشابہ کامرانی وصل کے بعد اپنے عزلت کدہ میں جب واپس آئی، تو ایک آتش سوزاں تھی جو اس کے دل و جگر کو خاک سیاہ کئے دیتی تھی، اور ایک غم تھا جو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا، آتش سوزاں تو بہر حال "غم نہاں" کی صورت اختیار کر سکتی تھی، لیکن اس لذت وصل کی یادگار کو، جو عنقریب پردۂ ظہور پر رونما ہونے والی تھی کیونکر چھپایا جا سکتا تھا؟ "آج" اس یادگار کے اثرات و نقوش کو چشم عالم سے پوشیدہ رکھا جا سکتا تھا لیکن "کل" جب وہ یادگار عہد ہوس اس عالم خاکی میں آنے پر مچل رہی ہو گی تو دنیا والوں کی آنکھ کون بند کرے گا؟

یہ تھے وہ خیالات و تاثرات جنھوں نے نوشابہ کی نیند حرام کر دی تھی، افکار و ہموم کی اس تراوش مسلسل نے اس کا سر، رنج بالیں اور اس کا تن بار بستر بنا رکھا تھا، ہوش و حواس اسے جواب دے چکے تھے۔ اب اسے فرار کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔

آخر ایک تیرہ و تار رات میں اس کے ارادے نے عزم کی صورت اختیار کر لی، اس

سے نے چادر اوڑھی اور اپنے تئیں اس شب بلا کے سپرد کر دیا، اس قطع مسافت کے بعد وہ ایک ویران و سنسان مقام پر پہنچی جہاں اسے ایک کھنڈر مل گیا جس میں وہ ٹھہر گئی، اس کھنڈر میں وہ تن تنہا تھی۔ نہ کوئی رفیق تھا نہ ہمدم، اگر رفیق تھا تو وہ غم جس نے دل کی دنیا تاراج کر دی تھی، اگر ہمدم تھا تو وہ یادگار عہد نشاط جو عنقریب عالم وجود میں آنیوالی تھی۔ اب کون تھا جو اس کی غمخواری کرتا،

ہاں نوشابہ کی ماں تھی جو اس کی ذرا سی تکلیف پر بیقرار ہو جاتی تھی اس کی پریشانی پر پریشان ہوتی تھی، اس کے رونے پر اس کے آنسو بھی اختیار سے باہر ہو جاتے تھے، لیکن اب تو وہ اس نعمت سے جدائی اختیار کر چکی تھی۔

اس کا باپ تھا، جس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نوشابہ کو کامیاب و کامراں اور بامراد و شادکام دیکھے، لیکن وہ تو اس کے ہاں سے ہجرت کر چکی تھی۔

اس کے نوکر چاکر تھے، کوئی اس کے سرھانے بیٹھ کر کہانی کہتا، کوئی پاؤں دابتا کوئی کچھ کرتا کوئی کچھ کرتا، لیکن اب تو وحشت و تنہائی اس کے جلو میں حاضر تھی۔

وہ اعزاز و اکرام کی مالک تھی، جو اس کے لئے سرمایہ تسکین و تسلی تھا، اس کا دل فخر و سرور سے لبریز رہتا اور اس کی گردن رشک و افتخار سے سربلند، لیکن اب تو وہ اس سے بھی محروم ہو چکی تھی۔

اسے آرزو تھی کہ اس کی حیات ازدواجی ایک کامیاب نمونہ ہو، لیکن آہ! کہ دست برد زمانہ سے یہ آرزو بھی ناکامی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

یہ تھے وہ خیالات و افکار جو صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتے، ایک روز جب وہ اپنے مصائب و نوائب کی علت پر غور کر رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ منصور ہی ہے جس نے میری زندگی تباہ کی، اس نے پیمان محبت باندھا ہمیشہ کے لئے تھا لیکن توڑ فوراً دیا، اور آج میں ہوں، اور تنگنائے حیات کے یہ روح فرسا شدائد۔

وہ انھیں خیالات میں مستغرق تھی کہ غم و غصہ سے اس نے اپنے پہلو میں ایک آگ سی

سلگتی محسوس کی، اسے غصہ آرہا تھا کہ منصور جو حقیقتہً اس کا قاتل ہے، کس مزے سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسے انسانی سوسائٹی پر غصہ آرہا تھا کہ وہ "قاتل" کا تعاقب کیوں نہیں کرتی، سراغ کیوں نہیں لگاتی اور اسے پابستہ زنجیر و رسن کیوں نہیں کرتی؟

دن گزرتے رہے اور ایک دن وہ وقت آن پہنچا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا یعنی نوشابہ کو درد شروع ہوا، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بچی عالم وجود میں آ ہی گئی، اس طرح کہ نوشابہ کے سوا کوئی نہ تھا جو اس کی خبرگیری کرتا جو اس انتہائی کرب و پریشانی کے عالم میں اس کا یار و مددگار رہتا، ہاں ایک بڑھیا تھی جو حق ہمسائگی ادا کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو آ گئی تھی اور بس بیچاری سے جو کچھ بن پڑا کیا، لیکن تھوڑی کے بعد وہ بھی چلی گئی، اور اب غریب نوشابہ پر جو گزرتی تھی گذری، جو پیش آنا تھا پیش آیا۔

نوشابہ اپنے اس جدید جہان سے جو اس کارگاہ عالم میں اسے سب سے زیادہ محبوب تھا، بہت دل تنگ تھی، ایک رات کو وہ بیٹھی ہوئی تھی، بچی اس کی گود میں پڑی سو رہی تھی، اور نوشابہ اپنا سر اپنی ہتھیلی پر ٹیکے ہوئے بیٹھی تھی، اس قفل خاموشی کو اس نے خود توڑا، اور خود بخود کہنے لگی، "کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا۔ کاش میں عالم وجود میں نہ آئی ہوتی، اگر میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو یہ دکھ کیوں سہتی؟ اس دنیا میں اگر کوئی ایسی ہستی ہے کہ جس کے وجود سے عدم بہتر ہے، تو بلا شبہ وہ میری ہستی ہے۔ آج سے قبل تک تو میں اپنے ننگ حیات وجود سے دنیا کو پاک کر سکتی تھی، لیکن اب؟ اب میرے لئے کیا چارہ کار رہ گیا ہے؟ کیا میں خودکشی کر لوں؟ لیکن اس بچی کا کیا ہوگا؟ کیا میرے لئے یہ مناسب ہوگا کہ اس معصوم بچی کے لئے میں اپنی ناشاد زندگی گزارتی رہوں؟ لیکن میں اگر زندہ رہنا بھی چاہوں تو موت تو میری تاک میں ہے وہ مجھے کیوں چھوڑنے لگی؟ وہ تو مجھے قبر تک پہنچا کے رہے گی، لیکن میرے بعد اس بچی کا کیا حال ہوگا؟ میرے بعد وہ اپنی کم بخت زندگی کچھ دن گزارے گی، لیکن کس جرم کی پاداش میں وہ یہ مصیبتیں جھیلے گی؟ کس گناہ کی اسے یہ سزا دی جائے گی؟ اس کی خطا سوا اس کے اور

کیا ہے کہ میں اس کی ماں ہوں ؟

اب وہ اپنی بچی کی طرف مخاطب ہوئی اور کہنے لگی ،

"میری بچی ! کیا تو اس لئے زندہ رہے گی کہ جب میری داستان حسرت سنے تو میرے لئے مغفرت کی دعا کرے ؟ اب تو میرے پاس زیور بھی کچھ نہیں رہے۔ جو دو ایک ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہیں انھیں بھی آج کل میں بیچ دوں گی۔ پھر اس کے بعد تیرا کیا حال ہوگا ؟ تیری کون خبر لے گا ؟

یہ تو ناممکن ہے کہ میں اپنے والد کے پاس واپس جاؤں اور انھیں اپنا قصہ درد سناؤں ، وہ تو مجھے رو چکے ، جس طرح مُردوں کو روتے ہیں ، میں اسے اچھا سمجھتی ہوں کہ میری موت پر رویا جائے نہ اسے کہ میری ناپاک زندگی پر آنسو بہائے جائیں۔

نوشابہ اسی طرح اپنے دل سے اور اپنی بچی سے باتیں کرتی رہی تھوڑی دیر کے بعد اس کا یہ سیلاب غم کم ہوا تو سیل گریہ نے اس کی جگہ لے لی ، گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے ، اور یہی وہ چیز ہے جس سے کمزور اور ناتواں لوگوں کے دل کی بھڑاس نکلتی ہے ، بقول غالب۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر !

دن گزرتے رہے اور نوشابہ نے اپنی تمام پونجی بیچ ڈالی ۔ اب نہ اس کے تن پر کپڑا تھا نہ ہاتھ میں پیسہ ، ہاں ایک پھٹی پرانی قمیص ، ایک پاجامہ ، ایک برقعہ ۔ بس یہ تھی وہ کل کائنات جو نوشابہ اور اس کی کمسن بچی کے دست قدرت میں تھی ۔

رات اور زیادہ ایذا رسانیوں کے ساتھ آئی ، نوشابہ نے برقعہ اوڑھا اور چل کھڑی ہوئی سڑکوں کو طے کرتے کرتے گلیوں میں پہنچی لیکن برابر چلتی رہی ، اس قطع مسافت سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ غم و آلام سے نجات پائے ، لیکن غم تھا کہ اس کا پیچھا کر رہا تھا ، اس کے نقش قدم پر چل رہا تھا ،

اتفاقاً ایک کٹنی کی نظر اس پر پڑ گئی، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی اور نوشابہ کے ساتھ ساتھ
س کے کھنڈر میں داخل ہو گئی، دلدہی اور دلداری کے لہجے میں نوشابہ سے اس کا حال پوچھنے
گی، وہ بیچاری غم کی ماری، دورو کی ستائی، کسی ہمدرد کو ترس گئی تھی، اس نے اس کٹنی کے
لہجے میں رفق و ملائمت کے آثار جو دیکھے تو ابل پڑی اور دل میں جو کچھ تھا سب ہی کچھ کہہ ڈالا، اپنے
عہد نشاط کے قصے بھی سنائے اور اپنی داستان غم بھی، کٹنی بھانپ گئی کہ اچھا شکار ہاتھ آیا ایک تو
لڑکی یوں ہی حسن و جمال، رعنائی و زیبائی میں بے نظیر ہے۔ پھر اگر میں نے اس کی خورد و پرداخت
کی، کھلایا پلایا اور اچھی طرح سے رکھا تو سونے پر سہاگا ہو جائے گا۔ اور پھر میں اپنی ساری زندگی بڑے
مزے میں اس کے ذریعے سے تیر کر دوں گی، آخر باتیں بنا بنا کے اسے بہلا پھسلا کے وہ اپنے گھر
لے گئی، یہاں شروع شروع تو نوشابہ کی خوب آؤ بھگت ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اس
نے محسوس کر لیا کہ وہ اس کٹنی کے دام حرص و ہوس میں بے طرح اسیر ہو گئی ہے اور اس بلا
سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔

یہاں وہ اپنی پہلی زندگی سے بھی زیادہ نامراد و تباہ حال زندگی بسر کر رہی تھی، اس لئے
کہ یہاں کوئی وقت ایسا نہیں تھا جب وہ خون جگر نہ پیتی ہو، یہاں کے حالات نے اس کی نیند
اڑا دی تھی، راتوں کے جاگنے سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور وہ بیچاری ان درندہ صفت
انسانوں کے اختلاف طبائع اور تنوع اخلاق کو بھی برداشت کرتی تھی جو اس کٹنی کے بلانے سے
آتے تھے اور اسے پریشان کیا کرتے تھے، اور جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو مایوس ہو کر اس نے

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

پر عمل شروع کیا۔

کچھ دن اگر یہ حالت بھی قائم رہتی تو نوشابہ اس پر بھی قانع ہو جاتی لیکن اس پر تو مصیبت
کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، ایک شخص جو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اپنی ناکامی کے
بعد اسے پریشان کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس نے تہمت لگائی کہ نوشابہ نے میرے

درہموں کی تھیلی چرالی ہے، اور صرف تہمت ہی نہیں لگائی۔ قاضی کے ہاں مقدمہ بھی پیش کردیا اوران عورتوں کو جواس کے حسن وجمال اور دیگر محامد ومحاسن کی بنا پر خار کھائے بیٹھی تھیں گواہی کے لئے بھی آمادہ کرلیا۔

پیشی کا دن آیا اور نوشابہ عدالت کے کٹہرے میں لاکر کھڑی کردی گئی، اس کی گود میں اس کی بچی تھی جو اپنی عمر کی سات منزلیں طے کرچکی تھی، قاضی آیا اور اس نے مثلیں دیکھ دیکھ کر اپنی رائے اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نوشابہ کی باری آئی وہ کرسئ عدالت کے پاس لاکر کھڑی کی گئی، اس نے جو قاضی صاحب کو دیکھا تو شدت تحیر سے نقش بہ دیوار بن گئی، اس لئے کہ اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی ہوا وہوس کی وہ شکار ہوئی تھی جو اس کی ان مصیبتوں کا اصل سبب ہے، جو اس کی ان تباہحالیوں کی اصل علت ہے، آخر اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ یک بیک چیخ اٹھی جس سے عدالت کا کمرہ گونج گیا، اس نے کہا،

"جناب قاضی صاحب! یہ آپ کے شایاں شان نہیں کہ آپ میرے مقدمے میں حکم بنیں، اس لئے کہ ہم دونوں میں سے ہر ایک چور بھی ہے اور خائن بھی، خائن کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ خائن کے محضر سزا پر دستخط کرے! ایک چور کب اس کا مستحق ہے کہ وہ دوسرے چوروں کو سزا دے؟"

نوشابہ کی بے باکانہ گفتگو سے قاضی عدالت اور حاضرین مجلس سب دنگ رہ گئے، قاضی صاحب اس گستاخی پر بہت برہم ہوئے اور فوراً چپراسی کو حکم دیا کہ وہ اسے کٹہرے سے باہر کردے، لیکن قبل اس کے کہ ایسا ہو نوشابہ نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا، اب جو قاضی صاحب کی نظر پڑی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے، ایک نظر میں انھوں نے سب کچھ بھانپ لیا، گزشتہ عہد کی ہوسناکیوں کا ایک ایک مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا، اس صورت حال نے سارے بدن پر لرزش طاری کردی، اور وہ کرسی پر اس طرح ساکت وصامت ہوگئے، جس

طرح مردہ بستر مرگ پر، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نوشابہ نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں نے مال چرایا ہے اور تم نے آبرو پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ آبرو مال سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے لہٰذا تم مجھ سے کہیں زیادہ مجرم ہو۔ جو مال چرائے، وہ اپنے جرم کی تلافی مال واپس کرکے یا کسی اور دوسرے طریقے سے کرسکتا ہے، لیکن جس عورت کی آبرو پر ڈاکہ ڈالا گیا ہو تو اس کی تلافی کیونکر ممکن ہے؟ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ آبرو جا کے واپس نہیں آتی؟ اگر تم نے میری متاعِ آبرو تاراج نہ کی ہوتی تو آج میں ان حالوں کو نہ پہنچتی۔ اٹھو، اپنی کرسی کسی دوسرے کیلئے چھوڑ دو اور آؤ، میرے پاس کھڑے ہو جاؤ، تاکہ کوئی قاضی عادل ہم دونوں کا محاکمہ کرے کہ جرم ایک ہی ہے جس کا مجرم یقیناً صرف تو ہے۔ اور میں ناحق اس میں شامل کی گئی ہوں۔

ہاں شریعت جانتی ہے کہ ہم دونوں کا جرم مشترک ہے، پھر بھی میں اس کٹہرے میں پابجولاں کھڑی کی گئی ہوں، اور تم عدالت کی کرسی پر متمکن ہو؟ کیا شریعت (نعوذ باللہ) ظالم ہے، کیا وہ عدل وانصاف کی صفات سے عاری ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں "یہاں" کیوں ہوں؟ اور تم "وہاں" کیوں ہو؟

جب میں یہاں داخل ہوئی ہوں تو میں نے تمہیں اس حال میں دیکھا کہ حاجب تمہارے آگے آگے منادی کر رہا ہے کہ قاضی صاحب مجمع القاب نہضت فرمائے عدالت ہوا چاہتے ہیں لوگ تمہارے خیر مقدم کے لئے اٹھ رہے ہیں، غرض ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے کہ قاضی صاحب آ رہے ہیں، قاضی صاحب آ رہے ہیں؛ اور اپنے کو اس حال میں پایا کہ آنکھیں آنسوؤں کے قطرے گرا رہی ہوں دل ہے کہ سوزِ غم سے جلا جا رہا ہے، تو میں نے اپنے دل میں کہا، یا للعجب! القاب وخطابات کا کتنا غلط استعمال ہو رہا ہے؟ اور یہ عالم کتنی بڑی گمراہی میں مبتلا ہے؟ کتنی بڑی جہالت اس پر طاری ہے؟

وہ لوگ کیسے ہیں جو تمہارے علم وفضل پر شہادت دیتے ہیں؟ تمہارے اخلاق وآداب کی تعریف میں رطب اللساں ہیں؟ وہ لوگ کتنے احمق ہیں جنھوں نے تمھیں اس منصب بلند پر سرفراز

کیا ہے۔ تمھارے ہاتھ میں قانون دے رکھا ہے اور تمھارے سامنے سپاہیوں کا یہ دستہ متعین کر دیا ہے کہ جو تمھارے احکام بجا لائیں، تمھارے فرامین نافذ کریں اور تمھاری خواہشات پوری کریں؛

تمھارے اور تمھارے ہم مشرب لوگوں کے لباس فاخرہ کے اندر بھی ویسا ہی خبیث دل ہے جیسا میرے ان چیتھڑوں کے اندر ہے۔ ہم میں جو جرائم پیشہ کہلاتے ہیں، اور تم میں جو بلند سے بلند مناصب پر فائز ہو، کوئی فرق نہیں، سوا القاب و خطابات کے، وضع و لباس کے۔ اس کے باوجود یہ ستم ظریفی دیکھو کہ تم قاضی ہو، اور میں، مجرم۔

میں یہاں اس لئے لائی گئی ہوں تا کہ حضور قاضی صاحب، مجھے سزائے زندان کا حکم دیں، لیکن میں حضور قاضی صاحب سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس سے قبل جو جور و ستم مجھ پر ہو چکے ہیں کیا وہ ابھی تشنۂ تکمیل ہیں؟ جو مزید الطاف و عنایت کی بھرمار ہے

تمھاری بزم نشاط پر میری بیکسی کی یاد سے کبھی اداسی نہیں چھاتی؟ کیا تمھارے سینے میں پتھر کا دل ہے جو کسی طرح میرے لئے پسیجتا ہی نہیں؟ اگر تمھارے تعلقات کا نتیجہ زیر آمد ہو چکا ہوتا تو میں کب کی اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کر چکی ہوتی، لیکن اس بچی کو دیکھو یہ میرے تمھارے درمیان ایک وسیلہ ہے جو ابھی تک باقی ہے،

منصور نے یہ سب سن کر اپنا سر اٹھایا، اپنی بچی کی طرف پیار و محبت کی نظر سے دیکھا اور اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ مظلوم نوشابہ کے ساتھ انصاف کرے گا، لیکن اس وقت اس نے اپنا فیصلہ یہ سنایا کہ یہ عورت پاگل ہو گئی ہے، پہلے اس کا مداوا ہونا چاہئے، پھر مقدمہ دیکھا جائے گا، لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔

عدالت برخاست ہوئی وہ اپنی کرسی سے اٹھا لیکن اس حال میں کہ نہ وہ دل کا مالک تھا نہ دماغ تھا، چند دنوں تک وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتا رہا پھر اس نے بہ عذر علالت اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔

اشتعل دینے کے بعد اسے اپنی نوشابہ کی جستجو ہوئی، آخر اس نے اسے پالیا اور اسے لے کر ایک دوسرے شہر میں چلا گیا، جہاں کوئی بھی ان دونوں سے واقف نہ تھا۔ وہاں اس نے باقاعدہ نوشابہ سے نکاح کر لیا۔

منصور، اب "پاپ کی بستی" سے "پریم کی نگری" میں آگیا تھا، یہاں اس کی اور نوشابہ کی زندگی بڑے سکھ سے بسر ہو رہی تھی، نوشابہ کو اس کا "پیتم" بڑے دکھ سہنے کے بعد ملا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ منصور جب پریم کی بانسری بجاتا، تو سارا سنسار مست ہو جاتا، کوئل جب پکارتی "پی کہاں" تو نوشابہ مسکرا کے بول اٹھتی "پی یہاں"۔

منصور کے طرزِ عمل نے پچھلی تمام باتوں کا کفارہ کر دیا تھا، وہ گزرا ہوا زمانہ انھیں بھولے سے بھی نہ یاد آتا

(ترجمہ از، النظرات، للمنفلوطی)

تنقید و تبصرہ

کتب :

ارتقاء۔ مشاہدات سائنس۔ تاریخ امریکہ۔ گلدستہ نعت فضیلت مکہ۔ دنیا کی حور۔ اساس منطق

ارتقاء | مصنفہ مشتاق احمد وجدی صاحب۔

یہ ایک مختصرہ ۱۰۵ صفحے کی کتاب انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہے اور مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے۔ مجلد۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ غلطیوں سے پاک ہے۔ قیمت عہ؍ ہے۔

کتاب کی زبان بہت صاف اور پیچیدہ ترکیبوں سے پاک ہے۔ علمی کتابوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ زبان سہل اور سلیس ہو۔ مگر پھر بھی چند غیر مانوس الفاظ آگئے ہیں جو تشریح کے محتاج ہیں۔ مثلاً اعج مایہ، منقلب پتھر، بارودی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کن علمی اصطلاحوں کے تراجم ہیں۔ ایسی کتابوں میں ہمیشہ ایک فرہنگ ہونی چاہئے جس میں انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ اور بعض حالتوں میں تشریح ہوا کرے تو مناسب ہے۔

فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ مگر کتاب میں کوئی باب نہیں ہے، بسم اللہ جو شروع کی ہے تو تتمہ پر جا کر دم لیا ہے اور ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔ اگر مختلف ابواب میں یہ کتاب تقسیم ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ باوجود ان باتوں کے اس کتاب کی معنوی خوبیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ کتاب کے باوجود اتنے اختصار کے

مسئلہ ارتقا پر نہایت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ جو ایک انجان آدمی کے سمجھانے کے لئے بھی کافی ہو۔ عوام اس مسئلے کا لب لباب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ یہ غلط فہمی ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ یورپ میں بھی ہے اور عوام کیا خواص بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ کتاب کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ جب یہ نظریہ الفریڈ ولیس اور چارلس ڈارون نے اول اول پیش کیا تو خود یورپ میں اس کی سخت مخالفت ہوئی اور اب بھی ہے اور ایسے ایسے سائنسداں جیسے کہ لارڈ کیلون اس کے مخالف ہو گئے اور ایسے فلسفی اور مدبر اور ادیب جیسے رسکن، گلیڈ سٹون، ڈسرائیلی سالسبری اور نیومن اور کارلائل اس کے خلاف رائے زنی کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض سائنس کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ اگر ہمارے اکبر مرحوم نے اس کا مذاق اڑایا تو کوئی نئی بات نہیں کی۔

کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ تھیلز اور انا کسمنڈر قدیم یونانی حکما اس کی ابتدائی اصول بتا چکے ہیں۔ مولانا روم اپنی مثنوی میں بارہا اشارہ فرماتے ہیں۔ خود قرآن شریف بھی انسان کو خاک کا تپلا قرار دیتا ہے مگر جس بات کا سہرا ڈارون اور ولیس کے سر بندھا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ارتقا کو سائنس کے قالب میں ڈھال کر اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اور اسے فلسفے کی حد سے نکال کر سائنس کی ترازو میں تولا ہے۔ فاضل مصنف نے یونانی اور ہندی فلسفے کا بھی ابتدا میں حوالہ دیا ہے۔

کتاب اگرچہ بہت صاف زبان میں ہے مگر پھر بھی بعض جگہ مثالوں کی کمی ہے، خصوصًا جہاں مدارج حیات کا ذکر ہے۔ ایسے نظریے میں مثالیں کم ہوں یا واضح نہ ہوں تو اسے صرف اہل فن ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایک خاص کمی یہ بھی ہے کہ اس میں تصویریں نہیں ہیں۔ ارتقا کے مختلف مدارج کے سمجھانے کے لئے ان کا ہونا ضروری تھا، مگر غالبًا فاضل مصنف اردو پریس کی چیرہ دستیوں سے خوب واقف ہیں کہ یہ آدمی کو نہ معلوم کیا بنا دیتے۔ اور شاید خود مسئلہ ارتقا میں ان کی بدولت انقلاب پیدا ہو جاتا اور ڈارون کی روح کاتب کو دعائیں دیتی۔

کتاب کے آخر میں ایک تمہ ہے جس میں مسئلہ ارتقا کے اخلاقی اور مذہبی پہلو سے بحث کی ہے۔ اسپنسر کا ہر چیز میں ارتقا کا جلوہ دیکھنا دراصل مسئلہ ارتقا کی ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ باوجودیکہ وہ خود ارتقائے حیاتی سے ناواقف تھا۔ یہ بحث دلچسپ ہے۔ اور برگسان کا فلسفہ اس فلسفہ کو روحانی سانچے میں ڈھالتا ہے مگر اس سلسلے میں ہم کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ جب ایک عالم دوسرے علم پر خامہ فرسائی کرتا ہے تو اور زیادہ دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ جو اعتراض فاضل مصنف نے اور خود ہم نے لارڈ کیلون (طبیعی) اور گلیڈ سٹون وغیرہ پر کئے ہیں وہ اپنا میدان چھوڑ کر کیوں دوسرے خار دار جنگل میں پھنستے ہیں اور اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں اُسی طرح فاضل مصنف اگر تمہ نہ لکھتے تو فلسفے کے اور مذہب اور اخلاق کی پیچیدگیوں میں نہ الجھتے جن کو وہ بخوبی نہ سلجھا سکے۔ اس کا ثبوت اُن کے آخری فقرے سے ملتا ہے لکھتے ہیں۔

"..... یہ نیا مذہب نماز، روزہ اور گنڈے تعویذ کی توہم پرستیاں بھلا کر ہمیں رنج و غم، جہالت اور توہم پرستی سے جنگ کرنے اور دنیا میں مسرت اور شادمانی کا دور لانے کی کوشش میں مصروف رکھے گا"۔ گنڈے تعویذ کہیں مذہب میں داخل نہیں ہیں۔ نماز روزہ عبادات ہیں جسے ہر مذہب نے کسی نہ کسی صورت میں سکھایا ہے اور یہ بھی عبادت کی ارتقائی صورتیں ہیں۔

بہرحال کتاب بحالت مجموعی نہایت دلچسپ ہے اور اس قابل ہے کہ جو شخص مسئلہ ارتقا سے واقف ہونا چاہئے وہ اسے ضرور پڑھے۔ (م۔ ع۔ ح)

مشاہدات سائنس | مصنفہ محمد عمر صاحب حسنی سی۔ ای وغیرہ انجنیر جونا گڈھ۔ حجم ۲۲۴ صفحے قیمت عہ

ناظرین جامعہ کے لئے سید محمد عمر حسنی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اکثر

سائنس کے مباحث اور صنعت جدیدہ کے کرشموں کو اردو داں پبلک کے سامنے اپنے مضامین کے ذریعے پیش کرتے رہتے ہیں۔ مشاہدات سائنس آپ کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو نقیب جامعہ اور سائنس میں ایک ایک کر کے چھپ چکے ہیں مگر اس وقت کتابی صورت میں یکجا شائع کئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر ان مضامین کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد عمر صاحب نے سائنس کے مسائل اور صنعت کی جدید ایجادوں کو عام فہم زبان میں اور دلچسپ طریقے پر بیان کرنے میں خاص کامیابی حاصل کی ہے۔ کیوں نہ ہو آپ کی ذات خود مجموعہ کمالات ہے۔ یہی نہیں کہ آپ جاپان اور جرمنی کے سند یافتہ اور تجربہ کار انجنیر ہیں بلکہ اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں آپ کچھ دنوں معلم بھی رہ چکے ہیں اور پھر اخبار الہلال کے ادارہ میں مولانا ابو الکلام کے ساتھ مضمون نگاری بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ سب باتیں تعارف سے معلوم ہو سکتی ہیں جو کتاب کے شروع میں جناب اختر جوناگڈھی نے لکھا ہے۔ مندرجہ بالا تعارف کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشاہدات سائنس لکھنے کا حق محمد عمر صاحب کو ہی حاصل ہے۔ جہاں علمی اعتبار سے آپ نے بہترین تعلیم گاہوں میں سائنس اور انجنیری سیکھی ہو وہاں ملک کے بہترین ادارے میں مضمون نگاری کی مشق کی ہے اور پھر معلمی کے سلسلے میں آپ نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ایک مشکل مضمون کو بچوں اور ناواقفوں کے لئے کیونکر آسان بنایا جا سکتا ہے۔

البتہ کہیں کہیں لکھنے کی رو میں محمد عمر صاحب کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جن کی صحت پر اعتراض کیا جا سکتا ہے مثلاً "تحت الثریٰ کی سیر" میں آپ فرماتے ہیں:۔

"وہاں زیادہ تر کاربانک ایسڈ گیس ہوتی ہے جو حیات حیوانی کے لئے سب سے زیادہ مضر شے ہے" اگر یہ واقعی درست ہے تو سوڈا واٹر کی بوتلوں پر جن میں یہی کاربانک ایسڈ گیس بند ہوتی ہے سرخ روشنائی کے ساتھ موٹے قلم سے "زہر" لکھنے کی ضرورت ہوتی۔ اسی طرح مندرجہ ذیل عبارت غلط فہمی میں ڈالنے والی ہے اور اصلیت کو ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کرتی

"لوہے کو جب تپایا جاتا ہے اور سرخ ہو جاتا ہے تو ہوا جس میں آکسیجن کا حصہ زیادہ شامل ہوتا ہے سرخ لوہے سے رگڑ کھاتے ہی جل جاتی ہے اور ایک ہلکی سی پپڑی جم جاتی ہے یہ حقیقت میں لوہے کا جزو نہیں ہوتی بلکہ جلی ہوئی ہوا کی پپڑی ہوتی ہے" اس پپڑی کو محض جلی ہوئی ہوا کہنا غلط ہے یہ پپڑی دھات اور ہوا کے حصوں کی کیمیائی ترکیب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ پپڑی لوہے کا جزو نہ ہو مگر لوہا اس کا جزو ہوتا ہے، یہ لکھنا کہ "جب حرارت کو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو وہ غائب ہونے اور کام نہ کرنے کی کوشش کرتی ہے" حرارت کو ایک کام چور اور سست نوکر خیال کرنا ہے - یہ تصور غلط ہے اور یہ تشبیہ علمی نقطۂ نظر کے منافی ہے۔

بعض مقالات پر مضامین کے حصے عام فہم نہیں رہے۔ شاید انھی مقالات کی طرف اشارہ کر کے جناب اختر جوناگڈھی نے تعارف میں لکھا ہے "کہیں کہیں دقت مضمون کی وجہ سے اظہار خیال میں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے" مگر حقیقت یہ ہے کہ اکثر مقامات اظہار خیال میں اتنا الجھاؤ نہیں جتنا پڑھنے والے کی سائنس سے عدم واقفیت کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ خرابی یہ ہے کہ بہت سے مقامات تشریح کے محتاج رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ سائنس سے پہلے سے واقف ہیں اور ان تشریحات کے نہ ہونے پر بھی مصنف کے مطلب کو سمجھ جاتے ہیں مگر جن کے لئے یہ کتاب خصوصیت سے لکھی گئی ہے وہ ان مقالات پر الجھ کر رہ جاتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ "برف سازی" کے آخری حصہ کو زیادہ واضح کر دیا جائے اور ان مسائل کی بھی تشریح کر دی جائے جس سے مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب میں اگر تصاویر زیادہ ہوتیں تو اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا۔ کہیں کہیں بعض نامانوس ترکیبیں بھی کتاب میں نظر آتی ہیں۔ "ناقابل حس حصہ"، "حس آمیز تجربہ"، "متحرک نشارہ" ایسی ہی ترکیبیں ہیں جو غیر ضروری ہیں اور خواہ مخواہ مضمون کو مشکل بناتی ہیں۔

بعض مضامین کو محمد عمر صاحب نے بڑی احتیاط اور محنت سے لکھا ہے جیسے "روشنی کی رفتار"، "توانائی اور برق"۔ یوں بھی مشاہدات سائنس دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے مگر ان

مضامین نے اس کی قدر و منزلت کو اور بلند کر دیا ہے۔

ہندوستان میں اس کا عام رونا ہے کہ کتاب کتنی ہی احتیاط سے چھپوائی جائے۔ اس میں کتابت کی غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں۔ اس نقص سے "مشاہدات سائنس بھی پاک نہیں۔ بعض مقامات پر کاتب نے اپنی سمجھ کے مطابق الفاظ کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔" روشنی کی رفتار" ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے مگر اس میں لفظ 'خلا' کو کاتب نے کہیں "خار" اور کہیں "خلو" لکھ دیا ہے۔ موقع ایسا ہے کہ خلا کی جگہ 'خار' پڑھنے سے مطلب بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب ہائی اسکول کی لائبریریوں میں ایک مفید اضافہ ہوگی۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔ (ت - ج)

تاریخ امریکہ | مصنفہ محمد یحییٰ صاحب تنہا، تقطیع ۲۰×۲۶، حجم ۲۰۲ صفحے۔ مقام اشاعت:۔ دارالاشاعت غازی آباد۔ قیمت عار

محمد یحییٰ صاحب تنہا کا تاریخی ذوق اس محنت سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے رابن سن کی "تاریخ مغربی یورپ" کے ترجمے پر صرف کی اور تاریخ امریکہ اسی شوق اور محنت کی ایک اور دلیل ہے۔ اس کتاب کے ضروری اور مفید ہونے میں کوئی شک نہیں، اگرچہ ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ "ہمارے ملک ہندوستان کو امریکہ کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے" محض اس وجہ سے کہ "بالواسطہ ہمارا ملک ہی امریکہ کی دریافت کا باعث ہوا" تواریخ کا ذخیرہ بہت کم ہے اور تنہا صاحب نے امریکہ کی تاریخ لکھ کر اردو ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے، دوسرے ملکوں کے متعلق معلومات یوں بھی اردو دانوں میں بہت کم ہے، خصوصاً امریکہ کی طرف سے جو بے پروائی برتی جاتی ہے وہ ان بی۔ لے۔ ڈاکن، صاحب کے خیالات سے ظاہر ہوتی ہے جن کا ذکر مصنف نے دیباچے میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے "تاریخ امریکہ" اردو خواں طبقے کی نظروں میں ایک نعمت ہونا چاہیے۔

کتاب کا حجم زیادہ نہیں مگر اس میں مصنف نے شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں کی تاریخ بیان کی ہے۔ بہتر ہوتا اگر موضوع صرف ریاستہائے متحدہ تک محدود رکھا جاتا، اور ان کی تاریخ کچھ زیادہ تفصیل سے دی جاتی، امریکہ کی تاریخ سے ہندوستانی سبق ضرور حاصل کر سکتے ہیں مگر "تاریخ امریکہ" میں جو مضامین کی تقسیم کی گئی ہے وہ مصنف کے مقصد اور ناظرین کی خواہشوں کو پورا نہیں ہونے دیتی۔ مصنف نے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ "پہلے دو باب کسی قدر تفصیل کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر کہ تفصیل لازماً کتاب کو ضخیم بنا دے گی، دیگر ابواب کو جہاں تک ممکن ہو سکا مختصر کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب کی ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ نہ ہونے پائے۔" اس منطق کو سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ لائق مصنف نے کولمبس کا ذکر پچاس صفحوں میں کیا ہے، اور ابراہم لنکن کا جس کی شخصیت کی عظمت کا ساری دنیا میں چرچا ہے، ڈیڑھ صفحے سے کم میں۔ کولمبس کی ہمت اور حوصلے کی مصنف کے دل میں خواہ کتنی ہی قدر ہو، لنکن کے مقابلے میں اسے اتنی اہمیت دینا صریحی زیادتی ہے جس کے عذر میں اختصار کی خواہش یا ضرورت نہیں پیش کی جا سکتی۔ اگر اختصار کی ضرورت ایسی ہی شدید تھی تو کولمبس اور امریکہ کے دریافت کرنے والوں کا ذکر آسانی سے ڈیڑھ صفحے میں کیا جا سکتا تھا۔

تقسیم مضامین کے علاوہ وہ حصے جہاں مصنف نے واقعات نہیں بیان کیے ہیں بلکہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بہت کمزور ہیں۔ مثلاً باب سوم میں جہاں "ہندوستانیوں" اور یورپ کے ان مہاجروں کا مقابلہ کیا گیا ہے جو امریکہ میں جاکر آباد ہوئے۔ بعض باتیں ہیں جن کا تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، ہمیں فن حرب کے کسی ایسے انقلاب کا علم نہیں جو "ہندوستانیوں" کے ذریعے سے پیدا ہوا، نہ کوئی ایسی "جنگی چالوں" کی خبر ہے جو "ہندوستانیوں" نے اہل امریکہ اور یورپ کو سکھائی ہوں۔ یہ بھی کہنا کہ "ریاستہائے متحدہ کی آزادی بھی زیادہ تر "ہندوستانیوں" کی بدولت حاصل ہوئی ہے، کیونکہ "ہندوستانیوں" نے یورپ والوں کو بھونڈے طریقے سے آزادی کی قدر و قیمت اور ضرورت و آرزو سکھائی، انفرادی ضرورت اور سربلندی بھی

سکھائی اور اکثر کار فنون حرب سے واقف کیا ، صریحاً غلط ہے۔ جو لوگ یورپ چھوڑ کر ریاستہائے متحدہ میں آباد ہوئے انھوں نے اپنا وطن آزادی کی خاطر چھوڑا تھا ، انفرادیت کے پہلے سے معتقد تھے اور اکثر فنون حرب سے واقف بھی تھے۔

بعض بعض الفاظ کے ترجمے میں بھی ہمارے خیال میں مصنف نے صحیح انتخاب نہیں کیا ہے۔ امریکہ کے دیسی باشندوں کو یورپ والوں نے ابتدا میں غلطی سے "انڈین" "Indian" کہنا شروع کیا ، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ تاریخ امریکہ کے لائق مصنف بھی وہی غلطی کریں۔ ان لوگوں کو "انڈین" یا "دیسی امریکی" کہنا ہمارے خیال میں بہت زیادہ مناسب ہوتا۔ اسی طرح Boston Tea-Party مشہور واقعے کو مصنف نے "بوسٹن میں چائے کی جماعت" کے تحت میں بیان کیا ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ انگریزی میں Tea-Party "چائے کی دعوت" کو کہتے ہیں۔

امید ہے کہ اس قسم کی خامیاں آئندہ اشاعت میں درست کر دی جائیں گی۔

(م۔م)

گلدستہ نعت | مرتبہ سید اشفاق حسین صاحب و شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ضخامت ۱۶ صفحے۔

ملنے کا پتہ :۔ سید اشفاق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول ضلع رہتک

اس رسالے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند نعتیہ نظمیں جمع کر دی گئی ہیں اور عاشقان رسول کی خدمت میں مفت نذر کیا جاتا ہے میلاد کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے اچھی چیز ہے

فضیلت مکہ | از جناب مولانا خلیل احمد صاحب (جامعی) نائب صدر جمعیت شبان المسلین حجم ۳۲ صفحے تقطیع چھوٹی۔ قیمت ۱ر ملنے کا پتہ : منظور حسین سکرٹری جمعیۃ شبان المسلین بتوسط فریدی دواخانہ فریزر اسٹریٹ رنگون۔

یہ حضرت شیخ حسن بصری ؒ کے ایک رسالہ کا ترجمہ ہے اس میں مکہ کی فضیلت پر قرآن کی آیتیں اور ہر قسم کی حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

دنیا کی حور | از حضرت کوثر چاند پوری ضخامت ۵۰ صفحہ۔ تقطیع خورد۔ کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ حضرت کوثر چاند پوری، گورنمنٹ بھوپال۔

یہ ازدواجی زندگی سے متعلق ایک اصلاحی افسانہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ میاں بیوی کی باہمی محبت، خلوص، شرافت، نیکدلی، محنت دیانتداری اور خوش سلیقگی کی بدولت انھیں دنیا میں کیسی شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ فسانہ خاصا ہے۔ مگر بعض موقعوں پر غیر ضروری تمہیدوں سے پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔

اساس منطق | از جناب سید عبدالقدوس صاحب بہاری، مدرس مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ۔ سید رکن الدین عالم مدرسہ عالیہ مصباح العلوم الہ آباد

قدیم منطق پر اردو میں مولوی رکن الدین صاحب دانا اور دوسرے حضرات نے بھی رسالے لکھے ہیں لیکن یہ کتاب مجموعی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہے۔ بہتر ہوتا اگر جناب مؤلف اسے اور زیادہ سہل اور آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کرکے۔ بہرحال عربی مدارس کے طلبہ کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی۔

کلامِ ثاقبؔ

یہ غزل اور قطعات حضرت میرزا ثاقب مدظلہ العالی نے مشاعرہ یوم آئیں میں پڑھے تھے
ممدوح کی اجازت سے شکریے کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ زخم کے پردے میں غم کے گھر بنے
کل جو روزن دل میں تھے وہ آج بڑھ کر در بنے

جاں بری ہو عشق سے ممکن موافق ہو جو دل
ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے

ظالموں کے ہاتھ اپنی ہی تواضع سے اُٹھے
کیوں سرِ تسلیم خم ہو کس لئے خنجر بنے

تنکے ممکن ہیں مگر ڈرتا ہوں لے برقِ فلک
تو نہ برہم ہو تو میرا بھی چمن میں گھر بنے

غیر کے اسباب زینت اپنی جانکاہی سے ہیں
لاکھ آنسو ابر کے ٹپکیں تو اک گوہر بنے

مجھ پہ جو گزری گلِ صد برگ نے سب کہہ دیا
ایک دل کی داستاں اتنی کہ سو دفتر بنے

ہے بلائے ناگہاں ثاقبؔ شبِ غم دیکھئے
کیا مصیبت جان پر ہو کیا مرے دل پر بنے

ہر ایک بات میں جب مشقِ لن ترانی تھی
ہمارے بیچ میں مفسدِ شب جوانی تھی

بڑھائی جس نے تری نیند مجھ کو تڑپا کر
وہ میری عمرِ گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

کہاں ہے آئینہ جو صورتِ صفا دیکھوں
ہر ایک دل میں غبار آگیا تو کیا دیکھوں

ستارے گن کے بھی اب رات کٹ نہیں سکتی
یہ دل کہاں جو کسی کو ترے سوا دیکھوں

جہاں میں قلبِ ذلت کش کی بھی اک شان ہوتی ہے   شبِ فرقت بس اک میرے ہی گھر مہمان ہوتی ہے
جفاؤں کے سبب کہتی ہے دنیا سنگدل ان کو   ترس کھائیں وہ کیوں کیا عاشقوں کے جان ہوتی ہے

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی   اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے   اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

فکرِ آسانی برائے امرِ مشکل چاہیے   غم کی وہانی تو آساں ہے مگر دل چاہیے
ظلم کے اظہار میں کرتے ہیں کوشش اہلِ دہر   آگ شمعوں میں لگا دینے کو محفل چاہیے

شذرات

اب کی کئی سال کے بعد جامعہ ملیہ کا یوم تاسیس منایا گیا، اس کے سلسلے میں ۲۸ اکتوبر کو اسکول اور کالج کے طلبہ نے مل کر پروفیسر محمد مجیب صاحب کا ڈراما "کھیتی" اسٹیج پر دکھایا۔ جس طرح یہ ڈراما ادبی خوبیوں کے علاوہ دردِ ملت کے جذبے سے معمور ہے اسی طرح اس کا تماشا فنی دلکشی کے ساتھ ساتھ کیف اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ دہلی کے معززین اور باہر کے محترم مہمان بھی تھے۔ اتفاق سے اسی روز دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ اس کے کل ارکان اور دوسرے رہبرانِ قوم جو اس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے ڈاکٹر انصاری صاحب کی دعوت پر ڈراما دیکھنے کے لئے چلے آئے تھے۔ تماشائیوں کا ایسا مجمع بہت کم تماشوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس سارے مجمعے پر اول سے آخر تک وجد کا عالم طاری تھا اور یہ بجائے خود دیکھنے کی چیز تھے۔ ہم محمد مجیب صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کیونکہ یہ پُر اثر نظارہ انہیں کی بدولت دیکھنے میں آیا۔ انھیں کا ڈراما تھا اور انھیں نے طلبہ کو مہینوں محنت کرکے اس کے دکھانے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ عطائی تماشاگر بھی اپنے ادب آموز کی طرح تعریف اور داد کے مستحق ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو واقعی کمال کر دیا۔ ہمیں امید ہے کہ ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر اس طرح کا ڈراما دکھایا جائے گا جو عبرت اور ذوق دونوں کا سامان رکھتا ہو۔

---

۲۹ اکتوبر کو ۸ بجے شب سے یوم تاسیس کا جلسہ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ العالی کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلے جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کے پچھلے چار برس کی کارگزاری مختصر طور پر بیان کی جس سے معلوم ہوا کہ یہ تعلیمگاہ زمانے کی طرح آہستہ آہستہ غیر محسوس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آپ نے جامعہ کے کل شعبوں کی اجمالی رپورٹ

ثانی۔ ابتدائی تعلیم کے شعبے کا ذکر جناب موصوف نے کسی قدر تفصیل سے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے،
پچھلے پانچ سال کے تجربے سے جامعہ کے منتظمین نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ملت اسلامی کی اصلاح و
ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرنا ہے۔ یہی
وہ بنیاد ہے جس پر قومی تعلیم کی نئی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ اسی خیال سے جامعہ سب سے
پہلے ابتدائی کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ پہلے ایک مثالی مدرسہ
قائم کیا جائے جس میں جدید ترین طریقے سے تعلیم دی جائے اور اسی کے ساتھ بچوں کی جسمانی
اور روحانی تربیت کا خیال رکھا جائے اور آگے چل کر اس مدرسے کے نمونے پر ہر شہر اور گاؤں
میں مدرسے قائم کرائے جائیں، چنانچہ دو سال ہوئے چار ابتدائی درجے الگ کر کے ایک جداگانہ
مدرسہ بنایا گیا اور اس کی نگرانی ایک نوجوان معلم کے سپرد کی گئی جنھوں نے موگا میں "منصوبی"
طریقۂ تعلیم سیکھا ہے اور اس میں امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔ جامعہ کے مدرسے میں اب یہی
طریقہ رائج ہے۔ اس کے اصل اصول یہ تین چیزیں ہیں۔

(۱) تعلیم میں ترکیبی عنصر تحلیلی عنصر پر غالب رہے۔

(۲) فاعلی پہلو انفعالی پہلو پر غالب رہے۔

(۳) تعلیم کا محرک شوق ہو خوف نہ ہو

ان اصولوں پر عمل اس طرح ہوتا ہے کہ بچوں کو کسی دلچسپ کام کا شوق دلاتے ہیں
مثلاً کوئی چھوٹا سا سفر اور اس میں لڑکوں کو جو انہماک اور جوش ہوتا ہے اس سے کام لے کر انھیں
اسی کے سلسلے میں لکھنا پڑھنا، نقشہ کشی، حساب، جغرافیہ، تاریخ، معلومات عامہ وغیرہ سکھاتے ہیں۔
چونکہ کام کے بچوں کے شوق کا ہوتا ہے اس لئے اس کی خاطر وہ ہنستے کھیلتے اُن چیزوں کو سیکھ لیتے
ہیں جو عموماً مکتبوں میں مار مار کے سکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے مقصد کو "منصوبہ" اور اس طرز
تعلیم کو "منصوبی" کہہ سکتے ہیں۔ جامعہ کے ابتدائی مدرسے نے اس طرز تعلیم سے دو ہی سال
میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور حافظ فیاض احمد صاحب کی حوصلہ مندی اور کوشش کی

بدولت اس کی ایک شاندار عمارت بھی بن گئی ہے۔ جامعہ کے قصرِ تعلیم کی بنیاد کے استوار ہو جانے کے بعد انشاء اللہ اس پر ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، فنی تعلیم اور علمی تحقیق کی منزلیں اُسی شان سے قائم ہو سکیں گی جو ارباب جامعہ کے پیش نظر ہے۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد ایک چھوٹے سے بچے نے ابتدائی مدرسے کی مفصل رپورٹ پڑھ کر سنائی اور پھر ہنگری کے ممتاز مستشرق پروفیسر جولیس گرمانس نے جو شانتی نکیتن میں اسلامیات کے استاد ہیں، محاسن اسلام پر تقریر کی اور اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ حاضرین نے نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلے بلند کر کے پروفیسر صاحب کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر انصاری صاحب نے جامعہ کی گزشتہ اور موجودہ زندگی پر مختصر سا تبصرہ فرمایا اور پروفیسر جولیس گرمانس کا بڑی گرمجوشی سے اسلامی برادری میں استقبال کیا۔ اب جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ ان تحفوں کی نمائش دیکھنے کے لئے منتشر ہو گئے جو جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر جامع مسجد دہلی کا چوبی نمونہ تھا جو شعبۂ نجاری کے طلبہ نے بڑی نفاست سے تیار کیا تھا۔

---

۹ بجے شب سے وہ مشاعرہ شروع ہوا جس کا ہم پچھلے پرچے میں اعلان کر چکے ہیں۔ باہر کے شعراء میں سے حضرت ثاقب لکھنوی، حضرت مانی جائسی، حضرت حسرت موہانی، حضرت حفیظ جالندھری اور حضرت اصغر گونڈوی تشریف لائے تھے۔ مولانا صفی، مولانا ظریف لکھنوی اور حضرت فانی علالت کی وجہ سے نہیں پہنچ سکے۔ دہلی کے لوگوں میں سے حضرت ساحر، ڈاکٹر سعید صاحب، اکبر حیدری صاحب اور عشرت رحمانی صاحب موجود تھے۔ پہلے مقامی حضرات نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ ڈاکٹر سعید صاحب کی ایک نظم "تو اور میں" کے پہلے حصے کو ارباب نظر نے بہت پسند کیا اور حضرات کے کمال سخنوری کی بھی عام طور سے داد دی گئی۔ باہر کے حضرات میں سے پہلے حضرت حفیظ نے مولانا محمد علی صاحب مرحوم کا مرثیہ پڑھ کر محفل مشاعرہ کو مجلس ماتم بنا دیا۔

آپ نے اپنا مستغرق کلام بھی سنایا اور مشاعرے کے ختم ہونے کے بعد اپنی معرکے کی تصنیف شاہنامہ اسلام کا ایک ٹکڑا اپنے خاص انداز میں پڑھ کر قلب کو گرما دیا اور روح کو تڑپا دیا۔ حضرت مانیؔ، حضرت حسرتؔ اور حضرت ثاقبؔ نے اپنی منتخب غزلیں سنا کر ساری محفل کو لطف زبان، حسن بیان اور کیف معنی کی شراب ناب میں سرشار کر دیا۔ حضرت اصغر اپنا کلام خود نہیں پڑھ سکے۔ دوسرے حضرات کے پڑھنے سے "تصنیف را مصنف" کا لطف نہیں آیا پھر بھی حسن کلام کی تاثیر نے پڑھنے والوں کی زبان میں بھی اثر پیدا کر دیا۔ آخر میں حضرت یاس ٹونکی میر مشاعرہ نے دیر تک سامعین کو اپنی منتخب غزلیں اور نظمیں سنا کر محظوظ فرمایا۔ ایک بجے کے بعد مشاعرہ ختم ہوا اور لوگ کچھ کیف سخن اور کچھ نیند میں مخمور اپنے اپنے گھر گئے ہم تمام شعرائے کرام کے خصوصاً بیرونی حضرات کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ وہ بڑی زحمت اٹھا کر ہمارے مشاعرے میں تشریف لائے۔ خدا ان کو اس فیاضی کا اجر دے۔

جم گئی اور اس نے محمد ابن بشیر ہی کو قاضی صاحب مرحوم کا جانشین مقرر کیا۔

محمد ابن بشیر کی بعض خصوصیات | محمد ابن بشیر اپنی قابلیت اور اتقاء و انصاف میں سابق قاضی سے بھی سبقت لے گئے۔ لیکن جس طرح پہلے وہ نفیس و باریک اور رنگین کپڑے پہنا کرتے تھے حالت قضا میں بھی پہنتے رہے۔ ان کی عادت مانگ نکالنے کی تھی وہ اب بھی رہی۔ ان کا دستور تھا کہ گہرے گلابی رنگ کی ازار پہنے، بالوں میں مانگ نکالے ہوئے مسجد میں آتے اور اسی وضع میں عدل و انصاف کے ساتھ تمام معاملات کا تصفیہ کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر زہد و ورع میں بہت کم لوگ ان کے ہمپایہ تھے۔

قاضی محمد ابن بشیر کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ | ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص کہیں باہر سے قاضی صاحب کو تلاش کرتا ہوا جامع مسجد میں آیا، قاضی صاحب اسی ہیئت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے چند لوگوں کے ایک حلقے میں آکر قاضی صاحب کو دریافت کیا لوگوں نے اس حلقے کی طرف اشارہ کر دیا جس میں قاضی صاحب بیٹھے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے وہ اس حلقے میں گیا اور واپس آکر انھیں لوگوں سے کہنے لگا "خدا تم لوگوں پر رحم کرے، میں نے تو تم کو بھلا آدمی جانکر تم سے دریافت کیا تھا۔ تم مجھ سے مذاق کرتے ہو اور ایک غنڈے کو قاضی بتا کر دھوکا دیتے ہو۔" ان لوگوں نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم تمھیں دھوکا نہیں دیتے قاضی وہی ہیں اور تم کو جن خوبیوں کی تلاش ہے وہ سب انھیں میں ملیں گی۔" وہ شخص پھر قاضی کے پاس گیا تو انھوں نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اور اس کے معاملات میں گفتگو کی وہ بہت مسرور ہوا اور ان میں اپنی امید سے زیادہ نیکی، پارسائی زہد اور قابلیت دیکھ کر خوش خوش واپس ہوا۔ پھر ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا "میں نے قاضی صاحب میں اپنے گمان سے زیادہ اوصاف پائے۔"

قاضی محمد ابن بشیر کی دیانت | عباس ابن عبداللہ ابن مروان القرشی امیر کے خاص درباریوں میں تھا۔ جو تقرب و خصوصیت اس کو حاصل تھی، کسی دوسرے کو میسر نہ تھی۔ ایک شخص نے

اس کے خلاف ایک جائداد غیر منقولہ کا مقدمہ قاضی محمد بن بشیر کے اجلاس میں دائر کیا۔ عباس قرشی کو معلوم ہو گیا کہ قاضی صاحب کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ الحکم کے پاس آیا اور اس نے الحکم سے قاضی صاحب کی شکایت کی اور انھیں کچھ برا بھلا کہہ کر قاضی صاحب کے اجلاس سے انتقال مقدمہ کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں اس کے علاوہ قاضی صاحب کی اور بھی بہت سی شکایتیں کیں۔ الحکم نے سب کے جواب میں کہا کہ "اگر تو سچا ہے تو قاضی صاحب کے گھر جا کر ان سے مل اگر وہ تجھے تنہا اپنے پاس آنے دیں تو بیشک ہم تجھے سچا جانیں گے اور انھیں موقوف کر دیں گے۔"

قرشی حسب قرار داد قاضی صاحب کے گھر گیا۔ امیر نے چند جاسوس مقرر کر دیئے کہ وہ خبر لائیں کہ قاضی صاحب نے قرشی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ قرشی اس شان کے ساتھ قاضی صاحب کے گھر گیا تھا کہ اس کے ہمراہیوں کی کثرت سے لوگوں کو راستہ چلنا دشوار تھا۔ قرشی نے قاضی صاحب کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا ایک بڑھیا باہر نکلی، قرشی نے اپنا نام بتا کر اندر آنے کی اجازت چاہی قاضی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے بڑھیا کو گھُرکا اور کہا کہ اس سے کہہ دو کہ اگر کوئی حاجت ہے تو مسجد میں جہاں اہل مقدمہ بیٹھے ہوئے ہیں ان میں بیٹھو اور میرے باہر آنے کا انتظار کرو۔ تمھارے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قرشی نے بہت عجز و الحاح کے ساتھ اندر آنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر قاضی صاحب کے یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ جاسوسوں نے الحکم کو اس کی اطلاع کی۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہوا۔

ایک عورت کی فریاد اور الحکم کی بروقت امداد

بجدانیہ کی طرف کا ایک شخص کسی وفد میں شریک ہو کر آیا۔ امیر نے اس سے سرحد کے حالات دریافت کئے اس نے دشمن کی ایک جنگ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ میں نے ایک عورت کو چلاتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ الحکم کی دہائی دے کر یہ کہہ رہی ہے کہ "اے الحکم ہماری فریاد کو پہنچ تو بیشک ہم سے غافل ہو گیا اور ہم کو دشمنوں کی لوٹ مار کے لئے چھوڑ گیا ہے" یہ واقعہ سنتے ہی الحکم غصہ میں بھر گیا اور اسی وقت تیار ہو کر مع لشکر کے روانہ ہو گیا اور اسی سرحد پر آیا اور دشمن پر حملہ کرکے

خدا کی مدد سے کامیاب ہوا۔ اس جنگ میں بہت سا مال غنیمت، قیدی، اور قلعے اور فوجی چوکیاں اس کے قبضے میں آئیں۔ پھر الحکم نے اس شخص سے اس عورت کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ جگہ بتائی۔ وہاں آکر اس عورت سے ملا اور چند قیدی اس کی ملک میں دئیے اور اس سے کہا کہ اپنے اہل کے معاوضے میں ان سے فدیہ لے، پھر وہیں اس کے سامنے باقی قیدیوں کی گردنیں مار دیں اور اس سے کہا "کیوں الحکم تیری فریاد کو پہنچا یا غافل رہا"۔ عورت نے کہا "بے شک فریاد کو پہنچا۔ اس نے ہماری مدد کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ اس کا یونہی معاون رہے"۔

محاصرہ جیان ایک بار الحکم حائر میں اپنے خاصہ کے گھوڑوں پر چوگان کھیل رہا تھا۔ اتنے میں خبر آئی کہ جابر ابن لبید نے جیان کا محاصرہ کر لیا ہے۔

الحکم کی فوج کا نظم الحکم کے پاس دو ہزار سوار ایسے رہتے تھے جن کی چھاونی زیر قصر نہر کے کنارے بنائی گئی تھی۔ یہ چھاونی دو حصوں میں تقسیم تھی اور ہر ایک میں ایک ایک ہزار سوار تھے اور ان پر دس دس رسالدار مقرر تھے جن کی نگرانی میں سو سو سوار ہوتے تھے۔ ان کے گھوڑوں کے دانے پانی وغیرہ کا انتظام انھیں رسالداروں کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اس طرح تیار رہتے تھے کہ ضرورت کے وقت فوراً کمربستہ ہو سکیں۔ کسی مہم پران کی تیاری میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی جتنی ایک گھوڑے اور ایک سوار کی تیاری میں ہوتی ہے۔

جیان کی مہم پر حیرت انگیز تیزی کا اظہار جیان کے محاصرے کی خبر سن کر الحکم نے ایک رسالدار کو بلا کر اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ فوراً جیان کی طرف ابن لبید کی مہم پر روانہ ہو جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے دو یہ کہہ کر بدستور کھیل میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد دوسرے رسالدار کو بلایا اور اس سے بھی یہی ہدایت کی اور کھیلنے لگا۔ غرض اسی طرح اس نے دس رسالداروں کو ایک ایک گھنٹے کے فاصلے سے روانہ کر دیا اور ایک کو دوسرے کی حالت نہ معلوم ہو سکی۔ دوسرے روز یہ سب رسالدار اس ترتیب کے ساتھ جیان میں ابن لبید کے سامنے پہنچ

رہے اور ان کی آمد سے رات تک فوج کا ایک تانتا لگا رہا۔ جب دشمن نے فوج کی یہ کثرت دیکھی تو اپنی تباہی کا یقین کر کے خیال کیا کہ سارا ملک میرے خلاف امنڈ آیا ہے اور ہیبت کے مارے بھاگ کھڑا ہوا۔ امیر کے سواروں نے دشمن کا مال واسباب خوب لوٹا اور تیسرے ہی روز دشمن کے سرداروں کے سر لئے ہوئے مظفر ومنصور واپس ہوئے۔ الحکم اس وقت حائر ہی میں اپنے خدام کے ہمراہ مقیم تھا اور کسی کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ اب الحکم نے اس واقعے سے خود لوگوں کو مطلع کیا۔

الحکم کا زبردست استقلال | ایک حکایت الحکم کے متعلق یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بعض والوں نے اس کے خلاف بغاوت کی اور حلف بیعت توڑ ڈالا۔ یہ لوگ اس کے لشکر کی جان تھے۔ جب ان سے مقابلہ ہوا تو الحکم نے نہایت درجہ صبر واستقلال سے کام لیا۔ ایک دن جب لڑائی پوری شدت کے ساتھ ہو رہی تھی، اس نے عطر و مشک منگا کر اپنے سر اور مانگ میں خوب لگایا۔ اس کے ایک خادم نے دریافت کیا کہ "آقائے ولی نعمت آج خوشبو کے استعمال اور زینت کا کیا موقع ہے"۔ الحکم نے پہلے اس کو جھڑک دیا پھر کہا "آج میں نے عہد کیا ہے کہ یا دشمن پر فتح حاصل کروں گا یا مارا جاؤں گا۔ اس لئے میرا منشا یہ ہے کہ لوگ اس خوشبو کے اثر سے الحکم کے سر کو دوسرے سروں میں پہچان سکیں"۔

بربریوں کی بغاوت کا قابل ذکر انسداد | ایک بار ماردہ کے عامل نے الحکم کو لکھا کہ یہاں کے بربری رعایا پر تاخت و تاراج کر رہے ہیں ہمیں بھی لڑائی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ الحکم کے لشکر کا ایک رسالدار بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر الحکم نے مجھے طلب کیا اس وقت تک مجھے عامل کی کسی تحریر کی کوئی اطلاع نہ تھی نہ کہیں جنگ وفساد کا خیال تھا کیونکہ اس وقت ملک میں بظاہر امن تھا۔ میں حاضر ہوا تو الحکم محلسرا کے کسی صحن میں بیٹھے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے ہمراہی سب تیار ہیں"۔ میں نے کہا "خدا حضور کے دولت واقبال میں ترقی دے سب تیار ہیں"۔ فرمایا کہ جاؤ اس کا سر لے آؤ۔ ورنہ اس کی جگہ تمہارا سر قلم ہو گا۔ حتی الامکان اتنی سخت جنگ

کرنا جتنی تم سے ممکن ہو۔ میں یہ حکم سن کر واپس ہونے لگا تو پھر مجھے بلایا اور کہا کہ میں یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ میں الحکم کی اس تاکید پر بہت متعجب تھا اور جو حکم ہوا تھا اس سے خوف زدہ بھی تھا۔ وہاں سے نکل کر فوراً روانہ ہوگیا۔ میں نے دشمن کو نہایت محفوظ پایا اور اس جنگ کو اپنے قیاس سے زیادہ اہم سمجھا۔ مگر جب جنگ کی حالت میں گھبرا کر خیال کرتا کہ مولشکر کے پسپا ہوجاؤں تو مجھے الحکم کے یہ الفاظ "ورپھر تمہارا سر اس کی جگہ قلم ہوگا" یاد آجاتے اور میں پھر بھی توڑ کر لڑنے لگتا۔ غرض میں نے نہایت بے جگری سے جنگ کی آخر کو اللہ نے مجھے نصرت عطا کی اور چوتھے دن میں دشمن کا سر لئے ہوئے الحکم کے حضور میں پہنچا۔ میں نے ان کو اسی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا جس جگہ سے میں ان سے رخصت ہوا تھا۔ الحکم کے خدام نے مجھ سے کہا کہ سوائے نماز و وضو وغیرہ ضروریات کے امیر اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔

واقعۂ ربض کے بعد جو شعر الحکم نے کہے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

رایت صدوع الارض بالسیف راقعا (۱) وقدماً لامتُ الشعبَ مذکنت یافعا

فسائل ثغوری ہل بہا الیوم ثغرۃٌ (۲) اُبادرہا مستنفضی السیف دارعا

وشافہ مع الارض الفضاء جماجما (۳) کاقحاف شریان الہبید لوامعا

تنبئک انی لم اکن فی قراعہم (۴) بوان وقدماً کنت بالسیف قارعا

---

(۱) میں نے زمین کے شگافوں میں تلوار سے پیوند لگادیا (فسادات کی اصلاح کر دی) میں تو لڑکپن ہی سے ایسی اصلاح میں مشغول ہوں۔

(۲) میری سرحد والوں سے پوچھو کہ ان کے یہاں کوئی خلل ہے جس کے انتظام کے لئے میں زرہ لگاؤں اور تلوار سوت کر سبقت کروں؟ (یعنی نہیں ہے)

(۳) میدان جنگ کی وسیع زمین پر دیکھو کھوپریاں ایسی چمکتی ملیں گی جیسے حنظل کے شکستہ پھل۔

(۴) یہ کھوپریاں تمہیں آگاہ کر دیں گی کہ میں نے ان کے اعلان جنگ پر سستی نہیں کی میں ہمیشہ سے ایسی بات کا جواب تلوار سے دیتا ہوں۔

وانی اذا حاد و احزاعا من الردی (۵) فلم اک ذا حید من الموت جازعا
حمیت ذماری فانتہبت ذمارہم (۶) ومن لایحامی ظل خزیان ضارعا
ولما تساقینا سجال حروبنا (۷) سقیتہم سما من الموت ناقعا
وہل زدت ان وفیتہم صاع قرضہم (۸) فوافوا منایا قدرت و مصارعا
فہاک بلادی اننی قد ترکتہا (۹) مہادا ولم اترک علیہا منازعا

عثمان ابن المثنیٰ ادیب کہتا ہے کہ عباس ابن ناصح امیر عبدالرحمٰن[*] کے زمانۂ حکومت میں قرطبہ آئے اور انھوں نے مجھ سے الحکم کے یہ شعر جو ربض کی شورش کے بعد الحکم نے کہے تھے سنے جب میں اس شعر پر پہنچا ؎

وہل زدت ان وفیتہم صاع قرضہم فوافوا منایا قدرت و مصارعا

تو مجھ سے کہا "اگر الحکم اہل ربض کا دشمن ہی رہتا تو اس کے لئے یہ شعر ایک معقول عذر تھا۔

---

(۵) اس میں شک نہیں کہ وہ ہلاکت سے گھبرا کر میدان سے ہٹ گئے، مگر میں نے موت کے خوف سے منہ نہیں موڑا۔

(۶) میں نے عزت نفس کی حفاظت کی، ان کی آبرو لے لی، جو اپنی آبرو نہیں بچاتا وہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔

(۷) جب ہم نے ایک دوسرے سے جنگ کی تو تم نے ہمیں موت کا زہر خالص پلایا اور ہمیں تباہ کرنے میں کمی نہ کی۔

(۸) اس لئے اگر میں نے بدلے کے طور پر ان کا قرض ادا کر دیا جیسا انھوں نے کیا تھا اس کا بدلا لے لیا اور اس کے نتیجے میں انھیں موت اور شکست نصیب ہوئی تو اس میں میری کیا زیادتی ہے۔

(۹) ذرا میرے ان شہروں کو تو آکر دیکھ جنھیں میں نے فرش کی طرح صاف کر رکھا ہے اور انھیں ہر مفسدے پاک کر دیا ہے۔

(*) یہاں عبدالرحمٰن سے مراد عبدالرحمٰن ابن الحکم ہے۔

لونڈیوں سے عشق | الحکم کے پاس پانچ لونڈیاں تھیں جن کا عشق اس پر غالب آگیا تھا۔ ان لونڈیوں نے اس پر اتنا قابو پالیا تھا کہ الحکم دوسری بیویوں اور عورتوں سے تقریباً بے تعلق سا ہوگیا تھا۔ ایک دن الحکم نے دوسری عورتوں کے پاس جانا چاہا تو یہ لونڈیاں غصہ ہوگئیں، ورسب نے جمع ہوکر اسے دوسری جگہ جانے سے روک دیا۔ پھر جب وہ خفا ہوکر امیر کے پاس سے جانے لگیں تو امیر نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کی رضاجوئی کے لئے حسب ذیل اشعار کہے، جن سے اس کا رنگ تغزل نمایاں ہے۔

قضب من البان ماست فوق کثبان (۱) ولین عنی وقد ازمعن ہجرانی

ناشدتہن بحقی فاعتزمن علی (۲) العصیان ماخلامنہن عصیانی

ملکننی ملکا ذلت عزائمہ (۳) للحب ذل اسیر موثق عانی

من لی بمغتصبات الروح من بدنی (۴) یغصبننی فی الہوی عزی وسلطانی

انھیں کنیزوں کے متعلق الحکم کے یہ اشعار بھی ہیں۔

ظل من فرط حبہ مملوکا (۵) ولقد کان قبل ذاک ملیکا

---

(۱) درخت بان کی شاخوں کی طرح نازک اور پتلی نازنینوں نے جانے کے ارادے سے مجھ سے پیٹھ پھیری اور جدائی کا عزم کرلیا۔

(۲) انھوں نے میری نافرمانی کی تو میں نے ان کو اپنا حق جتاکر بلایا مگر ان کا ارادہ نافرمانی مضبوط تھا۔

(۳) وہ مجھ ایسے بادشاہ کی مالک بن بیٹھی ہیں جس کے حوصلے محبت سے ایسے پست ہوگئے ہیں جیسے کسی قید میں جکڑے ہوئے قیدی کے ہوجاتے ہیں۔

(۴) ایسی دلرباؤں سے مجھے کون بچا سکتا ہے جو میرے بدن سے روح کو زبردستی چھینے لیتی ہیں اور عشق کے زور سے میری عزت وسلطنت کو غصب کررہی ہیں۔

(۵) وہ شخص فرط محبت سے غلام بن گیا جو حقیقت میں اس سے پہلے بادشاہ تھا۔

ان بکا او شکا الهوی زید ظلما (۶) وبعاد اادنے احسا تا وشیکا

ترکته جآذر القصر صبا (۷) مستهاما علی الصعید تریکا

یجعل الخد واضعا فوق ترب (۸) للذی یجعل الحریر أریکا

هکذا یحسن التذلل للحر (۹) اذا کان فی الهوی مملوکا

امیر عبدالرحمٰن ابن الحکم

اخلاق وفضائل امیر عبدالرحمٰن ابن الحکم نہایت بردبار، فیاض، ادیب، فقیہ، حافظ قرآن اور محدث تھا۔ ایک روز اس کے مصاحبوں میں سے کسی نے عبدالرحمٰن سے حدیث وسیر میں مناظرہ کیا تو اس نے کہا "سنو مجھے یہ سب واقعات حفظ ہیں" اور یہ کہہ کر واقعات سنا دیئے۔ اس کی فیاضی کے متعلق ایک بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایسا کوئی شخص نہ ملا جس نے عبدالرحمٰن سے کوئی بڑی یا چھوٹی چیز مانگی ہو اور اسے نہ ملی ہو۔ عبدالرحمٰن کو سلطنت ایسے عالم میں ملی تھی کہ ملک میں کافی انتظام تھا۔ جملہ بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں اور اس کے لئے حصول لذات اور خواہشات پورا کرنے کے سوا کوئی کام نہ رہا تھا، اس کی حالت بالکل اس جنتی کی سی تھی جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے۔

ایک خادم کی خیانت اور عبدالرحمٰن کی چشم پوشی ایک روز بہت سا مال اور روپیوں اور اشرفیوں کے توڑے عبدالرحمٰن کے سامنے پیش ہوئے۔ خدام ان توڑوں کو پیش کرتے جاتے تھے، وہ

---

(۶) اب وہ اگر روتا ہے یا محبت کی شکایت کرتا ہے تو اس پر اور ظلم کیا جاتا ہے اور وہ موت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے

(۷) اس کو قصر کی نازنینوں نے اپنا ہدف بنا کر زمین پر بے قابو کر کے چھوڑ دیا ہے (جاذر = گاو وحشی کے بچے)

(۸) اب اس شخص کے رخسار سے زمین پر ہیں جن کا تکیہ ریشم سے بنایا جاتا تھا۔

(۹) آزاد جب محبت کا بندہ ہو جائے تو اس کے لئے ایسی ہی سکنت زیبا ہے۔

ملاحظہ کرتا جاتا تھا۔ جب تمام حاضرین اور خدام چلے گئے۔ تو ڑے اور مال وہیں پڑا رہا۔ صرف ایک خادم رہ گیا تو اس وقت عبدالرحمٰن کو کچھ غنودگی سی آگئی اور ذرا آنکھ جھپک گئی۔ خادم نے اسے سوتا خیال کر کے ایک توڑا اٹھایا اور اپنی آستین میں چھپا لیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ اس حرکت کو دیکھ رہا تھا اتنے میں دوسرے خادم بھی آگئے۔ امیر نے حکم دیا کہ یہ سب مال شمار کر کے خزانے میں داخل کر دیا جائے۔ جب توڑے شمار کئے گئے تو کم معلوم ہوئے اور خدام آپس میں ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگے۔ عبدالرحمٰن نے کہا "اس بات کو جانے دو جس نے لیا ہے اور جس نے دیکھا ہے دونوں اس کو ظاہر نہیں کریں گے اور دیکھنے والے کی شان اس کی مقتضی نہیں کہ اس کا انکشاف کرے" پھر حکم دیا کہ جتنا مال موجود ہے داخل کر لیا جائے۔

کنیز کا دروازہ اشرفیوں سے چن دیا

ایک بار عبدالرحمٰن کی ایک کنیز اس سے ناراض ہو گئی۔ عبدالرحمٰن نے اس کے پاس آدمی بھیجا مگر اس نے دروازہ بند کر لیا اور آدمی کو نہیں آنے دیا۔ عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ اس کے دروازے پر توڑے اس طرح چن دو کہ دروازہ ڈھک جائے۔ جب اس کنیز نے دروازہ کھولا تو یہ توڑے اس پر گر گئے۔ کنیز نے رکھنے کے لئے شمار کئے تو تقریباً بیس ہزار اشرفیاں نکلیں۔

کنیز کے لئے قیمتی ہار کی خریداری اور وزیر کے اعتراض کا جواب

ایک بار عبدالرحمٰن نے اپنی کنیز کے لئے دس ہزار اشرفی کا ایک ہار خریدنے کا حکم دیا۔ ایک وزیر کو جو اس وقت دربار میں موجود تھا یہ بات گراں گزری۔ امیر نے کہا "تجھ پر افسوس ہے کمبخت! اللہ تعالیٰ نے جواہرات تو اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ ایسے حسین چہرے ان سے مزین کئے جائیں اور ان سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور حاصل ہو۔ دنیا میں جواہرات کا مصرف اس سے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسینوں کے جسم پر آراستہ ہو کر اپنی اور ان کی بہار میں اضافہ کریں، اور ہم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں" یہ کہہ کر امیر ابن شمر اپنے

امیر ابن شمر کی شاعری

درباری شاعر کی طرف مخاطب ہوا، اور کہا تم کو اس موقع کا کوئی شعر یاد ہے؟ اس نے اقرار کیا اور امیر کی فرمائش پر بسر و چشم کہہ کر حسب ذیل اشعار سنائے۔

اتقرن حصبائز الیواقیت والدر (۱) الی من تعالی عن سنا الشمس والبدر
الی من برت قدما ید اللہ خلقتہ (۲) ولم یک شئ غیرہ ابداً یبری
فاکرم بہ من صنعۃ اللہ جوہرا (۳) تضارل عنہ جوہر البر والبحر
لہ خلق الرحمن ما فی سمائہ (۴) وما فوق ارضیہ و مکن فی الامر

امیر عبدالرحمن ابن الحکم نے اس کے جواب میں یہ اشعار کہے :-

قریضک یا ابن الشمر عفی علی الشعر (۵) وجل عن الاوہام والفہم والفکر
اذا شافہتہ الاذن ادی بسحرہ (۶) الی القلب ابداعاً فجل عن البحر
وہل برأ الرحمن من کل ما برا (۷) اقر لعین من منعمۃ بکر
تری الورد فوق الیاسمین نجد ہا (۸) کما فوق الروض المنور بالزہر

---

(۱) کیا تو یاقوت اور موتیوں کے دانوں کو ایسی ہستی کے برابر کئے دیتا ہے جو آب و تاب اور مرتبہ میں چودھویں کے چاند اور سورج سے بالاتر ہے۔

(۲) یہ وہ ہستی ہے جسے خود اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے حالانکہ اس سے پہلے کسی کو یہ عزت نہ ملی تھی۔

(۳) اس طرح یہ ہستی ایک نہایت نفیس خداساز جوہر ہے جس کے مقابلے میں بحر و بر کے جوہر ماند ہو گئے۔

(۴) زمین و آسمان پر جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ سب کچھ خدا نے اسی کے لئے پیدا کیا اور اسے با اختیار بنایا ہے۔

(۱) اے ابن شمر تیرے شعر نے تمام اشعار کو پست کر دیا اور وہم و فہم و فکر کے احاطہ سے باہر ہو گیا۔

(۲) جب تیرے شعر کو کان سن لیتے ہیں تو وہ اپنے سحر کے اثر سے قلب تک نئی نئی باتیں پہنچا دیتا ہے اس لئے وہ رتبے میں دریا سے بھی زیادہ ہے۔

(۳) کیا اللہ نے تمام مخلوقات میں اس کے سوا بھی کوئی ایسی اچھوتی نعمت پیدا کی ہے جو آنکھوں کے لئے ٹھنڈک ہو۔

(۴) اس کے رخساروں کی وجہ سے تو گلاب کو یاسمین پر فوقیت دے گا۔ جیسے پھول والے باغوں کو پھولوں کی وجہ سے فوقیت ہوتی ہے۔

طلوانی ملکت قلبی وناظری (۵)، نظفتہا منہا علی الجید والنحر

پھر امیر نے حکم دیا کہ ابن شمر کو پانچسو دینار کا ایک توڑا انعام میں دیا جائے جب اس کا خادم ان توڑوں کو لے کر چلا گیا اور امیر کی نظر سے اوجھل ہو گیا تو امیر نے ابن شمر سے دریافت کیا "رات کو چاند کہاں رہا" اس نے کہا "حضور کے پہلو میں"

امیر سات سال تک اہل ماردہ سے لڑتا رہا۔ اسی مدت میں اہل لشکر اور محصورین سب تھک کر پریشان ہو گئے۔ ایک دن امیر لشکر کی طرف دیکھ رہا تھا، یکایک اس نے دیکھا کہ اس کا لشکر شہر کی دیواروں پر چڑھ رہا ہے اور اہل شہر پر غالب ہو چلا ہے۔ اہل شہر کمزور ہوتے جاتے ہیں اور ان میں مدافعت کی طاقت کم ہو چلی ہے، پھر اس نے عورتوں اور بچوں کی چیخ سنی۔ یہ سن کر امیر نے حکم دیا کہ جنگ موقوف کر دی جائے۔ پھر اپنے وزیروں اور فوجی افسروں کو طلب کر کے کہا "تم کو معلوم ہے کہ میں ان فسادات پر کس قدر دشواریوں اور جانی و مالی نقصانوں کے بعد قابو پا سکا ہوں۔ لیکن میں نے اہل شہر سے محض خدا کے خوف سے درگزر کی اور خدا کے لئے ان سب کو چھوڑ دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ لڑکے اور عورتیں بے قصور قتل و غارت کی نذر ہوں گے اور مجھے یہ بات بالکل ناپسند تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری اس عنایت و شفقت لوٹنے کامیابی کے وقت درگزر کرنے اور انتقام نہ لینے کا ان لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی تو ان کے لئے بہتر ہوگا ورنہ خدا نے جس طرح اس وقت ہماری مدد کی اور ہمیں غالب کیا پھر ان پر غلبہ دے گا اور انھیں ذلیل و تباہ و برباد کر دے گا۔

اس تقریر کے بعد وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ دشمنوں کے آدمی اظہار اطاعت کے لئے اس کے سامنے آ گئے اور اس کے شاہانہ مراحم سے مستفید ہوئے۔

---

(۵) اگر مجھے اپنے قلب و نگاہ پر قدرت ہوتی تو میں ان دونوں کو پرو کر اس کے سینے اور گردن کا ہار بنا دیتا۔

عبدالرحمن کے بعض خدام میں سے کسی نے اس کے نام ایک عریضہ لکھا جس میں اس سے ایسی ملازمت کی استدعا کی تھی جو اس کے شایاں نہ تھی۔ اس عریضہ پر امیر نے اس مضمون کی عبارت اپنے قلم سے لکھی: "جو شخص حصول مطلب کا طریقہ نہیں جانتا اس کے حق میں محرومی زیادہ بہتر ہے۔"

عبداللہ ابن قرلمان ابن بدر اس کا خاص خادم تھا۔ عبداللہ ایک دن اپنی جاگیر کی طرف گیا ہوا تھا، یہاں امیر کے پاس مجلس عیش و نشاط گرم تھی، کیونکہ اس روز امیر نے فصد لی تھی، جب لوگ مجلس سے واپس ہوتے تھے تو ہر شخص کو حسب حیثیت دو سو اشرفیوں سے پانسو تک نقد انعام دیا جاتا تھا۔ عبداللہ ابن قرلمان کو بھی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھی آیا تاکہ اور لوگوں کی طرح اپنا حق انعام حاصل کرے۔ اس موقع پر عبداللہ نے حسب ذیل اشعار لکھے۔

یا ملکا حل ذری المجد (۱) وعم بالانعام والرفد
طوبیٰ لمن اسمعتہ دعوۃ (۲) فی یوم احساعک للفصد
فظل ذاک الیوم من قصفہ (۳) مستوطنا فی جنۃ الخلد
وقد عدانی ان اری حاضراً (۴) جدتی یخط الوری میکدی
فانتعش العثرۃ من عاثر (۵) عدی علیہ النحس القرد

---

(۱) اے بادشاہ عزت و سربلندی کی چوٹیاں تیرا مقام ہیں اور تو نے عطا اور بخشش کو عام کر دیا ہے۔
(۲) ایسے لوگوں کے لیئے مژدہ ہے جنھیں تو نے اپنی فصد کے دن دعوت دی۔
(۳) اور یہ دن اپنی شگفتگی (اور آپ کی توجہات سے) جنت خلد کا ایک دن بن گیا (جس میں ہر قسم کی نعمتیں اور راحتیں مہیا ہیں)
(۴) میرے منحوس نصیبے نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے کہ جب مخلوق آپ کے کرم سے حصہ پاتی ہے مجھے حاضر ہونے نہیں دیتا۔
(۵) تو ایسے لغزش کرنے والے کی لغزش سے درگذر کر جس پر منحوس ترین بندر یعنی بخت سیاہ نے زیادتی کر رکھی ہے۔

وامنن باصفادی عطالم یزل (۶) یشمل اہل القرب والبعد

امیر نے اس کے اشعار کے نیچے یہ لکھ دیا۔

من آخر التضجع فلیرض بحظہ من النوم۔ یعنی (جو سویا سو اس نے کھویا۔

اس پر عبداللہ نے پھر حسب ذیل اشعار لکھے۔

لانمت ان کنت یا مولائی محروما (۷) ولا طعمت علی ما نالنی نوما

اسی لحرمان یوم لا اعتیاض بہ (۸) لو ان من جنۃ الفردوس لی یوما

ورویتی منک وجہا ما اکتحلت بہ (۹) الا تعرفت صنعا منہ محتوما

فکیف امنع ورد آمنک آملہ (۱۰) صدیان حام رجائی نو قہ حاما

اب امیر نے عبداللہ کے لئے صلہ کا حکم دے دیا اور اس کے شعروں کے نیچے یہ اشعار لکھ دئے۔

لاغرو ان کنت ممنوعا ومحروما (۱۱) اذکنت آثرت ہونا یورث النوما

---

(۶) مجھے ایسی بخشش سے مقید کر کے احسان فرما جس نے ہر قریب و بعید کو مستفید کیا ہے۔

(۷) اے آقا اگر میں محروم ہوں تو خدا کرے کبھی نہ سوؤں اور خواب کا ذائقہ ہی نہ چکھوں کیونکہ خواب نے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔

(۸) میں تو اس دن کی محرومی پر افسوس کرتا ہوں جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اب اگر جنت کا دن بھی ملے تو کیا ہے۔

(۹) ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اپنی آنکھوں میں تیری دید کا سرمہ لگایا ہو اور تیرے احسانات سے روشناس نہ ہوا ہوں۔ یعنی جب حضور میں آیا ہمیشہ انعام و اکرام پایا۔)

(۱۰) پھر میں آپ کے چشمۂ فیض پر آتے ہی کیسے روکا جاتا ہوں۔ حالانکہ میں تشنگی میں اس کا امیدوار بن کر آیا ہوں اور میری امید اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔

(۱۱) جب تو نے ایسی دد سستی کو پسند کیا جس کا نتیجہ نیند ہے تو تیری محرومی جائے تعجب نہیں۔

ولم ینل امرؤ من خطوه اسلاً (۲) حتی یشد علی الاجاد حیسنروما
نہاک من سینیا ماکنت تاملہ اذ صمت فوق رجاء الورد تحویا

امیر محمد ابن عبدالرحمٰن

عام اخلاق و فضائل محمد ابن عبدالرحمٰن حلیم، نیک نفس، عفو پیشہ، فیاض اور اخلاق مجسم امیر تھا۔ فن حساب میں ماہر تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ امیر محمد اپنے خدام و عمال کا حساب نہایت صحت کے ساتھ خود جانچا کرتا تھا۔ اور اگر ان سے کوئی ذرا بھی غلطی یا لغزش ہو جاتی تو اس پر بھی اصلاح و تنبیہ کرتا تھا۔ اس کی متانت و سنجیدگی اور اعتدال طبیعت پر جن واقعات سے روشنی پڑتی ہے ان میں کا ایک واقعہ یہ ہے۔

حسن سیاست و استقلال مزاجی کی ایک عمدہ مثال ہاشم ابن عبدالعزیز نے امیر کے ایک خادم کے خلاف سازش کی اور بہت سے لوگوں کو اس میں شریک کر لیا۔ صرف اپنی ذات کو اس معاملے سے بالکل علیحدہ رکھا تاکہ امیر اس بارے میں ہاشم ہی سے مشورہ کرے۔ چند روز کے بعد امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوران گفتگو میں اس خادم کا ذکر اس طریقے سے چھیڑا کہ اس کی نسبت امیر کا خیال ظاہر ہو سکے، لیکن خلاف امید اسے اپنی کامیابی میں دیر ہوئی۔ اور امیر کا کوئی خیال معلوم نہ ہو سکا۔ پھر اور لوگوں نے اس خادم کے متعلق امیر سے گفتگو کی اور اب خود ہاشم نے بھی اثنائے گفتگو میں اپنی رائے پر اتنا اصرار کیا کہ اس خادم کے نہ صرف معزولی بلکہ خون تک کے جواز کی تحریک کر دی۔ لیکن امیر محمد نے اس کے جواب میں صرف ہاشم کو بلا کر ایک خط دکھایا

---

(۲) کوئی شخص احسان کو فقط امید کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا جب تک سعی و کوشش کے لئے اپنا سینہ مضبوط نہ کرلے۔

(۳) سو تو ہمارے انعام و صلہ جسکی تجھے امید تھی اور جسکے لئے تو نے اُمید کے گھاٹ پر چکر لگایا

اس پہ پوچھا کہ کیا یہ تمہارا خط ہے، ہاشم نے اقرار کیا اور اس کے وجوہ بیان کئے امیر نے کہا مجھ
اس خادم کے خلاف بے حد شکایتیں پہنچی ہیں۔ تیری کیا رائے ہے۔ ہاشم نے کہا سزا اور جلاوطنی۔
اس پہ امیر نے حکم دیا کہ اچھا ٹھیرو اور وہ کاغذوں کا پلندہ رکھا ہے اٹھالاؤ۔ ہاشم پلندہ اٹھالایا
اس میں غالباً سو خط بندھے ہوئے تھے۔ امیر نے حکم دیا کہ ان کو پڑھو۔ ہاشم نے ان خطوں کو
ایک ایک کرکے پڑھنا شروع کیا۔ ہر خط کا مضمون اس نتیجہ پہ پہنچاتا تھا کہ ہاشم واجب القتل ہے۔

خطوں کو پڑھتے وقت ہاشم کا ہاتھ کانپ رہا تھا، اس کی پیشانی عرق آلود تھی، منہ سے جھاگ
آرہے تھے۔ جب وہ ایک خط پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس حالت میں جب وہ سب
خط پڑھ چکا تو امیر نے دریافت کیا کہ تمہارے پاس بھی کچھ عذرات ہیں۔ ہاشم نے قسمیں کھانا شروع
کیں اور کہا کہ میرے حاسدوں نے آپ کی توجہ اور نیک خیالی دیکھ کر مجھے تباہ کرنے
کے لئے یہ کارروائیاں کی ہیں، حضور اگر اس کی تحقیقات فرمائیں اور حق و باطل ظاہر ہونے تک
مجھ سے درگزر کریں تو بہتر ہے اس لئے کہ جو کام آپ کر گزریں گے اس پہ ندامت بے سود ہوگی۔
اور جو نہیں کیا ہے اس کے کرنے کی قدرت ہر وقت حاصل ہے، پھر حضور والا کی سنجیدگی متانت
اور بتدریج فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی صفت میرے معاملے میں بھی بروئے کار آنا چاہئے۔ کیونکہ
یہ صفات تو حضور کے اخلاق میں خصوصیت سے نمایاں ہیں۔

امیر نے کہا، اے ہاشم اکثر جلدبازی کا نتیجہ ندامت ہوتا ہے اور تو جانتا ہے کہ جلدباز
نہیں ہوں ورنہ تو ہی پہلا شخص تھا کہ جو اب تک قتل ہو چکا ہوتا۔ ہم نے ان امور کی بہت کچھ جانچ
کر لی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں غلط اور بے بنیاد بہتان ہیں
جو تیرے خلاف باندھے گئے ہیں۔ اگر ہم ان بہتانوں کو ان کے لکھنے والے کے پاس واپس
کر دیتے اور انہیں یہ معلوم ہوجاتا کہ ہم ایسے معاملات پر کوئی توجہ نہیں کرتے تو وہ ہماری خیرخواہی
اور خبررسانی سے دستکش ہوجاتے۔ ہم نے ان معاملات کو اپنے دل میں رکھ کر ان کی بابت
پورا علم حاصل کرنے کے بعد سچ جھوٹ کی حقیقت معلوم کر لی اور خوب سمجھ لیا ہے کہ راست و

دروغ میں کیا فرق ہے۔ اب تجھے بھی لازم ہے کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ آنے دے تاکہ ان واقعات کی اطلاع دینے والوں کو یہ حال معلوم نہ ہو۔ اگر تو نے لوگوں کو اطلاع کر دی اور اس گفتگو کا ایک لفظ بھی ظاہر ہوگیا تو ایسی سخت پاداش اٹھانا پڑے گی کہ تیرے بعد شاید کوئی بھی ایسے جرم کی جرأت نہ کرے گا۔ میں اس وقت تیرے حق میں کسی کی سفارش قبول کروں گا نہ تیری کسی خیر خواہی کا لحاظ کروں گا۔ اب جو طریقہ تو مناسب سمجھے وہ اختیار کر۔"

ہاشم کے ایک حریف ولید ابن عبدالرحمن کی سیرچشمی، پسماندگان ہاشم کے ساتھ سلوک

جب ہاشم مقام کرکریں قتل ہوگیا اور اس کی اطلاع امیر کو پہنچی تو لوگ اس کے خصائل پر تبصرہ کرنے لگے۔ امیر محمد نے کہا "ہاشم میں عجلت اور غصہ بہت تھا اور دانشمندی کی کمی تھی۔ یہ حالت اس کی ہمیشہ رہی" اس مجلس میں وزرا کے ساتھ ولید ابن عبدالرحمن ابن غانم بھی موجود تھا جس کے اور ہاشم کے درمیان پہلے سے کچھ رنج تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاشم کی برائی میں کچھ حصہ نہ لیا بلکہ تردید کرتے ہوئے کہا "ہاشم تقدیر سے مجبور ہوگیا ورنہ اس نے پوری پوری کوشش اور دانشمندی سے امیر کی خیر خواہی کی اور یہ مشیت ایزدی ہے کہ اسے اور اس کے ہمراہیوں کو ناکامی ہوئی لیکن اس نے اپنی جان قربان کر دی" امیر ولید کی گفتگو سے بہت خوش ہوا اور اس کے دل میں جو خیال ہاشم کے خلاف قائم کرایا گیا تھا نکل گیا۔ پھر امیر نے وہ تمام کام جو ہاشم کے متعلق تھے ولید کے سپرد کیے جانے کا حکم دیا لیکن ولید نے عرض کی کہ خدائے تعالیٰ امیر پر اپنا فضل و کرم رکھے اور اقبال و دولت میں دن دونی ترقی دے۔ ہاشم امیر کا غلام تھا اور دشمن کے حق میں تیروں میں کا ایک تیر اور تلواروں میں کی ایک تلوار تھا۔ وہ امیر کی خدمت گزاری میں یہاں تک مصروف رہا کہ امیر پر قربان ہوگیا اور امیر کی رضامندی حاصل کی۔ اس لئے امیر کو بھی چاہئے کہ ہاشم کے بعد اس کی اولاد کے ساتھ بھی ایسی ہی بھلائی کریں اور اس کا متعلقہ کام اس کی اولاد ہی کے سپرد فرمائیں" امیر نے کہا "واللہ تو نے نہایت شریفانہ بات کہی اور ہمیں بھی بھلائی کی طرف متوجہ کیا۔ تو ہمیشہ سے نیک خیال اور اچھا آدمی ہے۔ بہترین آدمی ہمارے لئے وہ ہے

(باقی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۷	بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا)

الاعتصام بالحدیث والسنہ

جامعہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک مضمون مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کا "منکرین حدیث" کے زیرعنوان نظر سے گزرا۔ مولانا کی تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ "حدیث وسنت دلیل شرعی اور حجت دینی نہیں ہوسکتی"۔ جامعہ کے ایک ندوی طالب العلم نے اس مضمون کا جواب بھی دیا ہے۔

میرے حلقہ احباب میں اس موضوع سے کافی دلچسپی لی گئی اور مجھے اظہار خیال کے لئے مجبور کیا گیا۔ لہٰذا میری اس تحریر کا مقصود معارضہ یا محاکمہ نہیں محض امتثال امر ہے۔

عام طور پر مسلمانان عالم کے لئے دلائل شرعی قرآن وحدیث، اجماع وقیاس ہیں ان ادلہ شرعیہ سے جو قول بھی باہر ہو، مردود ہے، ہرگز مقبول نہیں ہوسکتا، قرآن تو خیر متفق علیہ ہے اب رہی حدیث، تو یہی ما بہ النزاع ہے لیکن پھر بھی اثبات مدعا کے لئے اس موقع پر حدیث سے استدلال یقیناً قابل تسلیم ہے کیونکہ منکرین حدیث، حدیث کو دینی تاریخ قرار دیتے ہیں، جس سے عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، پس جس طرح دینی تاریخ سے عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ میں قرآن اور آیات پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم کی جاسکتی ہے، اسی طرح اطاعت رسول کے متعلق جو نص صریح وارد ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی تفسیر اور تعمیل عہد رسالت میں کیونکر کی گئی۔ اس معاملے میں حدیث سے استدلال بالکل درست اور منکرین حدیث کے لئے ناگزیر طور پر قابل قبول ہے۔

پھر حدیث کے بعد اجماع امت کا نمبر آتا ہے، جس سے منکرین حدیث کو مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ خود قرآن مجید سے اجماع امت کے حجت شرعی ہونے پر دلائل قطعی قائم ہوسکتے ہیں۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى جو شخص ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت

وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَہَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا

(النساء پ۵)

کرے اور مومنین کی راہ کے سوا دوسرے راستے کی پیروی کرے ہم اس کو اسی طرف متوجہ کردیں گے جدھر وہ متوجہ ہوا اور اس کو ہم جہنم میں ڈال دیں گے، جو کہ بہت بری جگہ ہے

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا

(آل عمران پ۴)

اے مسلمانو! خدا کی رسی کو مضبوط پکڑلو، اور آپس میں تفرقہ اور پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ تعالیٰ نے تم پر جو نعمتیں نازل فرمائی ہیں اُن کو یاد کرو۔ کہ تم لوگ اسلام کے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی (ایک توحید، ایک پیغمبر، ایک قرآن، ایک دین ہر امر میں متفق کردیا) پھر اس طرح متفق کہ گویا تم لوگ بھائی بھائی ہوگئے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْہَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ

(انفال پ۱۰)

اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور آپس میں نہ جھگڑا کرو ورنہ کم ہمت ہوجاؤ گے۔ اور تمہاری قوت اور دولت جاتی رہے گی۔ اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیتوں سے اتفاق واجتماع کا وجوب اور اختلاف وافتراق کی حرمت، اجماع امت کا دلیل شرعی ہونا عیاں طور پر ثابت ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء پ۵)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور صاحب امر کی

"اولوالامر" کے معنی کی تنقیح اور تعیین میں اختلاف ہے۔

قال فی معالم التنزیل اختلفوا فی اولی الامر قال ابن عباس وجابر رضی اللہ عنہما ہم الفقہا

معالم التنزیل میں ہے کہ لوگوں نے اولوالامر کے معنی میں اختلاف کیا ہے، ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اولوالامر سے

والعلماء الذین یعلمون الناس معالم دینہم وہو قول الحسن والضحاک ومجاہد

مراد علما اور فقہا ہیں جو لوگوں کو دین کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہی قول حسن اور ضحاک اور مجاہد کا ہے۔

وقال فی مدارک التنزیل ای الولاۃ والعلماً لان امرہم ینفذ علی الولاۃ

اور مدارک التنزیل میں ہے کہ حکام اور علما، مراد ہیں کیونکہ علما کا حکم حکام پر نازل ہوتا ہے۔

اس آیت شریفہ سے بھی امام فخرالدین رازیؒ نے اجماع امت کا حجت دینی و دلیل شرعی ہونا ثابت کیا ہے، حیث قال فی تفسیر ہذہ الآیۃ

وجب ان یکون المراد بقولہ واولی الامر اہل الحل والعقد من الامۃ، وذلک یوجب القطع بان اجماع الامۃ حجۃ

واجب ہے کہ خداوند تعالیٰ کے قول "واولی الامر" سے مراد اس امت کے ارباب حل وعقد ہوں، اور یہ قطعی طور پر اجماع امت کے حجت شرعی ہونے کو واجب کرتا ہے

اب اجماع کے حجت ہونے پر کچھ احادیث ملاحظہ ہوں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یجمع امتی او قال امۃ محمد علی ضلالۃ ویداللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔ رواہ الترمذی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کبھی ضلالت اور گمراہی پر اجماع نہیں کرے گی اور اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہے اور جو شخص جماعت سے کنارہ کرے گا وہ جہنم میں بھی اکیلا جائے گا۔

وقال صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار رواہ ابن ماجہ وقال فی المرقاۃ السواد الاعظم یعبر بہ عن جماعۃ الکثیرۃ والمراد ما علیہ اکثر المومنین

نیز آپ نے فرمایا کہ تم لوگ بڑی جماعت کی اتباع کرو کیونکہ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوگا جہنم میں بھی تنہا جائے گا اور مرقاۃ میں ہے کہ سواد اعظم سے مراد وہ امر ہے جس پر اکثر مسلمانوں کا اتفاق ہو

پھر عقلاً وعرفاً بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب امور دنیاوی میں بھی کثرت آرا بالاتفاق مسلم اور لائق عمل ہے۔ تو امور دینی میں اس کا لحاظ موجب فلاح کیونکر نہ ہوگا؟

ادلۂ شرعیہ میں سب سے آخری درجہ قیاس کا ہے، اگر قرآن یا حدیث یا اجماع امت سے کوئی بات ثابت نہ ہو تو پھر قیاس ہے۔

اب سب سے پہلے اس دعوے کو قرآن سے جانچ کر دیکھنا چاہیے کہ کہاں تک یہ دعویٰ مبنی بر صداقت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران ۳۱)	اے میرے حبیب! آپ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو۔ خدا خود تمہیں محبوب بنالے گا، اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

منکرین حدیث اس آیت کریمہ کی ایک دور راز کار تاویل کرتے ہیں کہ خود چونکہ رسول کو اتباع قرآن کا حکم ہے (اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ) اس لئے فاتبعونی سے مراد اتباع قرآن ہے۔ حالانکہ اس آیت صریحہ کے لئے کسی تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس آیت میں خطاب مومنین سے ہے، جو یقیناً احکام قرآنی سے منحرف نہ ہوں گے۔ قرآن کو منزل من اللہ اور واجب الاطاعت جانتے ہوں گے اور اس پر عمل پیرا ہوں گے لیکن باوجود اس کے حکم دیا جاتا ہے کہ نہیں، آپ اُن سے فرمادیں کہ اُن کا ایمان، اُن کا عمل بالقرآن، ان کی خدا سے محبت کوئی چیز قابل قبول نہیں جب تک کہ وہ آپ کی اطاعت نہ کریں، آپ سے محبت نہ کریں، گویا ؎

نئے انداز سے ہم عشق کا اظہار کرتے ہیں	جو تم کو پیار کرتا ہے ہم اس کو پیار کرتے ہیں
مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۷)	رسول جو کچھ تم کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔

حدیث وسنت کے حجت دینی ہونے پر یہ آیت کریمہ کس قدر صاف اور عیاں اور دلیل روشن ہے، لیکن منکرین حدیث کتنی "پادر ہوا" تاویلیں کرتے ہیں کہ یہ چونکہ مال فیٔ کی تقسیم کے متعلق ہے اس لئے اس کو حدیث وسنت سے کوئی واسطہ نہیں۔

یاللعجب، دعوے عمل بالقرآن اور یہ بے خبری، کہ "العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المحل"۔

اگر اسی طرح ہر جگہ عمومیت لفظ کا خیال نہ کیا جائے اور خصوصیت محل کا اعتبار کیا جائے تو بہت سے احکام قرآنی خصوصیت محل کی وجہ سے بیکار ہو جائیں گے۔

" مدعیان عمل بالقرآن " اپنے مخالفین سے کلام مجید سے ثبوت طلب کرتے ہیں اور آیات قرآنی کی تشریح قرآن ہی سے چاہتے ہیں لیکن خود اس آیت کی تشریح اور تحقیق میں روایت سے کام لے رہے ہیں اور روایت و حدیث سے استدلال ہے، لہذا منکرین حدیث کو اپنے مخالفین کی تشریح آیات قرآنی میں استدلال بالحدیث سے ہرگز اعراض مناسب نہیں۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ع ۸)	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور صاحب امر کی جو تم میں سے ہوں، اگر کسی معاملے میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو

اب رہا یہ امر کہ " اولی الامر منکم " صاحب امر کی اطاعت بھی تو اسی طرح ثابت ہے، پھر حدیث کی طرح ان کا مجموعۂ اقوال و افعال بھی ہونا چاہئے "

میں کہتا ہوں کہ ہاں، اگر اولوالامر سے مراد علما اور فقہا ہوں، جب بھی اطاعت واجب ہے۔ فَاسْئَلُوْا اَہْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، اور اگر حکام یا بادشاہان مراد ہوں جب بھی اطاعت واجب۔ عَلَیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ عَبْدًا حَبْشِیًّا۔ لیکن بہر تقدیر ان کی اطاعت حدود شریعت تک ہے۔ اگر حکام یا بادشاہان، علما یا فقہا کوئی حکم خلاف شریعت دیں تو ہرگز واجب الاطاعت نہیں اور حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ برخلاف رسول کے کہ رسول کا کوئی حکم خلاف شریعت نہیں ہو سکتا کیونکہ حکم رسول تو عین شریعت ہے، پس معلوم ہوا کہ حکام یا بادشاہان، علما یا فقہا کی اطاعت کا حکم محض بربنائے مصالح ہے۔ اور اصل میں اطاعت شریعت کے حکم کی ہے، پھر ان کے مجموعۂ اقوال و افعال کی کیا ضرورت ہے ؟

" اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم " اطاعت خدا پھر اطاعت رسول، سب کے بعد بغیر ذکر لفظ " اطیعوا " عطف کے ذریعے سے اطاعت اولوالامر کا حکم صاف ظاہر کر رہا ہے،

کہ درحقیقت خدا اور رسول کی اطاعت فرض ہے، اور "اولی الامر" کی تاکید "اطیعوا" سے کئے بغیر اطاعت اولوالامر کا حکم برنبائے مصالح ہے اور عین اطاعت شریعت کا حکم، کیونکہ پھر فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے کہ ۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ	کہ اگر تم آپس میں جھگڑ بیٹھو۔ تو اُس کو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یہ نہیں کہ " فردوہ الی اللہ والرسول والی اولی الامر منکم "۔

یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (انفال ۹)	اے مومنو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران ۴)	خدا اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۔
۱۲ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا	جو خدا اور رسول کا فرماں بردار ہوا اُس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی

منکرین حدیث سے سوال ہے کہ اگر " اطیعوا الرسول " سے اطاعت قرآن ہی مراد ہے کیونکہ دوسری چیز نہیں، تو پھر " اطیعوا اللہ " کے بعد " اطیعوا الرسول " کہنا تحصیل حاصل ہے، " اطیعوا اللہ " ہی سے اطاعت رسول، اطاعت قرآن و شریعت ظاہر ہے، پھر " اطیعوا الرسول " کی کیا ضرورت تھی ؟

درحقیقت " اطیعوا الرسول " سے مراد اطاعت قرآن ہو ہی نہیں سکتی ۔ یہ محض " کھینچ تان " ہے کیونکہ جہاں جہاں خداوند تعالیٰ نے اطاعت قرآن کا حکم دیا ہے وہاں دوسرا طرز بیان اختیار فرمایا ہے ، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (طٰہٰ ۱۶)	جس نے میری ہدایت (کتاب) کی پیروی کی وہ گمراہ نہ ہوگا۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (اعراف ۸)

اس کی پیروی کرو، جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے آتارا گیا ہے، اور خدا کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کی اتباع نہ کرو

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ہ یَّہْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُہُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَہْدِیْہِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (المائدہ ۶)

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتاتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور ان کی راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے

۵۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا (احزاب ۲۱)

بیشک تم لوگوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ایک (پیروی اور اتباع کے لئے) بہترین نمونہ ہے، جو شخص خوف خدا و یوم آخرت دل میں رکھتا ہے اور خدا کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔

منکرین حدیث اس برہان قاطع کے بعد صرف یہیں تک سر تسلیم خم کرتے ہیں کہ "حدود قرآنی تک (حدیث وسنت سے) رسول اللہ کے عمل بالقرآن کا نمونہ قابل تسلیم ہے" لیکن رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات اقدس کا عمل اگرچہ انسانیت اور زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بہترین نمونہ ہونا قابل تسلیم ہے اور لائق اتباع نہیں، بریں عقل و دانش بباید گریست، محض ہوائے نفسانی اور آزادی کے لئے بہترین نمونے کو چھوڑ دینا کونسی عقل سے جائز ہے؟

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (بیشک رسول صلعم کی ذات اقدس میں تمھارے لئے اتباع اور پیروی کا بہترین نمونہ ہے) بالکل عام ہے، اس کو حدود قرآنی تک محدود کردینا آپ نے قرآن کے متعلق اپنے عمل سے جو نمونہ قائم کردیا ہے، وہی اس آیت سے مقصود ہے، کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا۔

ﷺ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (سورۂ بقرہ ۲)

اور (جدھر آپ نماز پڑھتے تھے) اسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا تاکہ جانچیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔

یعنی بیت المقدس کو اس لئے قبلہ بنا دیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کا امتحان ہو کہ اپنا آبائی قبلہ یعنی کعبہ چھوڑ کر رسول کے حکم سے بیت المقدس کو قبلہ بناتے ہیں یا نہیں، اگر اطاعت رسول ضروری نہیں تو پھر اس امتحان کی کیا ضرورت تھی۔

ﷺ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (سورہ انفال ۱۰)

اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور آپس میں جھگڑا کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری قوت جاتی رہے گی اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس قبل خداوند علام الغیوب نے اپنی رحمت کاملہ سے خاصۃً منکرین حدیث ہی کی ہدایت کے لئے یہ آیت نازل فرمائی تھی اور اتمام حجت کر دیا تھا تاکہ پھر کسی تاویل اور عذر کا موقع باقی نہ رہے کہ اطاعت رسول تمام عالم اسلام کا ایک متفق علیہ فیصلہ ہے اس میں جھگڑا پیدا کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کرو، ورنہ

ﷺ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۔ (سورہ نساء ۱۴)

جو شخص (تمام عالم اسلامی کے ایک متفق علیہ فیصلے کو ٹھکرا کر) (اس مذکورہ آیت) ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول کے برخلاف کرے اور (اتباع ہوائے نفسانی میں) جمیع مومنین کی متفق علیہ راہ کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار کرے، تو جدھر وہ متوجہ ہوا (یعنی جو راہ جدید اس نے نکالی اسی (راہ کی) طرف ہم اسے متوجہ کر دیں گے، اور جہنم میں ڈال دیں گے۔

کیا منکرین حدیث تیرہ سو برس قبل کے فیصلۂ آسمانی پر بھی سر تسلیم خم نہ کریں گے، اور اس

وعید شدید کے باوجود اجماع امت کی مخالفت کرتے ہوئے، حدیث وسنت کو حجت دینی اور دلیل شرعی نہ مانیں گے۔ اور حدیث وسنت کو ناقابل عمل ہی سمجھیں گے؟

۳۱ یَوْمَئِذٍ یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا (سورہ نساء ۵)	اس دن (روزِ قیامت) کفار اور جن لوگوں نے رسول کی نافرمانی کی، یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دیے جائیں، لیکن خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

کیا منکرین حدیث یہاں بھی وہی تاویل کریں گے کہ "آم سے مراد املی" یعنی رسول کی نافرمانی سے مراد قرآن کی نافرمانی ہے! اگر ایسا ہے تو پھر "کفروا" بیکار ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن کی نافرمانی کرنے والا تو کافر ہی ہوگا، پھر "کفروا" کی ضرورت؟

خواہ مخواہ تاویل کرنا اور بات ہے، ورنہ درحقیقت اس آیت میں دو قسم کے نافرمانوں کا ذکر ہے، ایک خدا کا نافرمان یعنی منکر قرآن و رسول جسے "کفروا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے رسول کا نافرمان یعنی منکرین حدیث و اہل بدعت وغیرہ۔

۳۲ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا	جس شخص نے خدا کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔

جس نے خدا کی نافرمانی کی، یعنی منکر قرآن و رسول ہوا وہ تو کھلم کھلا کافر ہو گیا، اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کھلی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے اور جس نے صرف رسول کی نافرمانی کی اس کا دین ناقص رہا، اس کا ایمان مکمل نہ ہوا اور وہ مورد عتاب خداوندی ہوا اور واضح ہے کہ یہ بھی کھلی گمراہی ہے۔

۳۳ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا۔ (سورہ نساء ۵)	اور جس نے اطاعت کی اللہ کی اور رسول کی تو یہ لوگ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین اور یہ حضرات بہترین رفیق ہیں۔

تعجب ہے کہ منکرین حدیث کیوں ہوائے نفسانی کے پیچھے، صریح الفاظ کی تاویل فرماکر حدیث وسنت سے اعراض کرتے ہیں، اور اس نعمت عظمیٰ سے محرومی کو پسند فرماتے ہیں:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا۔	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر وہ لوگ جبکہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تو آپ کے پاس آتے اور خدا سے استغفار کرتے اور اُن کے لئے رسول بھی استغفار کرتے تو بیشک وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

صاف ظاہر ہے کہ بلا واسطہ جناب رسالت بارگاہ خداوندی میں گزر نہیں، رسول واجب الاطاعت ہیں، قبول توبہ میں توسط پیغمبر کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی پھر ارشاد ہوتا ہے اور اس حکم کی مزید تشریح ہو جاتی ہے، کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (سورہ نساء پ۵)	قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ ایمان والے نہوں گے جب تک کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنائیں، پھر اپنے دلوں میں آپ کے فیصلے سے کسی قسم کی کدورت نہ پائیں، اور آپ کے حکم کو پوری طرح رضا ورغبت سے ان لیں

درمنثور میں ہے کہ ایک پانی کی نالی تھی، جس سے حضرت زبیر اور ایک انصاری اپنے اپنے کھیت سینچتے تھے، انصاری نے کہا تم پانی کھول دو کہ ہمارے درختوں میں بھی آئے۔ حضرت زبیر نے انکار کیا، حضور میں قضیہ پیش ہوا، آپ نے فرمایا، زبیر پہلے تم اپنے درخت سینچ لو، پھر پانی کھولدو۔ انصاری خفا ہو کر بولا، یہ رعایت اس لئے ہے کہ زبیر آپ کے قرابت مند ہیں، حضور کے روئے مبارک کا رنگ غصے سے بدل گیا اور کہا، اے زبیر پانی روک لو، یہاں تک کہ دیواروں سے بہہ کر نکلے، اُسی وقت یہ آیت اتری کہ، فَلَا وَرَبِّكَ الخ

ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ وحی خفی یا اجتہاد کی بنا پر تھا، کیونکہ قرآن میں اس قسم کے قضیئے کے

لئے کوئی نص صریح نہیں، لیکن انصاری کے اعراض پر آپ کا غضب اور پھر نزول آیت اور اتباع حکم رسول کی تاکید شدید سے حدیث وسنت کا اتباع واجب قطعی ہو جاتا ہے۔

اس روایت سے قطع نظر بھی آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے یہی معنی، یہی مفہوم اور یہی حکم ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا دار و مدار ہی اس پر ہے کہ اپنے ہر جھگڑوں میں رسولؐ کو حکم بنایا جائے اور پھر آپ کے فیصلے کو برضا ورغبت قبول کر لیا جائے اور اب جب کہ رسولؐ ہم لوگوں میں موجود نہیں اس حکم کے تعمیل کی سوائے اس کے اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ حدیث وسنت سے ہر قضیے کا فیصلہ ہو اور حدیث وسنت کے فیصلے کو بطیب خاطر قبول کیا جائے۔

اتباع حدیث وسنت کے لئے یہ آیت دلیل محکم اور آفتاب روشن ہے اور کسی تاویل کی محتمل نہیں ہو سکتی، یوں تو اور بھی بے شمار دلائل ہیں، لیکن سب سے قطع نظر آخر میں ایک اور صرف ایک دلیل۔

۱۶ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ نساء، ع۴)	جس نے رسول کی اطاعت کی بیشک اس نے خدا کی اطاعت کی

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اطاعت رسول میں خدا کی اطاعت داخل ہے، لیکن یہ کہیں نہیں فرمایا کہ من یطع اللہ فقد اطاع الرسول جس نے خدا کی اطاعت کی، اس نے رسول کی بھی اطاعت کی۔ پس معلوم ہوا کہ رسول کی اطاعت کافی ہے۔ اور صرف خدا کی اطاعت کافی نہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اللہ کی اطاعت کا ایک جزو یعنی اطاعت رسول ترک ہوا، یا یہ کہ بلا واسطہ اطاعت وعبادت مقبول نہیں، کیونکہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

یاایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاہدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کی طرف (رسائی حاصل کرنے کے لئے) وسیلے کی تلاش کرو، اور اس کی راہ میں تم جہاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ۔

فبأیّ حدیث بعد اللہ و آیاتہ یؤمنون

قرآن سے اس مضمون کی خوب اچھی طرح تشریح ہو چکی کہ اطاعت رسول فرض، حدیث و سنت دلیل شرعی، حجت دینی اور واجب الاتباع ہے، اب اس کی مزید تائید کے لیے حدیث و سنت کو بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ حضور نے ان آیات قرآنی کی کیا تشریح فرمائی، کیا معنی سمجھائے اور صحابہ کا طرز عمل حدیث و سنت کے متعلق کیا رہا ؟

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابیٰ قیل ومن ابیٰ قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابیٰ

(رواہ البخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری کل امت جنت میں داخل ہو گی، مگر جس شخص نے انکار کیا، لوگوں نے عرض کیا حضور کی امت میں ایسا کون شخص ہے جو حضور سے (حضور کی شریعت سے، قرآن سے) مجال انکار رکھتا ہو ارشاد ہوا جس نے میری اطاعت کی جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے گویا (قرآن و شریعت سے) انکار کیا۔

اصح الکتب بعد کتاب اللہ (بخاری شریف) کی یہ حدیث کتنے پر زور طریقے پر "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی ترجمانی کر رہی ہے کہ "اطیعوا الرسول" سے مراد اطاعت قرآن نہیں، بلکہ اطاعت رسول اور اتباع حدیث و سنت ہے۔

عن انس بن مالک رضی قال جاء ثلثۃ رھط الیٰ ازواج النبی صلعم۔ یسالون عن عبادات النبی صلعم، فلما اخبروا بہا، تقالوہا، فقالوا این نحن من النبی صلعم وقد غفر اللہ لہ من ذنبہ ما تقدم وما تاخر۔ فقال احدہم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم ابدا ولا افطر وقال الآخر

تین جماعتیں ازواج مطہرات کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق سوال کرنے آئیں اور جب اُن کو اس کی خبر دی گئی تو انھوں نے عبادت رسول صلعم کو نہایت قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں ہم لوگ اور کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کے تو کل اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دئے گئے ہیں، پھر اُن میں سے ایک

اا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی صلعم فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا، انی لاخشاکم للہ و اتقاکم لہ لکنی انا اصوم وافطر واصلی وارقد، واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

(رواہ البخاری والمسلم)

نے کہا کہ میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا ہوں دوسرے نے کہا میں تو ہمیشہ روزہ رکھتا ہوں اور کبھی افطار نہیں کرتا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے کنارہ کرتا ہوں اور کبھی شادی نہ کروں گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ تم لوگوں میں اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی؟ میں تم لوگوں کو خدا کا خوف دلاتا ہوں اور خدا سے ڈراتا ہوں، مجھے دیکھو کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

صحیحین کی اس روایت صحیحہ سے ظاہر ہے کہ آپ نے اتباع سنت کی کس قدر تاکید شدید فرمائی ہے اور گویا ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے کی ہدایت فرمائی "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کی تشریح بھی اس حدیث سے اچھی طرح ہو گئی، کہ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کو صرف حدود قرآنی تک محدود کر کے لائق عمل سمجھنا ہرگز درست نہیں۔

عن ابی رافعؓ قال قال رسول اللہ صلعم لاالفین احدکم متکئا علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نہیت عنہ فیقول لاادری ماوجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ

(رواہ احمد وابوداؤد)

ابی رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں میں سے میں کسی کو بھی ایسا نہ پاؤں کہ وہ متکبرانہ انداز سے، اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا ہوا ور جب اس کے پاس میرا کوئی حکم پہنچے، جس کے متعلق میں نے حکم دیا ہو یا منع کیا ہو، پس وہ میرے حکم کو سن کر کہے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ میں نے کتاب اللہ میں پایا اس کی اطاعت کی

اس حدیث سے "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" کے معنی واضح اور متعین ہو گئے کہ اگرچہ

تم کتاب اللہ پر عمل کرو، اگر میری سنت سے اعراض کروگے تو ہرگز قابل قبول نہیں
اس حدیث کے بعد ہر مسلمان کو منکرین حدیث کے فتنے سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے،
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو برس قبل پیشینگوئی فرما کر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور حدیث ذیل پر عمل کرنا چاہئے کہ

عن ابی ہریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائة شہید (رواہ البیہقی)

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری سنت پر عمل کیا فساد امت یعنی غلبہ بدعت اور جہل کے وقت اُس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

عن مالک بن انس مرسلا قال قال رسول اللہ صلعم ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنة رسولہ (رواہ فی الموطا)

مالک ابن انس سے مرسلا روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم لوگ اُن پر عمل کرتے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت۔

عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلعم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد قال بسنة رسول اللہ صلعم، قال فان لم تجد فی سنة رسول اللہ صلعم قال اجتہد برائی ولا آلو، قال فضرب رسول اللہ صلعم علی صدرہ، وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ
(رواہ الترمذی، وابوداود، والدارمی)

معاذ ابن جبل کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم نے مجھے والی یمن بنا کر بھیجا تو مجھ سے سوال کیا کہ اگر کوئی جھگڑا تمہارے آگے پیش ہوگا تو کس طرح فیصلہ کروگے میں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو، میں نے کہا سنت رسول سے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ، میں نے عرض کیا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، پس رسول اللہ صلعم نے خوش ہو کر میرے سینے پر مارا اور کہا، خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے رسول کو اُس چیز کی توفیق بخشی جس سے اس کا رسول خوش ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حدیث وسنت محض دینی تاریخ کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ حجت دینی اور دلیل شرعی ہے، ورنہ حضور نے اظہار رضامندی کیوں فرمایا؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے "اطیعوا الرسول" کی تشریح کے بعد صحابہؓ کے طرز عمل کو دیکھنے سے اور بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ہرگز صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین، صرف تمسک بالکتاب کو کافی نہیں سمجھتے تھے اور حدیث وسنت پر عمل ضروری اور لازمی سمجھتے تھے، جب کسی نے کوئی حدیث پیش کی، شہادت یا حلف سے اس کی توثیق فرما کر ضرور قبول کر لیتے تھے، البتہ خلفائے راشدین قبول روایت میں بہت احتیاط سے کام لیتے۔ اور قلت روایت اور کثرت طرق کے زبردست حامی تھے، اور خلیفہ وقت کے لئے عوام کی افراط وتفریط کی روک تھام کے لئے یہ احتیاط بہت ضروری اور لازمی اور حق بجانب تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ صحابہ یا خلفائے راشدین نے باوجود شہادت وتوثیق کسی حدیث سے اعراض فرمایا ہو۔

اکثر جلیل القدر صحابہ کے لئے تو حدیث وسنت سے زیادہ محبوب کوئی دوسرا شغل ہی نہ تھا اور عمر کی عمر اسی مبارک اور محبوب ترین شغل میں بسر کر دی۔

قرآن وحدیث کے بعد اجماع امت کو دیکھتا ہوں تو منکرین حدیث کے دعوے کے از سرتاپا غلط ہونے پر اور بھی مہر توثیق ثبت ہو جاتی ہے اور اس دعوے کی صحت کا ایک سکنڈ کے لئے امکان بھی باقی نہیں رہتا، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک حدیث وسنت کے واجب الاتباع اور حجت دینی ہونے میں آج تک کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اگر گنتی کے چند اہل قرآن کی مخالفت کو ثبوت میں پیش کیا جائے تو وہ کسی طرح قابل وقعت نہیں ہو سکتی۔

منکرین حدیث اجماع امت سے استدلال پر کس قدر پریشان ہوتے ہیں اور لاجواب ہو کر کس طرح پیچھا چھڑاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

"تمہارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب وسنت، اجماع وقیاس، اور اسی ترتیب سے ان کے مدارج بھی ہیں، کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہو۔ اجماع سے جو فروتر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو، اگر ایسا ہے تو تمہارا مشعل تاریک ہے۔"

ہمارا مشعل تاریک نہیں، منکرین حدیث کی عقل تاریک ہے، ہم اگر صرف اجماع امت سے حدیث وسنت کے حجت شرعی ہونے پر دلیل قائم کرتے تو خیر، کیونکہ ہم تو قرآن سے استدلال کرتے ہیں اور منکرین حدیث کے ابطال دعوے کے لئے ایک دو نہیں متعدد اور بیسیوں نص صریح پیش کرتے ہیں، پھر حدیث اور تعامل صحابہ سے اس کی تشریح اور تائید کرتے ہیں، پھر مزید تائید اور غایت توثیق کے لئے اجماع امت سے ثبوت پیش کرتے ہیں، لیکن مخالفین حدیث کے پاس مجرد دعویٰ اور محض تاویل کے سوا اور کیا ہے؟

اور بالفرض اگر ہم اپنے مخالفین کے قصور فہم، قلت بصارت اور فقدان بینائی کی وجہ سے اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی میں دکھلاتے ہیں، جس کے بعد ہمارا مخالف سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو اس سے ہمارا مشعل تاریک کیونکر ثابت ہوا؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اسی طرح منکرین حدیث کا یہ عذر لنگ بھی لائق اعتنا نہیں "کہ اجماع سارے عالم کے لئے ایک ہنگامی چیز ہے۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اس کو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے"، کیونکہ اس کے متعلق کافی گفتگو ہو چکی ہے اور اجماع حجت شرعی ہونے پر کلام الٰہی سے ثبوت اور احادیث سے اُس کی تشریح اور تائید بھی ہو چکی۔

قرآن وحدیث اور اجماع امت کے بعد اب صرف قیاس باقی رہتا ہے جس کی مطلقاً ضرورت ہی نہیں کیونکہ قیاس قرآن وحدیث اور اجماع کے بعد ایک بیکار چیز ہے لیکن پھر بھی قیاس کا جب فیصلہ ہوگا تو یہی ہوگا کہ جو حکم صریح قرآن میں موجود ہے اور جس کی تشریح اور تائید احادیث

اور تعامل صحابہ سے ہو، جس پر اجماع امت ہو، اُس کی محض تاویل ہی تاویل روگردانی کے مترادف ہے۔

اب ہر شخص آسانی کے ساتھ یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ جس دعوی کی تغلیط پر قرآن وحدیث ناطق ہو، جس دعوے کی تکذیب اجماع امت اور قیاس سے ہوتی ہے۔ وہ دعویٰ کسی طرح بھی قابل قبول ہوسکتا ہے؟ اور منکرین حدیث کی چند صاف صاف اور کھلی کھلی آیات قرآنی کی الٹی سیدھی تاویل کسی طرح بھی نیک نیتی پر محمول ہوسکتی ہے؟

ابلغکم رسٰلت ربی وانا لکم ناصح امین

وما علینا الا البلاغ

چین کا موجودہ نظام تعلیم

(بسلسلہ گزشتہ)

۳۔ ثانوی تعلیم

جب ۱۹۲۲ء میں نیشنل ایسوسی ایشن کی طرف سے تعلیم کو ترقی دینے کے لئے اسکول نظام کی تجویز پیش ہوئی جسے پیکن کی سابق حکومت کے محکمہ تعلیم نے منظور کیا تو اس پر عمل کرنے کی کوشش شروع ہوئی اس نظام کے مطابق ثانوی تعلیم، سینیر مڈل اور جونیر مڈل اسکولوں میں تقسیم کی گئی اور ہر ایک کی مدت تعلیمی تین تین سال قرار دی گئی۔ موجودہ محکمہ تعلیم نے ثانوی تعلیم کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ سابق محکمہ تعلیم کے رویے سے کسی قدر مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موجودہ محکمہ تعلیم نے مڈل اسکولوں کی تعداد بڑھا دی او تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

اس کے متعلق موجودہ محکمہ تعلیم نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ یہ ہے کہ ضروری اور اہم نصاب تعلیم کا معیار متعین کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی، ابتدائی اسکولوں، جونیر مڈل اسکولوں اور سینیر مڈل اسکولوں کے شعبہ تیاری(۱) کے معیار کے مطابق "اصول ثلثہ" اور "قومی زبان" ان کے نصاب میں داخل کی گئی۔ بالفاظ دیگر "اصول ثلثہ" اور "قومی زبان" کی تعلیم کا سلسلہ ابتدائی سے لے کر سینیر مڈل اسکول کے شعبہ تیاری تک جاری ہے۔ جونیر مڈل اسکول کے پہلے دو سال میں کسی فن خاص کی تعلیم نہیں ہوتی، اس میں زیادہ تر معلومات عامہ پر زور دیا جاتا ہے تاکہ تعلیم کی بنیاد مضبوط ہو اور طلبہ سینیر مڈل اسکول میں شریک ہو کر مزید تعلیم حاصل کر سکیں۔ طلبہ کے انفرادی میلان

(۱) سینیر مڈل اسکول کا ایک شعبہ ہے جس میں طلبہ کالج میں شریک کرانے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔

ان کے خاص ذوق اور فطری لیاقت معلوم کرنے کے لئے تجربی نصاب کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ دستکاری ، صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی ہے ۔ اس لئے کہ جونیر مڈل اسکولوں میں بہت سے ایسے طلبہ ہوں گے جن کو اس سے فارغ ہوکر ذہنی کمزوری یا مالی دقتوں کے سبب سے مزید تعلیم کا موقع نہیں ملے گا ، اگر ان کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہوگا تو جونیر مڈل اسکولوں سے نکل کر دستکاری کے سہارے ان کی زندگی ضائع ہونے سے بچ جائے گی ۔

جونیر مڈل اسکولوں کے نصاب کی بنیادی اصول میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے

(الف) جونیر مڈل اسکول کا عام نصاب ایسا ہونا چاہئے کہ ایک طرف مضمون کی تکرار نہ ہو ، اور دوسری طرف وہ اسکول اور کالج کی تعلیم کے درمیان واسطے کا کام دے

(ب) اس کے نصاب میں آرٹ اور سائنس کو نہ داخل کرنا چاہئے ، بلکہ پورا غور کرنے کے بعد ایک وسیع اور جامع پروگرام تیار کرنا چاہئے ۔

(ج) ریاضی ، غیر وطنی زبان اور اسی درجہ کا اور کوئی مضمون ، طلبہ کو اتنا سکھانا چاہئے کہ وہ اعلیٰ تعلیم میں شریک ہوسکیں تمام اسکولوں کو اس نئے معیار پر تجربہ کرنے کی ہدایت کی گئی اور ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے نتائج سے محکمہ تعلیم کو مطلع کریں ۔ رپورٹوں کے مطابق اگر ضرورت ہوگی تو نصاب میں کچھ ترمیم کردی جائے گی ۔ پیشہ وری کی لیاقت کو نشو و نما دینا اور طلبہ کے ایجادی مادے کو بڑھانا اور انھیں کام کے آدمی بنانا چین کی موجودہ تعلیم کی دو اہم غرض و غایت ہیں ، چنانچہ دستکاری نصاب تعلیم میں شامل کردی گئی ہے اور ابتدائی اور جونیر مڈل اسکولوں میں اس کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے پہلے تو دستکاری کی تربیت صرف درسی کمرے میں ہوتی تھی مگر اب اس کا تعلق مقامی دستکاری کے مرکزوں کے ساتھ کردیا گیا ہے اور اس میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ مقامی ضروریات اور لوازمات کے مطابق طلبہ کوئی صنعت سیکھیں ۔ چنانچہ اسکولوں کے شعبۂ دستکاری نے مقامی کارخانوں سے تعلقات قائم کرلئے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کو عملی تجربات میں بڑی سہولت ہوگئی اور وہ جونیر مڈل اسکولوں سے نکل کر آسانی کے ساتھ کسی کارخانے میں کام کرسکتے ہیں ۔

دیہاتی تعلیم کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے محکمۂ تعلیم نے کثرت سے دیہاتی نارمل اسکول کو کھولنے کا ارادہ کیا ہے اور اس کے متعلق تیزی کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے چونکہ دیہاتی اسکولوں کی غرض و غایت کسانوں اور دیہاتیوں کو نفع و فائدہ پہنچانا ہے۔ اس لئے ان کے اسکول ایسے مقامات پر قائم کئے گئے ہیں جہاں کسان اور دیہاتی آسانی کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان میں بالکل جدید طریقے پر زرعی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے طلبہ اسکولوں سے فارغ ہو کر کسانوں اور دیہاتیوں کے معلمین اور مدرسین بن جاتے ہیں۔ ان کے نصاب میں عملی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور طلبہ پر ایسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں کہ وہ خود بخود آنے والی نسلوں کے قابل معلم اور باپ بن جائیں۔

انھیں بیس سال کے اندر ابتدائی اسکولوں کے کام کو چلانے اور لازمی تعلیم پر کاربند ہونے کے لئے کم سے کم چودہ ہزار معلمین درکار ہیں، کیونکہ محکمۂ تعلیم نے ایک اسکیم تیار کی ہے کہ پانچ سال کے اندر ایک ہزار پانسو صوبجاتی اور مقامی نارمل اسکول قائم کر دئے جائیں گے۔ اب ابتدائی تعلیم میں اچھی خاصی ترقی ہو گئی ہے پہلے تو صوبہ کیانگ سو کی سب سے اچھی تعلیم مانی جاتی تھی کیونکہ اس میں یورپ اور امریکہ کا تعلیمی طریقہ نافذ کیا گیا تھا، مگر ادھر دو سال کے اندر قومی حکومت کی کوشش سے یورپ اور امریکہ کا طرز تعلیم چین کے ہر گوشے میں عام ہو گیا ہے چینی طلبہ جو کہ یورپ اور امریکہ سے تعلیم پاکر واپس آئے ہیں وہ جدید تعلیمی طرز کے مطابق اپنے بھائیوں اور بہنوں کی تربیت میں نہایت شوق اور خلوص کے ساتھ دلچسپی لے رہے ہیں آج کل چین کے ابتدائی اسکولوں میں ساز و سامان کا کافی اضافہ ہوا ہے۔ مقامی تعلیم کے اخراجات سال بہ سال بڑھتے جا رہے ہیں اور طلبہ کی جسمانی تربیت پر کافی توجہ کی جاتی ہے۔ معلموں کی تنخواہ بڑھا دی گئی ہے — مگر ابھی بہت سے تعلیمی اصلاح کے کام کرنے باقی ہیں۔

اسکولوں کے لئے درسی اور مطالعے کی کتابوں کی تیاری میں بھی بہت کچھ ترقیاں نظر آتی ہیں، بچوں کی کتابیں لکھوانے، رسم الخط کو آسان کرنے اور بچوں کے لئے صحیح تلفظ

کے قواعد تیار کرانے میں محکمۂ تعلیم نے کم کوشش نہیں کی ہے۔

یہ سب کام ملکی زبان میں ہو رہا ہے، غیر ملکی زبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کوششوں کی غرض یہ ہے کہ چینی زبان کے سکھانے میں جو مشکلات ہیں، ان کو کم کر دیا جائے۔

ان کاموں کے ساتھ ہی ساتھ لازمی تعلیم کا سوال آتا ہے۔ سابق واہیو یوان نے ہر صوبہ میونسپلٹی اور شہر کو حکم دیا تھا کہ جہالت دور کرنے کی غرض سے لازمی تعلیم کی ایک خاص کمیٹی بنائی جائے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ بیس سال کی مدت میں چار کروڑ لڑکے کم سے کم چار سال کی تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے اخراجات کے لئے ۱۱۲،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ جب اخراجات کی کمی محسوس ہوگی۔ اس وقت اس کے پورے کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ باکسر کے معاملے کا جرمانہ جو دول یورپ نے چین کو واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ زیادہ تر تعلیمی کاموں میں صرف کر دیا جائے۔

سابق حکومت پیکن کے محکمۂ تعلیم نے تعلیمی نظام اور اس کے بنیادی اصول پر مطلقاً توجہ نہیں کی تھی، مگر اب موجودہ محکمۂ تعلیم اس کام میں حتی الامکان جد و جہد کر رہا ہے۔ اکثر ملحقہ تربیت گاہوں اور ابتدائی اسکولوں میں کنڈرگارٹن رائج کیا گیا ہے۔ ہر نارمل اسکول اور یونیورسٹی میں ایک ایسا خاص شعبہ کھولا گیا ہے، جہاں کنڈرگارٹن کے معلمین کی تربیت کی جاتی ہے اور کنڈرگارٹن کے نصاب کا بھی خاص معیار مقرر کیا گیا ہے۔

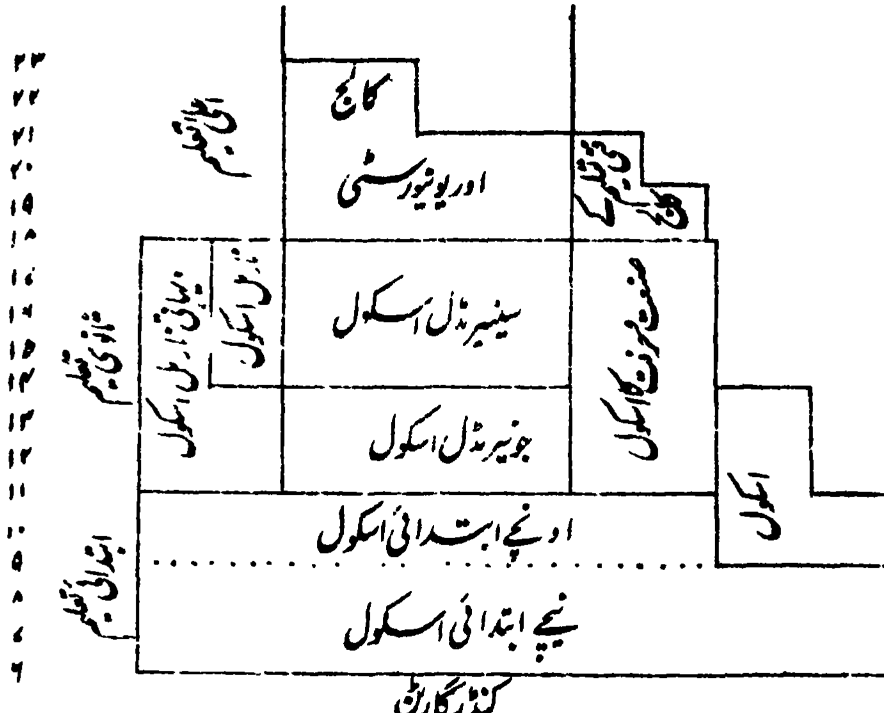
چین کے موجودہ اسکول کا نظام اس نقشے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائی تعلیم سے انتہائی تعلیم تک کل سترہ سال کا عرصہ لگتا ہے یعنی یہ تعلیم چھ برس کی عمر سے تئیس برس کی عمر تک دی جاتی ہے۔

۲۔ اس میں سے ۵ سال ابتدائی تعلیم میں، ۶ سال ثانوی تعلیم میں اور ۵ سال اعلیٰ تعلیم میں صرف ہوتے ہیں۔

۳۔ بعض طلبہ عام ثانوی تعلیم کے بجائے نارمل اسکول میں معلمی کی تعلیم پاتے ہیں یا کوئی حرفہ سیکھتے ہیں۔

۴۔ بعض یونیورسٹی کی عام تعلیم کے بجائے کسی فن کی تعلیم پاتے ہیں۔



تمام چینی اسکول جو غیر ممالک میں قائم کئے گئے ہیں، ان کو موجودہ محکمہ تعلیم سے الحاق کرانے کی ہدایت کی گئی ہے، بیرونی چین کا ذہنی معیار بلند کرنے کے لئے بیرونی چینی تعلیم کی کمیٹی کے نام سے ایک مجلس محکمہ تعلیم میں قائم کی گئی ہے۔

تعلیم بالغان کے میدان میں محکمہ تعلیم نے ملک کے ہر اسکول کو یہ ہدایت دی ہے کہ عام تعلیم کا انتظام کرے، تعلیمی سہولت کے لئے شام کا وقت اور تعطیل کا دن انتخاب کیا گیا ہے۔ جب عوام کو اپنے کاموں سے فرصت ملتی ہے، معلموں اور طلبہ دونوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جاہل عوام کی تعلیم کے لئے اپنے اسکول میں ایک زائد جماعت یا ملحقہ اسکول کھولیں۔ ان کو یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ وقتاً فوقتاً عام لکچر دیں، معاشرتی اور تعلیمی نمائش کریں۔ متحرک تعلیمی تصویریں عوام کو دکھلائیں، قومی گیت اور گانے ان کو سنائیں اور اس طرح اپنے اسکول کو معاشرتی تحریک و اصلاح کا مرکز بنائیں۔

عام کتب خانے کے متعلق قواعد بنائے گئے قدیم یادگاروں کو محفوظ کرنے کے لئے دو کمیٹیاں مرتب کی گئی، ایک کمیٹی کے ذمہ یہ کام ہے کہ پیپنگ (پیکن) کے شاہی محل کی حفاظت کرے، اور

دوسری کا فرض یہ ہے کہ لوجیہ میں خاندان مانگ کی سنگ تراشی اور نقاشی کو محفوظ رکھے۔

سابق داہیو یوان نے ہانگ چیو میں ایک آرٹ کالج اور شنگھائی میں ایک موسیقی کالج قائم کیا تھا، آرٹ کو اہمیت دینے کی غرض سے ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں تمام شنگھائی میں اور ۱۹۳۰ء کے موسم سرما میں ہانگ چیو میں آرٹ کی نمائش کی گئی۔

۴۔ مانگولی اور تبتی تعلیم

مانگولی اور تبتی لوگ اب تک گلہ بانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک تعلیم محض چند گیتوں اور پرانے اور وہ بھی صدیوں پرانے قصوں کو یاد کرانا ہے۔ قصوں میں اکثر جن اور پری کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ لاماؤں کے معتقد ہیں، شریف طبقے کے لڑکوں کو صرف چند مذہبی کتابیں یاد کرا دیتے ہیں۔ ان کے حالات دیکھ کر موجودہ محکمہ تعلیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہر نانکینگ میں مانگولی اور تبتی لوگوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو مانگولیہ اور تبت کی خدمت کے واسطے پیش کرتے ہیں، فوراً ایک خاص مڈل اسکول قائم کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نیشنل سنٹرل یونیورسٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ مانگولی اور تبتی طلبہ کے لئے ایک خاص کلاس کھول دیں۔ اس کے علاوہ دوسری یونیورسٹیاں بھی بڑے شوق سے ان کے طلبہ کو داخل کرتی ہیں، مستحق اور لائق مانگولی اور تبتی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے غیر ممالک بھیجنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

کل مانگولی اور تبتی طلبہ کی تعداد کی تحقیق کی جاتی ہے اور ان کی آئندہ تعلیم کے لئے یہ تجویز کی گئی ہے کہ پیپنگ، شین یان، تائی یوان اور پائی لا میں جو مانگولی اور تبتی مدارس موجود ہیں، ان کو دوبارہ منظم کیا جائے، مانگولی اور تبتی گیتوں اور اصطلاحوں کو جمع کیا جائے خاص درسی کتابیں اور ریڈریں تیار کی جائیں، ان کے اسکولوں کے نصاب تعلیم ایک خاص معیار پر لائے جائیں، اور ان کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں چینی زبان کا درس دیا جائے۔

درسی کتابوں پر تحقیق اور نظر ثانی کرنے اور اصطلاحوں کا معیار بنانے کا کام ہسابق واہیوان کے صیغہ عرانی نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ ۱۲۰ درسی اور فنی کتابیں تحقیق کر کے پسند کی گئیں۔ ۴۴ کتابیں ممنوع قرار دی گئیں اور ۳۲ کتابیں نظر ثانی کے لئے پھر صیغہ عرانی کے پاس بھیج دی گئیں۔ ۲۴۳ کتابیں بغیر تحقیق کے چھوڑ دی گئیں۔ جہاں تک مقامی بولی کا تعلق ہے، ۲۲۱۵ عام فقرے انتخاب کر کے پسند کئے گئے۔ موجودہ محکمہ تعلیم کے قائم ہوتے ہی صیغہ عرانی کے بجائے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس نئے محکمہ کے ماتحت پھر ۳۰ درس اور مطالعے کی کتابوں کی جانچ کرائی گئی۔ ۵۴ کتابیں مسترد اور ممنوع قرار دی گئیں، ۱۰ غیر مطبوعہ کو چھپوانے کی اجازت دی گئی، ۱۳۰ نظر ثانی کے لئے پھر محکمہ تعلیم کے پاس بھیجی گئیں۔ اور ۱۲۰ زیر تحقیق و انتخاب ہیں۔

اس کے علاوہ طب اور ریاضی کی اصطلاحوں کا معیار بنایا گیا جسمانی تربیت کی اصطلاحوں پر تبصرہ کیا گیا، تعلیمی، طبعی، فلسفی، سیاسی، زرعی، عملی (انجینرنگ) اصطلاحوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اور انکا معیار بنایا جا رہا ہے۔

۵۔ قومی تعلیم کی کانفرنس

۱۵ مئی ۱۹۲۸ء کو واہیوان کے اہتمام میں ڈاکٹر تسائی یوان پائی کے زیر صدارت قومی تعلیم کی کانفرنس کا پہلا اجلاس بمقام نانکنگ منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں ۸۰ تعلیمی نمائندے شریک تھے۔ ان میں مختلف صوبوں کے تعلیمی کمشنر یونیورسٹیوں کے چانسلر، واہیوان کے ۱۸ ماہرین اور قوم پرور جماعت اور حکومت کے نمائندے بھی شامل تھے۔

اس اجلاس نے یہ طے کیا کہ قومی تعلیم کا مقصد اصول ثلثہ کے مطابق ہونا چاہئے، اس تعلیمی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے اجلاس کے ختم ہونے پر یہ اعلان شائع کیا گیا۔

۱۔ قومیت کو ترقی دینے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے نوجوانوں کے دماغ میں قومی روح پھونکی جائے، قدیم قومی روایات زندہ کی جائیں، اخلاقی ذہنی اور جسمانی تربیت کا عام معیار

بلند کیا جائے، جدید علوم کی اشاعت کی جائے، فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کیا جائے۔

۲۔ یہی جمہوریت حاصل کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کو فرماں برداری اور قانون کی پابندی جیسی خصلتوں کی ہدایت کی جائے، انتظام کا مادہ ملکی خدمت کی روح اور اتحاد عمل کی عادتیں پیدا کی جائیں، سیاسی معلومات کی اشاعت کی جائے اور عوام کو تعلیمی آزادی اور مساوات کا مطلب سمجھایا جائے۔

۳۔ معاشرت میں توازن و تناسب قائم کرنے اور اجتماعی عدل و انصاف کے عمل کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعے سے لوگوں میں امداد باہمی کا دستور مروج کیا جائے اور ان کے اختراعی مادے کو بڑھا دیا جائے۔ روزمرہ کی عام معلومات سے ان کو آگاہ کیا جائے اور عوام کو ان منافع و مفاد کی اہمیت بتائی جائے جو معاشی ہم آہنگی اور استقلال سے تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ اسکول کا نظام دوبارہ منظم کیا گیا ہے اور اس میں خفیف اور معمولی تبدیلیاں ہوتی رہیں، مگر مجموعی طور پر وہی رہا جو کہ ۱۹۳۲ء میں پیکن کی حکومت نے بنایا تھا۔

اس زمانے میں چین کے اندر ایک اہم اور قابل توجہ تعلیمی مسئلہ در پیش ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ کی تحریک بہت زوروں پر ہے، ہر روز اور ہر وقت اسی سوال پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے متفقہ رائے یہ ہے کہ اس تحریک کو منظم کر دیا جائے اور حکومت سے یہ تسلیم کرا یا جائے کہ یہ طلبہ کی ایک مستقل جمعیت ہے۔ اس کے تمام عمل اور تحریکیں خالص ذہنی، اخلاقی اور اصلاحی ہیں اس کے متعلق ایک مسودہ قومی حکومت کے پاس بھیج دیا گیا ہے کہ اس پر غور کر کے منظوری دے۔

ثانوی جماعتوں میں فوجی تربیت کا مسئلہ بھی زیر بحث ہے۔ اس کے متعلق ایک مفصل اسکیم محکمہ فوج کی طرف سے کی گئی۔ اس اسکیم کا مقصد واحد یہ ہے کہ طلبہ میں پابندی برداشت اور انضباط کی عادتیں پیدا کی جائیں۔ ۱۹۲۸ء کی تعلیمی کانفرنس میں اس کے متعلق ایک تجویز بھی پاس ہوئی ہے۔

قومی تعلیمی اجلاس کے بعد ۱۵ر اپریل ۱۹۳۰ء میں ثانوی تعلیمی کانفرنس نانکین میں

منعقد ہوئی۔ اس میں ۱۰۰۷ نمائندے شریک تھے، دو ہفتہ تک ثانوی تعلیم کے مسائل پر غور کرتے رہے، دس اہم تجاویز پاس کی گئیں۔

۱۔ لازمی تعلیم:۔ بیس سال کے اندر اٹھائیس کروڑ ڈالر خرچ سے دس لاکھ ابتدائی اسکولوں کے معلمین تیار ہو کر چار کروڑ بچوں کو پڑھائیں اور ان کی تعلیمی بنیاد مضبوط کر دیں۔

۲۔ تعلیم بالغان:۔ ایک لاکھ پینتیس ہزار معلمین تیار کئے جائیں ایک لاکھ بارہ ہزار مدارس کھولے جائیں اور چھ سال کے اندر اٹھائیس کروڑ چونتیس لاکھ ڈالر کا فنڈ جمع کر کے ان جاہل عوام کے ضروری لکھنے پڑھنے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن کی عمر ۱۲ اور ۶۰ کے درمیان ہے۔

۳۔ اسکولوں کے تمام درجوں میں جو معلمین درکار ہیں، ان کو پانچ سال کے اندر تیار کیا جائے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم کے سامان اور تعلیمی ضروریات میں اضافہ کیا جائے۔

۵۔ ثانوی تعلیم کی توسیع:۔ آنے والے بیس سال کے اندر ہر ایک سال میں پچاس پچاس جونیر مڈل اسکولوں کا اضافہ کیا جائے۔

۶۔ اعلیٰ تعلیم کو ترقی دینا اور انگریزوں کے "ٹیوٹر سسٹم" کو بتدریج رائج کرنا۔

۷۔ عمرانی تعلیم:۔ کتب خانے، عجائب خانے، آرٹ کے ادارات، ورزشی میدان اور ملحقہ اسکولوں میں تمام درجے کھلوانا۔

۸۔ بیرونی چینی باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا:۔ (الف) محکمہ تعلیم میں، بیرونی چینی تعلیم کا صیغہ قائم کرنا۔ غیر ممالک کے ہر بڑے شہر میں جہاں کثرت سے چینی باشندے سکونت پذیر ہیں، ایک تعلیمی کمشنر مقرر کرنا، اور ان کا مرکز دار السلطنت نانکنگ میں بنانا۔ (ب) مالگذاری سے پانچ لاکھ ڈالر کی رقم منظور کرانا اور بیرونی چینی تعلیم کے لئے ایک کروڑ ڈالر کا فنڈ جمع کرنا۔

۹۔ منگولی اور تبتی تعلیم:۔ منگولیا اور تبت میں ابتدائی اسکول قائم کرنا۔ دو سال کے اندر مقام نانکنگ اور کلگینگ میں منگولی اور تبتی اسکول کھولنا اور ان کے طلبہ کو غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بھیجنا۔

۱۰۔ تعلیمی فنڈ۔ پہلے سال میں قومی تعلیم کے اخراجات شاید چھ کرور۔ ڈالر سے کچھ زیادہ ہوں گے لیکن بارھویں سال میں تعلیمی اخراجات پچاس کرور ڈالر سے بڑھ جائیں گے۔ اتنی بڑی رقم کے وصول کرنے کے ذرائع پر بھی بہت کافی غور کیا گیا اور مرکزی اور مقامی امداد کی تدبیریں سوچی گئیں۔

۶۔ مطبوعات

۱۔ واسیویوان کے ماہواری بلیٹن (صرف و شائع ہوئے)
۲۔ محکمہ تعلیم کے ماہواری بلیٹن۔
۳۔ پہلی قومی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ۔
۴۔ قومی یونیورسٹیاں اور ان کے حالات کی تحقیقی رپورٹ ۱۹۲۶ء
۵۔ کنڈرگارٹن کا معیاری نصاب
۶۔ جونیر مڈل اسکولوں کا معیاری نصاب۔
۷۔ سینیر مڈل اسکولوں کا معیاری نصاب (دو حصے)
۸۔ چینی تعلیم کی غایت اور اس کا پروگرام۔
۹۔ محکمہ تعلیم کے تعلیمی قوانین اور دستورالعمل۔

ادبیات ایران در دورۂ جدید

ہم پروفیسر محمد حبیب صاحب کے دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں یہ مضمون جو وہ ایران کی ہم سے مال غنیمت کے طور پر لائے ہیں اشاعت کے لئے عطا کیا۔ پروفیسر صاحب مضمون نگار سے تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں "آغا سعید نفیسی صاحب، طہران کے مدرسۂ عالی میں فارسی کے پروفیسر ہیں یہ ایران کے ممتاز ارباب علم و فضل میں سے ہیں مجھے طہران کے قیام میں بارہا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں ان کی وسعت قلب اور وسعت نظر کا قائل ہوگیا۔ یہ اور ایرانیوں کی طرح نہیں جو ہندوستان کی فارسی ادب کی خدمات کو قابل التفات نہیں سمجھتے بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں کی فارسی تصانیف کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور خسرو سے لے کر غالب تک جتنے مستند فارسی شاعر ہمارے یہاں گزرے ہیں ان سب کے کلام پر انھیں عبور حاصل ہے۔ بڑی خوشی ہوتی ہے جب ایک دور دراز ملک میں کوئی نقاد مل جاتا ہے جو ضیاء الدین برنی کے اسلوب بیان کی خوبیوں کو سمجھتا ہے اور ابوالفضل کے اسلوب کی خامیوں کے باوجود اس کے فضل و کمال کا قائل ہے۔ آغا نفیسی نے ایران کی تاریخ اور ادب پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک جید تصنیف رودکی کی شاعری پر تین جلدوں میں ہے اور ایران میں اس قدر مقبول ہے کہ کسی تعلیم یافتہ شخص کا کتب خانہ اس سے خالی نہیں یہ مختصر مضمون فارسی ادب کی نشو و نما کے متعلق آغا نفیسی نے میری درخواست پر لکھا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ مسلم یونیورسٹی جرنل میں شائع کیا جائے۔"

دورۂ جدید ادبیات ایران، تقریباً از اوائل قرن چہاردہم ہجری آغاز می کند، و اینک نزدیک پنجاہ سال از آن گزشتہ است۔ نزدیکی ایران با روپا، روابط دائمی کہ درمیان ایران و ممالک اروپا

پدیدار شد نهضتی در ادبیات ایران بوجود آورد، که دنباله آن تا این ایام پیوسته است، و هنوز در
راه تکامل و ترقیست. پس از برقراری سلطنت مغول در ایران، و پس از آنکه دشمنی در میان مسلمانان
و عیسویان که در جنگهای صلیبی بمنتهای شدت رسیده بود، از میان رفت، و بصلح و آسایش بدل
شد. و بیشتر بواسطه آنکه، پادشاهان مغول ایران صلح جو و معتقد بآزادی مذاهب بودند، سیاحان
و تجار اروپائی مخصوصاً از زمان سلطنت الجایتو سلطان محمد خربنده، بایران و ممالک مشرق آمدند، و
راه تجارت آسیا باز شد، و چون صفویه بپادشاهی ایران رسیدند، و رقابت بسیار شدیدی در میان
دربار ایران و دولت عثمانی بار شد. چون همواره در میان دولت عثمانی و دول اروپا مخاصمات بود
و دولت ایران در صدد برآمد، که از این دشمنی بهره مند شود بهمین جهت طرح دوستی با دول اروپا انداخت
و گاهی پادشاهان اروپا را بجنگ با عثمانیان تحریک می کرد. و در ضمن چون تجارت ایران در
زمان صفویه ترقی بسیار کرده بود، روابط سیاسی و تجارتی در میان ایران و اروپا بمنتهای کمال
رسید. پس از آنکه انگلیس هندوستان را متصرف شد، ایران در نظر انگلستان حائز اهمیت گشت
و در ضمن دول اروپا که، در آسیا با انگلستان رقابت می کردند، ایران را یکی از عوامل مهم
پیشرفت مقاصد خود شمردند. و در اوائل قرن دوازدهم هجری دربار ایران دائماً عرصهٔ کشمکش
منافع دول اروپا بود. و در این ضمن روسیه نیز آغاز کرد که بایالات شمال غربی ایران دست اندازی
کند و دولت ایران برای رهائی از خطر روسیه، گاهی بدولت فرانسه و گاهی بدولت انگلیس
متوسل می شد. و در ضمن در صدد برآمد که بوسیله علوم و تمدن جدید خود را نیرومند کند، و از خطر روسیه
رهائی یابد. بهمین جهت در زمان فتحعلی شاه و بیشتر بکوشش عباس میرزا نایب السلطنت قدمی چند
بسوی تمدن اروپائی از قبیل جلب صاحب منصبان نظامی از فرانسه و انگلستان و اطبا و صنعتگران
و معلمین برآمدند و بعضی صنایع جدید را مانند ساختن اسلحه و مطبع وغیره اخذ کردند. و در ضمن چند نفر
جوان ایرانی را برای تحصیل بانگلستان فرستادند، و زبانهای اروپائی مخصوصاً زبان فرانسه در ایران رواج گرفت.
چندی نگذشت که ایرانیان با ادبیات اروپائی پی بردند و بلافاصله بترجمه کردن از زبانهای

اروپا خصوصاً زبان فرانسه، آغاز نهادند۔ و از زمان محمد شاه ادبیات اروپا در ایران معروف شد۔
ولی اوج این نهضت در زمان ناصرالدین شاه و در اواخر قرن سیزدهم هجری بود که در ایران مدارس
جدید یک اروپائی افتتاح کردند و معلمین بسیار برائے تدریس در آں مدارس اجیر کردند و عده
کثیر جوانان ایرانی را برائے اخذ علوم جدید باروپا فرستادند۔ و تالیفات در سبک اروپائی آغاز
کردند۔ از طرف دیگر در زمان سلطنت طولانی ناصرالدین شاه، چوں آرامش و صلح در ایران برقرار
بود، ادبیات فارسی که در دورۂ انقلاب و اغتشاش تنزل کرده بود، دوباره پیش رفت کرد
و شعرا و نویسندگان بسیار پدیدار شدند۔ بزرگان شعرائے ایں عصر مانند قاآنی و محمود خاں ملک الشعرا
و درویش اصفهانی و فتح الله خاں شیبانی، تجددی در شعر فارسی پیش آوردند، و سبک اسلوب شعرائے
قرن پنجم و ششم را دوباره در ایران زنده کردند۔ در نثر فارسی اصلاحات بسیار پیش آمد۔ و
در نتیجۂ وقوف از ادبیات اروپا اذہان نویسندگان بزرگ متوجه آں شد که نثر را از استعارات
و کنایات و تشبیهات و صنائع لفظی و معنوی و تعقیدات و تکرارهائے مخل، پاک کنند و بیشتر و به بلاغت
و ایجاز و اختصار بکوشند همیں جهت نثر فارسی در نتیجه، مساعی نویسندگان معروف آں دوره مانند محمد حسن
خاں اعتماد السلطنت و حسن علی خاں امیر نظام، و حاج میرزا علی خاں امین الدوله در راه سادگی و ایجاز
وارد شد۔ اعتماد السلطنت مدتهائے مدید چند روزنامه در طهران انتشار داد، و سبک اسلوب روزنامه
نویسی را در زبان فارسی ایجاد کرد۔ از طرف دیگر جمعے از ایرانیان که در ممالک اسلامی مجاور اروپا
زندگی کردند و بحکومت آزادی خواه و مشروطه اروپا پے بردند در مصر و قفقاز و عثمانی نهضتے تولید
کردند، و بنای تبلیغات را برضد حکومت استبدادی ایران گذاشتند و جرائد و رسائل و کتب
دریں باب نشر دادند۔ و در تمام آں نشریات بزبان فارسی بسیار ساده چیزی می نوشتند و یک سلسله
آثار معتبر مانند روزنامه اختر در مصر و روزنامه ثریا در استانبول و آثار میرزا ملکم خاں و سید جمال الدین
اسد آبادی و کتاب سفرنامه ابراهیم بیگ تالیف حاج زین العابدین مراغه ای و رسائل میرزا یوسف
خاں مستشار الدوله، و تالیفات میرزا عبدالرحیم طالبوف و آثار میرزا آقا خاں کرمانی در خارج ایران

منتشر شده بود توجه طبقهٔ تحصیل کردهٔ ایران را جلب کرد. از طرف دیگر در داخلهٔ ایران عده‌ای توجهی کامله
مردم بخواندن آثار ادبیات اروپائیان داده بودند، جمعی از مترجمین قابل مانند محمد طاهر میرزا و
دکتر محمد خان کرمانشاهی، و میرزا محمد حسین فروغی و محمد حسن خان اعتماد السلطنت، بترجمه بعضی از
داستانها و روایات اروپائی آغاز کردند ذوق داستان سرائی نیز در ایران ریشه گرفت. همچنین
نمایش و تمثیل در ایران شروع شد. و محمد حسن خان اعتماد السلطنت بعضی از تمثیلات زبان فرانسه را
بفارسی ترجمه کرد و در طهران آنرا نمائش دادند. و مخصوصاً ترجمهٔ تمثیلات میرزا فتح علی اخوند نویسندهٔ
معروف قفقازی، که بتوسط میرزا جعفر قراجه داغی از ترکی بفارسی ترجمه شد، توجه عموم ایرانیان را
جلب کرد و موضوع ترجمه از زبانهای اروپائی بدرجه‌ای در ایران رواج یافت که در بار
طهران ادارهٔ مخصوصی باسم دار الترجمهٔ سلطنتی تاسیس کردند و از زبانهای فرانسه و انگلیسی و روسی
و المانی و حتی عربی و ترکی دارد و کتب و رسائل و مقالات و جرائد را بفارسی ترجمه می‌کردند، و در
وزارت مخصوصی باسم وزارت انطباعات تاسیس کردند و دار الطباعهٔ دولتی دائماً مشغول طبع و
نشر کتب و جرائد بود و مخصوصاً مجلدات نامهٔ دانشوران، که تراجم احوال بزرگان مشرق زمین
بود و در هشت جلد بتوسط یک عده از معاریف دانشمندان آن عصر مانند شمس العلماء عبد الرب
آبادی و میرزا عبد الوهاب قزوینی و میرزا ابو الفضل ساوجی تالیف شده، و مجلدات بسیار از کتب
تاریخ و جغرافیا تالیف اعتماد السلطنت در آن دوره بطبع رسیده است. از طرف دیگر رضا قلی خان
هدایت امیر الشعراء به تحقیقات و تالیفات ادبی و در تراجم احوال شعرائے ایران و تالیف کتب ادب
و لغت و تاریخ مشغول بود و بعضی از وزرا مانند علی قلی میرزا اعتضاد السلطنت وزیر علوم آن زمان تمام
اوقات خود را در ترویج ادبیات می‌گزارند. در سلطنت یازده ساله مظفر الدین شاه دنبالهٔ این نهضت
کشیده شد و مخصوصاً تشویقات بسیار. حاج میرزا علی خان امین الدوله صدر اعظم باعث شد که
عده مدارس جدیده در ایران چندین برابر گشت. و در این دوره همواره معلمین اروپائی برای علوم
جدید در طهران بوده اند و روزنامهٔ تربیت که بتوسط میرزا محمد حسین فروغی اصفهانی ذکاء الملک

انتشار می یافت یکے از بهترین یادگارہائے آں عصرست۔ از ۱۳۲۴ بعد کہ آغاز مشروطیت بنیاد بواسطۂ آزادی کامل کہ بجراید و مطبوعات ایران دادہ شد این نهضت ادبی جنبۂ وطنی بسیار قوی بخود گرفت و احساسات وطن پرستی در نظم و نثر فارسی وارد شد و شعرا نیز بہ سرودن مضامین ادبی پرداختند از آں جملہ میرزا صادق خاں ادیب الممالک و ملک الشعرا بہار و سید اشرف الدین مدیر روزنامۂ نسیم شمال و عارف قزوینی کہ در موسیقی جدید ایران تصنیف ہائے وطنی شرف دارد، و ایرج و۔ آزادی خواہان آں زمان آثار عمدہ از خود گذاشتہ اند۔ دریں دورہ عدہ جراید آزادی خواہ در طہران و سایر شہرہائے ایران بسیار بود و جرائد معروف مانند صور اسرافیل و حبل المتین یادگار آں عصرست۔ در میان روزنامہ نویسان میرزا علی اکبر خاں دہخدا رفیع ترین مقام دارد و قسمت ہائے مضحک و ہزل آمیزش کہ بعنوان "چرند و پرند" در صور اسرافیل منتشر می شد، و مقالات سیاسی و وطنی او در منتہائے خوبیست در اشعار احساساتی شعرائے بزرگ ایں عصر مانند شعرائے دورۂ ناصر الدین شاہ ہموارہ در احیائے سبک شعرائے قرن پنجم و ششم ایران کوشیدہ اند و معاریف ایشاں سید احمد ادیب پیشاوری و میرزا عبدالجواد ادیب نیشاپوری و شوریدۂ شیرازی بودہ اند، ازیں میاں حفظ ایرج میرزا جلال الممالک بزبان امروز ایران سخن گفتہ است۔ نویسندگان بزرگ ایں عصر سید ضیاء الدین طباطبائی در روزنامۂ رعد و میرزا علی خاں دشتی در روزنامۂ شفق سرخ از حیث روزنامہ نویسان و میر محمد خاں حجازی و سید محمد علی جمال زادہ از حیث نویسندگان داستانہا و روایات و میرزا یوسف خاں اعتصامی و میرزا نصر اللہ خاں فلسفی و میرزا محمد علی خاں فروغی از حیث مترجمین بشمار می آیند۔ شعبۂ دیگری کہ در ادبیات جدید ایران بمنتہائے کمال خود رسیدہ تحقیقات تاریخی و ادبی باسلوب جدیدست کہ می تواں گفت ذوق ایرانی دریں قسمت از ادبیات بیش از ہر فن دیگر ترقی کردہ و امروز در ایران تحقیقات ادبی و تاریخی باوج کمال خود رسیدہ است و ازیں حیث ایران با تمام ممالک متمدن امروز برابری می کند و حتی بر تمام ملل شرق برتری دارد و محققین درجۂ اول مانند میرزا محمد خاں قزوینی و میرزا

عباس خاں اقبال و رشید یاسمی در ایران ہستند کہ در نوع خود فریدند و تاکنوں در ایران از حیث وقت در مآخذ و توضیح مطالب نظیر نداشتہ اند۔

غزل

از حضرت اصغرؔ گونڈوی

(یہ غزل حضرت اصغرؔ نے ہمارے یہاں یوم تاسیس کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔)

پردۂ فطرت میں میرے اک نوائے راز ہے — ذرہ ذرہ اس جہاں کا گوش بر آواز ہے
خستگی اک مصلحت افتادگی اک راز ہے — خاک کی جبریل سے بڑھ کر کہیں پرواز ہے
وہ سراپا حسن ہے یا نغمۂ بے ساز ہے — چشم حسرت ہے کہ اک فریادِ بے آواز ہے
ہے خرد کی عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر — یہ شہید نغمہ ہے وہ مبتلائے ساز ہے
ایک ذوقِ دیدِ پیہم، اک تماشائے دوام — اب نہ کچھ انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے
تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریب رنگ و بو — یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے
گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا — یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے
بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا — اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے
کیف و مستی کی حقیقت ایک مینائے تہی — نغمہ بھی اس بزم میں ٹوٹا ہوا اک ساز ہے
عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید — میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے
سننے والا گوشِ بلبل کے سوا کوئی نہیں — ریشہ ریشہ ان گلوں کا اک صدائے راز ہے
کیا تماشا ہے کہ سب ہیں اور پھر کوئی نہیں — اس کی بزمِ ناز بھی خلوت سرائے راز ہے

ختم کر اصغرؔ یہ آشفتہ نوائی ختم کر
کون سنتا ہے اسے یہ دور کی آواز ہے

دنیا کی رفتار

ہندوستان

اسمبلی کی کامیابی | اسمبلی کا خاص اجلاس جو بارہ نومبر دہلی میں منعقد ہوا تھا اس لحاظ سے بہت کامیاب رہا کہ منتخب شدہ نمائندوں نے میزانیہ کے مسئلہ پر اپنی آزادی رائے کا ثبوت دیا۔ حکومت کی یہ کوشش تھی کہ میزانیہ کا مسودہ قانون جس صورت میں پیش کیا گیا تھا بلا کسی ترمیم یا تبدیلی کے سولہ ماہ کے لئے منظور ہو جائے، اسمبلی کے منتخب اراکین نے پوری رد و قدح کے بعد مجوزہ میزانیہ میں کئی ترمیمات کیں اور میزانیہ کو سولہ ماہ کے لئے منظور کرنے سے بھی انکار کیا۔ جب اصل مسودہ قانون کے منظور ہونے کی کوئی صورت حکومت نظر نہ آئی تو بالآخر ہز اکسلنسی وائسرائے نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو دعوت مشاورت دی اور اپنے تمام اثرات سے کام لیا، بہت کچھ سمجھایا بجھایا مگر یہ بھی بے اثر ثابت ہوا، بالآخر ہندوستان کے مفاد کے لئے، وائسرائے کو اختیارات خصوصی استعمال کرنا پڑے، اصل مسودہ قانون کی تصدیق کر دی گئی اور اس کا عملدرآمد یکم دسمبر سے شروع ہو گیا۔

لیکن یہ کوئی غیر متوقع کارروائی نہ تھی! جس وقت یہ میزانیہ پیش ہوا تھا اس وقت یہ معلوم تھا کہ دسمبر کی پہلی تاریخ سے اس کا نفاذ ہو جائے گا خواہ اسمبلی اس کو منظور کرے یا خود وائسرائے کو اس کی "تصدیق" کا "ناگوار" فرض انجام دینا پڑے۔ البتہ موجودہ اسمبلی سے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ گورنمنٹ کے مجوزہ میزانیہ کی مخالفت شدت سے کر سکے گی پھر خاص طور پر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مجوزہ میزانیہ جن لوگوں کی کوشش سے اسمبلی نے

نامنظور کیا ان میں زیادہ تر وہی وفادارانِ حکومت ہیں جو بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور ان کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے خطابات لگائے جاتے ہیں، سوراج پارٹی کے ہنگامہ پرور اراکین میں سے اب ایک دو بھی بمشکل اسمبلی کی پچھلی کرسیوں پر نظر آتے ہیں۔ نیشنلسٹ پارٹی کی نمایاں شخصیتیں بھی اب نہیں رہیں لیکن اس کے باوجود میزانیہ کے ایسے مسئلے پر حکومت کو شکست کھانا پڑی، اس سے البتہ ہوا کا رُخ معلوم ہوتا ہے۔

منتخب اراکین اسمبلی کی متفقہ رائے معلوم ہوجانے کے بعد حکومت نے جو کارروائی کی ہے اس سے اُن تحفظات کے متعلق جو آئندہ دستور اساسی کے لئے تجویز کئے گئے ہیں قوم کے شکوک و شبہات اور زیادہ قوی ہوجائیں گے، ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کا مسودہ قانون جب مرتب کیا جارہا تھا تو وائسرائے کے اختیارات خصوصی کی تمام دفعات محض تحفظات، ہی کی مد میں رکھی گئی تھیں، لیکن ان اختیارات کا استعمال برابر جس طرح کیا گیا وہ دنیا کو معلوم ہے۔ برطانوی وزارت کے پے درپے اعلانات کے بعد نیک نیتی کا ثبوت دینے کا یہ گرانقدر موقعہ حکومت کو ملا تھا، اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا، میزانیہ کے معاملے میں قوم کے "وفادار" نمائندوں کی متفقہ رائے کو ہرگز اس طرح نہ ٹھکرایا جاتا۔

بنگال آرڈیننس | یہ اس سال کا گیارھواں آرڈیننس ہے جو گورنر جنرل و ائسرائے ہند نے نافذ کیاہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ صوبہ بنگال میں انقلاب پسند جماعت کی تشدد آمیز کارروائیوں کو روکا جائے، متذکرہ بالا آرڈیننس کی کل دفعات کا یہاں نقل کرنا بے کار ہے لیکن اس کا ایک مجمل خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آرڈیننس کے ماتحت مخصوص عدالتہائے فوجداری قائم کی جائیں گی اور ان کو سرسری طور پر انفصال مقدمہ کا اختیار حاصل ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حق ہوگا کہ وہ جس فوجداری مقدمہ

کو چاہے عدالت خاص کے سپرد کر دے ۔ اقدام قتل کی سزا بھی وہی قرار دی گئی ہے جو قتل کے لئے ہے یعنی پھانسی یا عبور دریائے شور ۔ لوکل گورنمنٹ جب چاہے کسی کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد کو سرکاری کاموں کے لئے جبرا لے سکتی ہے اور خالی کرا سکتی ہے ۔ پولیس کو وسیع اختیارات حاصل ہوں گے کہ جس مرد عورت، بوڑھے بچے کو جہاں چاہے محض شبہہ کی بنا پر روک لے یا گرفتار کر لے، تمام سرکاری ملازمین اور اسکولوں اور کالجوں کے طلبا اور اساتذہ، زمیندار یا اور کسی شخص کی خدمات کی اگر ضرورت سمجھی جائے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جس وقت چاہے ان کو طلب کر سکتا ہے ۔ مختلف قسم کی سواریوں کی آمد و رفت پر قیود و پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں، یا اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاہے تو کسی سواری کو سرکار میں داخل کرنے کا حکم دے سکتا ہے کسی سرکاری عمارت میں یا کسی ریلوے عمارت یا کسی اور عمارت میں کسی شخص کے داخلے کی ممانعت کی جا سکتی ہے ۔ خانہ تلاشیوں کے لئے اور زیادہ وسیع اختیارات پولیس کو دیئے گئے ہیں ۔ مختلف قسم کے اسلحہ کے لائسنس کی ضبطی اور ان کی خرید و فروخت روکنے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مزید اختیارات حاصل ہوں گے، لوکل گورنمنٹ کسی گاؤں یا کسی اور حلقے کے باشندوں پر مجموعی حیثیت سے جرمانہ کر سکتی ہے جس کی تحصیل وصول لگان یا مالگذاری کی طرح ہو گی ۔ عدالت خاص کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو گی ۔

یہ اور اسی قسم اور دفعات جدید آرڈیننس میں شامل ہیں، صوبہ بنگال میں عملاً قانون فوجداری اور قانون شہادت دونوں کو بالکل منسوخ کر دیا گیا ہے ۔ ہر قسم کی شخصی آزادی سلب ہو گئی ہے شخصی جائداد اور شخصی دولت کی بھی کوئی حیثیت قانون کی نظر میں نہیں

حکومت کی یہ سراسیمگی اور دہشت کہاں تک حق بجانب ہے؟ اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ جدید آرڈیننس کلکتہ کی یورپین آبادی کے اختلاج قلب کو دور کرنے کے لئے ایک نسخہ تجویز کیا گیا ہے ۔ ورنہ کیا موجودہ قانون انقلاب پسندوں کی

سازشی کارروائیوں کو روکنے کے لئے کافی نہ تھا۔

تشدد آمیز کارروائیاں چاہے وہ حصول آزادی کے لئے کیوں نہ کی گئی ہوں مگر ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے آج تک اس کی حمایت نہیں کی اور نہ ان جانبازوں کے ساتھ کوئی ہمدردی ظاہر کی جو سولی پر لٹکائے گئے اور گولیوں کا نشانہ بنے۔ بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت نے ان کارروائیوں کی ہمیشہ مذمت کی اور حصول آزادی کی راہ میں اس کو ایک رکاوٹ قرار دیا۔ یہی ایک معاملہ ایسا ہے کہ جس میں کانگرس نے حکومت کے ساتھ تعاون کیا اور اخلاقی امداد بھی کی، لیکن اس کے باوجود اگر آج ملک میں ہر طرف سے اس آرڈیننس کی مخالفت کی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محض سازشیوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے ایک پورے صوبے پر ناقابل برداشت مصیبت نازل کی گئی ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہاں اندیشہ ہے کہ گھن کی وجہ سے گیہوں پس جائینگے بہرحال انقلاب پسند جماعت یہی چاہتی تھی اور اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ سازشیں ہمیشہ بے اعتمادی بےچینی اور دہشت وسراسیمگی کی فضا میں پرورش پاتی ہیں، یہ فضا بنگال میں خود حکومت نے پیدا کردی۔

ہندوستان میں فوجی تعلیم کا انتظام | گول میز کانفرنس کی سب کمیٹی نمبر ۷ (متعلق حفاظت) نے ماہران کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس میں سر سوامی آئر، میجر جنرل راجوادی، سر عبدالرحیم اور ڈاکٹر مونجے وغیرہ شامل تھے، کمانڈر انچیف اس کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ ہندوستان کی افواج کو جلد از جلد مکمل طور پر ہندوستانی افسروں کے ماتحت لانے کے لئے انگلستان کے فوجی کالج سینڈہرسٹ کے نمونے پر ہندوستان میں ایک فوجی کالج کے قیام کی اسکیم تیار کرے۔ کمیٹی نے متعدد اجلاس ہندوستان میں منعقد کئے۔ ابتدا ہی میں کمانڈر انچیف اور دیگر غیر سرکاری ارکان

کمیٹی میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ کمیٹی صرف کالج کے لئے ایک اسکیم تیار کرے یا ہندوستانی افواج کو جلد از جلد ہندوستانی بنانے کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کرے، اس اختلاف کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں تھیں بالآخر اس بات پر سمجھوتہ ہوا کہ جو اراکین آخر الذکر مسئلہ پر اظہار رائے کرنا چاہتے ہیں ان کی رائیں اصل رپورٹ میں داخل نہ کی جائیں بلکہ بطور ضمیمہ کے رپورٹ کے ساتھ شامل کر دی جائیں۔ چنانچہ کمیٹی کی اصل رپورٹ کل ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ باقی ۷۰ صفحات میں غیر سرکاری اراکین کے اختلافی نوٹ ہیں جس سے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ سر سواسوامی آئر، اور سر عبدالرحیم کے ایسے قانون داں ارکان کی یہ رائے ہو کہ کمانڈر انچیف نے سب کمیٹی کی قرارداد کی غلط تاویل کر کے کمیٹی کے اختیارات کو بالکل محدود کر دیا۔ اور یہ ایسا بنیادی اختلاف تھا جس کی وجہ سے مذکورہ کمیٹی کی سفارشات کی وہ اہمیت نہیں باقی رہتی جو دوسری صورت میں ہونا چاہئے تھی۔

جہاں تک کالج کی اسکیم کا تعلق ہے کمیٹی نے تقریباً متفقہ طور پر سفارش کی ہے کہ ۱۹۳۳ء کے آخر تک ستارہ یا مئو یا ڈیرہ دون میں ایک کالج سینڈ ہرسٹ کے نمونہ پر قائم کیا جائے۔ اکثریت ڈیرہ دون کے حق میں ہے، طلبہ کی کل تعداد ۶۰ ہو، اس میں سے ۲۰ طلبہ دیسی ریاستوں سے لئے جائیں، تیس فوجی ملازمین میں سے اور بقیہ تیس طلبہ کے لئے مقابلہ کا امتحان ہو اور اعلیٰ کامیابی کے اعتبار سے بالترتیب ۲۴ طلبہ اس میں سے داخل کئے جائیں باقی ۶ امیدواروں کو کمانڈر انچیف کامیاب طلبہ کی فہرست میں سے خود بلا شرکت غیرے منتخب کیا کریں، لیکن حق اولیٰ ترجیح اُن امیدواروں کو دی جائے جو ٹیریٹوریل یا آگزیلری Auxiliary فوج میں کام کر چکے ہوں۔ مقابلہ کا امتحان پبلک سروس کمیشن کی نگرانی میں ہو، داخلہ کے پہلے سال کے ختم پر ایک امتحان کالج میں لیا جائے اور جو طلبہ فوجی تعلیم کے لئے موزوں ثابت ہوں اور اگر اس راہ کو اپنے لئے پسند بھی کریں تو ان کے والدین یا سرپرستوں سے ایک عہدنامہ لکھایا جائے کہ بعد پانچ سال تک ان کا لڑکا فوج میں خدمت کرے گا۔ طلبہ کو نجی طور پر ملازم رکھنے کی اجازت

نہ ہو، مدت تعلیم تین سال ہو اور تین سال کے کل مصارف ۴ ہزار ۴ سو روپیہ سے زیادہ نہ ہوں لیکن ڈاکٹر مونجے کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں پچہتر روپیہ ماہوار سے کسی صورت میں زیادہ نہ ہونے چاہئیں۔ جن طلبہ کے باپ دادا فوج میں ملازم ہیں یا رہ چکے ہیں۔ ان کی فیسوں میں رعائت کی جائے۔ دیسی ریاستوں کے امیدواروں کے لئے بھی امتحان داخلہ ہو اور معیار قابلیت وہی ہو جو برطانوی ہند کے امیدواروں کے لئے مقرر کیا جائے۔

ہوائی فوج کے لئے جب تک افسروں کی اتنی بڑی تعداد کی ضرورت نہ ہو کہ ان کے لئے ایک نئے مدرسے کے مصارف برداشت کرنا ضروری ہو جائے اس وقت تک ہندوستانی امیدواروں کو کرانوال میں دو سال کی تعلیم کے لئے انگلستان ہی بھیجا جائے۔

توپ خانہ، سگنل اور انجینیری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی ہندوستان میں انتظام کیا جائے تمام نوجوان ہندوستانی افسروں کو ہندوستانی سپاہ کی کمان دینے سے قبل کم از کم ایک سال تک برطانوی فوج میں کام کرنے کا موقعہ دینا چاہئے۔

قضیۂ کشمیر | کشمیر کے معاملے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی ہے کہ تمام ملک کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے، ایک عرصے سے رعایا کی شکایات حکومت کشمیر کے خلاف روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ جب داد فریاد سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بالآخر رعایا پُر امن مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ حکومت اس قسم کی گستاخی کو کب برداشت کر سکتی تھی، لاٹھیاں چلیں، گولیاں چلیں، جنازے نکلے، ہڑتالیں ہوئیں اور ریاست کے اندر اور باہر آس پاس کے علاقوں میں ایک آگ لگ گئی، پھر حکومت کو ہوش آیا اور اس آگ کو بجھانے کے لئے تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، معافیاں دی گئیں، حقوق اور مراعات کا اعلان کیا گیا۔ مگر اب تیر ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ۲۵ ہزار سے زیادہ گرفتاریاں اس وقت تک عمل میں آچکی ہیں، اور سول نافرمانی برابر جاری ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ حکومت ہند نے بھی ریاست کشمیر کی ہمدردی میں ایک آرڈیننس نافذ کر دیا جس

سے برطانوی ہند میں کشمیریوں کے ساتھ ہمدردی کی تحریک بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب تک جتنی گرفتاریاں ہوئی ہیں اس میں زیادہ تر اہل پنجاب ہیں لیکن اب پنجاب اور کشمیر کے رشتے سے دہلی اور صوبہ متحدہ میں بھی تحریک کشمیر کے ساتھ قومی ہمدردی پیدا ہو رہی ہے بلکہ دہلی سے دو جتھے اب تک جا چکے ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ رضاکار اور جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر حکومت بجائے کشمیر آرڈیننس نافذ کرنے کے وزراء کشمیر کو مشورہ دیتی کہ وہ بھی ایک گول میز کانفرنس کے ذریعے سے حقوق رعایا کا اہم مسئلہ طے کرنے کی کوشش کرے تو بہت بہتر نتائج نکلتے۔ ورنہ بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو جانے کے بعد سائمن کمیشن سے کیا نتیجہ نکلا تھا جو اب کشمیر میں گلانسی کمیشن اور مڈلٹن کمیٹی سے نکلے گا۔

برطانوی ہند کی عام بیداری کا اثر ناممکن تھا کہ پردیس کے علاقوں پر نہ پڑے جہاں رعایا کی حالت برطانوی ہند سے بھی زیادہ زبوں اور ابتر ہے، چنانچہ کشمیر کے نوجوانوں نے بھی آخر مجبور ہو کر اپنے قومی وجود کو باعزت طریقے پر قائم رکھنے کے لئے پُر امن جدوجہد شروع کی۔ اس جدوجہد میں انڈین نیشنل کانگریس کے اصول جنگ پیش نظر رکھے گئے اور طریق کار بھی وہی رکھا گیا جو گذشتہ سال کانگریس کے تجربہ عمل کامیاب ثابت ہوا تھا۔ جب ایک طرف کامیاب تجربے کے نمونے پر دوسرا تجربہ شروع کیا جا رہا تھا تو دوسری طرف اگر تدبر اور دانشمندی سے کام لیا جاتا تو ہرگز موجودہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

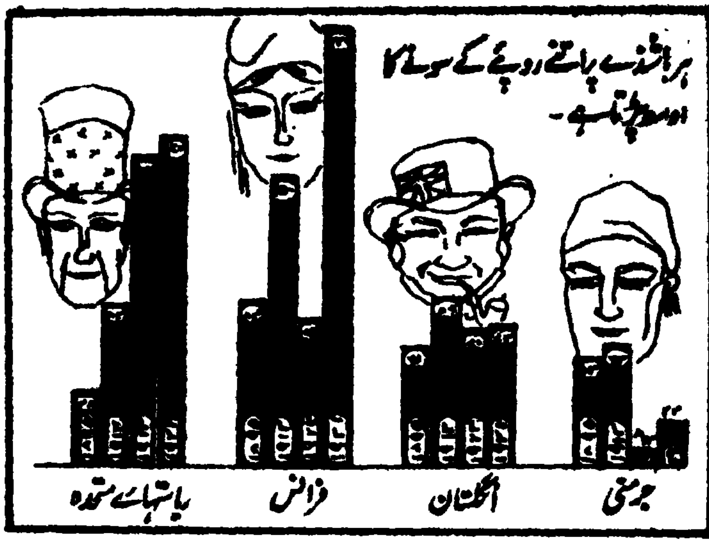
مجلس احرار پنجاب نے اپنے پڑوسیوں کی ہمدردی میں جو شاندار خدمت کی وہ حیرت انگیز ہے۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت جس میں ہندوستان بھر کے ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے پچیس ہزار سے زیادہ رضاکار میدان جنگ میں کام آئے۔ گذشتہ تحریک سول نافرمانی میں

بھی اتنی بڑی تعداد کسی ایک صوبے سے جیل خانے نہیں گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں صرف ہیتے سوا مہینے کے اندر صرف ایک صوبے نے جو ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا وہ ستیاگرہ کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک کے سلسلے میں اہل کشمیر اور ان کے ہمدردوں کو ابھی کیا کیا مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن غور طلب چیز یہ ہے کہ حکومت کشمیر اس تحریک کو دبا سکتی ہے؟ بظاہر اس کی کوئی توقع نہیں معلوم ہوتی۔ بالآخر وہی ہوگا جو گذشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا نتیجہ ہوا تھا۔ بلکہ بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت کشمیر اور حکومت دونوں کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع ہو گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تدبر اور دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جلد سے جلد کشمیری رعایا کے حقیقی نمائندوں اور جماعت احرار پنجاب سے گفتگو کر کے معاملے کو ختم کر دیا جائے۔ جہاں تک حکومت کے وقار اور رعب کا سوال ہے وہ تو خود حکومت کی ناعاقبت اندیشی سے خاک میں مل گیا۔ اب بھی اگر اس سے تعویق کی گئی تو پھر ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے اور ریاست کشمیر کی رعایا کے جائز حقوق اور مطالبات اصول حق و انصاف کے مطابق طے کرائے۔

ممالک غیر

دنیا میں سونے کی تقسیم | ایک گذشتہ اشاعت میں دنیا میں معاشی انتشار کے وجوہ بیان کرتے ہوئے سونے کی غیر مساوی تقسیم کا ذکر آیا تھا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، انگلستان اور جرمنی میں فی کس کتنا سونا ہے اور اس میں مختلف زمانوں میں کیا تغیر ہوا۔



مسئلہ منچوریا قضیہ منچوریا کے متعلق روز طرح طرح کی خبریں آرہی ہیں، کبھی جمہوریت کے قیام کی توقع ہوتی ہے، کبھی انجمن اقوام کی مداخلت سے معاملہ روبراہ آتا نظر آتا ہے، پھر مایوسی ہو جاتی ہے، کبھی جاپان دبتا ہے، کبھی اڑتا ہے، امریکہ اپنی دلچسپی اور تعلق خاص کا طرح طرح اظہار کرتا اور جاپان پر دباؤ ڈالتا ہے۔ ان خبروں کو سمجھنے میں غالبًا ذیل کی سطور سے مدد ملے گی۔

منچوریا کے معاملے سے دراصل چار قوموں کا گہرا تعلق ہے: چین، جاپان، روس اور امریکہ۔ منچو حکمراں خاندان کی ابتدا سے برابر منچوریا چین کا سیاسی جزو رہا ہے، لیکن گذشتہ صدی کے اواخر تک چینی لوگ منچوریا کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔ البتہ پچھلے ۳۰ برس میں کوئی ڈھائی کروڑ چینی اس ملک میں جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے جب سے چان سولین نے مکڈن میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی حکومت کی طرف سے بھی اس ملک کے لئے بہت کچھ کیا گیا ہے باوجود جاپان کی مخالفت کے چین نے وہاں ریل بھی بنائی ہے اور اس کا یہ مقصد ظاہر ہے کہ شمال سے جنوب تک ایک چینی ریل بنا لے جو خود اپنے بندرگاہ پر آکر ختم ہو۔ ظاہر ہے کہ چین اپنے کو منچوریا کا اصلی مالک اور اسے ترقی دے کر متمتع ہونے کا پہلا حقدار جانتا ہے۔

اُدھر جاپان اس علاقے میں خاص حیثیت کا طالب ہے، جاپان سمجھتا ہے کہ اس نے اس سرزمین پر اپنی تجارتی حوصلہ مندی ہی سے نہیں بلکہ خون بہا کر معاہدوں کے ذریعے اس مطالبے کا حق حاصل کیا ہے۔ ان معاہدوں کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے :-

۱۸۹۴ء میں جب جاپان نے چین پر فتح حاصل کی تو پورٹ آرتھر اور دائرن پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن روس کی مخالفت نے اسے اس انعام سے محروم رکھا۔ ستم بالائے ستم چین نے اُلٹے روس کو منچوریا میں بہت سے حقوق دے دیے۔ جاپان نے آٹھ سال بعد اس کا بدلہ لیا۔ روس کو شکست دینے کے بعد معاہدہ پورٹس متھ کی رو سے پورٹ آرتھر اور دائرن بھی جاپان کو ملے اور وہ تمام حقوق و مراعات بھی جو ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کے معاہدے کی رو سے روس کو ۲۵ برس کے لئے ملے تھے۔ اس کے علاوہ جاپان نے روس سے وہ ریل بھی حاصل کر لی جو جنوبی منچوری ریل کے نام سے مشہور ہے۔

روس اور جاپان میں معاملات کے اس طرح طے پا جانے کے بعد جاپان اور چین میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو معاہدہ ہوا۔ اس میں چین نے مذکورہ بالا روسی جاپانی قراردادوں کو تسلیم کیا، اور جاپان کو یہ حق بھی دیا گیا کہ ریل کی حفاظت کے لئے فی کیلومیٹر ۱۵ آدمی کے حساب سے سپاہی رکھ سکے۔ اس معاہدے کے ساتھ ساتھ ایک خفیہ قرارداد بھی ہوئی جس کی دفعہ ۳ کی رو سے چین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جنوبی منچوری ریلوے کو از روئے معاہدہ وقت مقررہ پر واپس پانے سے پہلے اس کے متوازی کوئی دوسری پٹری ڈالے یا ریل کی ایسی شاخیں کھولے جس سے جنوبی منچوری ریل کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو۔ جو حقوق روس اور جاپان کو ان معاہدوں سے حاصل ہوئے تھے وہ مدت معاہدہ ختم ہونے پر کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں جاپان نے جو ۲۱ مطالبات چین سے کئے اور اکثر بہ جبر منوائے ان میں ان معاہدوں کی مدت کو بھی بہت بڑھوا لیا گیا۔ اب جاپان کے پاس کوان تنگ علاقہ کا ٹھیکہ ۱۹۹۷ء تک کے لئے ہے، اور جنوبی منچوری ریل پر مراعات کی مدت ۲۰۰۲ء یا

ختم ہوئی ہے۔ ۲۲ سال کے بعد اس ریل کو واپس لینے کا جو حق چین کو حاصل تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ادھر جاپان کے حقوق بڑھ گئے ہیں۔ اسے جنوبی منچوریا میں زمین پٹہ پر دینے کا حق ہر تجارت، صنعت، زراعت کے کاموں کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کا حق ہے! جاپانیوں کو یہاں مستقل بود و باش کا حق ہے۔ بعض علاقوں میں کان کنی کا حق بھی انہیں ہی حاصل ہے۔ تمام دیوانی و فوجداری مقدمات میں جاپانی قنصل کو سماعت کے وقت موجودگی کا حق ہے۔ چین اگر جنوبی منچوریا میں کوئی پولیس کا قانون نافذ کرنا چاہے یا ٹکس کے متعلق کوئی قانون جس کا اثر جاپانی باشندوں پر پڑ سکتا ہو تو اس کا نفاذ بلا جاپانی قنصل کی منظوری کے نہیں ہو سکتا۔

اگر چین کوئی ریل بنائے اور خالص چینی سرمائے سے نہیں بلکہ پردیسی سرمائے سے بھی کام لینا پڑے تو پہلے جاپان کو حق ہے کہ قرض دے! اور یہی حال ہر اس قرض کا ہے جو منچوریا کے محاصل کی ضمانت پر چین لینا چاہے۔ کچھ ان معاہدوں نے جاپان کو ایک غیر معمولی حیثیت دیدی ہے، کچھ اس بات نے کہ منچوریا میں جاپانی خون بہہ چکا ہے وہاں کی فوج کا اس زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اور اگرچہ جاپانی مدبروں کی یہ خواہش کہ ان کے ملک کی آبادی میں ہر سال جو ۹ لاکھ آدمیوں کا اضافہ ہو رہا ہے اس کا ایک معتد بہ حصہ منچوریا میں جا بسے آب و ہوا کے اختلاف کے باعث پوری نہ ہو سکی لیکن پھر بھی کوئی ۲ لاکھ جاپانی تاجر، انجنیر، یا ملازم کی حیثیت سے وہاں آباد ہیں۔ ان کے علاوہ ۸ لاکھ کوریا والے جو جاپانی رعایا ہیں یہاں آ بسے ہیں جاپان کوئی دو ارب ین سے زیادہ اس ملک میں لگا چکا ہے۔ پھر جنوبی منچوریا میں کوئلہ، تیل، لوہا اور دوسری اجناس خام کی پیداوار بکثرت ہوتی اور ہو سکتی ہے جو جاپان جیسے صنعتی ملک کے لئے بڑی نعمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب معاہدوں کی رو سے جاپان کو یہاں تفوق حاصل ہو، اور اس ملک کی اہمیت جاپان کے لئے اس قدر ہو تو وہ اس پر اپنی گرفت سخت کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کرے گا۔

روس چاہتا ہے کہ بحر الکاہل تک چھوٹے سے چھوٹا راستہ اس کے قبضہ میں رہے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ چینی مشرقی ریلوے بالکل اس کے اثر سے نکل جائے۔ جاپانی چاہتے

ہیں کہ اس ریلوے کا سارا کام جنوبی منچوری ریلوے کی طرف منتقل ہو جائے۔ تاریخی وجوہ سے بھی جاپان اور روس میں رقابت موجود ہے۔ لیکن روس اس وقت جارحانہ رویہ نہیں لے سکتا۔ جاپان نے اپنی حیثیت اتنی مضبوط کر لی ہے کہ روس آسانی سے مقابلے کا خیال نہیں کرے گا۔ اس لئے غالباً اس ہنگامے میں صرف در پردہ چین کا ساتھ دے رہا ہے۔ ادھر جاپان بھی روس سے بگاڑنا نہیں چاہتا۔ اس کی نظر آج کے کمزور روس پر نہیں بلکہ ۴۰۔۵۰ سال بعد کے مضبوط روس پر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر روس کو منچوری لوٹ میں سے تھوڑا سا حصہ دے دیا جائے اور بحرالکاہل پہنچنے کے لئے راستہ سے تو وہ مطمئن رہے گا۔ جاپان اسے یہ اطمینان دینا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنی قوت بڑھا کر روسی مخالفت کے امکان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ نے کوئی پون صدی سے چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے ہیں۔ کچھ تو اس کا اثر ہے کہ امریکہ منچوریا کے معاملے میں چین کی طرف سے بولتا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے امریکہ جانتا ہے کہ منچوریا کے مستقبل پر مشرق بعید اور بحرالکاہل کے مسائل کا انحصار ہے۔ اگر جاپان نے یہاں اقتدار بڑھا لیا تو بحرالکاہل میں توازن قوت پر بہت اثر پڑے گا۔ منچوریا خود امریکی مصنوعات کے لئے بڑی منڈی بھی ہے اور اس کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ لہٰذا روسی جاپانی جنگ کے بعد سے برابر امریکہ یہی چاہتا ہے کہ منچوریا میں سیاسی حالات متغیر نہ ہوں، چین کا سیاسی تفوق باقی رہے اور تجارت، کان کنی وغیرہ کے لئے سب کو یکساں آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ واشنگٹن کانفرنس میں جو نو دول شریک تھیں ان سے استقلال چین کے اصول کو منوالیا گیا۔ جاپان کا یہ خیال کہ منچوریا میں اس کے مقابلے میں دوسری دول کو کچھ دخل نہ ہو۔ امریکہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جنگ عمومی کے بعد جب سائبیریا میں چکوسلاوی جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے نام سے مشترکہ یورش کی گئی تھی تو اس کے بعد امریکہ ہی نے جاپان کو شمالی منچوریا، مشرقی سائبیریا اور ولاڈی وسٹاک سے فوجیں ہٹانے پر مجبور کیا تھا۔ اور ان امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا جو جاپان نے اس مہم سے باندھ رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت امریکہ کے اس مسئلے میں دلچسپی

بعینہ جاپان کو بڑی تکلیف ہو اور وہ نہیں چاہتے کہ امریکہ اس معاملے میں بولے۔ ریاست میں کمزور فریق کی حیثیت مردہ لاش کی سی ہوتی ہے جس پر ہر طرف سے گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چین پر بھی جاپان، روس، امریکہ اور پوشیدہ طور پر اور بہتوں کی نظر بھی گدھ کی سی نظر ہے، اس وقت جاپان کا رویہ سب سے زیادہ جارحانہ ہے۔ اور ہر چند کہ چینی قومی حکومت کا صدر خود اپنی افواج کی قیادت کے لئے تل کھڑا ہوا ہے[1] لیکن فوجی معرکے میں کامیابی کی امید چین کے لئے بہت کم ہے۔ دوسرے دانشمندوں کے اثر سے ممکن ہے جاپان کے منصوبے پورے نہ ہونے پائیں۔ البتہ چین کے پاس بائیکاٹ کا حربہ ضرور ہے اور وہ اسے استعمال کر رہا ہے۔ چین جاپانی مال کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس لئے بمجبوری اس سامراجی حوصلہ مندی کا خمیازہ جاپانی معیشت کو اٹھانا ہوگا جو اس وقت کچھ بہت مضبوط حالت میں نہیں ہے۔

[1] اس نوٹ کے جانے کے بعد اطلاع آئی کہ صدر مستعفی ہوگیا!

عالم اسلامی

۱۔ **شؤون مصر** | گذشتہ انتخابات کے موقع پر جب انگلستان کی قدامت پسند جماعت نے "قومی حکومت" کے پردے میں پارلیمنٹ پر غلبہ حاصل کیا ہے تو خیال تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر مصر و برطانیہ کے تعلقات پر ضرور پڑے گا۔ مصر کے سیاسی حلقوں میں اس کا خاص طور سے چرچا تھا اگرچہ جریدہ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار کی رائے میں یہ سب کچھ مصریوں کو اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ حکومت برطانیہ کے پیش نظر شب و روز اگر کوئی معاملہ رہتا ہے تو وہ مصر کا ہے بہرحال دولت برطانیہ کو اصرار ہے کہ وہ مصر کے اندرونی معاملات سے مطلق تعرض کرنا نہیں چاہتی اور آج سے چند برس قبل اس نے مصری حکومت کے متعلق جو غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کیا تھا اس پر بدستور قائم ہے۔ بظاہر حالات یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن مصر کا اندرونی اضطراب دراصل اس بے اطمینانی کا نتیجہ ہے جو ابتدا ہی سے مصری برطانوی معاہدے

کی بدولت ہو گئی تھی اور جس کی موجودگی میں اہل مصر کبھی بھی وہ درجہ آزادی حاصل نہیں کر سکتے جس کے وہ آرزو مند ہیں۔ اس وقت حالات یہ ہیں کہ صدقی پاشا برسر حکومت ہیں اور ان کی جماعت تمام آزادانہ سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہے۔ حال ہی میں وفد (مصر کی انتہا پسند جماعت) نے تحریک استقلال اور سید عمر مختار مجاہد طرابلس کی شہادت کے متعلق دو جلسوں کا اعلان کیا تو حکومت مصر نے ان کو اس عذر کی بنا پر روک دیا کہ اس سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ زاغلول پاشا مرحوم کے مزار پر جو اجتماع ہوتا ہے۔ اس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ بایں ہمہ انگریزی اخبارات کو شکوہ ہے کہ اس موقعہ پر نحاس پاشا نے جو تقریر کی اس کا لب و لہجہ نہایت سخت تھا اور زعمائے وفد کی زبان و قلم سے دولت برطانیہ کے خلاف جو پروپیگنڈا جاری ہے وہ بالکل نامناسب ہے۔ ادھر جماعت وفد اور لبرل پارٹی جس کے لیڈر محمد پاشا محمود ہیں دونوں کی یہ خواہش ہے کہ مصری برطانوی معاہدے پر نظر ثانی کی جائے۔ لیکن ہنوز اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مصر کی داخلی مشکلات میں اس وقت سب سے پیچیدہ مسئلہ "معیار طلا" کا ہے۔ مصری پونڈ انگریزی پونڈ سے "وابستہ" ہے لہذا مصر و انگلستان کے لین دین میں "معیار طلا" کے ترک کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا لیکن انگلستان سے باہر دوسرے ممالک میں مصری پونڈ کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ اس سے ایک زبردست دقت کا سامنا ہو رہا ہے۔ علاوہ مصر کے اس قرضے کے جو اسے ممالک غیر کو ادا کرنا ہے۔ حکومت مصر کے غیر مصری ملازمین جن کا قیام اب یورپ کے کسی ملک میں ہے۔ شکایت کر رہے ہیں کہ چونکہ ان کی پنشن کی رقم مصری سکے میں دی جاتی ہے لہذا انہیں ۲۰ فیصدی کا خسارہ رہتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے کو "مخلوط عدالت" کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن جب سے یہ مخلوط عدالتیں قائم ہوئی ہیں (۱۸۷۵ء) ان کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ جس قوم کا معاملہ اس قسم کی کسی عدالت کے سامنے پیش ہو اس قوم

کے ناتستہ جج اس میں شریک نہیں ہوسکیں گے اور چونکہ یہ معاملہ ایسا ہے جس کا تعلق سبھی اقوام سے ہے لہذا اگر اس معاملے کو "مخلوط عدالتوں" میں پیش کیا گیا تو کوئی یورپین جج اس میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ بالفاظ دیگر یہ معاملہ صرف مصری ججوں کے سامنے پیش ہوگا۔ مگر دقت یہ ہے کہ قانوناً اس قسم کی کوئی عدالت جس میں مصری ججوں کی اکثریت ہو قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ معاملہ کسی طرح بھی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صورت حالات جس قدر پر لطف ہے اس کا اندازہ قارئین کرام بخوبی کرسکتے ہیں۔

سیاسیات سے باہر جس معاملے کو خصوصیت کے ساتھ اہمیت دی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوجوان مصری طبیب ڈاکٹر سرور نے جو جامعہ مصریہ کے شعبۂ طب میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک خاص انجکشن کے ذریعے "سرطان" کا علاج کرسکتے ہیں۔ اس مخصوص مرض کے اسباب اور طریق علاج کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کو قلمبند کرلیا ہے اور اب مغربی اطبا بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کا مطالعہ کررہے ہیں کیونکہ مرض سرطان کو یورپ میں لاعلاج تصور کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں عربی طب کے حامی ڈاکٹر سرور کے "اکتشاف" کو کس نظر سے دیکھیں اس لئے کہ سرطان کے علاج سے ان کا دماغ بھی عاری نہیں البتہ طب جدید وقدیم کے حامیوں کو ڈاکٹر سرور کے خیالات اور طریق علاج سے ضرور واقفیت پیدا کرنی چاہیئے۔

۲۔ اتحاد عراق وشام | کچھ عرصے سے یہ تجویز پیش کی جارہی ہے کہ عراق وشام میں ایک متحدہ حکومت قائم کردی جائے اور یہ اس لئے کہ برطانیہ اور فرانس دونوں حکومتوں نے جمعیت اقوام سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ عراق وشام کے حدود کا مسئلہ طے کردے۔ عراق وشام کی متحدہ حکومت کے لئے امیر فیصل کا نام لیا جارہا ہے۔ وحدت عربیہ کے اتحاد کے لئے جتنی بھی کوششیں کی جائیں مبارک ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تجویز کے پیچھے کونسا جذبہ کام کررہا ہے اور وہ کہاں تک واقعی اتحاد عرب کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں اگر سیاسیات شام کا ایک اجمالی خاکہ پیش کردیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اس وقت جمہوریہ شام فرانسیسی انتداب کے ماتحت ہے اور اس میں اسکندرون کی خود مختار سنجک، جمہوریہ لبنان جبل دروز اور عطاقیہ کی ریاست جو اس سے قبل "علوی ریاست" کے نام سے مشہور تھی شامل ہیں۔

جمہوریہ لبنان کا دستور مکمل ہے اور اس پر مدت سے عملدرآمد ہو رہا ہے لیکن جمہوریہ شام کا دستور جس کا اعلان ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا ابھی تک عمل میں نہیں آیا لہٰذا ان دونوں جمہوریتوں میں سے اگر کسی کو سب سے پہلے "ریاست" کا درجہ ملا تو وہ اول الذکر جمہوریہ ہوگی۔ فرانسیسی انتداب سے اس کا تعلق براہ راست ہے اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ لبنان کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے اس سلسلے میں یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ جمہوریہ لبنان کی حدود از سر نو متعین کر دی جائیں۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت طرابلس الشام، سدون اور بعلبیک کے اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ اضلاع جن کو ۱۹۲۰ء میں جمہوریہ لبنان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ جمہوریہ شام کو واپس کر دئے جائیں یا نہیں۔ ممکن ہے فرانسیسی حکومت کی یہ کارروائی مسلمانان شام کی تالیف قلوب میں مفید ثابت ہو۔ عیسائی بہرحال اس تجویز کے مخالف ہیں بلکہ ان کی رائے تو یہ ہے کہ بیروت کو جسے ایک طرح سے لبنان کا مرکز حکومت سمجھنا چاہئے کسی طرح بھی واپس نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسیات شام کی اس اجمالی کیفیت کے بعد اب اتحاد عراق و شام کے امکان پر پھر غور کرنا چاہئے۔ احرار شام کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ اصولاً ملوکیت کی حمایت کریں اس لئے کہ وہ ابتدا ہی سے جمہوری اصول حکومت کو اپنا عقیدہ قرار دے چکے ہیں۔ بایں ہمہ اگر شام کا تاج کسی عرب بادشاہ کو پیش کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے اس صورت میں احرار بھی اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ شامیوں کی یہ دیرینہ آرزو ہے کہ وہ دمشق میں از سر نو اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت کو زندہ کریں۔ خیال یہ ہے کہ جونہی عراق اور برطانیہ کا زمانۂ انتداب ختم ہو جائے امیر فیصل کو دعوت دی جائے کہ وہ شام کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں

ے لیں، امیر فیصل کو بھی در اصل شام ہی کی حکمرانی کی آرزو تھی اور بقول شامی وطنیین کے وہ
اہل شام کا نجات دہندہ بن کر ہی اس سرزمین میں آئے تھے (اس امر کی ذمہ داری
کہ واقعی اہل شام امیر فیصل کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں انگریزی ذرائع اطلاعات پر ہے)
البتہ یہ مسئلہ کہ اس صورت میں عراق کے تاج و تخت کا وارث کون ہوگا کوئی ایسا وقت طلب
نہیں۔ قرار داد یہ ہے کہ امیر علی (حجاز کا خانماں برباد امیر) جو امیر فیصل کے بھائی بھی ہیں
اور ان کی جگہ اکثر وکیل حکومت کے فرائض بھی انجام دیتے رہتے ہیں، اپنے بھائی کے جائز
وارث بن سکیں گے۔

یہ تمام تجاویز اور قرار دادیں بہرحال ابھی لوگوں کے ذہن میں ہیں جبکہ لبنان کو اس وقت
سب سے بڑی فکر اپنے اخراجات کم کرنے کی ہے اور فرانسیسی ہائی کمشنر نے ایک اعلان کے ذریعے
شام کی عارضی حکومت کے صدر کو معزول کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ انتخابات کا
زمانہ قریب آ رہا ہے اور حکومت یہ چاہتی ہے کہ ان میں انتہائی غیر جانبداری سے کام لے۔ ممکن
ہے وطن پسندان شام اب انتخابات کا مقاطعہ نہ کریں۔

۲۔ سیاسیات عرب | حکومت نجد و حجاز کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں۔ سلطان ابن سعود پٹرولیم
کا سارا ذخیرہ کام میں لا چکے ہیں۔ دلندیزی بینک سے قرضہ لینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس
میں ناکامی ہوئی اس لئے کہ حکومت نے جو ضمانتیں پیش کی ہیں ان سے بینک کا اطمینان نہیں
ہوا۔ اب سلطان اس کوشش میں ہیں کہ قاہرہ کے اس شامی حلقے سے جس نے کچھ مدت
ہوئی حکومت حجاز کے ساتھ ایک تجارتی بینک قائم کیا تھا مگر سلطان نے اس کی اجازت نہیں دی
حجاز و نجد کی مالی کمزوری کا ایک بہت بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حجاج کی تعداد میں باعتبار سابق
بہت کم رہ گئی ہے۔ محمل مصری کا قضیہ ابھی تک طے نہیں ہوا۔ انگریزی اخبارات یہ ظاہر کر رہے
ہیں کہ سلطان ابن سعود کی مالی دقتوں سے حکومت روس خصوصیت کے ساتھ فائدہ حاصل کرنے کی
کوشش میں ہے۔ جدہ میں جو روسی ایجنٹ مقیم ہے اس کے ذریعے بہت سا تجارتی لین دین

ہو رہا ہے اگرچہ روس کو اس کا خیال نہیں کہ اس میں فائدہ ہوگا یا نقصان ۔ اس کا مقصد صرف اسقدر ہے کہ حجاز میں بالشویک دعوت پھیلانے کا موقع مل جائے ۔

بہرکیف یہ امر یقینی ہے کہ اتحاد عرب کے دشمن ہر معمولی سی بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ گذشتہ ایام میں حکومت نجد و یمن کی باہمی کشاکش کو خاص طور سے اہمیت دی جا رہی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ دشمنان اسلام کی مساعی کارگر ثابت نہ ہوئیں ۔ یمن و نجد کے باہمی اتحاد اور دوستی کی ایک نئی صورت نکل آئی ہے جس کے لئے سلطان ابن سعود یقیناً مستحق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جبل عارسے دست برداری کا اعلان کر کے نفاق و شقاق کے ایک بہت بڑے سبب کا خاتمہ کر دیا ۔ ہمیں یقین ہے کہ ہر دردمند مسلمان جلالت الملک کے اس جذبہ ایثار کی تعریف کرے گا ۔

۴ ۔ انگورہ کے خارجی تعلقات | جنگ عظیم کے بعد اول اول اسلامی ممالک میں جو تحریک رونما ہوئی وہ نسلی عصبیت اور وطنی جذبے کا نتیجہ تھی ۔ اس کی وجہ کچھ تو وہ خیالات تھے جو مغربی اثر کی بدولت عرصے سے دنیائے اسلام میں سرایت کر رہے تھے لیکن حقیقی وجہ جو ان جذبات کا محرک ہوئی دراصل عالم اسلام کا وہ فرسودہ نظام سیاست ہے جس کو ہماری شریعت مقدسہ کی اصلی روح سے مطلق تعلق نہ تھا ۔ قاعدہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جب جذبات میں ہیجانی کیفیت رونما ہو نوجوان طبقہ اپنے خیالات و آرا کو غور و فکر سے قائم کرنے کے بجائے ہمیشہ عجلت سے کام لیتا ہے ۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہوئی اور بعض ممالک مثلاً ہندوستان و مصر میں اب تک ہے ۔ ہماری اس کوتہ اندیشی نے ہمیں صرف اس عظیم الشان سعادت ہی سے محروم نہیں رکھا کہ ہم اپنے دین مقدس کی تعلیمات کی غرض و غایت کا صحیح اندازہ کرتے بلکہ اس نے دشمنانِ اسلام کو بھی ہمارے خلاف ایک موثر حربہ بہم پہنچایا ہے ۔ اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح اسلام کی عمرانی روح اور اس کے نظام تمدن سے عدم واقفیت کی بدولت ہم نے اپنی انفرادی اور اجتماعی سیرت کی تشکیل نو میں ناقابل معافی غلطیاں کی ہیں ۔ بہرکیف ہماری ان غلط کاریوں کا ایک روشن

پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ دول اسلامی موجودہ اصول حکومت اور وطنیت و قومیت کے متعلق جو بھی روش اختیار کریں۔ اس تحریک نے تمام اقوام اسلام کے اندر آزادی اور جمہوریت کی تڑپ پیدا کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی وطنیت کا دارومدار کسی جغرافی احساس کو بنائے ملت قرار دینے پر نہیں تھا بلکہ اس کی غایت صرف یہ ہے کہ ہر اسلامی جماعت اپنے لئے ایک آزاد فضا پیدا کرے۔ چنانچہ جن جن مسلمان قوموں کو اس نعمت سے بہرہ مل چکا ہے اب ان کی نگاہیں اتحاد اسلامی کے اسی بلند پایہ اور پاکیزہ مقصد کی طرف اٹھ رہی ہے جس کو ہم اپنی کج روی یا ہمارے دوست نما دشمن بغض و تعصب کی بدولت مذہبی جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں حکومت انگورہ کے خارجی تعلقات خاص طور سے غور طلب ہیں۔ عالم اسلامی میں ترکوں ہی نے سب سے پہلے اسلام کی بجائے وطن کو بنائے ملت قرار دیا اور سیاسیین مغرب کی تقلید میں یہ اعلان کیا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ حکومت انگورہ کو اگرچہ ابھی تک اپنی اس "روشن خیالی" پر ناز ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ صرف ترک ہی نہیں بلکہ تمام مشرق کی نجات جدید تمدن کے اکتساب پر ہے لیکن ترکی ذہن کے اندر ہی اندر جو تحریکات موجزن ہیں ان کا غالباً انھیں خود بھی اندازہ نہیں۔ ترک کہتے ہیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سیاسیات کی دنیا میں کسی مذہبی تعصب سے کام لینا ایک جرم ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ترکوں کے مقاصد صرف ان کے آبائی وطن تک محدود ہیں۔ بایں ہمہ وہ تمام عالم اسلامی سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک حد تک انھیں اس کی بھی آرزو ہے کہ دنیائے اسلام میں ترکوں کو پھر وہی قدر و منزلت حاصل ہو جائے جس کا دولت عثمانیہ کو ادعا تھا۔ ترک کہتے ہیں کہ بیشک سیاسیات اور مذہب الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ہم مسلمان ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ممالک اسلامیہ کی حالت سے بے خبر رہیں۔ ضرور ہے کہ ہم اپنے اسلامی رشتہ اخوت سے فائدہ اٹھائیں۔ اتحاد اسلامی کے اس جدید احساس کا اظہار اول اول ترکوں کی ان کوششوں سے ہو رہا ہے جو وہ مصر و ترکی کی باہمی مودت و محبت کے لئے کر رہے ہیں۔ عام ترکوں کو

چھوڑ کر خود مسلمانوں میں وطنیت اور دنیوی سیاست کے بانی یعنی غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی یہ خواہش ہے کہ مصر و ترکی کے اتحاد و ارتباط کو جس طرح بھی ممکن ہو مستحکم بنایا جائے۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا جب امیر فیصل کا شوق سیاحت انہیں قسطنطنیہ لے آیا تھا لیکن اس کا مطلب بھی دراصل یہی تھا کہ وہ اسلامی سلطنتیں جو ایک دوسری کی ہمسایہ بھی ہیں، ایک دوسرے کی طرف دست اتحاد بڑھائیں۔ ہندوستان کا فاصلہ ترکی سے کچھ کم نہیں بایں ہمہ ترکی اخبارات ہمیشہ مسلمانان ہند کی حمایت کرتے ہیں اور صاف صاف لکھتے رہتے ہیں کہ ہماری عین آرزو ہے کہ " ہمارے بھائی" انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کے استبداد و تظلم سے محفوظ رہیں۔

ان حالات سے قطع نظر کرتے ہوئے ترکی کی سیاست خارجہ کا ایک اور پہلو خاص طور سے امید افزا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ عالم اسلامی میں جمہوریہ انگورہ ہی ایک ایسی ریاست ہے جسے صحیح معنوں میں آزاد و خود مختار سمجھنا چاہئے اور جس نے واقعی معاصر حکومتوں میں اپنی ہیبت اور وقار قائم کر لیا ہے۔ اس وقت جمعیۃ الاقوام کی خواہش یہ ہے کہ ترک اس میں شریک ہو جائیں برعکس اس کے روسی یہ چاہتے ہیں کہ حکومت انگورہ اس سے محترز رہے۔ روسی حکومت نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ ترکوں کے اندرونی نظم و نسق میں مطلقاً حارج نہیں ہونا چاہتی، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ روس اور انگورہ کے اتحاد سے مشرق قریبہ کا امن قائم رہے۔ حال ہی میں مسٹر لٹوی نوف جنہیں ماسکو کا سفیر خارجہ تصور کرنا چاہیے انگورہ آئے تاکہ حکومت کو گذشتہ مواعید کا خاص طور سے یقین دلائیں۔ اُدھر ہر لیگ کی یہ کوشش ہے کہ ترک اس میں شامل ہو جائیں اور لیگ کے کارندے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ترکوں کا فائدہ بھی دراصل اسی میں ہے۔ بہرحال ترک اپنی مرضی کے مالک ہیں اور وہ اپنے نفع و نقصان کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ حکومت انگورہ کا طرز عمل وہی ہوگا جس سے اس کو قوت و احتشام حاصل ہو۔

۵۔ قبرس | قبرس جس پر ابتدائے اسلام ہی میں خلفا کی سیادت قائم ہو گئی تھی جو حروب صلیبیہ کے دوران میں مسیحی جماعتوں کے قبضے میں آیا اور جسے تاجداران دولت عثمانیہ نے از سر نو

فتح کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے برطانیہ کے زیر اقتدار ہے۔ یہ دراصل اس خدمت کا صلہ تھا جو جنگ کریمیا میں حکومت برطانیہ و فرانس نے خلیفۃ المسلمین کی امداد کے لئے انجام دی تھی۔ اس زمانے سے مسلمانان قبرص کو جن کی تعداد غالباً پندرہ ہزار سے زائد نہیں مخصوص مراعات حاصل تھیں لیکن باب عالی کی سیاسی قوت کے انحطاط کے ساتھ رفتہ رفتہ قبرص کی حالت میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا۔ جنگ عظیم کے بعد جب اتحادیوں کی خفیہ کوششوں کی بدولت یونانیوں نے دولت بازنطینی کے احیا کے خواب دیکھنا شروع کئے ہیں تو قبرص میں بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی جو اتحاد یونان کی حامی ہے۔ دو ڈھائی مہینے ہوئے جب اس جماعت نے جس کو " انوسس " کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دولت برطانیہ کی جنگی قوت کا مقابلہ کرنا کچھ آسان نہ تھا۔ مالٹا، مصر اور سویز سے فوراً ہر طرح کی امداد پہنچائی گئی اور تھوڑے ہی عرصے میں شورش دب جینی کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت اب اس مسئلے پر خاص طور سے غور کر رہی ہے کہ آئندہ قبرص میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے لیکن اس امر کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کا وہ شرذمۂ قلیل جو اس جزیرے میں مقیم ہے کس حال میں ہے اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا ہو گا۔

۷۔ مسئلہ عدن | جب سے حکومت ہند نے اپنا مالی خسارہ پورا کرنے کے لئے تخفیف کا حربہ اختیار کیا ہے ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی جدید تجویز یا نیا مسئلہ آتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں عدن کے متعلق بھی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت بمبئی پر اس کے اخراجات کا بار نہایت تکلیف دہ صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ قیاس یہ تھا کہ شاید عدن کو بمبئی سے علٰحدہ کر دیا جائے۔ دو تین مہینوں کی خاموشی کے بعد اب پھر عدن کا نام لوگوں کی زبان پر ہے۔ حال ہی میں حکومت ہند سے متعدد سفارتوں میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ عدن کا تعلق بمبئی سے قائم رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی تاجروں کو عدن سے جو گہرا تعلق ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ حکومت ہند کوئی ایسی کارروائی نہ کرے جو اُن کے مفاد کے منافی ہو۔ ابھی تک اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہو سکا کہ حکومت اس معاملے میں کیا روش اختیار کرنے والی ہے لیکن عدن کے حالات یقیناً

ایک ایسی صورت اختیار کر چکے ہیں جن کا جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی فیصلہ ہونا ضروری ہے۔

عدن اور ہندوستان کے باہمی تعلق کی تاریخ مختصراً یہ ہے کہ ۱۸۳۹ء میں اس مقام پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور اس کا انتظام حکومت بمبئی کے ذمے کر دیا گیا۔ لیکن عدن کی جغرافی اہمیت نے تھوڑے ہی دنوں میں برطانوی ریزیڈنٹ کو مجبور کر دیا کہ وہ ماوراے عدن کے عربی قبائل اور مکلا، شحر اور سقطرہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت عثمانیہ کو جزیرۃ العرب کی سیادت کا دعویٰ تھا، لہذا یہ ایک قدرتی امر تھا کہ عدن کی بدولت حکومت برطانیہ اور باب عالی کے سیاسی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو۔ شروع شروع میں یہ مسئلہ مابہ النزاع رہا۔ بالآخر ایک مدت کی گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک متفقہ کمیشن قائم کیا جائے۔ بسنہ ۱۹۰۲ء میں عدن کی حدود متعین ہوئیں اور قرار پایا کہ حکام عدن علاقہ عدن کے باہر ترکی معاملات میں مطلق دخل نہ دیں۔ اسی طرح باب عالی نے بھی وعدہ کیا کہ علاقہ عدن کے اندر اسے عربی قبائل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترکی افواج عدن پر حملہ آور ہوئیں۔ یہ دیکھ کر کہ حکومت ہند شاید عدن کی حفاظت کا کافی انتظام نہ کر سکے وار آفس نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا (۱۹۱۷ء) اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ عدن کے سیاسی معاملات بھی براہ راست حکومت انگلستان کے زیر نگرانی رہیں گے۔ یہ صورت حالات اگرچہ عارضی تھی لیکن جنگ کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ عدن کا تعلق براہ راست حکومت انگلستان کے ساتھ قائم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کو اس تجویز کے قبول کرنے میں تامل تھا، کچھ دنوں تک معاملہ یونہیں چلتا رہا آخر ۱۹۲۱ء میں یہ طے پایا کہ ۱۹۱۷ء کے انتظامات کو برقرار رکھا جائے۔ گویا اب حکومت عدن کی کیفیت یہ ہے کہ (۱) وہ معاملات جن کا تعلق ہندوستان کے مفاد سے ہے حکومت ہند کے ہاتھ میں ہیں۔ (۲) علاقۂ عدن کا انتظام ریزیڈنٹ کے ذمے ہے۔ وہ عدن کا حاکم بھی ہے اور فوج کا سپہ سالار بھی۔ (۳) فضائی افواج اور جنگی نظم و نسق نظارت حربیہ (وار آفس) سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت ہند، حکومت بمبئی اور حکومت انگلستان سب عدن کے نظم و نسق میں شریک ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد مسئلہ عدن کی موجودہ حیثیت پر ہم آئندہ نمبر میں قلم اٹھائیں گے۔

اندھیری رات

ایک متوسط جسامت کا مچھر اڑتے اڑتے مسٹر بدرالزماں ایم ۔ اے ۔ ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ کی ناک کے پاس پہنچا، کچھ دیر بھنبھنایا، ان کی مونچھوں پر بیٹھا، آخر کو ان کی ناک کے اندر داخل ہوگیا، جو خراٹوں کی وجہ سے کبھی پھولتی اور کبھی پچکتی تھی۔ اب خدا معلوم یہ مچھر اس تاریخی مچھر کی نسل سے تھا جس نے نمرود کی ناک پر دھاوا کیا تھا یا آج کل کے منچلوں کی طرح نئی تحقیق اور تلاش کا شوق اسے اس وادی تیرہ و تار کے اندر لے گیا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وکیل صاحب کی ناک نے اس "مداخلت بیجا بخانہ" کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ وکیل صاحب چھینکے اور اس زور سے چھینکے کہ پلنگ کی چولیں ہل گئیں۔ پلنگ کے پاس میز پر جو گلاس رکھا تھا اس کو لرزش ہوئی، اور چھوٹی بچی چونک کر رونے لگی۔ وکیل صاحب کی بیوی نے سوتے سوتے ایک ہاتھ بڑھا کر بچی کو تھپ تھپایا، ایک خاص آواز میں اللہ اللہ کہا اور پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ وکیل صاحب تو خیر اپنا قانونی فرض پورا کرنے کے بعد پھر کسی موئے موکل کے پھنسنے کے خواب دیکھنے لگے، لیکن ان کی بیوی کی نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ ہزار کوشش کرتی ہیں لیکن آنکھ نہیں لگتی، خدا معلوم چھینک کی آواز کا ان کے قلب و دماغ پر کیا اثر ہوا تھا کہ اب سونا ناممکن ہوگیا، کمرے میں اندھیرا تھا، لیکن وہ اٹھیں، اسی طرح ٹٹولتی ہوئی پاندان کی طرف پہنچیں، ڈلی، کتھا کو کھائی، کتھا چونا چاٹا، اور چونے کی کچھی کتنے میں اور کتھے کی چونے میں ڈال کر پاندان بند کر دیا۔ اب کیا کریں، کھڑکی کے پاس پہنچیں، اسے کھولا اور باہر کی طرف دیکھنے لگیں۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور راتیں اندھیری تھیں، آسمان پر تارے اپنی پوری بہار دکھلا رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نامعلوم سرزمین میں ہزاروں روشنیاں چمک رہی ہیں۔ ساری دنیا محوخواب تھی حتیٰ کہ چوکیدار بھی جسے سوتوں کی نیند خراب کرنے کے معاوضے

میں سرکار کی طرف سے آٹھ روپئے ماہوار دئے جاتے ہیں، چپ چاپ تھا۔ درخت بھی کسی گہرے سوچ میں چپ کھڑے تھے۔

قدرت کی اس مہر سکوت کو خود وکیل صاحب کی بیوی نے توڑا، کھڑکی کے باہر دفعتاً صحن دیکھتے دیکھتے انھوں نے دفعتاً ایک چیخ ماری، درختوں کے سایہ کے اندر سے انھیں کوئی شکل مکان کی طرف آتی ہوئی نظر آئی پہلے تو سمجھیں کہ کوئی گائے یا بھینس احاطہ میں آگئی ہے لیکن اچھی طرح آنکھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھا تو اس کے آدمی ہونے کے متعلق کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ اب انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ کالی شکل آہستہ آہستہ باورچی خانے کی کھڑکی طرف بڑھی اور اندر کو دگئی۔ ان کے منہ سے فوراً نکل گیا "ارے چور" اور چہرے پر مردنی چھاگئی۔ بنگلہ شہر سے دور تھا، چوری کی واردات بھی ہو رہی تھیں۔ اب ان کے تخیل نے چشم زدن میں تمام ہونے والے واقعات ان کے ذہن کے سامنے پیش کر دئے، برتنوں کی چوری، اس کے بعد چور کا ان کے کمرے کی طرف آنا، وکیل صاحب سے لڑائی، وکیل صاحب کا کلہاڑے سے زخمی ہونا غرضکہ پوری واردات کی تفصیل ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی اور ان کے بدن میں رعشہ پڑگیا۔

انھوں نے وکیل صاحب کو زور سے ہلایا، "سنتے ہو، اے جی، اٹھو۔ ارے خدا کے لئے جاگو، آگ لگ جائے ایسی نیند کو۔ اے میں کیا کہہ رہی ہوں، ننھی کے ابا"

"او . . . و۔ ون" وکیل صاحب نے کروٹ لی، انگڑائی لی، چار مرتبہ منہ چلایا، اور پھر غافل ہوگئے۔

"ارے خدا کے لئے جاگو۔ باورچی خانے میں چور گھسا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے پاس ہی کپڑوں کا کمرا ہے، سارا اثاثہ وہیں۔ ہائے اللہ۔ ایسی نگوڑی نیند پر خدا کی سنوار" وکیل صاحب نے پھر انگڑائی لی، دونوں مٹھیاں بند کر کے آنکھیں ملیں اور فرمایا "کیا . . . کیا بات . . . . ہے"، ان کی بیوی کو اور غصہ آیا "لو صاحب اب انھیں سبق

پڑھا یا بیٹے۔ ارے میں کہتی ہوں باورچی خانے میں چور گھسا ہے، چور، نصیبن وہیں سوتی ہے ہولوں کے مارے مرجائے گی، پاس ہی کمرے میں زیور کا صندوقچہ رکھا ہے، خدا کے لئے اٹھو جاؤ۔"

وکیل صاحب نے اسی طرح بھاری آواز میں جواب دیا "تم بھی بڑی وہمی ہو۔ ہو ہی گے تم خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور یہ ہمیں وہمی بنا رہے ہیں، میری بلا سے وہ خدا کرے سارا گھر لوٹ لے جائے، لو اور سنو۔"

وکیل صاحب آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھے، بڑی زور سے کئی جمائیاں لیں، ہاتھ بڑھا کر سرہانے سے عینک کا ڈبہ نکالا، کھول کے عینک لگائی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

" راتوں کو نیند بھی کم بخت حرام ہو گئی ہے، واہی تباہی باتوں کے لئے سوتے سے جگا کر بٹھا دیا" ان کی بیوی نے انہیں ایک مرتبہ پھر خطرے کا احساس دلایا۔

" تمہارے سر کی قسم میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو باورچی خانے کی کھڑکی کے اندر کودتے دیکھا ہے۔"

وکیل صاحب نے جمائی مذاق میں بات اڑا دی "ارے تو اس میں ایسی کونسی قیامت آگئی۔ باورچی ہوگا، نصیبن سے ملنے آیا ہوگا"۔ اب تو ان کی بیوی کو ضبط کی تاب بالکل نہ رہی بہت غصے سے بولیں۔

" یہ کیا۔ کیا کہا تم نے، بس ہوش کی باتیں کرو"، وکیل صاحب نے پھر جماہی لیتے ہوئے کہا "میں کہہ رہا ہوں باورچی ہوگا" اب بیگم صاحب کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہوا "آگ لگے اس باورچی کو۔ موا خدائی خوار، میں اپنے گھر میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم ابھی جا کر اس موئے کو اس گھر سے نکال باہر کرو۔ جب میری آنکھ بند ہو جائے تو خوب دل کھول کر اپنے گھر میں ایسی باتیں کرانا، لیکن میرے جیتے جی تو یہ نہیں ہو سکتا" یہ کہہ چکیں تو اپنے مرنے کے بعد کی حالت کا خیال کر کے رقت طاری ہو گئی۔ ڈوپٹہ سے آنکھوں

کو پوچھا۔

وکیل صاحب اب مجبور ہو گئے تھے، کئی مرتبہ زور سے لاحول پڑھی، اپنی سلیپر پہنی اور اندھیرے میں اپنی رضائی ڈھونڈنے لگے۔ رضائی نہیں ملی ٹٹولتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچے، امامی چھوکرے کو جگا کر پوچھا "ابے میری رضائی کہاں ہے" اس نے کہا "سرکار بیگم صاحب اسے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف گئی تھیں وہیں ہوگی" لڑکے پر خفا ہوئے کہ "کم بخت چیزیں اٹھا کر بھی نہیں رکھتا۔ اب میں سردی میں مروں" بہرحال کانپتے اور تھرتھراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف گئے وہاں بھی اندھیرا تھا۔ وکیل صاحب نے کئی مرتبہ آواز دی "نصیبن او نصیبن" جواب نہ ملا "ارے کیوں مکاری کر رہی ہے، جیسے سو ہی تو رہی ہے، ارے تیرے کمرے میں ابھی کون آیا تھا"

نصیبن چونکیں، کن منائیں "جی حضور۔۔۔۔ کیا۔۔۔ کم۔۔۔ کمرے میں کون"

وکیل صاحب قانونی آدمی تھے۔ کئی بے قصوروں سے اپنی جرح کے زور سے قصور قبلوا چکے تھے اور پھر اس معاملے میں تو بیوی کی چشم دید شہادت موجود تھی کہنے لگے "ارے بس اب یہ اُڑن گھائیاں تو رہنے دے، میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا لیکن اس باورچی کم بخت کو ابھی یہاں سے نکال باہر کرو، اور خبردار جو وہ آئندہ کبھی رات کو اس کمرے میں آیا، تو اس کی اور تیری دونوں کی خیر نہیں" اب نصیبن ذرا بیچ کر بولیں "حضور بھلا یہ کہتے کیا ہیں۔ وہ موا نگوڑا باورچی آگ لگے اس کے منہ کو میرے کمرے میں کیوں آنے لگا۔ واہ میاں واہ۔ غریبوں کی بھی آخر آبرو ہوتی ہے۔ ایسے بھر منہ تہمت نہیں لگا دیتے" یہ کہتے کہتے اس پر رقت طاری ہو گئی، دو چار سسکیاں بھریں۔ زور سے ناک صاف کی۔

وکیل صاحب نے اطمینان سے کہا خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس باورچی کو ابھی فوراً اس کمرے سے نکال دے، سمجھی کہ نہیں، نصیبن نے پھر اپنی قسمت کا گلہ شروع کیا "چار روپے کی نوکری سارے گھر کا کام۔ اس پر رات کی نیند حرام ہو گئی اور تہمت الگ لگے۔ ایسی بے عزتی کی باتیں

تو سرکار ہم نے آج تک نہیں سنیں۔ ہم کل ہی بیگم صاحب سے کہہ کر چلے جائیں گے۔ یہی ہوگا کہ چھوٹی بٹیا دیکھنے کو نہ ملیں گی، کبھی کبھی چھٹے چھ ماہ انھیں ایک نظر دیکھ لیں گے۔ اوں۔ اوں (سسکیاں)۔

اب وکیل صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے "ارے مجھے ان باتوں سے کیا مطلب! مجھ کو تیری بیگم صاحب نے بھیجا تھا۔ تیری کوٹھری سے باورچی چھوڑ شیطان کو دے تو مجھے کیا، غرض کہ اپنا فرض پورا کر کے وکیل صاحب چلے، اپنی رضائی یاد آئی، کہنے لگے "ارے ہاں وہ میری رضائی کہاں ہے" نصیبن بولیں، "وہ سیدھے ہاتھ کی طرف کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے"

وکیل صاحب نے اندھیرے میں ٹٹولا، رضائی لی اور چلتے ہوئے۔

اب اس عرصے میں وکیل صاحب کی بیوی پر جو گزری اس کا حال خدا جانتا ہے یا ان کا دل، پہلے تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ تین منٹ ہوئے، چار ہوئے، پانچ ہوئے" اب ان کو گئے ہوئے دس منٹ تو ہو گئے ہیں، خدا معلوم کیا کر رہے ہیں، اگر باورچی ہی تھا تو کوئی ایسی ڈر کی بات نہیں ہے، لیکن اگر کہیں "شیطان کے کان بہرے" چور ہوا، تو" اس خیال کے آتے ہی پریشانی بڑھ گئی۔ ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا "الٰہی ان کی جان کی خیر، یہ کمبخت چور ڈاکو چاقو چھری لے کر چوری کرنے نکلتے ہیں، مجھ کمبخت نے آخر انھیں کیوں بھیج دیا، بارے پیر تمہارا ہی آسرا ہے۔ اگر ان کے دشمنوں پر آنچ آئی تو میں تو کہیں کی نہ رہی، اور پھر بچے" اس خیال کے ساتھ پھر رقت طاری ہوئی، لیکن ضبط کیا، بچی سے چمٹ کر لیٹ گئیں اور وہیں سے زور سے پکارا "ننھی کے ابا، ننھی کے ابا، کہاں ہو"

عین اسی وقت وکیل صاحب کمرے میں داخل ہوئے کہنے لگے "ارے کیوں پریشان ہو رہی ہو، سارا محلہ جاگ اٹھے گا، یہ کیا کھڑا ہوا ہوں، تمھارے پلنگ کے پاس" پلنگ پر بیٹھ گئے "تم بھی عجیب وہمی ہو۔ اس کمرے میں سوائے نصیبن کے کانی چڑیا تک نہیں ہے"

بھئی کل حکیم صاحب کو بلا کر کوئی مقوی قلب و دماغ نسخہ تمھارے لئے لکھوالیں گے، کیا پریشان کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

بیوی چپکی سنتی رہیں، اپنی غلطی پر نادم تھیں، تھوڑی دیر بعد بولیں "یہ پیاز کی بو کہاں سے آرہی ہے، دماغ پھٹا پڑتا ہے" وکیل صاحب نے سونگھا تو واقعی بو تھی کہنے لگے "ہاں ہے تو۔ یہ کہاں سے آرہی ہے" پھر فرمایا "اب نیند تو آنے سے رہی، میں لالٹین جلائے لیتا ہوں، مقدمے کے کچھ کاغذات ہی دیکھ ڈالوں" یہ کہہ کر پھر اپنی رضائی اوڑھے ہوئے اٹھے، دوسرے کمرے میں جاکر لالٹین جلائی اور لے کر اپنی بیوی کے پاس آئے، ذرا دور اور آگے بڑھے تھے کہ بیوی نے پھر زور سے ایک چیخ ماری "ارے اللہ یہ کیا" وکیل صاحب نے گھوم کر دیکھا تو ان کی بیوی کی آنکھیں ان کی رضائی پر جمی ہوئی تھیں اور ان کا منہ کھلا ہوا تھا۔ پوری طاقت سے چیخ کر بولیں۔

"یہ باورچی خانے میں اپنی رضائی اتارنے کی تمھیں کیا ضرورت ہوئی تھی، بولو جواب دو" وکیل صاحب سمجھے نہیں، پوچھا "کیوں یہ کیا بات" بیوی خفا ہو کر بولیں "بات وات تو میں جانتی نہیں لیکن ذرا اپنی قطع تو دیکھو کیا اچھے معلوم ہوتے ہو، دو دو بچوں کے باپ اور یہ حرکتیں"

اب جو وکیل صاحب نے اپنے اوپر نظر ڈالی تو سکتہ سا ہو گیا، دیکھا کہ نصیبن کی رضائی لپیٹے ہوئے ہیں، سٹ پٹا گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ نصیبن کی رضائی ان کے پاس کہاں سے آگئی بیوی کو دیکھا تو ماتھا پکڑے ہوئے چپ بیٹھی ہیں۔

اب وکیل صاحب لاکھ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ وہاں اپنی رضائی اوڑھ کر نہیں گئے تھے، اندھیرے میں دھوکا ہوا غلطی سے نصیبن کی رضائی کھونٹی سے اتار لی، لیکن ان کی بیوی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یقین نہ آیا۔

"ارے میں خوب سمجھتی ہوں، یہی تو میں کہہ رہی تھی کہ آتنی دیر کہاں لگی، خدا، یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رکھتا تو اچھا ہوتا۔ اور کیا صاحب، ابھی کیا ہے۔"

ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پورے دو دن تک وکیل صاحب کی بیوی نے ان سے بات نہ کی، آخر کو جب انھیں یاد آیا کہ وہ خود ان کی رضائی باورچی خانے میں چھوڑ آئی تھیں تو اطمینان ہوا، اس کے بعد سے وکیل صاحب نے عہد کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی بغیر روشنی کے کمرے سے باہر قدم نہ نکالوں گا، چنانچہ اب وہ عینک کے ڈبے کے ساتھ ایک چھوڑ دو دو دیاسلائی کی ڈبیاں بھی سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ (ماخوذ از چیخوف)

نوٹ: (اس قصے کے تمام افراد صرف افسانہ نگار کے تخیل کی پیداوار ہیں اس لئے اگر غلطی سے یہ "پربیتی" کسی کے لئے "آپ بیتی" ہو جائے تو اس کا قصور نہیں ہے)

تنقید و تبصرہ

کتب:

دیوان یقین ۔ تفویض The Great Prophet محمد بیرم خاں ترکمان

دیوان یقین | مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب ۔ متن ۱۴۶ صفحے ۔ مقدمہ ۹۶ صفحے ۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی نفیس ۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن
قیمت مجلد عہ/ بلا جلد عہ

انجمن ترقی اردو نے اردو شاعری کے بہت سے بیش بہا خزانے جو خاک گمنامی میں دفن ہو چکے تھے کھود کھود کر نکالے ہیں ۔ ان میں سے ایک دیوان یقین بھی ہے یقین کی شاعری کے متعلق مرتب دیوان کے غلو اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے اغراق سے تو ہمیں اتفاق نہیں مگر اس میں شبہ نہیں کہ بہت ستھرا، پاکیزہ کلام ہے اور پھر رعنائی اور شوخی سونے پر سہاگہ ہو گئی ہے ۔ کچھ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر شخص جو شعر کا سچا ذوق رکھتا ہے اس کی قدر کرے گا ۔

فاضل مرتب نے کتاب کی تصحیح میں تحقیق و تلاش کا حق ادا کر دیا ہے اور مقدمہ بھی بڑے سلیقے سے لکھا ہے ۔ پہلے یقین کے خاندان کے اور خود اُن کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں پھر تلمذ کا عنوان قرار دے کر ایک محققانہ اور دلچسپ بحث ان الزامات کی تردید میں کی ہے کہ یقین کا دیوان مرزا مظہر جان جاناں کا کہا ہوا ہے یا یقین نے اپنے ہمعصر شعرا سے سرقہ کیا ہے اس کے بعد یقین کے کلام کے متعلق چند شعرائے اردو کی رائیں نقل کی ہیں ۔ جن میں لچھمی نرائن شفیق کی رائے سب سے پر زور اور سب سے کم قابل قبول ہے ۔ اس سلسلے میں مرتب

نے شاہ حاتم، میر تقی، سودا، درد، تاباں کی ایک ایک غزل اور یقین کی ہم ردیف وہم قافیہ غزلوں کے ساتھ ساتھ نقل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان سب حضرات نے شگفتہ بحریں اور دلپذیر قافیے اور ردیفیں اختیار کرنے میں یقین کا تتبع کیا ہے۔ خود مرتب نے یقین کے کلام کی خصوصیات پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کے وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن کا مضمون فارسی اور اردو کے مشہور شعرا کے اشعار سے لڑتا ہے۔ یہ مقابلہ بعض مقامات پر بہت دلچسپ ہے۔ آخر میں فاضل مرتب نے چند الجھے ہوئے اشعار کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے نزدیک دو شعروں کے معنی انھوں نے صحیح نہیں سمجھے ہیں۔

اصول عشق پہ تولیں تو زمزمہ اس کا نہیں درست کہ جو بلبل شکستہ بال نہیں

اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں: "اس شعر میں بڑی بڑی تعقید ہے۔ اس کو اگر اس طرح نثر کیا جائے تو معنی صاف ہو جاتے ہیں جو بلبل شکستہ بال نہیں اس کا زمزمہ اگر اصول عشق پر تولیں تو درست نہ ہوگا) یعنی ایسے بلبل کے زمزمے میں مزا ہے جو شکستہ دل اور زخم خوردہ ہوا ور اسی کا زمزمہ عشق کی میزان میں پورا اتر سکتا ہے" ہمارا خیال یہ ہے کہ شعر میں تعقید نہیں ہر الفاظ میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہی مناسب ہے مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ بلبل بظاہر شکستہ بال نہیں اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا دل چوٹ سے خالی ہے ذرا اس کے آہنگ فریاد کو قانون محبت کے اصول پر جانچو تو پتہ چلے کہ یہ آواز کسی ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے بندگی کی جس نے خو کی وہ خدائی کیا کرے

اس کے متعلق فرماتے ہیں" اس شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ صرف اس لئے لکھ دیا ہے کہ فطرت انسانی کے ایک مسئلے کو اس میں بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاتح قوم مفتوح ہو جائے اور ایک عرصہ تک اس غلامی میں بسر کرے تو اس کے اخلاق ایسے خراب، اس کے خیالات ایسے پست (ہو جاتے ہیں) اور ہمت ایسی جواب دے جاتی ہے کہ پھر مدتوں تک اس میں حکومت کرنے کی قوت نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کاروں کو عہدیدار بنانے اور

ہندوستانیوں کو سوراج دینے میں تامل کیا جا رہا ہے" گویا شعر کا خلاصہ یہ ٹھہرا کہ عاشق با نیاز اگر معشوق بننا چاہے تو اس سے یہ بات بن نہیں سکتی۔ ہمارے خیال میں مطلب بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی معشوق کے دل میں اگر نیاز عشق پیدا ہو جائے تو ناز دلربائی کی شان قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ سلطنت برطانیہ نے گول میز کانفرنس منعقد کر کے ہندوستان کے نمائندوں پر ڈورے ڈالنا چاہتی ہے گویا اس نے انداز معشوقانہ کو چھوڑ کر رسم عاشقی اختیار کی ہے اب اس قسم کی حکومت کا طنطنہ کیا خاک قائم رہے گا۔

مرتب نے مقدمے میں اشعار کے انتخاب سے پہلو تہی کی ہے۔ ہم بھی اس ذمہ داری کو اپنے سر لینا نہیں چاہتے مگر نمونۂ کلام کے طور پر چند شعر نقل کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینے کو آتی ہیں — دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

باغ کے کوچے سے دیوانے نکل سکتے ہیں کب — رنگ گل کی موج سے زنجیر کرتی ہے بہانہ

باغباں ورنہ بند کر کہ دگر — ہم کہاں تو کہاں، بہار کہاں

ہائے میرا ہاتھ مت پکڑو کہ جب گل کی طرح — چاک ہی کرنے میں ہے میرے گریباں کی پھبن

کرتا ہے کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں — مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو — کیا عیش کر گیا ظالم دیوانہ پن میں

خوباں یقین کو معذور اب تو رکھو کہ اس کے — لوہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

خوش آتی ہے مجھ کو یہ بات اک مجنوں عریاں کی　　کیا کیجئے کہاں تک چاک گذرے ہم گریباں سے

تری آنکھیں سبھی سے آشنا ہیں اور کسی سے نہیں　　ہوئے جاتے ہیں ہم دیوانے اس نازو حقیقت کے

نہ رکھ اے ابر تو سر پر ہمارے بارِ منت کا　　وہ بادل اور ہے جو آگ کو دل کی بجھا جائے

تفویض | یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ایک خواب افسانہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی وکیل چیف کورٹ مارواڑ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم پانچ جزو۔ قیمت فی نسخہ ۵ر۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ ساقی کھاری باؤلی۔ دہلی۔

مرزا صاحب نے اس رسالے میں ان مظلوم اور بیکس مسلمان عورتوں کی داستان سنائی ہے جو ظالم شوہروں کے بس میں پڑ کر مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور مروجہ اسلامی قانون کی رو سے کوئی صورت چھٹکارے کی ان کو نہیں ملتی جس کی وجہ سے بعض حالتوں میں فسخ نکاح کے لئے بادل ناخواستہ مجبوراً ان کو دوسرا مذہب اختیار کرنا پڑتا ہے۔

چغتائی صاحب نے اس کو ایسے دلکش پیرائے سے بیان کیا ہے کہ وہ خود خواب میں لڑکی بن گئے ہیں جس کے اوپر وہ تمام حالات گذرے جو بے بس لڑکیوں پر نالائق شوہروں کے ہاتھوں سے گذرتے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی قانونی واقفیت سے مدد لے کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ظالم شوہر "محلہ کے مولوی صاحب" کے پنجہ سے رہائی حاصل کی۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ حقیقت ہے اور آئے دن اس قسم کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں کہ بعض بعض مسلمان عورتیں مجبور ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے عیسائی ہو جاتی ہیں اگرچہ ان کا دل کسی طرح اسلام چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ اس لئے اس ناگوار صورت حال کا علاج انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ مسلمانوں میں تفویض کو عام کیا جائے۔ یعنی

شادی کے وقت حق طلاق شوہروں کی طرف سے عورتوں کو دے دیا جائے تاکہ جس وقت اس قسم کی تکلیف دہ صورتیں پیدا ہوں وہ اس حق سے کام لے کر اپنی گلوخلاصی کر سکیں۔ یہ حق تفویض قانون فقہ کے مطابق خاص خاص شرائط کے ساتھ سپرد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس رسالے کے آخر میں ایسی دستاویزوں کے کئی نمونے اور مسودے بھی لکھ دئے ہیں جو نکاح کے وقت کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ علاج آسان نہیں اس لئے کہ شوہروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ حق طلاق عورتوں کے سپرد کر کے اپنے ہاتھ کٹا لیں کہ وہ خفیف سے تنازع کی صورت میں بھی اگر چاہیں تو چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ علما سے تحریک کی جائے کہ ان حالات کو دیکھ کر مروجہ دستور میں فقہ اسلامی کی رو سے ایسا طریقہ نکالیں کہ بلا تبدیل مذہب ایسی عورتوں کو رہائی مل سکے کیونکہ خلع بھی فقہ کی رو سے عورتوں کے اختیار کی چیز نہیں۔ غالباً جمعیۃ العلما پر سب سے زیادہ حق عائد ہوتا ہے کہ اس معاملے کی طرف توجہ کرے۔ علما سے ناامید ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں جب کہ ان کا فریضہ یہی ہے کہ وہ مشکل مسائل کی گتھیوں کو سلجھا کر صحیح راستہ پیدا کریں۔

آغاز رسالہ میں انھوں خود ہی تسلیم کیا ہے کہ اللہ اور رسول کی تعلیم اس سے بری ہے اور یہ صرف فقہا کی فہم کے نتائج ہیں۔ صغر سنی کی شادی بھی جو غیر فطری اور محل اعتراض ہے اور جس کو ہندوستان سے سال گذشتہ سارداایکٹ نے بند کیا ہے اس سے بھی انھوں نے قرآن کریم کے دامن کو پاک تسلیم کیا ہے۔

چغتائی صاحب کا یہ رسالہ نہ صرف ادبی اور ظرافت بلکہ اصلاح معاشرت کے لحاظ سے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

(پیغمبر اعظم) مولفہ الف، کے خاں درانی۔ چھوٹی تقطیع

صفحہ ۱۰۰، لکھائی چھپائی اچھی، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور کے پتہ پر ڈیڑھ روپئے میں مل سکتی ہے۔

یہ سیرۃ رسول جیسا کہ انتساب سے معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے رضیہ سلطان اور محمد اکرم کے لئے جو غالباً مولف کی کوئی عزیز یا شاگرد ہوں، لکھی گئی تھی، مگر بعد میں اس کو کتابی شکل میں مرتب کرکے شائع کی گئی، زبان نہایت آسان اور سہل ہے۔ انگریزی مدرسوں کے ساتویں آٹھویں جماعت کے بچے نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، ابواب کی ترتیب، واقعات کا انتخاب مولف کے حسن تالیف پر دال ہے، نیز سیرۃ رسول سے متعلق ضروری چیزیں ان چند صفحات میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور صاحب مولف قابل مبارکباد ہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۲ میں لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کعبے کے اندر ایک بت تھا جس کا نام ہبل تھا اور اس کے علاوہ دو بت اور تھے جو شہر مکہ میں تھے" یہ صحیح نہیں ہے۔ ہر مستند سیرۃ کی کتابوں میں کعبے کے اندر ۳۶۰ بت لکھا گیا ہے، اسی طرح سے صفحہ ۲ میں لکھا ہے کہ کعبہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس نے بنیاد ڈالی حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اس کی مرمت کرنے والے تھے یہ واقعہ بھی خود قرآن کی شہادت سے غلط ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ تیسری چیز صفحہ ۳ میں لکھی گئی ہے کہ آنحضرت صلعم نے وہ چیزیں لوگوں کو بتائیں کہ جس کا علم اس سے پہلے کسی کو نہ تھا۔ یہ قدرے مبالغہ ہے۔ آنحضرت خاتم الانبیاء کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے تھے اور وہ ادیان جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیغمبر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام لائے آپ نے اس کی تکمیل اور تصدیق کی۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے آپ نے بھی لوگوں کو وہی بتایا جس کو آپ کے پیشرووں نے اپنے اپنے موقع پر ظاہر کیا، ہاں البتہ آپ میں اور گذشتہ انبیاء کی تعلیمات میں یہ ضرور فرق ہے کہ آپ سے پہلے نبیوں کے زمانے میں احکامات وقتی اور مخصوص جماعت کے لئے تھے لیکن

آپ پر جو احکامات نازل ہوئے وہ دائمی اٹل اور ہر جماعت کے لئے یکساں ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے آپ کی شریعت آخری شریعت ہے لیکن بہرحال ۱۶۶ صفحے کی کتاب میں یہ غلطیاں خوبیوں کے مقابلے میں حقیر ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ سیرۃ ۱۴-۱۵ سال کے ہندستانی بچوں کی استعداد کے عین مطابق ہے۔ میں خصوصیت کے ساتھ ان عمر کے بچوں سے اس کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں اور بڑوں کے لئے بھی اس کا پڑھنا غیر مفید نہ ہوگا۔ آخر میں جناب وزانی صاحب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ سیرۃ کی کتابوں کی اشاعت ہر زبان ہر عمر اور ہر ملک میں حد درجہ ضروری ہے۔ صاحب موصوف نے کچھ تو کیا۔ خدا انھیں اس کا اجر دے۔

(ع-ج)

| محمد بیرم خاں ترکمان | از جناب کوثر چاندپوری۔ جیبی تقطیع ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ۸/ مع محصول ڈاک۔ جناب مصنف سے بیگم گنج بھوپال کے پتے پر مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے مشہور سپہ سالار بیرم خاں کے حالات ہیں۔ پہلے یہ مضمون رسالہ مخزن میں شائع ہوا تھا، اسی کو پھیلا کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے مقدور بھر کافی تحقیق اور تلاش وجستجو سے کام لیا ہے اور بیرم خاں کے تمام اوصاف کو اجاگر اور اس پر جو الزامات قائم کئے گئے ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر بعض مقامات پر مصنف نے بیجا طرفداری سے کام لیا ہے۔ خصوصاً بیرم کی تمرد اور سرکشی کے معاملے میں بیرم کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی اور سارا الزام اس کے مخالفین پر لگایا ہے مگر اس سلسلے میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ تاریخ کے طالب علم کے لئے تشفی بخش نہیں۔ بیرم کی شاعری کے معاملے میں بھی غیر ضروری حسن ظن سے کام لیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کتاب کا طرز تحریر بھی سوانح نگاری کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں بحیثیت مجموعی کتاب مطالعے کے قابل ہے۔

(م-ح-ج)

شذرات

اردو اکادمی کے لکچروں کا سلسلہ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جنوری ۳۲ء سے شروع ہو جائے گا۔ پہلا لکچر جناب سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا نفسیات مذہب پر ہوگا۔ جلسہ ۷ر جنوری ۳۲ء کو ۶ بجے شام کے وقت جامعہ ملیہ کے تعلیمی مرکز نمبر ۱ واقع قرولباغ دہلی میں منعقد ہوگا اور اس کی صدارت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے، ایم ای ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی فرمائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اکادمی کے ارکان اور دوسرے علم دوست حضرات جلسے میں شریک ہو کر ہمیں سرفرازی بخشیں گے باہر سے جو حضرات شرکت کے لئے تشریف لانا چاہیں وہ اپنی آمد کی اطلاع ناظم اکادمی کو ۵ر جنوری سے پہلے کر دیں تاکہ ان کے استقبال اور مہمانداری کا انتظام کیا جا سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوا۔ اس مرتبہ خطبہ پڑھنے کے لئے خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر تعلیمات حکومت بنگال تشریف لائے تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں ابتدا سے یہ رسم قائم ہوگئی ہے کہ تقسیم اسناد کے موقعے پر حکومت کے کسی اعلیٰ یا اوسط درجے کے عہدہ دار سے خطبہ پڑھوایا جاتا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر کے آنے کے بعد خدا خدا کر کے یہ آن ٹوٹی اور سید سلطان احمد صاحب اس خدمت کے لئے مدعو کئے گئے۔ اب پھر ارکان حکومت کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ گو وزرا کی حیثیت عام عہدہ داروں سے کسی قدر الگ ہے اور اصولاً ان کا شمار ملک کے رہنماؤں میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ جب تک ذمہ دار حکومت نہ ہو عملی طور پر وزیر اور مستقل ملازم سرکار برابر ہیں۔ ہمارا موجودہ سیاسی نظام اس کا مصداق ہے غم صیاد و فکر

باغباں ہے۔ وہ علی میں ہمارا آشیاں ہے اور ظاہر ہے اس میں صیاد کوئی ہو مگر باغباں وزیر ہے۔

ہمیں خواجہ ناظم الدین صاحب کے انتخاب پر شخصی حیثیت سے اعتراض نہیں لیکن بجائے خود یہ بات پسندیدہ نہیں کہ ملکی تعلیم کی رہنمائی میں ان لوگوں سے مدد لی جائے جو ہر مسئلے کو حکومت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ حکومت چاہے وہ اچھی سے اچھی کیوں نہ ہو، اپنے مقاصد کے لحاظ سے اس پر مجبور ہے کہ ملک کا موجودہ نظم برقرار رکھنے کے لئے اور سب مصلحتوں کو قربان کر دے۔ تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا نصب العین یہ ہے کہ حال پر تنقید کی نگاہ ڈالے اور استقبال کو اصلاح و ترقی کی راہ پر لگائے۔ حکومت کے خمیر میں جمود ہے، تعلیم کی فطرت میں حرکت ہے۔ اس لئے تعلیم میں حکومت سے ہدایت چاہنا گویا زنجیر کو راحلۂ سفر بنانا ہے۔

یہ اعتراض تو معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ علمی مقاصد کے لحاظ سے یہ اور بھی نازیبا ہے کہ ارباب علم کے ہوتے ہوئے اہم علمی اور تعلیمی جلسوں میں ارباب جاہ و حکومت سے خطبے پڑھوائے جائیں۔ یونیورسٹی کا اصل مقصد اعلیٰ تعلیم اور علمی تحقیق ہے۔ جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبے کی اصل غرض یہ ہے کہ ان نوجوانوں کو جو یونیورسٹی میں تحصیل علم کی پہلی منزل طے کرکے زندگی کے بڑے مدرسے میں داخل ہو رہے ہیں کسی عالم متبحر، کسی عارف زندگی کے بیش بہا خیالات سننے کا موقع ملے جس سے انہیں بصیرت و ہدایت حاصل ہو اور ان کے دلوں میں ذوق و شوق پیدا ہو۔ ایسے موقعے پر خطبہ پڑھنے کا اہل وہ شخص ہے جو علمی دنیا میں بلند مرتبہ رکھتا ہو جس نے علم کی حقیقت کو اور علم اور زندگی کے تعلق کو خود بھی سمجھا ہو اور دوسروں کو بھی سمجھا سکے جو یونیورسٹی کے اساتذہ کو تعلیم اور تحقیق کی نئی راہ دکھائے اور طلبہ کو تحصیل اور تعلیم کا حقیقی مقصد سمجھائے۔ ممکن ہے کبھی وہ زمانہ آئے جب حکومت کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہوں۔ ابھی تو وہ دن

بہت دور ہے۔

خواجہ ناظم الدین کا خطبہ اس معیار کے لحاظ سے جو آج کل مجالس علمیہ کے خطبوں کا ہو گیا ہے غنیمت ہے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ابتدا میں طریق انتخاب وغیرہ کے سیاسی مسائل چھیڑ دئے ان کا کیا موقع تھا۔ ان مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ اس خطبے میں یہ چیز بالکل بے محل تھی۔ ایک طرف تو یہ حضرات تعلیم کو سیاست سے الگ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف موقعے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تعلیمی جلسوں میں اپنے یا اپنے سرپرستوں کے سیاسی خیالات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ لائق مقرر کو کم سے کم یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ مسلم یونیورسٹی دو ایک سال سے ایک چھوٹے سے حلقے کے اقتدار سے نکل کر ساری ملت اسلامی سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے سب سے اہم جلسے میں بے ضرورت ایسے مسائل پر بحث کرنا جنھوں نے مسلمانوں میں شدید خانہ جنگی برپا کر رکھی ہے کہاں تک مناسب ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے جلسوں میں حکومت کے ارکان کو ذمہ داری کی تقریریں کرنے کے لئے ہرگز نہیں بلانا چاہئے۔ یہ بیچارے مجبور ہیں۔ بعض باتیں ان کا تکیۂ کلام اور تکیۂ خیال بن گئی ہیں۔ ان کے بغیر نہ وہ گفتگو کر سکتے ہیں نہ کچھ سوچ سکتے ہیں۔

تقریر کے دوسرے حصے میں لائق مقرر نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بے روزگاری کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اکیلے بنگال میں ہر سال یونیورسٹی سے دو تین ہزار گریجویٹ نکلتے ہیں جن میں صرف دو تین سو کو نوکری ملتی ہے۔ باقی لوگ چونکہ اور کسی کام کے نہیں ہوتے اس لئے بے روزگاری کی مصیبتیں سہتے رہتے ہیں اور جب انھیں معاشرتی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ملتی وہ اس کی تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس کا

سبب فاضل مقرر نے یہ قرار دیا کہ ہر طالب علم اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خواہ مخواہ کالج میں تعلیم پاتا ہے، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم کی قابلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ موصوف نے اس کا علاج وہی تجویز کیا ہے جو سیڈلر کمیشن کی رائے تھی کہ اسکول یا انٹرمیڈیٹ کالج کی تعلیم کے بعد اکثر طلبہ صنعت اور پیشے کی تعلیم پائیں اور یونیورسٹی میں صرف وہ لوگ داخل ہوں جو اعلیٰ ذہنی قابلیت رکھتے ہوں۔ اس تجویز سے ہمیں حرف بحرف اتفاق ہے لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ صنعت اور پیشوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہوگا اور دوسرا یہ کہ تعلیم پاکر بھی ملک کی موجودہ اقتصادی حالت میں ان لوگوں کے لئے کہاں تک گنجائش نکلے گی اور اس اقتصادی حالت کے بہتر ہونے کی کیا صورت ہے۔ پہلے سوال کا جواب موصوف نے دیا ہے، دوسرا یا تو ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا یا اس کا کوئی جواب جو خطرے سے خالی ہو نہیں سوجھا۔

تیسرے حصے میں لائق مقرر نے اس بات پر بحث کی ہے کہ صنعتی تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا نظام کیا ہونا چاہئے۔ موصوف نے فرمایا کہ اس قسم کی تعلیم دینا یونیورسٹی کا کام نہیں کیونکہ وہ خالص علمی درسگاہ ہے۔ اس مقصد کے لئے علٰحدہ ایک یا ایک سے زیادہ مرکزی تعلیمگاہیں ہونی چاہئیں۔ جن میں صوبوں کی حکومت طلبہ کو وظائف دے کر تعلیم دلائے۔ اصولاً موصوف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن عملی ضرورتوں کے لحاظ سے افراد اور قومیں اصول سے انحراف کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ تعجب ہے کہ موصوف نے باوجود اس تجربے کے جو انھیں حاصل ہوا ہوگا ایسی بات کہی جو فی الحال بالکل ناقابل عمل ہے۔ ملک کی مالی حالت یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سرمائے کی کمی سے نالاں ہیں، ایسی صورت میں صنعتی تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اور جب یونیورسٹیاں عام ذہنی پستی کی بدولت اعلیٰ نصب العین سے اتنی دور رہیں کہ انھوں نے طلبہ کو سرکاری ملازمت کے لئے تیار کرنا اپنا مقصد قرار دے لیا ہے تو ان کے اندر دوسرے پیشوں کی تعلیم کا انتظام کرنے میں آخر

کون سی قباحت ہے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ صنعتی درسگاہیں اگر یونیورسٹیوں سے علحدہ ہوں تو اندیشہ ہے ان کے طلبہ کا علمی اور ذہنی معیار اور بھی پست ہو جائے گا۔ اس کا تجربہ جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک کو ہو رہا ہے اس لئے یہ اگر مالی پہلو سے قابل عمل بھی ہو تو بھی اس پر عمل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

آخر میں موصوف نے طلبہ کو بہت سی بزرگانہ نصیحتیں فرمائیں جس کے مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً قومی خدمت اور ایثار کی تلقین جو آپ نے فرمائی ہر طرح قابل قدر ہے۔ اگر اسی کے ساتھ آپ خدمت اور ایثار کی کوئی عملی راہ بھی دکھاتے تو طلبہ کی سچی رہنمائی کا فرض پوری طرح انجام پاتا۔

مجلہ مکتبہ

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) حیدرآباد دکن کا علمی و ادبی مصور ماہوار رسالہ ہے جس کا شمار دنیائے اردو کے چند علمی رسالوں میں ہوتا ہے کئی سال سے مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی، مولوی سید محمد ایم اے اور مولوی عمیر رفیعی کی ادارت میں حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۔ اسمیں بعض عمدہ طبعزاد افسانے یا ہندی، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں کے تراجم ہوتے ہیں۔

۲۔ اسمیں تاریخ، سائنس، فلسفہ اور معاشیات پر بھی مفید علمی مقالے شائع ہوتے ہیں۔

۳۔ اسمیں عام ادبی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ دکن کے قدیم شعرا اور اردوئے قدیم کی نسبت محققانہ مضامین ہوتے ہیں۔

۴۔ مشاہیر ادبا و شعرا اور اہل علم و فضل کی تصویریں ہر نمبر میں شائع ہوتی ہیں۔

۵۔ اسمیں اردو کی نئی کتابوں پر تبصرے و جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شائع ہوتی ہیں۔

قیمت سالانہ (للعہ) ششماہی (عہ/) نمونہ (۶/)

منتظم مجلہ مکتبہ، مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

جو مشورے کے وقت خیر خواہ ہو اور جب ہم کوئی بات بھول جائیں یا کسی معاملے میں غافل ہوں تو ہمیں یاد دلا کر ہوشیار کر دے اور سلطنت کے کاموں پر ہمیں آمادہ کرتا رہے۔ ہمیں تمہارا مشورہ بہت پسند آیا۔ بہتر ہے کہ ہاشم کے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کرو اور اپنے الطاف و عنایات سے اسے خوش کرتے رہو۔

ادب کی سرپرستی و قدر شناسی | امیر محمد خود ادیب تھا اور اہل ادب کا قدر شناس بھی تھا۔ اس کے ایک خادم نے اس کی اس رغبت سے فائدہ اٹھا کر ایک جگہ کے لئے اپنی درخواست ملازمت پیش کی اور چند مرتبہ اس کے حضور میں چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ امیر نے درخواست کے جواب میں لکھا کہ تم کو اس جگہ کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ تمہاری کارگزاری ایسی نہیں جس کا صلہ ایسی خدمت سے دیا جائے۔ مگر چونکہ تم نے اس درخواست کو اچھے الفاظ اور دلکش عبارت سے زینت دی ہے اس لئے صرف یہی ایک وجہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ اگر یہ تحریر تم نے لکھی ہے تو نہایت اچھی ہے اور اگر کسی اور شخص سے لکھوائی ہے تو تمہارا حسن انتخاب قابل داد ہے اور ان دونوں صورتوں میں تم ہماری نظروں میں مستحق انعام ہو۔ لہذا ہم تمہیں اس خدمت پر مقرر کر کے امید کرتے ہیں کہ تم اس کام کو بھی ایسی ہی اچھی طرح انجام دیتے رہو گے اور اپنی تحریروں میں سنوارتے رہو گے اور ہماری خوش خیالی کو جو تمہاری نسبت پیدا ہو گئی ہے، قائم رکھو گے اور کسی شخص کو ایسا موقع نہ دو گے کہ وہ تمہاری شکایت کرے۔ جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا لحاظ کرو گے تو بڑی باتوں کا خیال خود بخود رہنے لگے گا جو ابتدا میں خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے اس کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے اور لوگ غیبت میں بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔

ابوالیسر ریاضی کی چالاکی اور امیر کا تدبر و سلوک | ابوالیسر شاعر جو الریاضی کے نام سے مشہور ہے مشرق میں بے روزگاری سے پریشان ہو کر مغرب میں اندلس آیا اور ایک جعلی خط ابن فلیح شامی کی جانب سے تیار کیا اور شہر والوں کی طرف سے ایک محضر نامہ ترتیب دیا۔ اس میں دربار خلافت تک رسائی کے لئے جو باتیں ضروری تھیں وہ سب درج کیں۔ اس کے بعد جب امیر محمد کی

خدمت میں حاضر ہوا اور یہ کاغذات پیش کئے تو امیر سمجھ گیا کہ یہ کاغذات جعلی ہیں اور الریاضی ایک چلتا ہوا چالاک ، کھانے کمانے والا آدمی ہے۔ تاہم اس نے حکم دیا کہ الریاضی کو مہمان رکھا جائے۔ الریاضی ایک مدت تک شاہی مہمان رہا۔ اس کے بعد اس نے واپسی وطن کی اجازت چاہی امیر نے ہاشم کو جو اس وقت زندہ تھا بلا کر کہا کہ یہ شخص بھی عجیب ہے یہاں حصول معیشت کے لئے آیا تھا جو اس کو حاصل ہے۔ اگرچہ فریب سے ہو۔ ہم اس کے پاس والے خط کے جعلی ہونے نہ ہونے کا ثبوت طلب کرتے یا جواب دے دیتے تو بنی ہاشم ہم پر ضحکہ اڑاتے اور ہم اس کو جھٹلا دیتے تو یہ بات ہماری دنائت وبخل پر محمول کی جاتی اور ہم بدنام ہوجاتے۔ باوجود ان حالات کے اگر یہ خط ہمارے پاس وہیں سے بھیج دیا جاتا تو بھی یہ شخص مستحق اکرام تھا چہ جائیکہ اس قدر دور کی مسافت طے کر کے آیا ہے ہمارے خیال میں تو یہی مناسب ہے اس کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اچھی طرح سے رخصت کیا جائے۔ چنانچہ پانسو دینار دے کر رخصت کر دیا جائے اور خط حوالے کیا جس میں سوائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کچھ نہ لکھا تھا۔

محمد ابن ولید فقیہ نے ہم سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب الریاضی قرطبہ سے مشرق جانے کے لئے روانہ ہوا تو اسی وقت ہم بھی مشرق کے سمت چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ہمارا اس کا ساتھ ہوگیا۔ الریاضی نہایت اچھا ادیب اور قادر الکلام شخص تھا۔ جب ہماری اس کی خوب ملاقات ہوگئی اور مدت تک ہم اور وہ جنگلوں میں ساتھ رہے تو اس نے اپنے حالات ہمیں بتا کر امیر کا خط ہمارے سامنے ہی کھولا جس میں صرف بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اور کچھ نہ تھا۔ اس وقت الریاضی کو امیر کی دانائی پر سخت تعجب ہو رہا تھا۔ اور وہ یہ کہتا تھا کہ "میں امیر کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ نہ وہ دھوکا کھاتے ہیں نہ بدنام ہوتے ہیں۔"

مصر میں الریاضی کی گرفتاری اس کے رہا ہونے کے حیلہ سازی کا ایک عجیب قاعدہ

جب الریاضی مصر پہنچا تو وہاں کے گورنر نے اس کی اطلاع پا کر الریاضی کو قید کر دیا۔ محمد ابن ولید کہتے ہیں کہ جب ہمیں یہ معلوم ہوا تو ہم اس کی ہمدردی اور دوستی کے سبب سے اندلس کے تین اور باشندوں کے ساتھ بعد

نماز جمعہ اس سے ملنے قید خانے گئے اور دریافت کرتے کرتے قید خانے کے دروازے تک جا پہنچے ۔ ہم نے الریاضی سے خواہش کی کہ وہ ہمیں اندر بلا کر ہم سے ملاقات کرے ۔ الریاضی نے جواب دیا کہ تم بھی میرے ساتھ قید خانے میں رہنا چاہتے ہو ۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیوں اس نے کہا کہ جو شخص قید خانے میں داخل ہو جاتا ہے وہ بلا حکم سلطانی رہا نہیں ہو سکتا ہم سمجھے کہ وہ ہم سے مذاق کر رہا ہے ۔ ہمیں اس کے قید ہونے کا بہت ملال تھا ۔ جب ہم وہاں سے واپس ہونے لگے تو ہمیں پہرے والے نے قید خانے میں ڈھکیل دیا اور گویا ہم بھی قید ہو گئے ۔ اب ہم سخت مصیبت میں تھے نہ ہمیں کوئی جانتا تھا نہ ہم کسی کو جانتے تھے ۔ ہم قید میں تھے کہ ہماری اطلاع المزنی فقیہہ کو ہوئی اور انھیں معلوم ہو گیا کہ ہم صرف طالب علم ہیں اور ہماری نیت بخیر ہے تو انھوں نے مصر کے گورنر سے ہمارے متعلق عرض و معروض کی اور ان کی سفارش اور خدا کے رحم و مہربانی سے ہمیں اس بلا سے نجات ملی ۔

ولید ابن عبدالرحمٰن وزیر کیسے ہوا | ایک موقع پر ولید[1] ابن عبدالرحمٰن ابن غانم نے ایک عریضہ امیر محمد کی خدمت میں پیش کیا جس میں محمد کے احسانات کا ذکر کر کے امیر کا شکر یہ ادا کیا تھا اور امیر کے لئے ترقی دولت و اقبال کی دعا اور اپنے اس عجز کا اظہار تھا کہ حقیقت میں قول و فعل سے ان نعمتوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا جو مجھ پر مبذول ہوئی ہیں آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں مرتے دم تک ان نعمتوں کا ممنون اور امیر کا خیر خواہ رہوں گا ۔

جواب میں امیر نے لکھا کہ خدائے تعالیٰ کی ایک صفت شاکر بھی ہے ۔ وہ شکر گزاروں کو پسند کرتا ہے ۔ تو نے ہمیں پکارا ہم نے سنا ۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے ۔ پھر کچھ مدت کے بعد اسے اپنا وزیر بنا دیا ۔

تاریخ سلطنت و انتقال | امیر محمد جمعرات کے روز تیسری ربیع الآخر ۲۳۸ھ کو امیر ہوا اور چونتیس

---

(۱) یہ ولید ابن عبدالرحمٰن وہی ہیں جن کا ذکر ہاشم کے سلسلے میں ہو چکا ہے یہاں انکے وزارت پر مقرر ہونے کا ذکر کیا ہے ۔

سال بادشاہ رہ کر جمعہ کے دن آغاز ماہ ربیع الاول ۲۷۳ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کی عمر ۶۵ سال ہوئی۔

امیر المنذر ابن محمد

المنذر ضلع ریہ میں امیر محمد کے حکم سے لڑ رہا تھا۔ وہیں اس کو اپنے باپ کی وفات کا علم ہوا یہ سنتے ہی وہ دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتا ہوا اتوار کے دن تیسری ربیع الاول کو قرطبہ پہنچ گیا اس نے اپنے باپ کے جنازے کی نماز وزراء کے ہمراہ ادا کی۔ ہاشم[1] اپنے آقا کے رنج سے بیتاب ہو رہا تھا اور ابو نواس کے یہ شعر پڑھتا جاتا تھا

اعزی یا محمد عنک نفسی　　معاذ اللہ والایدی الجسام

(اے محمد میں اپنے نفس سے تیری تعریف کرتا ہوں خدا کی پناہ وہ احسانات جو تو نے کئے ہیں کیا بھولے جا سکتے ہیں)

فہلا مات قوم لم یموتوا　　ودوفع عنک لی کاس الحمام

(وہ قوم جو زندہ ہے کیوں نہ مر گئی اور بجائے تیرے مجھے کیوں نہ موت آ گئی)

جب منذر نے یہ اشعار سنے تو وہ سمجھا کہ یہ مجھ پر طعن کیا جا رہا ہے اس بنا پر المنذر نے ہاشم کو قید کر کے قتل کرا دیا۔

المنذر دو ہی سال امیر رہا۔ اور اس قلیل مدت میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس میں اس کی قابلیت نمایاں ہوتی اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ وہ صاحب عزم تھا جس کے آثار اس میں پائے جاتے تھے۔ وہ بلنشتر میں محاصرہ کئے ہوئے مقیم تھا کہ ۱۷ صفر ۲۷۵ھ کو پیام مرگ آ پہنچا۔ وفات کے وقت اس کی عمر چھیالیس سال تھی۔

---

(۱) بظاہر یہ ہاشم کوئی دوسرا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے پہلے امیر محمد کے عہد میں ایک ہاشم کے قتل کا ذکر آ چکا ہے۔ (مترجم)

امیر عبداللہ ابن محمد

تخت نشینی اور فتنوں کا ہجوم | المنذر کے بعد سنیچر کے دن اس کا بھائی عبداللہ امیر ہوا۔ بلشتر میں جو لوگ محاصرہ کئے ہوئے پڑے تھے اب طول محاصرہ سے پریشان ہو چکے تھے۔ جب انھیں المنذر کی وفات کا علم ہوا تو اضلاع کے لشکر اور قبائل کے سب وفود منتشر ہونے لگے اور چاروں طرف سے لشکروں کی واپسی شروع ہو گئی۔ عبداللہ نے ان کو روکنے اور سب کو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے کا حکم دیا لیکن اب کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اب پھر لشکروں کو ان کی جگہ پر قائم رکھ سکتا۔ آخر عبداللہ بھی خائف ہوا کہ وہ تنہا دشمن کا مقابلہ کیونکر کرے گا اور یہ سوچ کر وہ بھی واپس ہو گیا۔ منذر مرحوم کی نعش بھی وہاں دفن نہ ہونے دی۔ بلکہ اپنے ساتھ لے گیا اور قرطبہ میں لاکر اپنے بزرگوں کے پاس قصر میں دفن کیا۔

ملک کی عام حالت اور امیر کے انتظامات | اب ملک کی حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ ہر صوبہ بغاوتوں اور سازشوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ امیر کے جنرل اس کی امداد سے قاصر ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں امیر نے تقوائے اور پرہیزگاری پر سختی سے عمل کیا اور مسلمانوں کے اموال کی کافی حفاظت و نگرانی کی۔ جہاں تک ممکن ہوتا کوئی صرف بیجا نہ ہونے دیتا۔

اس زمانے میں بغاوتوں اور حملوں کی وجہ سے ملک کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی اور لشکروں کے انتظام کی ضرورت بمقابلہ سابق اب زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ امیر عبداللہ نے اہل لشکر کی تنخواہوں میں اس آمدنی کی کمی کے باوجود اضافہ کیا اور دوسرے طبقات کے ملازموں کی تنخواہیں کم کیں۔ تاہم فسادات نے ملک میں مضبوطی سے جڑ پکڑ لی اور ابن حفصون کا واقعہ تو نہایت اہم ہو گیا تھا جو عموماً بہت مشہور رہے۔ یہاں تک کہ اس نے قلعہ بلائی پر قبضہ کر لیا۔ جو قرطبہ سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر ہے۔

ابن حفصون کے بلووں کی دراز دستیاں | ابن حفصون کے سوار اطراف میں پھیل گئے تھے اور اس کے

لشکر صبح و شام امیر کے خلاف حملے کیا کرتے تھے۔ ان حملوں نے یہاں تک ترقی کی کہ شقندہ اور فج المائدہ تک ان کی زد پہنچنے لگی، کسی شخص کو مدافعت کی طاقت نہ رہی بلکہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جس زمانے میں ابن حفصون اور اس کا لشکر قرطبہ کے نواح میں فج الطل پر خیمہ زن تھا اس کے ساتھیوں میں سے ایک بہادر سوار نے حملہ کیا اور پل تک زبردستی گھستا ہوا چلا آیا اور باب القنطرہ والے مجسمے تک پہنچ کر اس مجسمے کو نیزہ مارا اور پھر واپس ہو کر اپنے ہمراہیوں میں صحیح و سالم پہنچ گیا۔

ابوالعباس احمد کی سپہ سالاری اور بغاوتوں کا انسداد | یہ مصیبت پچیس سال تک رہی لیکن امیر عبداللہ کے آخر زمانہ حکومت میں ابوالعباس احمد ابن محمد بن ابی عبدہ کی سپہ سالاری کی وجہ سے ملکی معاملات کی اصلاح ہونے لگی۔ ابوالعباس نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور باغیوں نے نہ صرف بدلہ لیا بلکہ بطور سزا ان کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی اور ملک سے فساد رفع کر کے امن و امان قائم کر دیا۔ ابن حفصون کو قلعہ بلائی سے باہر نکالا اور بعض مشرقی ممالک سے خراج وصول کیا اور بہت سے ملکوں سے اسی خراج پر جو پہلے سے مقرر تھا اور بعض سے ان امرا کی بحالی پر جو وہاں پہلے سے مامور تھے، صلح کر لی۔

امیر کی ادبی قابلیت | امیر عبداللہ کی توقیعات یعنی وہ تحریریں جو بادشاہ اپنے قلم سے آپ لکھتا ہے نہایت درجہ بلیغ تھیں۔ اس کے اشعار میں تشبیب اور زہد کا رنگ غالب تھا۔ اس کی سی فصاحت و بلاغت کی مثال نہ سابقہ امیروں میں ملتی ہے نہ آئندہ امید ہے کہ ملے۔

ایک بار عبداللہ اپنے جنرل احمد بن محمد کو عید کے دن لکھا: "امابعد! خدا پر بھروسہ کرنا اپنا لازمی فرض سمجھو، اپنے تمام کاموں میں اسی پر اعتماد کرو خواہ تم اپنی سرحدوں کی حفاظت پر ہو کیونکہ اللہ پر بھروسہ کرنا تمام مشکلات کی کنجی ہے اور تمہاری خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ اپنی عیدوں اور خوشی کے دنوں میں بھی حفاظت کا فرض پورا پورا ادا کرو۔ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہی ارحم الراحمین ہے۔"

ایک دفعہ عبداللہ نے اپنے بعض عمال کو ایک خط لکھوایا: "امابعد اگر تمہاری توجہ ان

جہات کی طرف یمن پر ہم نے تم کو مقرر کیا ہے۔ فضول خط وکتابت کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہوتی تو ہم تمہیں بہترین آدمی وثیقہ رس، مدبر اور دوراندیش کارگزار خیال کرتے۔ خط وکتابت میں بے ضرورت وقت ضائع نہ کرو اور اپنے فکر وقوت کو پوری توجہ کے ساتھ اہم معاملات میں غور کرنے پر صرف کرو۔ اگر خدا نے چاہا تو یہی امور تمہاری بھلائی کا سبب ہوجائیں گے۔

<u>امیر کی شاعری</u> | امیر کی شاعری کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔ تشبیب میں۔

علی شان کحیل (۱) فی شغلہ یخلع العذار

کانما وجنتاہ ورد (۲) خالطہ ازورار البہار

تقضیب بان اذا تثنیٰ (۳) یدیر طرفاً بہ احورار

فصفو ودی علیہ وقف (۴) ما اطرد اللیل والنہار

زہد وتقوے کے موضوع پر اس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

یا من یرہ اغترا الاجل (۵) حتیٰ مَ یلہیک الامل

حتیٰ مَ لا تخشی الردی (۶) کانہ بک قد نزل

اغفلت عن طلب النجا (۷) ۃِ ولا نجاتَ لمن غفل

---

(۱) میری تباہی ایک آہوش، سرگیں چشم (محبوب) کی بدولت ہے جسے دیکھ کر لوگ ازخود رفتہ ہوجاتے ہیں۔

(۲) اس کے رخسار گویا گلاب کے پھول ہیں جن میں نور اور بہار مخلوط ہے۔

(۳) وہ (محبوب) جب جھکتا ہے تو نزاکت اور لچک میں درخت بان کی شاخ معلوم ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں گردش کرنے لگتی ہیں۔

(۴) جب تک لیل ونہار کا سلسلہ باقی ہے میری پرخلوص محبت اس کے لئے وقف ہے۔

(۵) اے وہ شخص کہ موت نے تجھے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے، امید تجھے کب تک غفلت میں ڈالے رکھے گی۔

(۶) تو کب تک ہلاکت سے خائف نہ ہوگا حالانکہ وہ قریب ہے گویا تجھ پر نازل ہو رہا ہے۔

(۷) کیا تو طلب نجات سے غافل ہوگیا ہے حالانکہ جو غافل رہے اسے کہیں نجات نہیں۔

ہیہات ینفلک المنی (۸) ولما یدوم بک الشغل
فکان یومک لم یکن (۹) وکان نعیک لم یزل.

عبدالرحمٰن الناصر بن محمد بن عبداللہ

اندلس میں امارت کے بجائے خلافت کا اعلان اور فسادات ملک پر قابو

امیر عبداللہ کے بعد عبدالرحمٰن بن محمد ابن عبداللہ تخت نشین ہوا اور اس نے بجائے امارت کے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اس وقت تمام اندلس پر فتنہ وفساد کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف علی الاعلان حکومت کی مخالفت ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن الناصر بھی ایسے نیک شگون کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا کہ جو شخص بھی اس سے مقابلہ کرتا وہ قتل یا ذلیل یا قید ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کے قبضے سے نکلے ہوئے شہر یکے بعد دیگرے دوبارہ فتح ہونے لگے۔ حکومت کی سخت گیری سے باغیوں اور سرکش مفسدوں کا سدباب ہو گیا۔ خلیفہ نے انھیں ذلیل کر کے ان کے قلعوں کو منہدم کرا دیا، ان پر سخت سے سخت تاوان عائد کئے اور سزا کے طور پر ان کے عامل ایسے ظالم وجابر مقرر کئے کہ سب کی اصلاح ہو گئی۔ اس کے ساتھ پے در پے دوسری اصلاحات بھی ہوتی رہیں، شہر کے شہر مطیع ہوتے گئے۔ ابن حفصون اپنی ہی موت اپنے قلعے میں مر گیا۔ اور اس کا لڑکا سلیمان حکومت کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کے تمام اہل و عیال قلعے سے نکل کر خلیفہ کے مطیع ہو کر اس کے لشکر میں شامل ہو گئے

بلشتر پر قبضہ اور ایک مضبوط قلعے کی تعمیر

پھر خلیفہ نے بلشتر پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مضبوط قلعہ تیار کرا کے

---

(۸) افسوس تجھکو تمناؤں نے مشغول کر لیا ہے۔ گو یہ ظاہر ہے کہ تیری یہ مشغولیت ہمیشہ نہیں رہے گی۔

(۹) تو تو یہ سمجھ کر کہ تیرا آج کا دن جیسے کبھی نہ تھا اور موت کی آواز تجھے ہمیشہ سے آ رہی ہے۔

اس کے اطراف کے سب چھوٹے چھوٹے قلعے گرا دئے۔ اس نے یہ قلعہ اس ضرورت سے بنوایا تھا کہ ضرورت کے وقت وہ اور اس کی اولاد اس میں پناہ لے سکے۔ اس زمانے میں یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ اندلس آج کل فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور باغی لوگ اہل ملک کو نکال کر شہروں کو تباہ و برباد کرتے اور مردوں کو قتل کر ڈالتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیتے ہیں۔ ان سے وہی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں جو قلعوں اور مضبوط فصیل والے شہروں یا جزیروں میں پناہ لیں اور یہ بھی مشہور تھا کہ اب یہ فساد اس طرح جڑ پکڑ گیا ہے کہ اب اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی امید نہیں۔

فتوحات کی وسعت اور عروج و اقبالمندی کا دور خلیفہ عبدالرحمٰن پچاس سال تک اسی عزت و احترام اور سطوت و شان سے حکومت کرتا رہا۔ اس کی فتوحات شرق سے غرب تک وسیع ہوتی رہیں اور وہ برابر اپنے دشمنوں کی سرکوبی اور ان کے قلعوں کے انہدام میں مصروف رہا اور اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ اس نے بڑے بڑے شہر اور مضبوط قلعے متواتر فتح کئے حتیٰ کہ سمندر کے پار بھی اس کی نصرت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سبتہ اور طنجہ وغیرہ بھی فتح ہو گئے اور اس نے اپنے جنرل مقرر کر کے اپنی فوج سے ان کی حفاظت کی۔

ان فتوحات کے سلسلے میں خلیفہ نے اپنی بہت سی فوج جہازوں کے ذریعے سے اطراف بربر میں پھیلا دی اور انھیں لوگوں نے جو پہلے اس کے خلاف تھے اب مطیع ہو کر اس کی اعانت کی۔ اور تمام ملک بربر اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ وہاں کے بادشاہ و فرمانروا یا تو مطیع ہو گئے یا تباہ و برباد ہو کر ذلت و نامرادی کے ساتھ مر گئے۔ غرض ایک وقت وہ آیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن کے سپاہیوں اور لشکریوں میں انھیں لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو پہلے اس کے مقابلے میں آ کر سر میدان اس سے لڑ چکے تھے اور آج اس کی رضا جوئی و اطاعت کو اپنی تمام ضرورتوں اور خواہشوں پر مقدم رکھتے تھے۔ تائید الٰہی سے تمام مغرب عبدالرحمٰن الناصر کی زیر نگیں ہو گیا۔ اگر اللہ کی مدد کچھ روز اور اس کے ساتھ رہتی تو یقین تھا کہ مشرق میں بھی اس کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جاتا

لیکن اللہ اس کو معاف کرے آخر میں وہ نفسانی خواہشوں کا غلام ہو گیا اور ان فتوحات کی کثرت نے اسے مغرور بنا دیا اور اب وہ بڑے بڑے عہدوں پر نااہل اور ذلیل لوگوں کو مقرر کرنے لگا جس سے امراء اور معززین ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ نجدۃ الحیری اور اس کے ساتھی جو کمینہ اور ذلیل لوگ تھے اس زمانے میں غیر معمولی عزت پا کر لشکر کے حکومت پر مامور ہوئے۔ بڑے بڑے شرفاء اور ذی عزت لوگ اس کی ماتحت کئے گئے اور انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ نجدہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوں۔

نجدہ الحیری کی سیادت سے فوج کا انحراف اور عین جنگ میں شکست کی سازش

نجدہ الحیری چھچھورا، کم ظرف، اور کوتاہ عقل آدمی تھا تمام امراء و اہل دربار نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ جو جنگ عنقریب ہونے والی ہے اس میں نجدہ کو تنہا چھوڑ کر سب کو بھاگ جانا چاہئے۔ چنانچہ جنگ الخندق میں جو سنہ ۳۲۶ھ میں ہوئی عین گرمی جنگ میں اس قرار داد پر عمل کیا گیا اور نتیجے میں عبد الرحمن الناصر کی فوج کو اتنی سخت شکست ہوئی جس کی تلافی نہ ہو سکی اور ایک مدت تک دشمن عبد الرحمن کے سپاہیوں کے تعاقب میں لگے رہے اور انھیں مارنے پکڑنے اور قید کرنے میں مصروف رہے یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک یہ سپاہی اپنے شہروں، چھاؤنیوں اور جھنڈوں کے نیچے پہنچ کر جمع نہ ہو گئے۔

اس کے بعد سنہ [illegible]ھ عبد الرحمٰن بنفس نفیس کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا اور عیش پرستی پر ایسا مائل ہوا کہ اس کی انتہا کر دی اور اتنی بے اعتدالیاں کیں کہ نہ اس سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ نے کی تھیں نہ آئندہ توقع ہے۔

خلیفہ کے باکمال کارپرداز

عبد الرحمن کے حالات و اخبار اس کثرت سے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں اس کو ایسے ایسے چیدہ اور کارگزار آدمی میسر ہوئے تھے کہ شاذ ہی کسی بادشاہ کو میسر ہوا کرتے ہوں۔ مثلاً موسیٰ ابن حدیر حاجب، عبد الحمید بن بسیل، عبد الملک بن جہور، اسمٰعیل ابن بدر، ابن ابی عیسیٰ قاضی، منذر بن سعید جو علم و ادب اور خطابت میں وحید عصر تھا، اور عیسیٰ بن فطیس کاتب۔

عیسیٰ ابن نطیس کو فن بلاغت و انشا میں ان سب پر خصوصیت سے ترجیح حاصل تھی مگر باوجود اس فضل و کمال کے جب وہ اپنے معاصروں کو خط لکھتا تو ان لوگوں کے اوصاف بیان کرنے سے قاصر رہتا اور ان کے کمال کے آگے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا۔

عیسیٰ ابن نطیس کی کتابت کا ایک نمونہ | جس زمانے میں احمد بن اسحاق قرشی سرقسطہ میں محمد ابن ہاشم تجیبی سے مصروف جنگ تھا۔ اس زمانے میں عبدالرحمٰن الناصر نے جو خطوط احمد بن اسحاق کو بھیجے تھے ان میں سے ایک خط کا ترجمہ جس میں کاتب نے اپنی انشا پردازی کا کمال ظاہر کیا ہے حسب ذیل ہے۔

"پہلے ہم تیری تعریف کرتے تھے تاکہ تیری اصلاح ہو جائے۔ لیکن افسوس تیری اصلیت تجھ پر غالب آکر رہی۔ اب فقر ہی سے تیری اصلاح ہو گی کیونکہ مال و دولت سے تو تیری سرکشی ترقی پر ہے۔ تو دولت کی قدر نہیں کرتا کیونکہ تو اس کا عادی نہیں تھا۔ شاید تو بھول گیا کہ تیرا باپ ابن حجاج کے سواروں میں تھا اور اس کی نظروں میں نہایت درجہ ذلیل۔ اور تو اس وقت اشبیلیہ میں گدھوں کی دلالی کرتا تھا۔ جب تو ہمارے پاس آیا تو ہم نے تجھے پناہ دی۔ تیری مدد کی اور عزت بڑھائی۔ یہاں تک کہ تو مالدار ہو گیا اور ہم نے تیرے باپ کو وزیر بنا کر تجھے فوج کا جنرل بنایا اور سب سے اہم اور اعتماد کی خدمت یعنی حدود ملک کی نگرانی تیرے سپرد کی لیکن افسوس تو نے اس کے عوض ہمارے احکام کی توہین کی اور ہم سے بے پروائی برتی اب باوجود مذکورہ احسانات کے تو خلافت کا بھی مدعی معلوم ہوتا ہے۔ آخر یہ جرأت تجھے کس حسب و نسب پر ہے۔ تیری ہی جیسی خصلت والوں کے لئے کہنے والوں نے کہا ہے۔

انتم خنائر الخشار (۱) ولیس خز کنحیش

ان کنتم من قریش (۲) تزوجوا فی قریش

---

(۱) تم بچے کچھے بیچ میں لوگوں کی نسل ہو ہمارے برابر کیسے ہو سکتے ہو جیسے ٹاٹ ریشم کی طرح نہیں ہوتا۔

(۲) اگر تم قریش کے خاندان سے ہو تو قریش میں شادی کرو۔

او کنتم قبط مصر (۱) فذا التعاظمُ لایش

کیا تیری ماں حمدونہ ساحرہ نہ تھی اور تیرا باپ جذامی نہ تھا اور کیا تیرا دادا حوفحہ ابن عباس کا دربان نہ تھا۔ جو اس کی ڈیوڑھی میں بیٹھا رسیاں بٹا کرتا اور چٹائیاں بنا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر اور ان لوگوں پر جنہوں نے تجھے ہمارے یہاں معزز کرایا ہے لعنت کرے اے نامرد، اے جذامی، اے حرامی، بچۂ سگ، ذلت کے ساتھ فوراً ہمارے حضور میں حاضر ہو۔"

عبدالملک ابن جہور کی شاعری کے نمونے | اپنی کمسنی میں عبدالملک ابن جہور نے استیجہ سے عبدالرحمٰن الناصر کی خدمت میں جو قصیدہ نذر گزرانا تھا اس کا عنوان یہ تھا۔

لابی المُطرِّفِ سیدی من عبدہ المتعبد

اور عنوان کے ذیل میں یہ اشعار تھے۔

دامت لک النعمے ۱ وان (۲) رغمت انوف الحسد
ودوتک نفسی کل مخ (۳) ذور یزوح ولیغتدی
وعلوت حتی الایعا (۴) ل لقدرک العالی ازدد
انی کتبت وحَسَرَ شو (۵) قی لیتیح تجلدی
ودموع عینی تنہمی (۶) فتحیل ماکتبت یدی

---

(۱) مگر جب تم قبطوں سے ہو تو یہ فخر و غرور کس بنا پر؟

(۲) تجھے عیش دائمی نصیب ہو اگرچہ بات حاسدوں کے کتنی ہی خلاف گزرے

(۳) ترے عہد میں بھی یہ دہشت و خوف ہر صبح و شام میرے لئے موجود ہے؛

(۴) حالانکہ تیرا پایہ اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ اس کے لئے مزید بلندی کی دعا سعی حاصل ہے۔

(۵) میں ایسی حالت میں یہ نظم لکھ رہا ہوں کہ میرا صبر و استقلال شوق کی گرمی سے پگھلا جاتا ہے۔

(۶) میرے آنسو بہہ بہہ کر میرے نوشتے کو مٹاتے دے رہے ہیں۔

تغـــربی وتوحشی (۱) وتغـــربی وتوحدی

من ذاق طعم البین ذا (۲) ق الموت غیر مصرد

ورای المنیۃ جہرۃً (۳) فی مصدر او مورد

اتذکر الانس الذی (۴) ولیٔ وطیب المشہد

وکریم بشرک لی ووجہ (۵) کَ حین یشرق فی الندی

فامی من الحسرات آل (۶) وانا لطیل تبـــلدی

فاسلم وعش وابلغ مدا (۷) ک ودع حسودک یکمد

فارحمہ ان بلت العلا (۸) وجری بجدٍ انکد

ثم السلام علیک من (۹) فی دائماً یا ســیدی

عبدالملک ابن جہور کی نیچرل شاعری | عبدالملک کے ذیل کے دو شعر جو اس نے نرگس کی تعریف میں

---

(۱) میری یہ حالت غریب الوطنی، وحشت اور تنہائی کی بدولت ہی۔

(۲) جس شخص نے جدائی کا مزہ چکھا وہ کچھ نہ کچھ موت کی تکلیف ضرور اٹھایا کیا۔

(۳) اور ہر حرکت وسکون کی حالت میں اسے موت کا چہرہ علانیہ نظر آیا۔

(۴) کیا وہ پرلطف اگلی صحبتیں اور محبت آپ کو یاد آتی ہے۔

(۵) اور آپ کو میری طرف اپنا وہ التفات یاد ہے جب آپ کا بشاش چہرہ مجلس احباب میں چمکتا تھا۔

(۶) اس نوع کی حسرتیں انواع واقسام کے ساتھ میری یاد میں اتنی محفوظ ہیں کہ ان کی حفاظت کرتے کرتے میرا حافظہ کند ہوا جاتا ہے۔

(۷) خدا کرے آپ عیش وآرام سے رہیں، اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوں اور آپ کے حاسد جلتے رہیں۔

(۸) جب آپ بلندی وعلو مرتبت حاصل کر چکے ہیں تو اس پر رحم کیجیے جس کی تقدیر برگشتہ اور تدبیر بیکار ہو رہی ہے۔

(۹) اے میرے سردار وآقا! اب میں پھر دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ سلامت رہیں۔

کہے تھے، اس کے تمام اشعار سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔

قد بعثنا الیک بالنرجس ا لہ (۱) غض حکی الون عاشق ممعود

فیہ ریح الحبیب عند البلاقی (۲) واصفرار المحب عند الصدود

بیوی کے متعلق عبدالملک کی ہجو عبدالملک اپنی بیوی کے اخلاق سے بہت ناراض رہتا تھا۔ آخر کو تنگ آ کر اس سے علحدگی اختیار کر لی۔ اس بیوی کے متعلق جو اشعار کہے ہیں وہ یہ ہیں۔

من ذا یفک اسار یہ (۳) ویحل عقد عقالیہ

من ذا یخلص من ہوی (۴) من حینہ فی الہاویہ

انی بلیت بشر من (۵) تحت السمار العالیہ

انی دہیت بحیتہ (۶) قطعت حراک لسانیہ

لوکنت تبصرہا سال (۷) ت اللہ منہا العافیہ

ما ابصرتہا مقلتی (۹) مذا بصر تہار اضیہ

---

(۱) ہم نے تمھارے پاس نرگس کا تازہ پھول بھیجا جس کا رنگ دل شکستہ عاشق کے رنگ کی طرح ہے۔

(۲) اس میں ایسی خوشبو ہے جیسی ملاقات کے وقت محبوب کے پاس سے آتی ہے اور ایسی زردی ہے جیسی محبوب کی روگردانی کے وقت عاشق کے چہرہ پر نظر آتی ہے۔

(۳) کون ہے جو میری بیڑیاں کاٹ دے اور میرے پاؤں کے بند کھول دے۔

(۴) ایسے شخص کو کون رہائی دلاتا ہے جو تباہ ہو کر دوزخ میں جا پڑا ہے۔

(۵) میرا سابقہ ایسی بدترین مخلوق سے پڑا ہے جو سب سے بدتر ہے۔

(۶) مجھے ایسی ناگن نے ڈسا ہے کہ میری زبان کی حرکت تک بند ہو گئی ہے۔

(۷) اگر تو اسے دیکھ لے تو اللہ سے عافیت کا طالب ہو۔ (۸) جب سے خوش دیکھا ہے میری آنکھوں نے آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ (۹) سالہا سال گزرتے جا رہے ہیں مگر اس کی زندگی دراز ہوتی جا رہی ہے۔

تمضی السنون وتنقضی (١) وحیاتہا متمادیہ
ولہا اہیل منتن (٢) عور الوجوہ سوا سیہ
لولا الحیاء بصقت فی (٣) تلک الوجوہ البالیہ
یا یوم معرفتی بہم (٤) یا زانی ابن الزانیہ
انشبتنی وعبرتنی (٥) وقعدت عنی نامیہ
ماکان ہذا منک فی الہ (٦) ودّ القدیم جزائیہ

اسمٰعیل ابن بدر کاتب کی شاعری | اسمٰعیل ابن بدر نے جو قصیدہ عبدالرحمٰن الناصر کی مدح میں لکھا تھا۔ وہ درج ذیل ہے۔

غدمت البین ازق طرف عینی (٧) وفرق بین من اہوی وبینی
لقد نام القعید قریر عین (٨) عن یہوی وبث سخین عین
اذا وجہ الصباح بدا تہادت (٩) رکا مبتلا این بعد این

---

(١) سالہا سال گزرے جا رہے ہیں مگر اس کی زندگی دراز ہوتی جا رہی ہو۔
(٢) اس کے رشتہ دار گندے، بدبودار اور سب کے سب معیوب چہرے کے ہیں۔
(٣) اگر حیا مانع نہ ہوتی تو میں ان بوسیدہ جھری پڑے ہوئے چہروں پر تھوک دیتا۔
(٤) اس دن پر سخت افسوس ہے جب ان سے میری شناسائی ہوئی، افسوس اے زانیہ کے بچے!
(٥) تو چپٹ گیا اور مجھے آفت میں مبتلا کر کے آرام سے بیٹھ رہا۔
(٦) تیری طرف سے قدیم محبت و دوستی کا بدلہ مجھے یہ نہ ملنا چاہئے تھا جو ملا۔
(٧) میں فراق کو کوستا ہوں جس نے میری نیند اڑادی اور محبوب کے اور میرے درمیان جدائی ڈالدی۔
(٨) محبوب کا ہمنشیں جو اسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتا ہے، سوگیا ہو اور میں اپنی گرم اور پرسوز آنکھوں کے ساتھ بیدار ہوں۔
(٩) جس وقت صبح ہوتی ہو تو ہماری سواریاں متواتر تکان کی وجہ سے ایک دوسرے پر گر پڑتی ہیں (یعنی اتنی تکلیفوں کے ساتھ سفر کرتے آرہے ہیں)

فقلبی نازح عنی غریب (۱) وجسمی دو نہ فی غربتین
اجوب القفر بعد القفر ابغی (۲) بذاک رضی امام المشرقین
ومن لا یبتغی وعتہ الی آن (۳) یکون خلیفۃ بالشرقین
لقد حلت حمیا الراح عندی (۴) وطابت بعد فتحک معقلین
وآذن کل ہم بالفراج (۵) وان یقضی غریک کل دین
وہذا البحر یذکر منک عہداً (۶) سقی مغناہ نوّ المرزمین
تحن الیک منہ طامیات (۷) من الامواج بلاً الی فقین
لئن جاشت غوار بہا بار (۸) اجاج لا یسوغ لواردین
فانت البحر عذباً مستہلا (۹) علینا بالنضار وبالُّلجین

---

(۱) میرا دل مجھ سے جدا ہو کر غربت میں پڑا ہوا ہے (آپ کے پاس ہے) اور جسم اس سے علحدہ ہے اور دو شخصوں کے فراق میں مبتلا ہے دل کے اور آپ کے۔

(۲) میں بیابان پر بیابان طے کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس طرح امام مشرقین کی خوشنودی حاصل کروں

(۳) اور میں وہ ہوں کہ جب تک خلیفۂ مشرق و مغرب کا خلیفہ نہ ہو جائے اس سے کچھ نہیں چاہتا۔

(۴) آپ کے دو قلعے فتح کر لینے کے بعد سے مجھ پر شراب اب حلال ہو گئی ہے (ورنہ پہلے حرام تھی۔

(۵) تمام رنج و غم دور ہو جانے کا اعلان ہو گیا ہے اور اس کا بھی کہ تیرے قرضخواہ کو کل قرضہ ادا کر دیا جائے گا۔

(۶) اس دریا کو تیرا اترنا یاد ہے جب کہ اس کی قیامگاہ زمین کے ستاروں کی تابش سے سیراب ہو گئی تھی

(۷) اس کی موجیں جو زمانے کو گھیرے ہوئے ہیں تیری مشتاق ہو ہو کر اٹھ رہی ہیں۔

(۸) اگر اس دریا کی لہروں سے ایسا پانی جوش زن ہو جو پینے والوں کے لئے خوشگوار نہ ہو تو مضائقہ نہیں

(۹) کیونکہ تو ایسا شیریں دریا ہے کہ ہم پر سونا چاندی کثرت سے برسا رہا ہے۔

فعش فی غبطة وسرور ملک (۱) تدوم له دوام الفرقدین

شعر نمبر لقد علت حمیا الراح وغیرہ داٰذن کل ہم والے شعروں کی تشریح یہ ہے کہ جب خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے دوسری چڑھائی کی تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک یہ قلعہ فتح نہ کر لوں گا کوئی خوشی نہ کروں گا۔ اس کی یہ قسم پوری ہوئی اور بجائے ایک قلعے کے خلیفہ نے ابن حفصون کے دو قلعے فتح کئے۔ ان شعروں میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

خلیفہ کی قدردانی اور اس قدردانی کا شکریہ | امیر المومنین الناصر اسماعیل ابن بدر کے اس قصیدے سے بہت خوش ہوا اور اس نے کانچ کے ایک ٹکڑے پر اس کے لئے ایک مختصر سا محبت نامہ لکھا! اسماعیل نے شکرئے کے طور پر حسب ذیل اشعار پیش کئے۔

قد کنت اوجبت فی الزجاج (۲) للراس منی بلا اختلاج

کبیرۃ اترعت رحیقا (۳) صرفا ابت ذلة المزاج

فلم ازل بعد ذا ارجاء (۴) ہا فہل یا دین لراج

یا مالکا رایه ضیاء (۵) فی کل خطب الم داجی

کانما الفجر من سناه (۶) فی غسق اللیل ذو ابتلاج

---

(۱) تو ملک کے لئے رشک و مسرت کا باعث بن کر ہمیشہ خوش رہے اور تارہائے فرقدین کے دوام تک قائم

(۲ و ۳) آپ نے میرے لئے بے تامل ایسی نفیس اور پاکیزہ شراب (محبت) شیشے میں بھر دی جس کا کسی چیز سے مخلوط ہونا اس کے لئے ننگ ہے۔

(۴) میں اس شراب (محبت) کا ہمیشہ سے امیدوار رہا اور تلاش میں رہا کہ کہیں کوئی شخص ایسے امیدوار کو پناہ دے۔ آپ نے یہ امید پوری کر دی۔

(۵ و ۶) اے آقا! آپ کی رائے ہر تاریک رات یا برے وقت آنے والی مصیبت میں اسی روشنی ہے جیسے صبح صادق رات کی تاریکی میں نمودار ہوتی ہے۔

بحرٌ من الجود فاض عذبا (۱) طمٌ علی الابحر الاجاج
من لی بیوم بہ قراع (۲) لیس اخو کربہ بناج
بکل بیضاءَ من راہا (۳) یحسبہا شعلۃ السراج
لا تنس مولاک فی وغاہ (۴) واذکرہ فی حومۃ الہیاج

امیرالمومنین الناصر کا منظوم جواب | عبدالرحمٰن الناصر نے اسمٰعیل کے شکریئے جواب میں یہ شعر کہے۔

کیف وانی لمن ینا جی (۵) من لوعۃ الشوق ما اناجی
ایطمع ان یستریح وقتا (۶) اویقبل الراح بالمزاج
لوحل الصخر بعض شجوی (۷) عاد الی رقۃ الزجاج
کنت کما قد علمت الہو (۸) اذا انا ما شکوت ناج
فصرت للبین فی علاج (۹) لم ادر لی علی العلاج
الورد مما یزید حزنی (۱۰) ویبعث السوسن اہتیاجی

(۱) آب فیاضی کا ایک دریائے شیریں ہے جو روانی و جوش میں پرشور دریاؤں سے بھی سبقت لے گیا۔
(۲و۳) جس دن شمشیر و خنجر سے سابقہ پڑتا ہے، جسے دیکھنے والے چراغ کا شعلہ سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف سے نجات دینے والا کوئی نہیں ملتا اس دن سوا تیرے میرا کون ہوگا۔
(۴) اے آقا تو اپنے غلام کو لڑائی کے موقع پر نہ بھولنا اور میدان جنگ میں ضرور یاد کرنا۔
(۵) جو شخص میری طرح آتش شوق سے پناہ کا طالب ہو اسے کہاں نجات مل سکتی ہے۔
(۶) کیا وہ اس طمع میں ہے کہ کسی وقت آرام کر سکے یا شراب ممزوج پی سکے۔
(۷) اگر میرا بار الم پتھر پر پڑ جائے تو وہ بھی شیشے کی طرح نازک و رقیق بن جائے۔
(۸) تجھے معلوم ہے کہ جب مجھے سوز دروں سے نجات ملنے والی تھی تو میں غفلت میں پڑ گیا تھا۔
(۹) پھر میں جدائی کا علاج کرنے لگا جو علاج کی حد سے تجاوز ہے۔
(۱۰) اور یہ حال ہو گیا کہ گلاب کے پھول سے میرا غم اور بڑھ گیا اور سوسن کے نظارے سے شوق میں اور ہیجان پیدا ہو گیا۔

بارع الیسانی بقدسن (۱) اصبح من ادوجہ ساج
لا ترج مما اردت شیئاً (۲) او یوذن الھم بالفراج

الناصر کی مدح میں اسمٰعیل ابن بدر کا ایک قصیدہ اور بھی قابل دید ہے، جس کے اشعار یہ ہیں۔

لطفت انا ملہ بعقرب صدغہ (۳) عمداً یلدغ فی فواد العاشق
وکان شاربہ ہلال طالع (۴) قد خطہ بالمسک اعذق حاذق
وکانما بجبینہ شمس الضحیٰ (۵) قد قنعت بظلام لیل غاسق
وکان وجنتہ ازاہر روضتہ (۶) یبا ئی بہا السوسان فوق شقائق
فاذا تلفت قلت صورۃ دمیۃ (۷) واذا تبسم قلت خطفۃ بارق
یا غایۃ الحسن الذی ہو غایتی (۸) کیف احتیالی فی فواد خافق
حکم الالہ بما تراہ فما ارے (۹) من حیلۃ فی دفع حکم الخالق

---

(۱) اب میں اچھی خاصی، یا توئی کو زشت دکر دہ چہروں سے زیادہ بدنما پاتا ہوں۔
(۲) تو نے جس بات کا ارادہ کیا ہے اس کی امید نہ کر نہ یہ خیال کر کہ غم دور ہو جائے گا۔
(۳) محبوب کی انگلیوں نے ازراہ لطف عقرب گیسو کو اشارہ کیا کہ عاشق کے دل میں کاٹ لے۔
(۴) اس کی مونچھیں گویا ہلال طالع ہیں جن پر کسی نہایت ماہر صناع نے مشک سے خط کھینچ دیا ہے
(۵) اور اس کی پیشانی میں گویا آفتاب درخشاں ہے جو اندھیری راتوں کی تاریکی پر چھا گیا ہے۔
(۶) اس کے رخسار گویا کسی باغ کے پھول ہیں جن کی بدولت گل سوسن کو گل لالہ پر فخر ہے۔
(۷) جس وقت وہ مڑتا ہے تو ایک تراشیدہ منقش پتلی کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب مسکراتا ہے تو بجلی سی گر پڑتی ہے۔
(۸) اے حسن مطلق کی انتہا! (کہ میرا مقصود وہی ہے) تو ہی بتا دے کہ میں اپنے تڑپتے ہوئے دل کو کیونکر سنبھالوں۔
(۹) جو کچھ تو دیکھتا ہے اس کا حکم خدا کی طرف سے ہو چکا ہے اور خدا کا حکم ٹلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

قل للخلیفة من امیة والذی (۱) ما دون فیض نواله من عائق
انسیت من منصورها ورشیدها (۲) فمحوت من مهدیها والواثق
وحکیت من عبد الملیک وهدیه (۳) سیما الخلیفة والامام السابق
أأضیع بعد مواثق لک جمة (۴) فیما مضی اکدتها بمواثق

اس کتاب میں اندلس کی فتوحات اور وہاں کے امرا کے حالات میں جو کچھ جمع کیا گیا تھا اس کا بیان ختم ہو گیا۔ الحمد للہ حق حمدہ والصلوٰۃ علی سیدنا محمد نبیہ وعبدہ

---

(۱) بنی امیہ کے خلیفہ یا اس شخص سے کہدے جس کے فیض کرم کا روکنے والا کوئی نہیں۔
(۲) کہ آپ نے خلفا میں منصور و ہارون رشید کو بھلا دیا اور مہدی و واثق کی شہرت کو پست کر دیا۔
(۳) ایک عالی رتبہ امام و خلیفہ کی طرح آپ نے عبد الملک اور ان کی عادتوں کی یاد تازہ کر دی۔
(۴) کیا میں آپ کے مضبوط اور بار ونوق وعدوں کے بعد بھی تباہ و محروم کر دیا جاؤں گا۔